

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ

اللہ ان سے راضی ہو گیا، اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے (القرآن)

اصحابُ الرسول ﷺ





تالیف

خلیق احمد مفتی

رضي اللّٰه عنهم و رضوا عنه

اللہ ان سے راضی ہوگیا، اور وہ اللہ سے راضی ہوگئے (القرآن)

اَصحابُ الرسول

صلی اللہ علیہ وسلم

تأ لیف:

خلیق احمد مفتی

نام کتاب : اصحاب الرسول ﷺ

طبع : اول ۱۴۳۶ھ مطابق ۲۰۱۵ء

تألیف : خلیق احمد مفتی

ناشر :

رابطہ

پوسٹ بکس نمبر:1625 عجمان، متحدہ عرب امارات ۔

khaleeqmufti@hotmail.com

face book: Khaleeq Ahmed Mufti



ملاحظہ: یہ کتاب مفت تقسیم کیلئے ہے۔

فہرست حسبِ حروفِ تہجی

الف

ب

ج

ح



فہرستِ مضامین

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز:

الحمد للّٰہ ربّ العالمین ، والصّلاۃ والسّلام علیٰ أشرف الأنبیاء والمرسلین ، نبیّنا محمّد وعلیٰ آلہ وأصحابہ أجمعین ، أمابعد :

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تمام بنی نوعِ انسان میں وہ برگزیدہ وخوش نصیب ترین افراد تھے جنہیں خیرالبشر، سیدالأولین والآخرین، خاتم الأنبیاء والمرسلین، رسول اکرم ﷺ کی زیارت، خدمت، صحبت ومعیت، نیز آپؐ سے براہِ راست کسبِ فیض کا اور دینِ برحق سیکھنے کا موقع نصیب ہوا، اور پھر انہی برگزیدہ شخصیات نے اس نورِ نبوت کو اور اس مقدس ترین امانت کو آگے تمام امت تک پہنچانے کا انتہائی اہم اور مبارک ترین فریضہ سرانجام دیا، لہٰذا حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا رہتی دنیا تک تمام امت پر یہ ناقابلِ فراموش احسان ہے، اور ان کے اسی احسانِ عظیم کی بدولت آج ہم اس قابل ہیں کہ اللہ کے دین کو سمجھ سکیں، اس دینِ برحق کی پاکیزہ تعلیمات پر عمل کرسکیں، اور یوں ......بتوفیقِ الٰہی......اپنے لئے دونوں جہانوں میں خیروخوبی اور صلاح وفلاح کا انتظام کرسکیں۔

یقیناً یہی بات ان جلیل القدر شخصیات کی عظمت کو سمجھنے اور ان کے بلندترین مقام ومرتبے کو پہچاننے کیلئے بہت کافی وشافی ہے، ان کی محبت ایمان کا تقاضا ہے، جبکہ ان سے بغض رکھنا، یا ان کے مقام ومرتبے کے بارے میں دل میں کسی قسم کا شک وشبہہ رکھنا دراصل دینِ اسلام کی تمام عمارت کو مجروح ومخدوش کردینے کے مترادف ہے۔

دینِ اسلام کا سب سے اولین، اہم ترین، اور بنیادی مأخذ ومصدر ''قرآن کریم'' ہے، اور

یہی حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر ''کتابتِ وحی'' کا فریضہ انجام دیتے رہے......جس کی بدولت ان کے اپنے دل بھی کلام اللہ کے نور سے مسلسل ''منور'' ہوتے رہے۔ لہٰذا قابلِ غور ہے یہ بات کہ ان مبارک و برگزیدہ حضرات کی امانت و دیانت یا ان کے مقام و مرتبے کے بارے میں کسی قسم کے شکوک وشبہات کا کیا مطلب ہوگا؟ اس چیز کے نتائج ومفاسد کس قدر تباہ کن اور خطرناک ہوں گے؟ اور یہ کہ بات آخر کہاں تک جا پہنچے گی......؟

مزید یہ کہ جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ نے تمام بنی نوعِ انسان میں سے اپنے حبیب ﷺ کو بطورِ خاص منتخب فرمایا اور ''امام الأنبیاء'' بنایا، تو یقیناً اللہ نے اپنے دین کی نشر واشاعت کے معاملے میں اپنے حبیب ﷺ کے ''اَصحاب'' کا انتخاب بھی خود ہی فرمایا ہوگا...... ورنہ یہ شرف' یہ اعزاز' یہ توفیق' اور یہ مقام و مرتبہ خود بخود نصیب ہو جانے والی چیز ہرگز نہیں ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں جا بجا ان خوش نصیب ترین افراد کو ہمیشہ کیلئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے رضامندی وخوشنودی اور جنت کی خوشخبری سے شادکام کیا گیا ہے۔

حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی یہ شان' یہ مقام و مرتبہ' اور پھر یہ کہ اللہ کا دین ہم تک پہنچانے کے معاملے میں ان کا یہ عظیم احسان......یہی وہ اسباب ہیں کہ جو ہم سے اس بات کا تقاضا کرتے ہیں کہ ہم اپنے دلوں میں ان کیلئے عزت واحترام اور محبت وعقیدت کے جذبات کے ساتھ ساتھ......ان کے حالاتِ زندگی کو جاننے کی فکر وجستجو بھی کریں، اور پھر یہی جذبہ ہم ''نسلِ نو'' تک بھی منتقل کریں، تاکہ ان کی تربیت اور نشو ونما بھی اس طرح ہو کہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی محبت وعقیدت ان کے دلوں میں پیوست ہو جائے اور اس چیز کو وہ اپنے لئے جزوِ ایمان تصور کرنے لگیں، اور ان کے

نقشِ قدم پر چلنے کے جذبے سے ہمیشہ سرشار رہیں۔

اسی جذبے کے تحت اس ناکارہ وناتواں بندۂ عاجز کے دل میں اس بارے میں کچھ تحریر کرنے کی تمنا بیدار ہوئی ہے۔

یقیناً یہ کام انتہائی محنت طلب ہے......جبکہ ہمت اور حوصلے کا مکمل فقدان ہے......اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا احساس شدت کے ساتھ دامن گیر ہے......

لیکن اس کے باوجود بس اللہ کا نام لے کر آج میں ناچیز اس کام کا آغاز کر رہا ہوں......اس یقین وایمان کے ساتھ کہ بندے کا کام تو محض اتنا ہے کہ کارِ خیر کا آغاز کر دیا جائے، آگے اللہ ارحم الراحمین کے حوالے......منزل تک پہنچانا اسی کا کام ہے......وما توفیقی الا باللہ، علیہ توکلت والیہ اُنیب......

اس موقع پر دل میں یہ تمنا اور حسرت بھی شدت کے ساتھ موجود ہے کہ اگرچہ حقیقت کی دنیا میں رسول اللہ ﷺ نیز آپؐ کے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دیدار اور زیارت وملاقات کا شرف تو نصیب نہیں ہوسکا......لیکن اس کتاب کو تحریر کرتے وقت ''تصور کی دنیا'' میں ہی چند گھڑیاں ان کی معیت میں گذر جائیں گی......شاید یہی چیز اس ناکارہ کیلئے ''سرمایۂ حیات'' اور پھر آخرت میں ''وسیلۂ نجات'' بن جائے......شاید یہی اندازِ فکر......اور یہ محنت وکوشش وہاں جنت الفردوس میں واقعی ان حضرات کی صحبت ومعیت کا سبب بن جائے......وماذلک علی اللہ بعزیز۔

خلیق احمد مفتی

۷/ جمادی الثانیہ ۱۴۳۵ھ۔مطابق ۷/ اپریل ۲۰۱۴ء

پوسٹ بکس نمبر:1625 عجمان، متحدہ عرب امارات khaleeqmufti@hotmail.com

مناقبِ صحابہ:

☆......صحابی کی تعریف:

صحابی سے مراد وہ شخص ہے جسے اپنی زندگی میں بحالتِ اسلام اپنی آنکھوں سے براہِ راست رسول اللہ ﷺ کے دیدار کا شرف نصیب ہوا، اور پھر وہ مسلسل تا دمِ آخر دینِ اسلام پر قائم رہا، اور اسی حالت میں اس کی وفات ہوئی۔(۱)

اہلِ علم کا اس پر اتفاق واجماع ہے کہ امت کا کوئی اعلیٰ ترین فرد بھی کسی ادنیٰ صحابی کے مقام ومرتبے کو نہیں پہنچ سکتا......کیونکہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین وہ مقدس وبرگزیدہ ترین افراد تھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ سے براہِ راست استفادہ وکسبِ فیض کیا، اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دین سیکھا، اللہ کا کلام سیکھا، حکمت ودانش سیکھی......آپ ﷺ کی تعلیم وتربیت اور فیضِ نظر کی بدولت یہ حضرات پاکیزہ وبرگزیدہ ترین اشخاص بن گئے......ان کے دلوں میں ایمان اس قدر راسخ ومضبوط ہوگیا کہ کوئی چیز انہیں کسی صورت راہِ حق سے برگشتہ ومنحرف نہیں کرسکتی تھی۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان حضرات کے ایمان کو رہتی دنیا تک تمام بنی نوعِ انسان کیلئے مثال اور معیار قرار دیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿فَاِن آمَنُوا بِمِثلِ مَا آمنتُم بِهٖ فَقَداهتَدَوا﴾ (۲) ترجمہ: (اگر وہ لوگ بھی اسی

(۱) ملاحظہ ہو: شرح العقیدۃ الطحاویۃ، از: صالح بن عبدالعزیز آل الشیخ، صفحہ: ۸۳۷، جلد: ۲ (باب: حب أصحاب النبی صلی اللہ علیہ وسلم دین وایمان، وبغضہم کفر ونفاق وطغیان)
نیز: مصطلح الحدیث، از: محمد بن صالح العثیمین، ص: ۵۴۔

(۲) البقرۃ [۱۳۷]

طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لائے ہو، تب وہ راہِ راست پر آ جائیں گے)
یعنی اصل اور حقیقی ایمان تو وہی ہے جو حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دلوں میں موجزن تھا۔

اسی طرح قرآن کریم میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو خطاب کرتے ہوئے یہ ارشادِ ربانی ہوا: ﴿......وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيكُمُ الاِيمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِي قُلُوبِكُمْ وَكَرَّهَ اِلَيكُمُ الكُفرَ وَالفُسُوقَ وَالعِصيَانَ أُولٰٓئِك هُمُ الرَّاشِدُونَ فَضْلاً مِّنَ اللّٰهِ وَنِعمَةً وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ﴾ (۱) ترجمہ: (......لیکن اللہ تعالیٰ نے ہی ایمان کو تمہارے دلوں میں محبوب بنادیا ہے، اور اسے تمہارے دلوں میں زینت دے رکھی ہے۔ اور کفر کو، اور گناہ کو، اور نافرمانی کو تمہاری نگاہوں میں ناپسندیدہ بنادیا ہے، یہی لوگ راہ یافتہ ہیں۔ اللہ کے انعام واحسان سے۔ اور اللہ دانا اور باحکمت ہے)
یقیناً یہ آیت خالق ارض وسماء کی طرف سے ان حضرات کے حق میں بہت بڑی گواہی، نیز ان کے ایمان اور رشد وہدایت پر ہونے کی واضح ترین دلیل ہے۔

اس سلسلے میں مزید قابلِ ذکر یہ کہ خود قرآن کریم میں ان حضرات کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے ہمیشہ کیلئے رضامندی وخوشنودی کی خوشخبری سے شادکام کیا گیا ہے، جیسا کہ ارشادِ ربانی ہے: ﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنهُم وَرَضُوا عَنهُ﴾ (۲) یعنی ''اللہ ان سے راضی اور خوش، اور یہ اللہ سے راضی اور خوش ہیں)

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے: (خَيرُ النَّاسِ قَرْنِي ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم ، ثُمَّ الَّذِينَ يَلُونَهُم) (۳) یعنی بہترین لوگ وہ ہیں جو میرے زمانے میں ہیں، پھر وہ لوگ جو

(۱) الحجرات [۷-۸] (۲) المائدۃ [۱۱۹]۔ التوبۃ [۱۰۰]۔ البینۃ [۸]
(۳) بخاری [۳۶۵۱] باب فضائل اصحاب النبی ﷺ۔ نیز: مسلم [۲۵۳۳] باب فضل الصحابہ۔

اُن کے بعد'اور پھر وہ لوگ جو اُن کے بعد)

نیز ارشادِ نبوی ہے: (لَاتَسُبُّوا أصْحَابِي، فَلَو أنَّ أَحَدَكُم أنْفَقَ مِثلَ أُحُدٍ ذَهَباً مَا بَلَغَ مُدَّ أَحَدِهِم وَلَا نَصِيفَهُ) (۱) یعنی ''میرے ساتھیوں کو برا نہ کہو، کیونکہ تم میں سے اگر کوئی اُحد پہاڑ کے برابر سونا اللہ کی راہ میں خرچ کرے' تب بھی وہ اُس اجر و ثواب کا مستحق نہیں بن سکتا جو میرے ساتھیوں میں سے محض مٹھی بھر (اناج) اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کیلئے ہے''۔(۲)

اسی طرح ارشادِ نبوی ہے: (اَللّٰهَ اَللّٰهَ فِي أصْحَابِي، لَاتَتَّخِذُوهُم غَرَضاً مِن بَعْدِي، فَمَن أحَبَّهُم فَبِحُبِّي أحَبَّهُم، وَمَن أبْغَضَهُم فَبِبُغْضِي أَبْغَضَهُم، وَمَن آذَاهُم فَقَدْ آذَانِي، وَمَن آذَانِي فَقَد آذَىٰ اللّٰهَ، وَمَن آذَىٰ اللّٰهَ فَيُوشِكُ أن يَأْخُذَه) (۳) ترجمہ: (میرے ساتھیوں کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو، تم میرے بعد انہیں [اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی خاطر] نشانہ نہ بنانا، جو کوئی ان سے محبت رکھتا ہے وہ دراصل مجھ سے محبت کی وجہ سے ان سے محبت رکھتا ہے، اور جو کوئی ان سے بغض رکھتا ہے وہ مجھ سے بغض کی وجہ سے ان سے بغض رکھتا ہے۔ جس نے انہیں کوئی اذیت پہنچائی اس نے مجھے اذیت پہنچائی، اور جس نے مجھے اذیت پہنچائی اس نے اللہ کو اذیت پہنچائی، اور جس نے اللہ کو اذیت پہنچائی' اللہ عنقریب اس کی گرفت فرمائے گا''۔

☆......حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں ''فرقِ مراتب'':

یقیناً حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تمام جماعت ہی برگزیدہ ترین ہے۔

(۱) متفق علیہ۔ مشکوٰۃ المصابیح [۵۹۹۸] باب مناقب الصحابہ

(۲) ترمذی [۳۸۶۲] باب فی من سبّ أصحاب النبی ﷺ۔

(۳) اُس دور میں ''مُد'' غلہ و اناج تولنے کیلئے ایک پیمانہ تھا۔

البتہ اہلِ علم نے ان میں باہم ''فرقِ مراتب'' اور ''تفاضل'' بیان کیا ہے، جس کی تفصیل کچھ اس طرح ہے:

☆ مجموعی طور پر تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سب سے بلندترین مقام ومرتبہ ان دس خوش نصیب ترین حضرات کا ہے جنہیں ایک موقع پر خود رسول اللہ ﷺ نے ایک ساتھ جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا اور اسی مناسبت سے انہیں ''عشرہ مبشرہ'' یا ''العشرۃ المبشر ون بالجنۃ'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے۔(۱)

☆ اور پھر ان ''عشرہ مبشرہ'' میں سے بلندترین مقام ومرتبہ چاروں ''خلفائے راشدین'' کا ہے۔

☆ پھر حضرات ''خلفائے راشدین'' میں فرقِ مراتب ان کی ترتیب کے مطابق ہے، یعنی خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ، خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، اور خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

☆ ہجرتِ مدینہ سے قبل دینِ اسلام قبول کرنے والوں کا مقام ومرتبہ ہجرت کے بعد اسلام قبول کرنے والوں سے بلند ہے۔

☆ غزوۂ بدر میں شرکت کرنے والوں کا مقام ومرتبہ دوسروں سے زیادہ ہے۔

☆ بیعتِ رضوان کے موقع پر جو حضرات شریک تھے ان کا مقام ومرتبہ دوسروں سے بڑھا ہوا ہے...... نیز ان کیلئے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے بطورِ خاص رضامندی وخوشنودی کا

(۱) ملاحظہ ہو حدیث: (ابوبکر فی الجنۃ، وعمر فی الجنۃ، وعثمان فی الجنۃ، وعلی فی الجنۃ، وطلحۃ فی الجنۃ، والزبیر فی الجنۃ، وعبدالرحمٰن بن عوف فی الجنۃ، وسعد فی الجنۃ، وسعید فی الجنۃ، وأبوعبیدۃ بن الجراح فی الجنۃ) (ترمذی [۳۷۴۷] عن عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، ابواب المناقب)۔

اعلان ہے(۱)

☆فتحِ مکہ سے قبل مشرف باسلام ہونے والوں کا مقام ومرتبہ فتحِ مکہ کے بعد مسلمان ہونے والوں سے زیادہ ہے۔

لہٰذا سب سے کم مقام ومرتبہ ان حضرات کا ہے جو فتحِ مکہ کے بعد مسلمان ہوئے، جیسا کہ قرآن کریم میں ارشاد ہے:﴿لَا يَسْتَوِي مِنكُم مَّنْ أَنفَقَ مِن قَبْلِ الْفَتْحِ وَقَاتَلَ أُولَٰئِكَ أَعْظَمُ دَرَجَةً مِّنَ الَّذِينَ أَنفَقُوا مِن بَعْدُ وَقَاتَلُوا وَكُلًّا وَعَدَ اللَّهُ الْحُسْنَىٰ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ﴾ (۲) ترجمہ:(تم میں سے جن لوگوں نے فتح سے پہلے [اللہ کی راہ میں] خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے' وہ دوسروں کے برابر نہیں، بلکہ وہ اُن سے بہت بڑے درجے کے ہیں جنہوں نے فتح کے بعد [اللہ کی راہ میں] خرچ کیا ہے اور قتال کیا ہے، ہاں البتہ بھلائی کا وعدہ تو اللہ نے ان سب سے کیا ہے، جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ اس سے باخبر ہے)(۳)

(۱) ارشادِ ربانی﴿لَقَدْ رَضِيَ اللَّهُ عَنِ الْمُؤْمِنِينَ إِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ......﴾ کی تفسیر ملاحظہ ہو(سورۃ الفتح:۱۸)

(۲)سورۃ الحدید[۱۰]

(۳) یعنی فتحِ مکہ سے قبل چونکہ مسلمان کمزور تھے اور مشکل حالات سے گذر رہے تھے' لہٰذا ان مشکلات کے باوجود جس کسی نے اللہ کی راہ میں خرچ کیا اور جہاد بھی کیا، اس کا مقام ومرتبہ فتحِ مکہ کے بعد یہ کام انجام دینے والوں سے زیادہ ہے۔ لہٰذا اجر وثواب میں نیز مقام ومرتبے میں یہ دونوں برابر نہیں ہوسکتے۔

ہاں البتہ اسی آیت کے آخری حصے میں یہ وضاحت بھی آگئی ہے کہ صحابۂ کرام کے ان دونوں گروہوں میں اگرچہ فرقِ مراتب تو ضرور ہے......لیکن اس کے باوجود اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے فتحِ مکہ کے بعد دینِ اسلام قبول کرنے والے صحابۂ کرام کیلئے بھی ''حُسنیٰ''، یعنی ''بھلائی کا وعدہ'' موجود ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور خلیفۂ اول کو تاریخ میں ''ابوبکر صدیق'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، ابوبکر ان کی کنیت تھی، جبکہ ''صدیق'' لقب تھا، اصل نام ''عبداللہ'' تھا، اسلام سے قبل ان کا نام ''عبدالکعبہ'' تھا، قبولِ اسلام کے بعد خود رسول اللہ ﷺ نے ان کا نام عبدالکعبہ سے تبدیل کر کے ''عبداللہ'' رکھ دیا تھا۔

بچپن سے ہی ''عتیق'' کے لقب سے بھی مشہور تھے، جبکہ قبولِ اسلام کے بعد مزید یہ کہ ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ خوشخبری سنائی تھی: أنتَ عَتِيقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ (۱) یعنی ''آپ اللہ کی طرف سے جہنم کی آگ سے آزاد کردہ ہیں''۔

البتہ بعد میں ''عتیق'' کی بجائے ہمیشہ کیلئے ''صدیق'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مکی تھے، قُرَشی تھے، مہاجر تھے، قبیلۂ قریش کے معزز خاندان ''بنوتَیم'' سے ان کا تعلق تھا، جو کہ مکہ کے مشہور محلّہ ''مسفلہ'' میں آباد تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ'' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے والد کا نام ''ابوقحافہ'' جبکہ والدہ کا نام ''سلمیٰ'' تھا، یہ دونوں باہم چچازاد تھے، لہٰذا والد اور والدہ دونوں ہی کی طرف سے آپؓ کا سلسلۂ نسب ساتویں پشت (مُرّہ بن کعب) پر رسول اللہ ﷺ کے سلسلۂ نسب سے جا ملتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی مقرب اور خاص ترین ساتھی

(۱) ترمذی [۳۶۷۹] باب مناقب ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

ہونے کے علاوہ مزید یہ شرف بھی حاصل تھا کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے سسر بھی تھے، اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپؓ ہی کی صاحبزادی تھیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو یہ خاص شرف اور اعزاز بھی حاصل تھا کہ ان کے خاندان میں مسلسل چار نسلوں کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت کا شرف نصیب ہوا، چنانچہ ان کے والدین بھی صحابی تھے، یہ خود بھی صحابی تھے، ان کے صاحبزادے عبداللہ اور عبدالرحمٰن' نیز صاحبزادیاں عائشہ اور اسماء......اور پھر نواسے عبداللہ بن زبیر (رضی اللہ عنہم اجمعین) سبھی رسول اللہ ﷺ کے صحابی تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ولادت مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے تقریباً ڈھائی سال بعد' اور پھر وفات مدینہ میں آپ ﷺ کی وفات کے تقریباً ڈھائی سال بعد ہوئی۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جاہلیت اور پھر اسلام دونوں ہی زمانوں میں نہایت باوقار اور وضع دار رہے، تمدنی و معاشرتی زندگی میں انہیں ہمیشہ ممتاز مقام حاصل رہا، ظہورِ اسلام سے قبل بھی اُس معاشرے میں انہیں ہمیشہ انتہائی عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، سب اہلِ مکہ اپنے اختلافات اور خاندانی جھگڑوں میں انہیں اپنا ''ثالث'' مقرر کرتے، اور پھر ان کے ہر فیصلے کو بلا چون و چرا تسلیم کیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کو جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نبوت عطاء کی گئی اور آپؐ نے اعلانِ نبوت فرمایا......تب آپؐ کی اہلیہ محترمہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا و دیگر افرادِ خانہ کے بعد' سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے دینِ اسلام قبول کیا، آپؐ کی مکمل تصدیق کی، اور اس موقع پر کوئی دلیل یا معجزہ نہیں مانگا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ظہورِ اسلام سے قبل ہی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت گہرا تعلق تھا، دونوں میں بہت قربتیں تھیں، اور ایک دوسرے کے گھر آمد و رفت کا سلسلہ رہتا تھا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی ذاتی ملکیت میں قبولِ اسلام کے وقت نقد چالیس ہزار درہم تھے، قبولِ اسلام کے بعد انہوں نے اپنی یہ کل پونجی رسول اللہ ﷺ کی خدمت ' اور دینِ اسلام کی نشر و اشاعت میں صرف کردی۔

دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں متعدد ایسے افراد جو کہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے، اور دینِ اسلام قبول کر لینے کی وجہ سے اپنے مشرک آقاؤں کے ہاتھوں بدترین عذاب اور سختیاں جھیلنے پر مجبور تھے، انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنی جیبِ خاص سے نقد رقم ادا کر کے ان کے مشرک آقاؤں سے خرید لیا، اور پھر اللہ کی خوشنودی کی خاطر انہیں آزاد کر دیا...... قرآن کریم کی درجِ ذیل آیت میں اسی بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے: ﴿وَسَیُجَنَّبُهَا الْأَتْقَىٰ الَّذِي يُؤْتِي مَالَهُ يَتَزَكَّىٰ وَمَا لِأَحَدٍ عِندَهُ مِن نِّعْمَةٍ تُجْزَىٰ إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ﴾ (۱)

ترجمہ: (اور ایسا شخص اُس [جہنم] سے دور رکھا جائے گا جو بڑا پرہیزگار ہوگا، جو پاکی حاصل کرنے کیلئے اپنا مال دیتا ہے، کسی کا اُس پر کوئی احسان نہیں کہ جس کا بدلہ دیا جا رہا ہو، بلکہ صرف اپنے پروردگار بزرگ و بلند کی رضا چاہنے کیلئے، یقیناً وہ [اللہ] عنقریب راضی ہو جائے گا)۔

مفسرین کے بقول اس آیت کا مفہوم اگرچہ عام ہے، یعنی جو کوئی بھی محض اللہ کی رضامندی

(۱) سورۃ اللیل [۱۷-۲۱]

وخوشنودی کی خاطر اپنا مال خرچ کرے گا وہ جہنم کی آگ سے محفوظ رہے گا......البتہ بطورِ خاص اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف اشارہ بھی مقصود ہے۔(۱)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا اُس معاشرے میں کافی اثر ورسوخ تھا اور حلقۂ احباب بھی کافی وسیع تھا، لہٰذا انہیں اللہ کی طرف سے ''ہدایت'' کی شکل میں جو خیر نصیب ہوئی تھی اسے انہوں نے خود اپنی ذات تک محدود رکھنے کی بجائے اس اثر ورسوخ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دوسروں تک پہنچانے کی کوشش بھی نہایت سرگرمی اور جذبے کے ساتھ شروع کر دی، چنانچہ ان کی ان دعوتی وتبلیغی کوششوں کے نتیجے میں اُس معاشرے کے متعدد ایسے بڑے بڑے اور بااثر افراد مشرف باسلام ہو گئے جو آگے چل کر دینِ اسلام کے بڑے علمبردار اور اس قافلۂ توحید کے سپہ سالار ثابت ہوئے......دینِ اسلام کی نشر واشاعت اور سربلندی کی خاطر جنہوں نے تاریخی خدمات اور ناقابلِ فراموش کارنامے انجام دیئے، ''عشرہ مبشرہ'' یعنی وہ دس خوش نصیب ترین حضرات جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا' ان میں سے پانچ حضرات نے آپؓ کی دعوت اور تبلیغی کوششوں کے نتیجے میں ہی دینِ برحق قبول کیا تھا(۲)

☆......''صدیق''

مکی دور میں جب نبوت کا بارہواں سال چل رہا تھا، تب ماہِ رجب میں وہ انتہائی عجیب و

(۱) مزید تفصیل کیلئے سورۃ اللیل میں مذکورہ آیات کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

(۲) یعنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ، حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔ جبکہ ''عشرہ مبشرہ'' میں سے دیگر پانچ حضرات یہ ہیں: حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ، حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ۔

غریب واقعہ پیش آیا جو کہ ''اسراء ومعراج'' کے نام سے معروف ہے۔ یہ واقعہ اپنی ابتداء سے انتہاء تک عجیب وغریب اورانتہائی محیرالعقول قسم کے امور پر مشتمل تھا......اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کو اللہ کے حکم سے بیت المقدس اور پھر ملأ اعلیٰ یعنی آسمانوں کی سیر کرائی گئی، جہاں آپؐ نے بہت کچھ دیکھا، جنت اور وہاں کی نعمتوں کا' نیز جہنم اور وہاں کے عذاب کا مشاہدہ کیا۔مختلف آسمانوں پر متعدد انبیائے کرام علیہم السلام سے ملاقات بھی ہوئی۔ یہ تمامتر مسافت رات کے ایک مختصر سے حصے میں طے کر لی گئی اور آپؐ راتوں رات واپس مکہ مکرمہ بھی پہنچ گئے......بیشک اللہ ہر چیز پر قادر ہے......!!

رسول اللہ ﷺ راتوں رات جب اللہ کی قدرت سے بیت المقدس اور پھر آسمانوں کے اس سفر کے بعد واپس مکہ مکرمہ پہنچے اور مکہ والوں کو اس عجیب وغریب سفر کے بارے میں مطلع فرمایا تو مشرکینِ مکہ نے آپؐ کی زبانی اس سفر کی روداد سننے کے بعد آپؐ کا خوب مذاق اڑایا، تماشا بنایا، اور تمسخر واستہزاء کا بازار گرم کر دیا۔

جبکہ اہلِ ایمان نے اس واقعہ کی ''تصدیق'' کی، بالخصوص اس موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا موقف بہت زیادہ نمایاں اور جرأت مندانہ تھا......لہٰذا اسی نسبت کی وجہ سے آپؓ ہمیشہ کیلئے تاریخ میں ''صدیق'' کے لقب سے معروف ہو گئے۔(۱)

☆......ہجرتِ مدینہ:

نبوت کے تیرہویں سال کے آخری ایام میں جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو مسلمان بڑی تعداد میں مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے، مختلف گروہوں اور ٹولیوں کی شکل میں بھی ......نیز اِکا دُکا بھی......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رفتہ رفتہ مکہ مسلمانوں سے خالی ہو گیا، اب محض

(۱) مصنف عبدالرزاق[۵/۳۲۸]

مجبور اور محبوس قسم کے لوگ ہی مکہ میں رہ گئے تھے، یعنی وہ لوگ جو کسی کی قید میں تھے، یا جو غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے تھے۔ البتہ تین افراد ایسے تھے کہ جو نہ تو محبوس تھے اور نہ ہی مجبور...... لیکن اس کے باوجود وہ تاہنوز مکہ میں ہی مقیم تھے، یعنی خود رسول اللہ ﷺ، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، نیز حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، اور اس کی وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ تو اب تک اپنے اللہ کی طرف سے ''اجازت'' کے منتظر تھے، جبکہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اب تک آپ ﷺ نے خود روک رکھا تھا۔

البتہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس دوران متعدد بار آپؐ سے ''ہجرت'' کی اجازت طلب کر چکے تھے، لیکن ہر بار آپؐ انہیں یہی جواب دیتے کہ: لَا تَعْجَل یَا أبَا بَکر! لَعَلَّ اللّٰہَ یَجْعَلُ لَکَ صَاحِباً یعنی ''اے ابوبکر! جلدی نہ کرو، شاید اللہ تمہارے لئے کسی ہمسفر کا انتظام فرمادے......'' اور تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں یہ حسرت پیدا ہوتی کہ شاید وہ ''ہمسفر'' خود رسول اللہ ﷺ ہی ہوں......

اور پھر ایک روز جب آپؐ اچانک اور خلافِ معمول تپتی ہوئی دوپہر میں حضرت ابوبکر صدیقؓ کے گھر تشریف لائے اور انہیں مطلع فرمایا کہ آج سفرِ ہجرت پر روانگی ہوگی...... تب حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: الصُحبَۃ یا رسُولَ اللّٰہ؟ یعنی ''اے اللہ کے رسول! اس سفر میں کیا میں آپ کے ہمراہ چلوں؟'' آپ ﷺ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نَعَم، الصُحبَۃ یا أبَا بَکر۔ یعنی: ''ہاں اے ابوبکر! اس سفر میں تم میرے ''ہمسفر'' ہوگے''۔ اور تب فرطِ مسرت کی وجہ سے ابوبکرؓ اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے...... ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے، اور ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......!!

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ

عنہا اُس وقت یہ تمام منظر دیکھ رہی تھیں...... وہ فرماتی ہیں کہ اُس روز جب میں نے اپنے والد (ابوبکرؓ) کو فرطِ مسرت سے روتے ہوئے دیکھا......تو اُس وقت زندگی میں پہلی بار مجھ پر یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ انسان جس طرح بہت زیادہ غم اور صدمے کے وقت روتا ہے، اسی طرح بہت زیادہ خوشی کے وقت بھی روتا ہے......انسان کی آنکھوں سے بہنے والے یہ آنسو کبھی ''غم کے آنسو'' ہوا کرتے ہیں، اور کبھی ''خوشی کے آنسو''، اس سے قبل مجھے اس بات کا علم نہیں تھا''۔

اور پھر آپ ﷺ اپنے ''رفیقِ سفر'' کو چند ضروری ہدایات دینے کے بعد اپنے گھر واپس تشریف لے آئے۔

اور جب رات ہوئی، ہر طرف اندھیرا چھا گیا، تب رؤسائے قریش کی طرف سے مقرر کردہ مسلح نوجوانوں کا ایک چاق و چوبند دستہ وہاں آ پہنچا، اور آتے ہی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے گھر کا محاصرہ کر لیا، تاکہ آپؐ حسبِ معمول جب رات کے آخری پہر عبادت کی غرض سے بیت اللہ کی جانب روانگی کیلئے گھر سے نکلیں گے تب یہ سب یکبارگی آپؐ پر ٹوٹ پڑیں گے......!

اُس رات رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ ''اے علی! آج رات تم میرے بستر پر سو جاؤ اور میری چادر اوڑھ لو''۔

اور پھر رات کے آخری پہر رسول اللہ ﷺ قرآن کریم کی آیت: ﴿وَجَعَلْنَا مِن بَينِ أَيْدِيهِم سَدّاً وَّ مِن خَلْفِهِم سَدّاً فَأَغْشَينَاهُم فَهُم لَا يُبْصِرُونَ﴾ (۱) پڑھتے ہوئے اپنے گھر سے باہر تشریف لائے، اپنی مٹھی میں کچھ خاک لی، اور پھونک مار کر اسے

(۱) سورۃ یٰس [۹]

ان مسلح نوجوانوں کی جانب اُڑا دیا، اور نہایت اطمینان کے ساتھ ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذر گئے...... لیکن نہ تو انہیں کچھ نظر آیا، اور نہ ہی انہیں کچھ علم ہوسکا، اور وہ رات بھر اس اطمینان کے ساتھ وہاں پہرہ دیتے رہے کہ آپ ﷺ اندر اپنے گھر میں موجود ہیں۔

رسول اللہ ﷺ اُس رات اپنے گھر سے روانگی کے بعد سیدھے اس شخص کے گھر پہنچے کہ جس پر اُس وقت آپ ﷺ کو سب سے زیادہ بھروسہ تھا، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، اور پھر فوراً ہی وہ دونوں رات کی تاریکی میں گھر کے عقبی دروازے سے نکل کر ایک نئی منزل کی جانب روانہ ہوگئے۔

مدینہ منورہ مکہ مکرمہ سے شمال کی جانب واقع ہے، لیکن یہ دونوں حضرات بالکل مخالف سمت میں یعنی جنوب (ملکِ یمن) کی طرف چل دیئے، رات کے اندھیرے میں دشوار گذار پہاڑی راستوں پر کہ جہاں ہر طرف نوکیلے سنگ ریزوں کی بھرمار تھی...... دونوں مسلسل پاپیادہ چلتے رہے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کبھی رسول ﷺ کے آگے چلتے، کبھی پیچھے، کبھی دائیں، اور کبھی بائیں، یوں وہ بار بار اپنی جگہ تبدیل کرتے، گویا بڑی بے چینی میں مبتلا ہوں...... آپؐ نے ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دریافت فرمایا کہ اے ابوبکر! کیا بات ہے؟ اس پر ابوبکرؓ نے جواب دیا: ''اے اللہ کے رسول! مجھے کبھی یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ کوئی دشمن سامنے کہیں چھپا بیٹھا ہو اور وہ اچانک سامنے سے ظاہر ہو کر آپ کو کوئی نقصان پہنچائے، اس لئے میں آپ کے آگے آگے چلنا لگتا ہوں، اور پھر یہ اندیشہ ہونے لگتا ہے کہ ایسا نہ ہو کوئی تعاقب کرنے والا کہیں پیچھے سے اچانک آجائے، یہ سوچ کر میں آپ کے پیچھے آجاتا ہوں، پھر یہ فکر ستانے لگتی ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ دائیں یا بائیں کوئی دشمن گھات لگائے بیٹھا ہو...... اس لئے میں کبھی آپ کے دائیں چلنے لگتا ہوں اور کبھی آپ کے

بائیں......!!

اسی کیفیت میں یہ دونوں حضرات مسلسل چلتے رہے...... یہاں تک کہ تقریباً پانچ میل (یعنی تقریباً آٹھ کلومیٹر) کی مسافت پیدل طے کرنے کے بعد ایک انتہائی بلند و بالا پہاڑ کے دامن میں پہنچے، اور انتہائی کٹھن اور مشکل ترین راستہ طے کرتے ہوئے اس کی چوٹی پر واقع ایک غار کے سامنے جا پہنچے جو کہ ''غارِ ثور'' کے نام سے معروف ہے۔

اس غار کے دہانے پر پہنچنے کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ! آپ یہیں توقف فرمایئے، پہلے میں اکیلا اندر جا کر غار کا جائزہ لے لوں...... کہیں ایسا نہ ہو کہ پہلے سے ہی وہاں کوئی دشمن چھپا بیٹھا ہو...... چنانچہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تنہا اندر گئے، اچھی طرح جائزہ لیا، اور کچھ صفائی وغیرہ بھی کی، اِدھر اُدھر چند چھوٹے بڑے سوراخ نظر آئے، حضرت ابوبکرؓ کو یہ اندیشہ لاحق ہوا کہ کہیں ان سوراخوں میں کوئی موذی جانور نہ ہو، کہ جو رسول اللہ ﷺ کیلئے تکلیف و اذیت کا باعث بن جائے...... یہ سوچ کر انہوں نے اپنے لباس سے کچھ کپڑا پھاڑ کر اس کے ذریعے ان سوراخوں کو بند کر دیا، اور پھر باہر آ کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ ''یارسول اللہ! اب آپ اندر تشریف لے آیئے''۔ جس پر آپ ﷺ غار کے اندر تشریف لے آئے، اور اس کے بعد یہ دونوں حضرات اس غار میں تین دن مقیم رہے۔

اُدھر مکہ شہر سے ان دونوں حضرات کی خفیہ روانگی کے بعد اب نہایت زور و شور کے ساتھ تعاقب اور تلاش کا سلسلہ شروع ہو گیا...... ہر کوئی نہایت سرگرمی کے ساتھ اسی کام میں سرگرداں ہو گیا۔ آخر ایک بار ایسا موقع بھی آیا کہ یہ لوگ تعاقب کرتے کرتے اُس غار کے دہانے پر جا پہنچے کہ جس میں وہ دونوں حضرات پناہ لئے ہوئے تھے، حتیٰ کہ ان کی آوازیں

اوران کی باہمی گفتگو غار کے اندر سنائی دینے لگی۔اس قدر نازک ترین صورتِ حال کی وجہ سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پریشان ہوگئے،اورعرض کیا کہ ’’اے اللہ کے رسول! مجھے اپنی کوئی فکر نہیں ہے،البتہ مجھے یہ غم کھائے جارہا ہے کہ کہیں آپ کو کوئی تکلیف نہ پہنچے، کیونکہ اگر آپ کو کچھ ہوگیا تو پھر پوری امت کا کیا بنے گا......؟‘‘یعنی یہ تو پوری امت کا خسارہ ہوگا،تب آپ ﷺ نے انہیں تسلی دیتے ہوئے ارشادفرمایا: مَا ظَنُّكَ يَا أَبَا بَكْرٍ بِاثْنَيْنِ ، اَللّٰهُ ثَالِثُهُمَا؟ یعنی’’اے ابوبکر! ایسے دوانسان کہ جن کے ساتھ تیسرا خوداللہ ہو‘ ان کے بارے میں تمہارا کیا گمان ہے؟‘‘ مقصد یہ کہ ہم محض دو نہیں ہیں، بلکہ ہمارے ساتھ اللہ کی معیت ونصرت بھی شاملِ حال ہے،لہٰذافکر کی کوئی بات نہیں۔

اسی واقعے کی طرف قرآن کریم میں اس طرح اشارہ کیا گیا ہے:﴿اِلَّا تَنصُرُوهُ فَقَد نَصَرَهُ اللّٰهُ اِذ أَخرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَينِ اِذ هُمَا فِي الغَارِ اِذ يَقُولُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحزَن اِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا﴾ (۱) ترجمہ:(اگرتم ان (نبی ﷺ) کی مدد نہیں کروگے‘ تو اللہ نے ہی ان کی مدد کی اُس وقت جبکہ انہیں کافروں نے نکال دیا تھا‘ دو میں سے دوسرا‘ جبکہ وہ دونوں غار میں تھے،جب یہ اپنے ساتھی سے کہہ رہے تھے کہ غم نہ کرو،اللہ ہمارے ساتھ ہے)

رسول اللہ ﷺ‘ نیز آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ‘ دونوں تین دن تین رات مسلسل اس غار میں مقیم رہے،اس کے بعد وہاں سے آگے منزلِ مقصود یعنی مدینہ کی جانب روانگی ہوئی،طویل سفر کے بعد آخر یہ دونوں حضرات نبوت کے چودہویں سال، بتاریخ ۸/ربیع الاول،بروز پیر،مدینہ کے مضافات میں پہنچ گئے۔

(۱)التوبہ[۴۰]

اس یادگار اور اہم ترین سفر کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جس طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت و پاسبانی کا فریضہ سرانجام دیا...... یقیناً وہ تاریخِ اسلام کا ناقابلِ فراموش باب ہے۔

☆......غزوات:

ہجرت کا حکم نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے، جہاں نئی اور بدلی ہوئی زندگی تھی، جہاں مشرکینِ مکہ کی طرف سے ظلم و زیادتی کے وہ پرانے سلسلے نہیں تھے۔

لیکن مشرکینِ مکہ کو یہ بات ہرگز گوارا نہیں تھی کہ مسلمان ان کے شکنجے سے نکلنے کے بعد اب مدینہ میں سکون و اطمینان کی زندگی بسر کریں، وہاں پھلتے پھولتے رہیں اور ان کی قوت میں اضافہ ہوتا چلا جائے، بالخصوص انہیں اُس تجارتی شاہراہ کی وجہ سے بہت زیادہ پریشانی لاحق تھی کہ جس پر سفر کرتے ہوئے ان کے تجارتی قافلے مکہ سے ملکِ شام آتے جاتے تھے، اور وہ شاہراہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی۔

چنانچہ ایسے ہی حالات میں ہجرت کے بعد دوسرے ہی سال مشرکینِ مکہ کی جانب سے مسلمانوں کے خلاف مسلح یلغار کے سلسلے شروع ہو گئے، نیز مشرکینِ مکہ کے علاوہ دیگر بہت سے مشرک قبائل' اور اسی طرح یہودیوں کے ساتھ بھی وقتاً فوقتاً مسلح تصادم کی نوبت آتی رہی، اور یوں ''غزوات'' کا سلسلہ چلتا رہا......

ایسے میں ہر غزوے کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت پیش پیش رہے...... شجاعت و بہادری کے بے مثال کارناموں کے علاوہ مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت' پاسبانی' اور مشاورت کے فرائض بھی سرانجام دیتے رہے۔

غرضیکہ سفر ہو یا حضر، امن ہو یا جنگ، ہمیشہ ہر موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ رہے...... نیز دینِ اسلام کی نشر و اشاعت اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے ہمیشہ کوشاں و سرگرداں رہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب؛ چند احادیث کی روشنی میں:

☆......رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (مَا لِأَحَدٍ عِندَنَا يَدٌ اِلَّا وَقَد كَافَينَاهُ ، مَا خَلَا أَبَابَكرٍ ، فَاِنَّ لَهُ عَندَنَا يَداً يُكَافِئِهُ اللَّهُ بِهٖ يَومَ القِيَامَةِ، وَمَا نَفَعَنِي مَالُ أَحَدٍ قَطُّ مَا نَفَعَنِي مَالُ أَبِي بَكرٍ، وَ لَوكُنتُ مُتَّخِذاً خَلِيلاً لَاتَّخَذتُ أَبَا بَكرٍ خَلِيلاً ، أَلَا وَاِنَّ صَاحِبَكُم خَلِيلُ اللّٰه) (۱)

ترجمہ: (ہم نے ہر ایک کے احسان کا بدلہ چکا دیا ہے، البتہ ابوبکر کے احسانات ایسے ہیں کہ جن کا بدلہ انہیں خود اللہ ہی روزِ قیامت عطاء فرمائے گا، کسی بھی شخص کا مال میرے اس قدر کام نہیں آیا، کہ جس قدر ابوبکر کے مال سے مجھے فائدہ پہنچا ہے، اگر میں کسی کو اپنا ''خاص دوست'' بناتا' تو یقیناً ابوبکر ہی کو بناتا، لیکن بات یہ ہے کہ تمہارا یہ ساتھی [یعنی خود رسول اللہ ﷺ] تو بس صرف اللہ ہی کا ''خاص دوست'' ہے)

☆......(مَاعَرَضتُ الِاسلَامَ عَلَىٰ أَحَدٍ اِلَّا كَانَت لَهُ كَبوَةٌ ، اِلّا أَبُو بَكرٍ ، فَاِنَّهُ لَم يَتَلَعثَم فِي قَولِهٖ) (۲)

ترجمہ: (میں نے جس کسی کو بھی دینِ اسلام کی طرف دعوت دی' اس نے ابتداء میں کچھ تردد کا اظہار کیا، سوائے ابوبکر کے جنھوں نے اس موقع پر قطعاً کسی تردد کا اظہار نہیں کیا)۔

(۱) ترمذی [۳۶۶۱] باب مناقب ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

(۲) جامع الأصول، باب الفضائل والمناقب، ج:۸۔ص:۵۸۵۔ بحوالہ: الدیلمی، فی: مسند الفردوس۔

☆...... عن أبي هريرة رضي اللّهُ عنه قال: قَالَ رَسُولُ اللّهِ ﷺ : مَن أَصْبَحَ مِنكُمُ اليَومَ صَائِماً؟ قَالَ أبوبكر: أنَا ، قَالَ: فَمَن تَبِعَ مِنكُمُ اليَومَ جَنَازةً؟ قَالَ أبوبكر: أنَا ، قَالَ: فَمَن أَطْعَمَ مِنكُمُ اليَومَ مِسْكِيناً؟ قَالَ أبوبكر: أنَا ، قَالَ: فَمَن عَادَ مِنكُمُ اليَومَ مَرِيضاً؟ قَالَ أبوبكر: أنَا ، فَقَالَ رَسُولُ اللّهِ ﷺ : مَا اجْتَمَعنَ فِي امْرِئٍ اِلَّا دَخَلَ الجَنَّةَ ۔ (۱)

ترجمہ: حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے دریافت فرمایا: ''آج تم میں سے روزہ کس نے رکھا ہے؟'' ابوبکر رضی اللہ عنہ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے''۔ تب آپؐ نے دریافت فرمایا: ''تم میں سے کس نے آج جنازے میں شرکت کی ہے؟'' ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے''۔ تب آپؐ نے دریافت فرمایا: ''تم میں سے کس نے آج مسکین کو کھانا کھلایا ہے؟'' ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے''۔ تب آپؐ نے دریافت فرمایا: ''تم میں سے کس نے آج بیمار کی عیادت کی ہے؟'' ابوبکرؓ نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! میں نے''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''جس شخص میں یہ تمام خوبیاں جمع ہوگئیں وہ ضرور جنت میں داخل ہوجائے گا''۔

☆......حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: (اِنَّ مِن أَمَنِّ النَّاسِ عَلَيَّ فِي صُحبَتِهٖ وَ مَالِهٖ أَبُوبَكر) (۲) یعنی ''تمام لوگوں میں سب سے زیادہ جس شخص کی صحبت کو' نیز اس کے مال کو میں اپنے لئے باعثِ اطمینان

(۱) مسلم [۱۰۲۸] باب من فضائل أبي بكر الصديق ۔

(۲) صحیح بخاری [۳۶۵۴] کتاب (نمبر ۶۲) فضائل الصحابۃ ۔ باب (نمبر ۳) سُدّوا الأبواب ۔ الاّ بَاب أبي بكر ۔

تصور کرتا ہوں، وہ ابوبکر ہیں''۔

☆......حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک باررسول اللہ ﷺ نے ارشادفرمایا:(اِنَّ اللّٰہَ بَعَثَنِي اِلَیکُم فَقُلتُم : کَذَبتَ ، وَقَالَ أبُوبَکر: صَدَقتَ) (۱) یعنی''اللہ نے مجھےتم لوگوں کی جانب مبعوث فرمایا،تب تم لوگوں نے مجھے جھٹلایا،جبکہ ابوبکر نے میری تصدیق کی''۔(۲)

☆......حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:(أَمَرَنَا رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ أن نَتَصَدَّقَ ، وَوَافَقَ ذَلِكَ عِندِي مَالًا ، فَقُلتُ: اليَومَ أسبِقُ أبَابَکرٍ ان سَبَقتُهُ يَوماً ، فَجِئتُ بِنِصفِ مَالِي، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ : مَا أبقَيتَ لِأهلِكَ؟ قُلتُ : مِثلَهُ ، وَ أتَىٰ أبُوبَکرٍ بِکُلِّ مَا عِندَهُ ، فَقَالَ رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ : يَا أبَا بَکر مَا أبقَيتَ لِأهلِكَ؟ قَالَ : أبقَيتُ لَهُمُ اللّٰہَ وَ رَسُولَه ، قُلتُ : لَا أسبِقُهُ اِلَىٰ شَيءٍ أبَداً) (۳)یعنی''ایک باررسول اللہ ﷺ نےہمیں صدقہ دینے کا حکم دیا، اتفاق سے اُس وقت مجھے کچھ مال میسر تھا،لہٰذا میں سوچنے لگا کہ آج تو میں ابوبکر پر سبقت لے جاؤنگا، یہی سوچ کر میں اپنا آدھا مال لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوگیا،آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا''اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ کرآئے ہو؟'' میں نے عرض کیا''اتنا ہی مال ان کیلئے چھوڑآیا ہوں''۔اورتب ابوبکر اپنا سارا مال لئے ہوئے حاضر ہوگئے،رسول اللہ ﷺ نے ان سے بھی یہی دریافت فرمایا کہ''اپنے گھر والوں کیلئے کیا چھوڑ کرآئے ہو؟''ابوبکر نے جواب دیا''اے اللہ کے رسول! گھر والوں

(۱)بخاری[۳۶۶۱]باب: لَو کُنتُ مُتَّخِذاً خَلِیلاً...... (۲)یعنی ابتداء میں کسی نے انکار کیا،کسی نے کچھ تردد کا اظہار کیا،فوری اور بلاتردد تصدیق ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سوا کسی نے نہیں کی۔

(۳)ترمذی[۳۶۷۵]باب مناقب أبي بکر الصدیق رضی اللہ عنہ۔

کیلئے میں اللہ اور اس کے رسول کا نام چھوڑ آیا ہوں''۔تب میں نے اپنے دل میں سوچا کہ ''آج کے بعد میں کبھی ابوبکر سے سبقت لے جانے کی کوشش نہیں کروں گا......''(۱)

☆......سن ۹ ہجری میں باقاعدہ اسلامی عبادت کے طور پر جب فرضیتِ حج کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنے نائب کی حیثیت سے ''امیر الحجاج'' مقرر فرمایا، اور تمام مسلمانوں نے دینِ اسلام کے اہم ترین رکن کی حیثیت سے تاریخ میں پہلی بار فریضۂ حج حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امارت میں ادا کیا۔

☆......رسول اللہ ﷺ اس جہانِ فانی سے رحلت سے قبل آخری ایام میں جب ۷/ ربیع الاول بروز بدھ مسجد میں آخری بار اپنے منبر پر جلوہ افروز ہوئے تھے اور متعدد نصیحتیں اور وصیتیں فرمائی تھیں، تب اسی موقع پر آپؐ نے وہاں موجود افراد کو مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد بھی فرمایا تھا: (اِنَّ عَبداً خَیَّرَہُ اللّٰہُ أن یُؤتِیَہٗ مِن زَھرَۃِ الدُّنیَا مَا شَاءَ ، وَبَینَ مَا عِندَہٗ ، فَاختَارَ مَا عِندَہٗ) یعنی ''اللہ کا ایک بندہ ہے، جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطاء فرمائے، اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے......لہٰذا اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کرلیا ہے''۔(۲)

اس حدیث کے راوی حضرت ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ ''یہ بات سن کر حضرت ابوبکرؓ رونے لگے، اور بیساختہ یوں کہنے لگے: فَدَینَاكَ بِآبَائِنَا وَأمّھَاتِنَا یَا رَسُولَ اللّٰہ) یعنی ''اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان......''

(۱) یہ واقعہ سن ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک کیلئے تیاری کے موقع پر پیش آیا تھا۔

(۲) یعنی اس دنیا میں مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اللہ کے پاس چلے جانے کو پسند کرلیا ہے......

ابوبکرؓ کی اس کیفیت پر ہمیں تعجب ہونے لگا، یہ منظر دیکھ کر کچھ لوگ یوں کہنے لگے کہ ابوبکر کو دیکھو......رسول اللہ ﷺ ہمیں یہ بات بتا رہے ہیں کہ ''اللہ کا ایک بندہ ہے' جسے اللہ نے اس بات کا اختیار دیا ہے کہ اگر وہ چاہے تو اللہ اسے دنیاوی زندگی کی خوب رونقیں عطاء فرمائے، اور اگر وہ چاہے تو اب اللہ کے پاس موجود نعمتوں میں چلا آئے، اور اس بندے نے اللہ کے پاس موجود نعمتوں کو پسند کر لیا ہے''۔ اور ذرہ ابوبکر کو دیکھو، رسول اللہ ﷺ کی یہ بات سن کر یہ رو رہے ہیں، اور کہتے ہیں کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ پر ہمارے ماں باپ قربان'' بھلا یہ کیا بات ہوئی......؟؟

اس کے بعد حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ (فَكَانَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ هُوَ الْمُخَيَّرُ ، وَكَانَ أَبُوبَكر أَعْلَمَنَا) (۱) یعنی ''اللہ کی طرف سے اپنے جس بندے کو یہ اختیار دیا گیا تھا......وہ خود رسول اللہ ﷺ تھے......اور ابوبکر ہم سبھی سے زیادہ علم والے تھے......''

مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے اختیار دیئے جانے پر جواب میں رسول اللہ ﷺ اس فانی دنیا میں اب مزید زندگی بسر کرنے کی بجائے اپنے رب کے جوارِ رحمت میں منتقل ہو جانے کو پسند فرما چکے تھے......ہم اس بات کو نہیں سمجھ سکے......البتہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) ہم میں سب سے زیادہ علم ودانش سے مالا مال تھے......رسول اللہ ﷺ کی گفتگو کو' نیز اس میں پوشیدہ اسرار ورموز کو ہم سب سے زیادہ وہی سمجھنے والے تھے......لہٰذا اس راز کی بات کو ہم نہیں سمجھ سکے، اور اس وجہ سے ہم تعجب کرنے لگے، جبکہ حضرت ابوبکرؓ اس راز کو سمجھ گئے اور......بے اختیار رونے لگے......!

(۱) متفق علیہ۔ مشکاۃ المصابیح [۵۹۵۷] باب ہجرۃ أصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ ووفاتہ۔

یقیناً اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ' فہم و فراست' رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا خاص تعلقِ خاطر اور مزاج شناسی' نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی برگزیدہ ترین جماعت میں ان کی خاص حیثیت اور دینی بصیرت واضح وثابت ہوتی ہے۔

☆......اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری ایام میں (بتاریخ ۹/ربیع الاول بروز جمعرات) جب شدتِ مرض کی وجہ سے نقاہت بہت بڑھ چکی تھی اور آپؐ کو اطلاع دی گئی تھی کہ عشاء کی نماز کیلئے سبھی لوگ مسجد میں منتظر ہیں......تب آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا کہ: ''مُرُوا أبَابَکر، فَلیُصَلِّ بِالنَّاس'' (۱) یعنی''ابوبکر سے کہو کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں''

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا چونکہ اپنے والد (حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ) کے مزاج سے بخوبی واقف تھیں' لہٰذا اس موقع پر انہوں نے اپنے والد کے بارے میں عرض کیا''اے اللہ کے رسول! وہ تو بہت ہی کمزور اور نرم دل انسان ہیں' ان کی آواز بھی کافی پست ہے، مزید یہ کہ وہ جب بھی قرآن پڑھتے ہیں تو بہت زیادہ رونے لگتے ہیں''

تب آپ ﷺ نے اپنا وہی حکم دہرایا، اور حضرت عائشہؓ نے بھی اپنی وہی گذارش دہرائی' آخر تیسری بار آپؐ نے قدرے سختی کے ساتھ یہی حکم دہرایا......اور تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہی، اور خود آپؐ کے حکم پر......آپؐ کی جگہ مسجدِ نبوی میں امامت کا آغاز کیا......!

غور طلب بات ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے اپنے تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی

(۱) صحیح بخاری [٦٦٤] کتاب الأذان۔ باب (نمبر ۳۹) حد المریض أن یشھد الجماعۃ۔ وغیرہ۔

برگزیدہ و پاکیزہ ترین جماعت میں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اپنی مسجد میں، اپنی جگہ نماز پڑھانے کیلئے ، اور تمام مسلمانوں کی امامت کیلئے خود منتخب فرمایا، مزید یہ کہ اصرار اور تاکید کے ساتھ متعدد بار اس چیز کا حکم دیا۔

چنانچہ خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ آپؐ کے مصلیٰ پر کھڑے ہو کر امامت کے فرائض انجام دیتے رہے...... جبکہ آسمانوں سے نزولِ وحی کا، نیز جبریل امین علیہ السلام کی آمد ورفت کا سلسلہ ابھی بدستور جاری تھا۔

یقیناً اس سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی عظمتِ شان ظاہر ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے موقع پر حضرت ابوبکر صدیقؓ کا کردار:

رسول اللہ ﷺ کی رحلت اور اس جہانِ فانی سے رخصتی کا سانحہ یقیناً تمام مسلمانوں کیلئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا رَأَیتُ یَوماً قَطُّ کَانَ أحسَنَ وَلَا أضوَأَ مِن یَومٍ دَخَلَ عَلَینَا فِیهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ وَمَا رَأَیتُ یَوماً أقبَحَ وَلَا أظلَمَ مِن یَومٍ مَاتَ فِیهِ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ (۱)

یعنی ’’میں نے مدینہ شہر میں کبھی کوئی ایسا خوشگوار اور روشن دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے موقع پر تھا، اسی طرح میں نے مدینہ شہر میں کبھی اس قدر سوگوار اور بجھا ہوا دن نہیں دیکھا کہ جیسا رسول اللہ ﷺ کی وفات کے موقع پر تھا‘‘۔

چنانچہ اُس روز تمام مدینہ شہر میں ہر جانب رنج والم کی فضاء چھائی ہوئی تھی...... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا جا رہا تھا، ہر ایک پر بے خودی کی کیفیت طاری تھی، اور ہر طرف آہ وبکاء کا ماحول تھا، کسی کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا، نہ ہی کسی کا ذہن اس جان لیوا خبر کو قبول کرنے

(۱) مشکاۃ المصابیح [۵۹۶۲] باب ہجرۃ أصحابہ صلی اللہ علیہ وسلم من مکۃ ووفاتہ۔

کیلئے آمادہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ اب ہمیشہ کیلئے ہم سے جدا ہو چکے ہیں۔
ایسی نازک ترین صورتِ حال میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ناقابلِ فراموش کردار تمام امت کیلئے سہارے اور تسلی کا باعث بنا۔
چنانچہ اس موقع پر وہاں موجود سبھی افراد کے سامنے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختصر خطبہ دیا، جس میں رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا یوں اعلان فرمایا ''مَن کَانَ مِنکُم یَعبُدُ مُحَمَّداً فَاِنَّ مُحَمَّداً قَد مَاتَ ، وَمَن کَانَ یعبُدُ اللّٰهَ فَاِنَّ اللّٰهَ حَيٌّ لَا یَمُوتُ ''یعنی''تم میں سے جو کوئی محمدؐ کی عبادت کرتا تھا، وہ جان لے کہ محمدؐ کا اب انتقال ہو چکا ہے، اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا، تو اللہ ہمیشہ زندہ رہنے والا ہے، اسے کبھی موت آنے والی نہیں ہے''، اور پھر قرآن کریم کی یہ آیت تلاوت کی: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلّا رَسُولٌ قَد خَلَتْ مِن قَبلِهِ الرُّسُلُ أفَاِن مَّاتَ أو قُتِلَ انقَلَبتُم عَلَىٰ أعقَابِكُم ومَن يَّنقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيهِ فَلَن يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيئاً وَّ سَيَجزِي اللّٰهُ الشَّاكِرِينَ﴾ (۱) (۲)
ترجمہ: ''محمد [ﷺ] تو صرف رسول ہی ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گذر چکے ہیں، کیا اگر ان کا انتقال ہو جائے، یا وہ شہید ہو جائیں، تو تم اسلام سے اپنی ایڑیوں کے بل پھر جاؤ گے؟ اور جو کوئی پھر جائے اپنی ایڑیوں پر تو ہرگز وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑے گا، عنقریب اللہ شکرگذاروں کو نیک بدلہ دے گا''۔
حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس آیت سے، نیز اس کے مضمون سے خوب واقف تھے، اور عرصۂ دراز سے اسے پڑھتے اور سنتے چلے آ رہے تھے، لیکن اس روز حضرت

(۱) صحیح بخاری [۳٦٦٨] کتاب (نمبر ٦٢) فضائل الصحابہ، باب (نمبر ۵) قول النبی ﷺ لو کنت متخذاً خلیلاً......
(۲) آل عمران [۱۴۴]

ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی جب یہ آیت سنی تو انہیں یوں محسوس ہوا کہ گویا یہ آیت ابھی نازل ہوئی ہو، ان کے ذہنوں میں اس آیت کا مضمون تازہ ہو گیا، وہ سب اس آیت کو بار بار دہرانے لگے، جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ اُس وقت وہاں جس شخص کی طرف بھی میری نگاہ اٹھی، مجھے اس کے لب ہلتے ہوئے نظر آئے، اور وہ یہی آیت زیرِ لب دہراتا ہوا نظر آیا۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں کے غم و اضطراب میں بتدریج کمی آنے لگی اور رفتہ رفتہ انہیں اس تلخ ترین حقیقت پر یقین آنے لگا کہ رسول اللہ ﷺ واقعی اب ہم میں نہیں رہے، اور یوں اُس نازک ترین موقع پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا یہ تاریخی کردار تمام مسلمانوں کیلئے تسلی و تشفی کا، نیز صورتِ حال کو بگڑنے سے بچانے کا سبب اور ذریعہ بنا......!

خلافت کیلئے انتخاب:

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مسلمانوں کے تمام امور مخصوص انداز سے چل رہے تھے۔ پھر آپؐ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے نتیجے میں سبھی کچھ بدل کر رہ گیا، ظاہر ہے کہ ایسے میں امت کو کسی پاسبان و نگہبان کی اشد اور فوری ضرورت تھی، تاکہ بیرونی دشمنوں، نیز اندرونی بدخواہوں، منافقوں اور موقع پرستوں کو کسی سازش کا موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ سن گیارہ ہجری میں بتاریخ ۱۲/ ربیع الاول بروز پیر جب رسول اللہ ﷺ کے انتقال کا جاں گداز واقعہ پیش آیا تھا اور آپؐ کی تجہیز و تکفین کے سلسلے میں ہی مشاورت کی غرض سے اکابر صحابہ میں سے متعدد حضرات آپؐ کے گھر میں موجود تھے، اس دوران کچھ لوگوں نے وہاں موجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو آکر اطلاع دی کہ مسجدِ نبوی سے متصل ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' نامی مقام پر بڑی تعداد میں لوگ جمع ہیں اور وہاں یہ موضوع زیرِ بحث

ہے کہ اب رسول اللہ ﷺ کا خلیفہ اور جانشیں کون ہوگا......؟ (۱)

یہ اطلاع ملنے پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ ''قبل اس کے کہ معاملہ نازک ہو جائے......ہمیں وہاں چلنا چاہئے......''

چنانچہ یہ حضرات وہاں پہنچے، وہاں یہی موضوع زیرِ بحث تھا، اور کسی بھی لمحے یہ معاملہ کوئی غلط رُخ اختیار کرسکتا تھا، صورتِ حال کی اس نزاکت کو بھانپتے ہوئے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نازک موقع پر ''فتنہ وافتراق'' سے بچنے' اور اتفاق واتحاد کو بہرصورت قائم رکھنے کی اہمیت وضرورت کے بارے میں مختصر گفتگو کی۔

اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ' نیز حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یقیناً یہی دو حضرات رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے قابل ہیں، لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر جلد از جلد بیعت کر لی جائے''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات سُن کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''ہم میں سے کس کا دل اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ شخص جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت کیلئے منتخب فرمایا تھا، اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو اس منصب کیلئے پسند کیا جائے؟

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اصرار کیا ''ابوبکر، اپنا ہاتھ بڑھایئے'' جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ان کی جانب اپنا ہاتھ بڑھایا، اور تب فوراً ہی

(۱) ''سقیفہ بنی ساعدۃ'' نامی یہ تاریخی مقام مسجد نبوی کی توسیع کے بعد اب مسجد کے اندر شامل ہے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے وہاں موجود لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یہ الفاظ کہے ''لوگو! میں ابوبکر کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہوں، تم سب بھی انہی کے ہاتھ پر بیعت کرلو، یہی رسول اللہ ﷺ کے جانشیں ہیں''۔(۱)

اس پر وہاں موجود سبھی افراد نے بڑی تعداد میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ کبارِ صحابہ کرام میں سے چند افراد اس وقت وہاں موجود نہیں تھے، جنہوں نے بعد میں مسجدِ نبوی میں بیعت کی۔ یوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو بالاتفاق رسول اللہ ﷺ کے جانشین اور ''خلیفۂ اول'' کی حیثیت سے منتخب کرلیا گیا۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے فوری بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختصر خطبہ دیتے ہوئے فرمایا: (أيُّهَا النَّاس! اِنِّي وُلِّيتُ عَلَيكُم وَلَستُ بِخَيرِكُم ، اِن أحسَنتُ فَأعِينُونِي ، وَاِن أسَأتُ فَقَوِّمُونِي ، الصِّدقُ أَمَانَة ، وَالكَذِبُ خِيَانَة ، الضَّعِيفُ فِيكُم قَوِيٌّ عِندِي حَتّىٰ أُرجِعَ اِلَيهِ حَقَّهٗ ، وَالقَوِيُّ فِيكُم ضَعِيفٌ عِندِي حَتّىٰ آخُذَ مِنهُ حَقَّهٗ ، أطِيعُونِي مَا أطَعتُ اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ ، فَاِن عَصَيتُ اللّٰهَ وَ رَسُولَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِي عَلَيكُم)

ترجمہ: ''لوگو! میں تمہارا امیر مقرر کیا گیا ہوں' حالانکہ میں تم سے افضل نہیں ہوں۔ اگر میں اچھے کام کروں تو تم میری مدد کرنا، غلطی کروں تو اصلاح کرنا۔ سچ امانت ہے، جبکہ جھوٹ خیانت ہے۔ تم میں سے جو شخص کمزور ہے، وہ میرے نزدیک طاقتور ہے جب تک میں اسے اس کا حق نہ دلا دوں۔ اور تم میں سے جو کوئی طاقتور ہے، میرے نزدیک وہ کمزور ہے، تاوقتیکہ میں اس سے حقدار کا حق وصول نہ کرلوں۔ تم میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ

(۱) ملاحظہ ہو: صحیح بخاری [۳۶۶۸] کتاب (نمبر ۶۲) فضائل الصحابہ، باب (نمبر ۵) قول النبی ﷺ لو کنت متخذاً خلیلاً......

اوراس کے رسولؐ کی اطاعت کروں، اور اگر مجھ سے کوئی ایسا عمل سرزد ہو جس میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی نافرمانی کا پہلو نکلتا ہو، تو تم پر میری اطاعت واجب نہیں ہوگی۔ اللہ تم پر رحم فرمائے''۔

خلیفۂ اول کی اس اولین تقریر کے ایک ایک جملے میں رسول اللہ ﷺ کی پاکیزہ تعلیم وتربیت اوراخلاص وتقویٰ کی جھلک نمایاں نظر آتی ہے۔ نیز اس اولین تقریر میں انہوں نے یہ وضاحت وصراحت کردی کہ ان کا اندازِ فکر یہ ہے کہ ''وہ خود کو عوام الناس سے ممتاز ومنفرد تصور نہیں کرتے''۔ نیز ان کا اندازِ حکمرانی یہ ہوگا کہ ''سچ کی نشرواشاعت اور جھوٹ کا راستہ روکنے کی ہر ممکن کوشش کی جائے گی، اور یہ کہ ہر قیمت پر انصاف کا بول بالا کیا جائے گا' جبکہ ظلم وناانصافی کا مکمل سدِ باب کیا جائے گا، نیز یہ کہ جب تک وہ خود اللہ عزوجل کی اطاعت وفرمانبرداری کے راستے پر گامزن رہیں گے' عوام الناس پر ان کی اطاعت وفرمانبرداری محض اُسی وقت تک ضروری ولازمی ہوگی''۔

کارنامے اور خدمات:

☆......جیشِ اُسامہ کی روانگی:

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے بالکل آخری دنوں میں رومیوں کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف بلاجواز مسلسل اشتعال انگیزی کے جواب میں مناسب کارروائی کی غرض سے ایک لشکر تیار فرمایا تھا، اور پھر اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما (جو اس وقت بالکل نوعمر تھے) کی زیرِ قیادت اس لشکر کو ملکِ شام کی جانب روانگی کا حکم دیا تھا۔ لیکن رسول اللہ ﷺ کی ناسازیٔ طبع کی وجہ سے یہ لشکر مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر پہنچ کر رک گیا تھا، اور پھر

انہی حالات میں رسول اللہ ﷺ کا انتقال ہوگیا تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین کی حیثیت سے صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ نے جب خلافت کی ذمہ داری سنبھالی تو اب ان بدلے ہوئے حالات میں لشکر کو مدینہ سے دور بھیج دینا بہت ہی نازک اور انتہائی خطرناک اقدام تھا۔ کیونکہ اُن دنوں مسلمان جس نازک ترین صورتِ حال سے دوچار تھے، اس سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے اندرونی و بیرونی دشمن مسلمانوں پر فیصلہ کن ضرب لگانے کیلئے تیار بیٹھے تھے......لہٰذا اس موقع پر بڑے بڑے صحابۂ کرام نے مصلحت سے کام لینے اور اس لشکر کی روانگی کو فی الحال مؤخر کردینے کا مشورہ دیا۔ جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت پُرعزم انداز میں دوٹوک فیصلہ سنایا کہ ''جس لشکر کی روانگی کا حکم خود رسول اللہ ﷺ نے دیا تھا' وہ لشکر ضرور جائے گا''۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد اب صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے اس حکم کی تعمیل میں یہ لشکر روانہ ہوا، جس کی وجہ سے دشمنوں پر مسلمانوں کا رعب قائم ہوگیا، اور وہ اب اس سوچ میں پڑ گئے کہ ہم تو مسلمانوں کو کمزور تصور کررہے تھے......لیکن ان میں تو دم خم باقی ہے......ان کے حوصلے بلند ہیں، تبھی تو اس قدر نازک صورتِ حال کے باوجود یہ لشکر روانہ ہوا ہے''۔ یوں صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام مسلمانوں کے حق میں مفید ثابت ہوا، اور اس کے نتائج مثبت اور خوشگوار رہے۔

☆......فتنوں کی سرکوبی:

رسول اللہ ﷺ کے سانحۂ ارتحال کے نتیجے میں اچانک جو اتنا بڑا خلا پیدا ہوگیا تھا اس کی وجہ سے دشمنوں اور فتنہ پردازوں نے مسلمانوں کے خلاف تانے بانے بُننے شروع کردیئے۔ اندرونی منافقین اور بدخواہ تو ہمیشہ سے ہی کسی ایسے ہی نازک موقع کی تلاش میں تھے، ان

کے علاوہ بیرونی دشمن بھی عرصۂ دراز سے مسلمانوں پرضربِ کاری لگانے اورانہیں نیست ونابودکردینے کی حسرت دل میں لئے بیٹھے تھے، جس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے حالات بگڑنے لگے، چہارسومختلف قسم کے فتنے سراٹھانے لگے۔

ایسے میں رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین کی حیثیت سے ان تمامتر فتنوں کی سرکوبی کی ذمہ داری حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پرآپڑی،ان میں سے چنداہم فتنوں کا مختصرتذکرہ درجِ ذیل ہے:

☆ فتنۂ ارتداد:

ملکِ عرب کے دوردرازعلاقوں میں آبادمتعددقبائل سے تعلق رکھنے والے بہت سے ایسے افرادتھے جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے بالکل آخردنوں میں مدینہ آکردینِ اسلام قبول کیاتھا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں زیادہ وقت گذارنے اوردینِ اسلام کی تعلیمات مفصل طورپرسیکھنے کاانہیں موقع نہیں مل سکاتھا، یہی وجہ تھی کہ دینِ اسلام ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہواتھا۔ لہٰذارسول اللہ ﷺ کی وفات کی خبرسنتے ہی ان کے قدم ڈگمگانے لگے،گذشتہ تمام عمرجن فضولیات وخرافات میں اورجس لہوولعب میں بسرکی تھی، اب دوبارہ انہیں اسی میں کشش محسوس ہونے لگی، اوررفتہ رفتہ یہ لوگ دینِ اسلام سے منحرف ہونے لگے، دیکھادیکھی یہ فتنہ بہت سے قبائل میں نہایت سرعت کے ساتھ پھیلتا چلاگیا......اوربڑی تیزی کے ساتھ لوگ دینِ اسلام سے برگشتہ ومنحرف ہوتے چلے گئے۔

☆ مانعینِ زکوٰۃ:

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعدبہت سے قبائل نے یہ اعلان کردیاکہ رسول اللہ ﷺ کے بعداب ہم نمازتوپڑھیں گے،لیکن زکوٰۃ ادانہیں کریں گے، یہ

فتنہ بھی مرورِ وقت کے ساتھ شدت پکڑتا چلا گیا۔

☆ جھوٹے مُدعیانِ نبوت:

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے فوری بعد ملکِ عرب کے اطراف واکناف میں آباد مختلف قبائل سے تعلق رکھنے والے متعدد افراد نے نبوت کا دعویٰ کر دیا۔ ظاہر ہے کہ ان لوگوں کا مقصد حصولِ اقتدار اور مسلمانوں میں افتراق وانتشار پیدا کرنا تھا......قوم پرستی اور قبائلی تعصب کی بنیاد پر بہت جلد دیکھتے ہی دیکھتے ہزاروں افراد ان کے ہمنوا بن گئے۔ یوں یہ فتنہ ہر گذرتے دن کے ساتھ شدت اختیار کرتا چلا گیا۔

اس قدر نازک ترین صورتِ حال میں کہ جب ان فتنوں نے تمام ملکِ عرب کو ہلا کر رکھ دیا تھا، اور یوں محسوس کیا جانے لگا تھا کہ خدانخواستہ دینِ اسلام کی کشتی ہچکولے کھانے لگی ہے، اور یہ کہ مسلمانوں کا شیرازہ ہی بکھرا جا رہا ہے...... یہی وجہ تھی کہ اس موقع پر بڑے بڑے صحابۂ کرام ''مصلحت'' سے کام لینے کا مشورہ دے رہے تھے......لیکن صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش نہ آسکی۔ چنانچہ انہوں نے اس موقع پر انتہائی استقامت اور بے مثال جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان تمام تر فتنوں کی سرکوبی کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا۔

☆......جمعِ قرآن:

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا جاں گداز واقعہ پیش آنے کے فوری بعد ملکِ عرب کے اطراف واکناف میں جھوٹے مدعیانِ نبوت کا فتنہ جو بڑی ہی شد ومد کے ساتھ ظاہر ہوا تھا، انہی فتنوں میں بالخصوص ''مسیلمہ کذاب'' کا فتنہ کافی پریشان کن صورتِ حال اختیار کرتا جا رہا تھا۔ ''یمامہ'' سے تعلق رکھنے والا یہ شخص بہت زیادہ طاقت

قوت، شان وشوکت، اور جوش وخروش کے ساتھ اپنی ''نبوت'' کے دعوے، اور اپنی جھوٹی تعلیمات کی نشرواشاعت میں مشغول ومنہمک تھا۔

نبوت کے اس جھوٹے مدعی کی طرف سے برپا کردہ اس فتنے کی شدت کا اندازہ اس بات سے کیا جاسکتا ہے کہ اس کی سرکوبی کی غرض سے ''یمامہ'' کے مقام پر جو جنگ لڑی گئی اُس میں شہید ہونے والے مسلمانوں کی تعداد ایک ہزار سے زائد تھی ......ظاہر ہے کہ ان میں بہت بڑی اکثریت حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تھی، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے محض چند ماہ بعد ہی یہ جنگ پیش آئی تھی۔

اس اتنے بڑے نقصان کے علاوہ بالخصوص جو بات تمام مسلمانوں کیلئے بہت زیادہ اضطراب اور تشویش کا باعث بنی، وہ یہ کہ اس موقع پر اتنی بڑی تعداد میں شہید ہونے والے ان مسلمانوں میں ستر حفاظِ قرآن بھی تھے۔

ایک ہی جنگ میں ستر حفاظِ قرآن کی ایک ساتھ شہادت......اگر یہ سلسلہ جاری رہا، تو قرآن کریم کا کیا ہوگا؟(۱)

یہ سوال ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کیلئے بڑی پریشانی وفکرمندی کا باعث تھا، البتہ حضرت عمر بن

(۱) اُس وقت تک قرآن کریم کتابی شکل میں یکجا نہیں تھا، رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں جب بھی کوئی نئی آیت نازل ہوتی آپ ﷺ اسے فوری طور پر حفظ کرلیا کرتے......نیز کاتبینِ وحی میں سے کسی کو بلاکر وہ آیت تحریر بھی کروالیا کرتے، حضرات صحابۂ کرام نہایت شوق اور اہتمام کے ساتھ ان آیات کو زبانی یاد بھی کیا کرتے، نیز تحریر بھی کرلیا کرتے، یوں تمام قرآنی آیات ان حضرات کے سینوں میں بھی......اور تحریری شکل میں بھی محفوظ تھیں......لیکن یکجا نہیں تھیں......غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہر وقت یہ امکان رہتا تھا کہ شاید کسی بھی وقت کوئی نئی آیت نازل ہوجائے......رسول اللہ ﷺ کے بعد خلیفۂ اول کے دور میں جنگِ یمامہ کے موقع پر ستر حفاظِ قرآن کی یکبارگی شہادت کا جو دلدوز واقعہ پیش آیا......تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پرزور اصرار کیا کہ اب قرآن کریم کو جلد از جلد ''کتابی شکل'' میں یکجا کیا جانا چاہئے۔

خطاب رضی اللہ عنہ اس معاملہ میں بطورِ خاص بہت زیادہ فکرمند اور مضطرب تھے۔ (۱) یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اولین فرصت میں خلیفۂ وقت یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اپنی اس پریشانی کا اظہار کرتے ہوئے پرزور اصرار کیا کہ جلد از جلد کتاب اللہ کی حفاظت کی طرف توجہ دی جائے، قرآن کریم کی تمام آیات کو یکجا کر کے ہمیشہ کیلئے کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے۔

اس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ ''جو کام خود رسول اللہ ﷺ نے انجام نہیں دیا' میں وہ کام کس طرح کر سکتا ہوں......؟''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس معذرت اور انکار کے باوجود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلسل اصرار کرتے ہی رہے، جس پر آخر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو ان کے اس مطالبے اور اصرار پر اطمینان اور شرحِ صدر ہو گیا، اور تب انہوں نے اس مقصد (یعنی جمعِ قرآن) کیلئے حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی برگزیدہ ترین جماعت میں سے چند ایسے حضرات کا انتخاب فرمایا جنہیں بطورِ خاص قرآنی علوم میں بڑی دسترس اور انتہائی مہارت حاصل تھی۔ اور پھر ان منتخب حضرات پر مشتمل اس لَجنہ (کمیٹی) کی سربراہی و نگرانی کی عظیم ترین ذمہ داری رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو سونپی، جو عرصۂ دراز تک آپؐ کی خدمت میں بطورِ ''کاتبِ وحی'' خدمات انجام دیتے رہے تھے۔

چنانچہ ان حضرات نے انتہائی عرق ریزی اور محنتِ شاقہ کے بعد ''جمعِ قرآن'' کا یہ اہم ترین کام انجام دیا......جبکہ اس دوران خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ براہِ

(۱) اس موقع پر شہید ہونے والے ستر حفاظِ قرآن میں خود حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بھائی حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

راست مسلسل اس انتہائی حساس اور اہم ترین کام کی نگرانی کا فریضہ انجام دیتے رہے...... یوں پہلی بار قرآن کریم کو یکجا، کتابی شکل میں، ہمیشہ کیلئے محفوظ و مُدوّن کرلیا گیا۔

یقیناً خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے کلام اللہ کی یہ بہت بڑی خدمت، نا قابلِ فراموش کارنامہ، انتہائی قابلِ تحسین اقدام، نیز ہمیشہ کیلئے تمام امتِ مسلمہ پر بہت عظیم احسان تھا۔

☆......سادگی وانکسار:

خلافت کے عظیم ترین منصب پر فائز ہونے کے باوجود صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی سادگی اور انکسار کا یہ عالم تھا کہ ہمیشہ خدمتِ خلق میں مشغول ومنہمک رہا کرتے، خود اپنے ہاتھوں سے بلا جھجک دوسروں کے روزمرہ کے کام کاج کردیا کرتے، بیکسوں کی دستگیری اور ضرورتمندوں کی خبر گیری کو انہوں نے تاحیات اپنا شیوہ وشعار بنائے رکھا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

كُنتُ اَفتَقِد أبَا بَكر أيَّامَ خِلافَتِهٖ بَينَ فَترَةٍ وأُخرَىٰ ، فَلَحِقتُهُ يَوماً ، فَاِذَا هُوَ بِظَاهِرِالمَدِينَةِ - أي خَارِجَهَا۔ قَد خَرَجَ مُتَسَلِّلاً ، فَأدرَكتُهُ ، وَقَد دَخَلَ بَيتاً حَقِيراً فِي ضَوَاحِي المَدِينَةِ ، فَمَكَثَ هُنَاكَ مُدَّةً ، ثُمَّ خَرَجَ وَعَادَ اِلَىٰ المَدِينَةِ ، فَقُلتُ لَأدخُلَنَّ هٰذَا البَيتَ فَدَخَلتُ ، فَاِذَا امرَأَةٌ عَجُوزٌ عَميَاءُ ، وَحَولَهَا صِبيَةٌ صِغَارٌ ، فَقُلتُ يَرحَمُكِ اللّٰهُ يا أمَةَ اللّٰه ، مَن هٰذَا الرَّجُلُ الَّذِي خَرَجَ مِنكُم الآن؟ قَالَت: اِنَّهٗ لَيَتَرَدَّدُ عَلَينَا ، وَوَاللّٰهِ اِنّي لَا أعرِفُهٗ ، فَقُلتُ: فَمَا يَفعَل؟ فَقَالَت: اِنَّهٗ يَأتِي اِلَينَا ، فَيَكنِسُ دَارَنَا ، وَيَطبَخُ عَشَائَنَا ، وَ يُنَظِّفُ قُدُورَنَا ، وَ يَجلِبُ لَنَا المَاءَ ، ثُمَّ يَذهَبُ ۔

یعنی: ''ابوبکر رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران میں ان کے معمولات کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ چنانچہ ایک روز میں نے انہیں خاموشی کے ساتھ مدینہ شہر سے باہر کی جانب روانہ ہوتے دیکھا، میں بھی ان کے پیچھے ہولیا، ایک مضافاتی بستی میں پہنچنے کے بعد وہ ایک معمولی سی جھونپڑی میں داخل ہو گئے، اور پھر کچھ وقت گذرنے کے بعد وہاں سے نکلے اور واپس مدینہ شہر کی طرف چل دیئے......تب میں نے سوچا کہ میں بھی ذرہ اس جھونپڑی میں جا کر دیکھوں، اور پھر میں اس جھونپڑی میں جا پہنچا، وہاں میں نے دیکھا کہ ایک نابینا بڑھیا ہے، اور اس کے ہمراہ چند چھوٹے بچے بھی ہیں۔ میں نے اس بڑھیا سے دریافت کیا ''اے اللہ کی بندی! اللہ تم پر رحم فرمائے، یہ شخص کون تھا جو ابھی کچھ دیر قبل تمہاری جھونپڑی سے نکل کر گیا ہے؟'' بڑھیا نے جواب دیا ''یہ شخص یہاں اکثر آیا کرتا ہے، لیکن ہمیں نہیں معلوم یہ کون ہے''۔ تب میں نے کہا ''اچھا! یہ بتاؤ، یہ شخص یہاں آ کر کیا کرتا ہے؟'' اس پر بڑھیا نے کہا ''یہ ہماری اس جھونپڑی میں جھاڑو لگاتا ہے، صفائی کرتا ہے، ہمارے لئے پانی بھرتا ہے، ہمارے لئے کھانا بھی تیار کرتا ہے، اور پھر ہمارے برتن مانجھتا ہے، اور بس...... واپس چلا جاتا ہے''۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جب خلیفۂ وقت' نیز رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین' صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کی یہ ''عظمت'' دیکھی، اور اس ضعیف و نابینا بڑھیا کی زبانی یہ تمام گفتگو سنی......تو ان کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہنے لگے۔

(۱) تاریخ الخلفاء/ جلال الدین السیوطی: (۱/ ۷۸)

وفات:

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت مختصر لیکن انتہائی اہم تھا، لہٰذا اس نازک ترین دور میں انتہائی جرأتمندانہ اور فیصلہ کن قسم کے فوری اقدامات کی اشد ضروری تھی کہ جن پر آئندہ ہمیشہ کیلئے امت کی بقاء کا انحصار تھا۔

چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر صدق واخلاص، دینی بصیرت، فہم وفراست، عزم واستقامت، اور بے مثال ایمانی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے انتہائی قابلِ تحسین اور دوررس قسم کے اقدامات کئے، تمام فتنوں کا قلع قمع کیا، یہی وجہ ہے کہ تاریخِ اسلام میں ان کا نام ہمیشہ روشن، اور ان کا کردار ہمیشہ نا قابلِ فراموش رہے گا۔

اسی کیفیت میں تقریباً ستائیس ماہ تک امت کی قیادت کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دینے کے بعد آخر ایک بار جب شدید سردی کا موسم چل رہا تھا، تب اس ٹھنڈے موسم سے متأثر ہونے کے نتیجے میں ان کی طبیعت ناساز ہوگئی، مرض شدت اختیار کرتا گیا۔

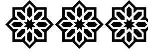
اسی کیفیت میں انہوں نے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشاورت کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین مقرر کیا۔ اپنی بیٹی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو وصیت کی کہ ''مجھے پرانے کپڑوں میں کفنانا، کیونکہ نئے کپڑے پہننے کے مستحق زندہ لوگ ہیں''۔

اور پھر اس مختصر علالت کے بعد ۲۲/ جمادیٰ الثانیہ بروزِ پیر، سن ۱۳ ہجری، تریسٹھ برس کی عمر میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جاملے۔ بوقتِ انتقال زبان پر آخری الفاظ یہ تھے: (تَوَفَّنِي مُسلِماً وَّ أَلحِقنِي بِالصَّالِحِينَ) یعنی: ''اے میرے

رب! مجھے مسلمان ہونے کی حالت میں وفات دینا، اور مرنے کے بعد صالحین کے پاس جگہ عطاء فرمانا''۔(۱)

رسول اللہﷺ کی قبر مبارک کے پہلو میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو سپردِ خاک کیا گیا، یوں ''رفیقِ غار'' اب ہمیشہ کیلئے ''رفیقِ قبر'' بھی بن گئے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیبﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



(۱) یہ دعاء دراصل قرآنی آیت ہے (سورہ یوسف:۱۰۱)

الحمدللہ آج بتاریخ ۲۴/رجب ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲۳/مئی ۲۰۱۴ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی، خلیفۂ دوم امیر المؤمنین فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا تعلق قبیلۂ قریش کے معزز ترین خاندان ''بنوعدی'' سے تھا، جوکہ مکہ شہر کے مشہور و معروف محلّہ ''شُبیکہ'' میں آباد تھا۔ بچپن کے بعد جب شباب کی منزل میں قدم رکھا تو قبیلۂ قریش سے تعلق رکھنے والے دیگر معزز افراد کی مانند تجارت کو اپنا مشغلہ بنایا، فنونِ سپہ گری، شمشیر زنی، نیزہ بازی، تیراندازی، اور گھڑسواری میں خوب مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ پہلوانی اور کُشتی کے فن میں بھی انہیں کمال مہارت حاصل تھی۔ مکہ شہر کے قریب ہر سال ''عُکاظ'' کا جو مشہور و معروف اور تاریخی میلہ لگا کرتا تھا، اس میں بڑے بڑے دنگلوں میں شرکت کرتے اور ''قوتِ بازو'' کا خوب مظاہرہ کیا کرتے تھے۔

مزید یہ کہ بچپن میں ہی لکھنا پڑھنا بھی سیکھا، عربی لغت، ادب، فصاحت و بلاغت، خصوصاً تقریر و خطابت کے میدان میں انہیں بڑی دسترس حاصل تھی، شجاعت و بہادری کے ساتھ ساتھ حکمت و دانش...... نیز فنِ تقریر و خطابت پر مکمل عبور...... یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی بناء پر قریشِ مکہ ہمیشہ نازک اور حساس مواقع پر گفت و شنید کی غرض سے انہی کو اپنا ''سفیر'' اور ''نمائندہ'' بنا کر بھیجا کرتے تھے۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ان حضرات میں سے تھے جنہوں نے ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمان بہت زیادہ مظلوم و لاچار تھے...... یہی وجہ ہے کہ اُس بے بسی و کسمپرسی کے دور میں دینِ اسلام قبول کرنے والوں کا بڑا مقام و مرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں، اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین''، یعنی ''بھلائی میں سبھی

سے آگے بڑھ جانے والے'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے......انہی خوش نصیب اور عظیم ترین افراد میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

مزید یہ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ 'عشرہ مبشرہ' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی مقرب اور خاص ترین ساتھی ہونے کے علاوہ مزید یہ شرف بھی حاصل تھا کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے سسر بھی تھے، ام المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا آپؓ ہی کی صاحبزادی تھیں۔

☆ قبولِ اسلام:

آفتابِ نبوت کو مکہ شہر میں اپنی کرنیں بکھیرتے ہوئے پانچواں سال چل رہا تھا......عمر اُس وقت چھبیس برس کے کڑیل جوان تھے......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مکہ کی وادی میں بلند کی جانے والی توحید کی صدا عمر کیلئے بالکل نامانوس اور اجنبی چیز تھی۔ عمر کی طبیعت میں بہت زیادہ سختی اور تیزی تھی، جس کسی کے بارے میں معلوم ہو جاتا کہ وہ مسلمان ہو گیا ہے، عمر اس کے درپے آزار ہو جاتے......یہی حال ابوجہل کا بھی تھا......مسلمانوں کو ان دونوں کی طرف سے شدید پریشانی کا سامنا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اُن دنوں اکثر دعاء فرمایا کرتے: (اَللّٰھُمَّ أَعِزَّ الاِسلَامَ بِعُمَر بن الخَطَّاب أو بِعَمرو بن هِشَام) یعنی ''اے اللہ! تو دینِ اسلام کو قوت عطاء فرما عمر بن خطاب 'یا عمرو بن ہشام کے ذریعے)۔ (۱) (۲)

(۱) عمرو بن ہشام یعنی ''ابوجہل''۔ (۲) اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت عمرؓ خود ''مُرادِ رسولؐ'' تھے......

اُس ابتدائی دور میں مکہ میں مٹھی بھر مسلمانوں کو مشرکین کے ہاتھوں جس طرح اذیت کا سامنا تھا......اس چیز کو دیکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں کو ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر جانے کا مشورہ دیا تھا، جس پر (نبوت کے پانچویں سال) یکے بعد دیگرے مسلمانوں کی دو مختلف جماعتیں مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کر گئی تھیں۔

ایسے ہی ایک موقع پر عمر نے اپنے قریبی عزیزوں میں سے ایک مسلمان شخص کو جب بے بسی ولاچاری کی کیفیت میں مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کرتے دیکھا تو بڑی ہی حسرت کے ساتھ اسے ہجرت کا یہ ارادہ ملتوی کر کے مکہ میں ہی رک جانے کا مشورہ دیا......جس پر اس شخص نے بھی بڑی حسرت کے ساتھ یہ جواب دیا کہ ''اے عمر! کاش تم نے ہمیں ناحق اس قدر نہ ستایا ہوتا......تو ہم یوں بے وطن ہو جانے پر مجبور نہ ہوتے''۔ یہ بات سن کر عمر پہلی بار اپنی تمامتر ترش مزاجی کے باوجود دکھی ہو گئے......اپنی قوم کو یوں ٹوٹتے اور بکھرتے ہوئے ......اور پھر بے وطن ہوتے ہوئے دیکھنا......یہ چیز عمر کیلئے انتہائی صدمے کا باعث بنی، جس کی وجہ سے وہ شب و روز اسی پریشانی میں مبتلا رہنے لگے کہ آخر یہ معاملہ کس طرح حل ہوگا؟ اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا......اور پھر بالآخر اس کے اگلے سال، یعنی جب نبوت کا چھٹا سال چل رہا تھا، ایک روز عمر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا......سوچا کہ جس شخص کی وجہ سے میری قوم یوں ٹوٹتی اور بکھرتی جارہی ہے......اسی شخص کو (نعوذ باللہ) قتل کر دیا جائے......اور یوں اس مشکل کا ہمیشہ کیلئے خاتمہ کر دیا جائے......یہی بات سوچ کر وہ ایک روز سخت گرمی کے موسم میں اور تپتی ہوئی دوپہر میں ننگی تلوار ہاتھ میں لئے ہوئے چل دیئے۔ راستے میں نُعیم بن عبداللہ (۱) نامی ایک شخص کی ان پر نظر پڑی تو وہ ٹھٹھک کر رہ

(۱) نُعیم بعد میں مسلمان ہو گئے تھے، ۱۵ھ میں جنگِ یرموک کے موقع پر شہید ہوئے (الاستیعاب: ۲۵۹۹)۔

گیا......اس قدر آگ برساتی ہوئی گرمی میں، اور تپتی ہوئی اس دوپہر میں عمر اپنے ہاتھ میں ننگی تلوار لئے ہوئے چلے جارہے ہیں......وہ شخص خوفزدہ ہو گیا......اور خوب سمجھ گیا کہ معاملہ خطرناک ہے۔ چنانچہ اس نے اسی خوف ودہشت کی کیفیت میں دریافت کیا: ''عمر! خیریت تو ہے؟ اس وقت آپ کہاں چلے جارہے ہیں؟ عمر نے جواب دیا (نعوذ باللہ) آج میں اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) کا کام تمام کرنے جارہا ہوں''۔ اس پر وہ شخص بولا ''عمر! پہلے اپنے گھر کی خبر تو لے لو......تمہاری اپنی بہن اور بہنوئی مسلمان ہو چکے ہیں'' اس شخص کی زبانی یہ بات سن کر عمر آگ بگولہ ہو گئے......اور وہاں سے سیدھے اپنی بہن (فاطمہ بنت خطاب) کے گھر پہنچے۔ اس وقت وہ اور ان کے شوہر (سعید بن زید رضی اللہ عنہ) دونوں تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے۔ عمر نے وہاں پہنچتے ہی نہایت غصے کی کیفیت میں بہن کو زدوکوب کرنا شروع کر دیا......یہی سلسلہ جاری تھا کہ اس دوران اچانک بہن نے نہایت پرعزم لہجے میں اور فیصلہ کن انداز میں بھائی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''عمر! تم جس قدر چاہو مجھے مار لو......لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوگا (۱) بہن کی زبانی یہ بات سن کر......اور پہلی بار......بالکل غیر متوقع طور پر اس کی یہ جرأت دیکھ کر عمر چونک اٹھے...... اور سوچنے لگے کہ اس دین میں اتنی قوت......اس کلام میں اس قدر تأثیر......کہ اس قدر زدوکوب کے باوجود بہن نے یوں دوٹوک فیصلہ سنا دیا......تب عمر کے انداز بدلنے لگے...... اور پھر قدرے توقف کے بعد بہن کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگے ''اچھا......جو کچھ تم پڑھ رہے تھے......ذرہ مجھے بھی وہ چیز دکھاؤ......'' اس پر بہن نے جواب دیا ''عمر! تم مشرک

(۱) یعنی اس طرف اشارہ مقصود تھا کہ دینِ برحق کی خاصیت ہی ایسی ہے کہ جب یہ ایک بار دل میں گھر کر لیتا ہے، تو پھر کسی صورت وہاں سے نکل نہیں سکتا......

ہو، ناپاک ہو، لہٰذا تم اللہ کے اس پاک کلام کو نہیں چھو سکتے''۔ عمر نے مسلسل اصرار کیا...... آخر عمر کا یہ اصرار اب ''التجاء'' میں تبدیل ہونے لگا......بہن نے جب عمر کے رویے میں یہ اتنی بڑی تبدیلی دیکھی تو کہا کہ ''بھائی پہلے تم غسل کر کے پاک صاف ہو جاؤ......'' تب عمر غسل کر کے آئے اور پھر وہی مطالبہ دہرایا، تب بہن نے انہیں وہ اوراق دکھائے جن میں وہ قرآنی آیات تحریر تھیں......عمر پڑھتے گئے......﴿طٰـهٰ، مَآ أنـزَلـنَـا عَلَيكَ القُرآنَ لِتَشـقَـىٰ، اِلّا تَـذكِـرَةً لِّمَن يَخشَىٰ، تَنزِيلاً مِّمَن خَلَقَ الأَرضَ وَالسَّمٰوَاتِ الـعُلَىٰ، الرَّحمٰنُ عَلَىٰ العَرشِ استَوَىٰ ، لَهٗ مَا فِي السَّمٰواتِ وَمَا فِي الأَرضِ وَ مَا بَينَهُمَا وَمَا تَحتَ الثَّرَىٰ، وَاِن تَجهَر بِالقَولِ فَاِنَّهٗ يَعلَمُ السِّرَّ وَأَخفَىٰ، اَلـلّـهُ لَآ اِلٰهَ اِلّا هُوَ لَهُ الأَسمَآءُ الحُسنَىٰ﴾ (۱) ترجمہ: (''طٰہٰ، ہم نے یہ قرآن اس لئے نازل نہیں کیا کہ تم مشقت میں پڑ جاؤ، البتہ یہ اس شخص کی نصیحت کیلئے نازل کیا ہے جو [اللہ سے] ڈرتا ہو، اس کا نازل کرنا اس اللہ کی طرف سے ہے جس نے زمین کو اور بلند آسمانوں کو پیدا کیا ہے، جو رحمٰن ہے عرش پر قائم ہے، جس کی ملکیت آسمانوں اور زمین' اور ان دونوں کے درمیان' اور زمین کی تہوں کے نیچے کی ہر ایک چیز پر ہے۔ اگر تو بلند آواز سے کوئی بات کہے' تو' وہ تو ہر ایک پوشیدہ سے پوشیدہ تر چیز کو بھی بخوبی جانتا ہے، وہی اللہ ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں' اسی کے بہترین نام ہیں)۔

عمر یہ آیات پڑھتے گئے، اور ایک ایک لفظ ان کے دل کی گہرائیوں میں اترتا چلا گیا، دیکھتے ہی دیکھتے دل کی دنیا بدل گئی......اور پھر بے اختیار یوں کہنے لگے: ''کیا یہی وہ کلام ہے جس کی وجہ سے قریش نے محمد اور ان کے مٹھی بھر ساتھیوں کو اس قدر ستا رکھا ہے......؟''۔

(۱) طٰہٰ [۱-۸]

اور پھر اگلے ہی لمحے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کی غرض سے بے تابانہ وہاں سے روانہ ہوگئے۔

اُن دنوں رسول اللہ ﷺ بیت اللہ سے متصل ''صفا'' پہاڑی کے قریب ''دارالارقم'' نامی گھر میں رہائش پذیر تھے، جہاں مٹھی بھر مسلمان آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر اللہ کے دین کا علم حاصل کیا کرتے تھے۔ چنانچہ عمر اسی ''دارالارقم'' کی جانب روانہ ہوگئے۔

اُس وقت وہاں دارالارقم میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ چند مسلمان موجود تھے، انہوں نے جب عمر کو اس طرف آتے دیکھا تو وہ پریشان ہوگئے......اتفاق سے اُس وقت ان کے ہمراہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، جن کا اس معاشرے میں بڑا مقام ومرتبہ اور خاص شان وشوکت تھی، جن کی بہادری کے بڑے چرچے تھے، خاندانِ بنو ہاشم کے چشم و چراغ، نیز رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے......اور محض تین دن قبل ہی مسلمان ہوئے تھے......انہوں نے جب یہ منظر دیکھا......اور وہاں موجود کمزور و بے بس مسلمانوں کی پریشانی دیکھی......تو انہیں تسلی دیتے ہوئے کہنے لگے: ''فکر کی کوئی بات نہیں، عمر اگر کسی اچھے ارادے سے آرہے ہیں تو ٹھیک ہے، اور اگر کسی برے ارادے سے آرہے ہیں تو آج میں ان سے خوب اچھی طرح نمٹ لوں گا'' اور پھر عمر وہاں پہنچے، آمد کا مقصد بیان کیا......حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ انہیں ہمراہ لئے ہوئے اندر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، عمر نے وہاں آپ ؐ کی خدمت میں حاضر ہوکر أشھَدُ أن لا اِلٰــه الّا اللّٰه وَ أَشهَدُ أَنّكَ عَبـدُ اللّٰـــهِ وَرَسُـولُـه (میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود برحق نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ ؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں'' کہتے ہوئے دینِ اسلام قبول کیا، اور آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

اس موقع پر وہاں موجود مسلمانوں کی مسرت اور جوش و خروش کا یہ عالم تھا کہ ان سب نے یک زبان ہو کر اس قدر پر جوش طریقے سے ''نعرۂ تکبیر'' بلند کیا کہ مکے کی وادی گونج اٹھی...... مشرکینِ مکہ کے نامور سرداروں کے کانوں تک جب اس نعرے کی گونج پہنچی...... تو وہ کھوج میں لگ گئے کہ آج مسلمانوں کے اس قدر جوش و خروش کی وجہ کیا ہے؟ اور آخر جب انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ آج عمر مسلمان ہو گئے ہیں ......تو وہ نہایت رنجیدہ و افسردہ ہو گئے......اور بے اختیار یوں کہنے لگے کہ'' آج مسلمانوں نے ہم سے بدلہ لے لیا''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے قبل تک مسلمان کمزور و بے بس تھے، چھپ چھپ کر اللہ کی عبادت کیا کرتے تھے......جس روز حضرت عمرؓ نے دینِ اسلام قبول کیا، تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں عرض کیا کہ: أَلَسْنَا عَلَىٰ الحَقِّ يَا رَسُولَ اللّٰه؟ یعنی'' اے اللہ کے رسول! کیا ہم حق پر نہیں ہیں؟'' آپؐ نے جواب دیا: بَلَىٰ يَا عُمَر یعنی'' ہاں اے عمر''۔ تب عمر کہنے لگے: فَفِيمَ الإِخفَاءُ؟ یعنی'' تو پھر ہمیں چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟'' اور تب پہلی بار مسلمان وہاں سے بیت اللہ کی جانب اس کیفیت میں روانہ ہوئے کہ انہوں نے دو صفیں بنا رکھی تھیں، ایک صف کی قیادت حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ جبکہ دوسری صف کی قیادت حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کر رہے تھے......حتیٰ کہ اسی کیفیت میں یہ تمام مسلمان بیت اللہ کے قریب پہنچے جہاں حسبِ معمول بڑی تعداد میں رؤسائے قریش موجود تھے، ان سب کی نگاہوں کے سامنے مسلمانوں نے پہلی بار علی الاعلان بیت اللہ کا طواف کیا اور نماز بھی ادا کی......یہی وہ منظر تھا جسے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے حضرت عمر کو ''الفاروق'' یعنی ''حق و باطل کے درمیان فرق اور تمیز کر دینے والا'' کے یادگار لقب سے

نوازا تھا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مزاج میں طبعی اور فطری طور پر ہی تندی اور شدت تھی......قبولِ اسلام کے بعد اب ان کی یہ شدت اسلام اور مسلمانوں کی حمایت ونصرت میں صرف ہونے لگی، جس سے کمزور و بے بس مسلمانوں کو بڑی تقویت نصیب ہوئی......جیسا کہ مشہور صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ''مَا زِلنَا أَعِزَّةً مَنذُ أَسلَمَ عُمَر'' یعنی ''جب سے عمر مسلمان ہوئے ہیں......تب سے ہم طاقتور ہوئے ہیں''(۱)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (اِن کَانَ اِسلَامُ عُمَر لَفَتْحاً ، وَهِجرَتُهُ لَنَصراً ، وَاِمَارَتُهُ رَحمَةً ، وَاللّٰهِ مَا استَطَعنَا أن نُصَلِّيَ بَالبَيْتِ حَتّىٰ أسلَمَ عُمَر ''(۲) یعنی ''عمر کا قبولِ اسلام ہمارے لئے بڑی فتح تھی، ان کی ہجرت ہمارے لئے نُصرت تھی، اور ان کی خلافت ہمارے لئے رحمت تھی، اللہ کی قسم! عمر کے قبولِ اسلام سے قبل ہم کبھی بیت اللہ کے قریب نماز تک نہیں پڑھ سکتے تھے''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام سے قبل کیفیت یہ تھی کہ مکہ میں جو کوئی مسلمان ہو جاتا وہ اپنے قبولِ اسلام کو حتیٰ الامکان چھپانے کی کوشش کیا کرتا تھا......جبکہ اس بارے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا حال یہ تھا کہ تمام سردارانِ قریش کے پاس جا جا کر انہیں اپنے قبولِ اسلام کے بارے میں خود آگاہ کیا کرتے تھے۔

حضرت صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: (لَمَّا أسلَمَ عُمَرُ ظَهَرَ الِاسلَامُ، وَدُعِيَ اِلَيهِ عَلَانِيَةً، وَجَلَسنَا حَولَ البَيتِ حِلَقاً، وَطُفنَا بِالبَيْت وَانتَصَفْنَا مِمَّن غَلَظَ عَلَينا ، وَ رَدَدنَا عَلَيهِ بَعْضَ مَا يَأتِي بِهٖ)۔

(۱) صحیح بخاری[۳۸۶۳] باب اسلام عمر بن الخطاب۔ (۲) مجمع الزوائد[۹/۶۵]

یعنی ''جب عمر (رضی اللہ عنہ) مسلمان ہوئے تو دینِ اسلام کو غلبہ نصیب ہوا، اور دینِ اسلام کی طرف علی الاعلان دعوت دی جانے لگی، بیت اللہ کے قریب ہم اپنے حلقے بنا کر (بے خوف وخطر) بیٹھنے لگے، بیت اللہ کا طواف کرنے لگے، اور ماضی میں جو لوگ (ہمارے قبولِ اسلام کی وجہ سے) ہمارے ساتھ ظلم وزیادتی اور ناانصافی کرتے چلے آرہے تھے......اب ہم کسی حد تک ان سے اپنا حق بھی وصول کرنے لگے تھے''۔(۱)

یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام مسلمانوں کیلئے فتح ونصرت......جبکہ کفار ومشرکین کیلئے شکست وہزیمت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

☆ ہجرت:

مکہ میں اسی طرح وقت گذرتا رہا......حتیٰ کہ جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو کیفیت یہ تھی کہ تمام مسلمانوں نے خفیہ طور پر مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب ہجرت کا ارادہ کیا......تو بڑی ہی شانِ بے نیازی کے ساتھ مشرکینِ مکہ کی بھیڑ سے بے خوف وخطر گذرتے ہوئے بیت اللہ کے قریب پہنچے، نہایت اطمینان کے ساتھ طواف کیا، دو رکعت نماز پڑھی، اس کے بعد وہاں موجود ان سردارانِ قریش کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''میں مدینہ جا رہا ہوں......تم میں سے اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی ماں اس کی لاش پر روئے......اس کی بیوی بیوہ ہو جائے......اور بچے یتیم ہو جائیں......تو وہ آئے......مجھے روک لے......''۔

یہ سن کر وہ تمام سردارانِ قریش سہم گئے، اور ان میں سے کسی کو آگے بڑھ کر روکنے کی ہمت نہیں ہوئی......اور یوں حضرت عمر رضی اللہ عنہ خفیہ ہجرت کی بجائے......علی الاعلان وہاں

(۱) تاریخ عمر بن الخطاب/ ابن الجوزی [صفحہ:۱۳۰]

سے مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے۔

☆غزوات:

مکی دور مسلمانوں کیلئے مظلومیت اور مشکلات کا دور تھا، اس کے بعد مدنی دور آیا جو مکی دور سے ہر لحاظ سے مختلف تھا، یہاں مسلمان اب مشرکینِ مکہ کے مظالم اور ایذاء رسانیوں سے دور مسرور و مطمئن اور خوشگوار زندگی بسر کرنے لگے...... مشرکینِ مکہ کو مسلمانوں کی یہ نئی خوشگوار زندگی پسند نہ آئی ۔ چنانچہ انہوں نے متعدد بار مسلمانوں کو صفحۂ ہستی سے نیست و نابود کر دینے کی ٹھانی، جس کے نتیجے میں بہت سے غزوات کی نوبت آئی۔ ایسے میں ہر غزوے کے موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شرکت کی، شجاعت و بسالت کے بے مثال جوہر دکھائے۔

اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا، جنگ کا موقع ہو یا امن کا زمانہ، سفر ہو یا حضر، ہمیشہ ہر حالت میں اور ہر موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت' نیز صحبت و معیت میں پیش پیش رہے...... مزید یہ کہ ہر موقع پر رسول اللہ ﷺ کی مشاورت کے فرائض بھی بحسن و خوبی انجام دیتے رہے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے مناقب؛ چند احادیث کی روشنی میں:

☆......اِنَّ اللّٰهَ تَعَالَىٰ جَعَلَ الحَقَّ عَلَىٰ لِسَانِ عُمَرَ وَقَلبِهِ (۱)

ترجمہ: (بے شک اللہ تعالیٰ نے ''حق'' کو عمر کی زبان پر اور ان کے دل میں رکھ دیا ہے)

☆......لَو كَانَ نَبِيٌّ بَعدِي لَكَانَ عُمَرَ بن الخَطّاب (۲)

ترجمہ: (میرے بعد اگر کوئی نبی ہوتا تو یقیناً وہ عمر بن خطاب ہی ہوتے)

(۱) ترمذی [۳۶۸۲] باب مناقب ابی حفص عمر بن الخطاب ؓ (۲) ترمذی [۳۶۸۶]

☆......لَقَد كَانَ فِيمَا قَبلَكُم مِنَ الأُمَمِ مُحَدَّثُونَ مِن غَيرِ أن يَكُونُوا أنبِيَاءَ فَاِن يَكُ فِي أُمَّتِي أَحَدٌ فَاِنَّهٗ عُمَرُ (۱)

ترجمہ:(تم سے پہلی امتوں میں کچھ ایسے لوگ ہوا کرتے تھے جو اگرچہ نبی تو نہیں تھے البتہ ان کے قلب میں [من جانب اللہ] القاء کیا جاتا تھا، میری امت میں بھی اگر کوئی ایسا انسان ہوتو یقیناً وہ عمر ہی ہو سکتے ہیں)

☆......يَا ابنَ الخَطَّابِ! وَالَّذِي نَفسِي بِيَدِهٖ مَا لَقِيَكَ الشَّيطَانُ سَالِكاً فَجّاً اِلَّا سَلَكَ فَجّاً غَيرَكَ (۲)

ترجمہ:(اے ابنِ خطاب! قسم اس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، جب کبھی شیطان تمہیں کسی راستے پر چلتا ہوا دیکھتا ہے تو وہ فوراً [وہ راستہ چھوڑ کر] دوسرے راستے پر چلنے لگتا ہے)

رسول اللہ ﷺ کے نزدیک اپنے جلیل القدر صحابی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کیلئے جو مقام و مرتبہ تھا اس کا اندازہ مذکورہ بالا احادیث سے بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

خلافت کیلئے انتخاب:

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اور صحبت و معیت میں پیش پیش رہے، علمی استفادہ اور کسبِ فیض کا سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، آپ ﷺ بھی ہمیشہ تادمِ آخر حضرت عمر بن خطابؓ سے راضی اور مسرور و مطمئن رہے، اور یوں آپ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا۔

آپ ﷺ کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت

(۱) متفق علیہ۔ مشکاۃ المصابیح [۶۰۲۶] باب مناقب عمر۔ (۲) متفق علیہ۔ مشکاۃ المصابیح [۶۰۲۷]

عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو انتہائی قریبی اور قابلِ اعتماد ساتھی اور خصوصی مشیر کی حیثیت حاصل رہی، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مشورے، فہم و فراست، دوراندیشی، اور اصابتِ رائے پر ہمیشہ مکمل بھروسہ اور اطمینان رہا۔
چنانچہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے انتقال سے چند روز قبل مہاجرین وانصار میں سے کبارِ صحابہ کے ساتھ مشاورت اور غور وفکر کے بعد یہ وصیت فرمائی کہ میرے بعد عمر بن خطاب مسلمانوں کے خلیفہ کی حیثیت سے فرائض انجام دیں گے۔ اس پر بعض افراد نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے یوں کہا کہ ''عمر کے بارے میں ہمیں کوئی تردد تو نہیں ہے...... البتہ یہ کہ ان کے مزاج میں سختی ہے''۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا: ''عمر کی سختی اس لئے ہے کہ میں نرم ہوں، جب ساری ذمہ داری ان پر ہوگی، تو وہ خود ہی نرم ہوجائیں گے''۔ اس کے بعد مزید فرمایا: ''اگر اللہ نے پوچھا، تو یہ جواب دوں گا کہ اپنے بعد ایسے شخص کو مسلمانوں کا فرمانروا بنا کر آیا ہوں جو تیرے بندوں میں سب سے بہتر ہے''۔
جس روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا، اسی روز یعنی ۲۲/ جمادیٰ الثانیہ سن ۱۳ ہجری بروز پیر مدینہ میں تمام مسلمانوں نے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی۔
خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالتے ہی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے لوگوں کے سامنے اپنے مختصر خطاب میں کہا:
''لوگو! تمہارے معاملات کی اب تمامتر ذمہ داری میرے شانوں پر رکھدی گئی ہے، اس لئے میری تمام سختی اب نرمی میں بدل چکی ہے، جو کوئی امن وامان اور سلامتی کے ساتھ رہنا چاہے، میں اس کیلئے انتہائی نرم ہوں، البتہ جو لوگ دوسروں پر ظلم وزیادتی کرتے ہیں،

میری سختی ان کیلئے بدستور قائم رہے گی، اگر کوئی کسی کے ساتھ ظلم وزیادتی کرے گا تو میں اسے اُس وقت تک نہیں چھوڑوں گا جب تک اُس کا ایک رخسار زمین پر ٹکا کر' اور دوسرے رخسار پر پاؤں رکھ کر اُس سے مظلوم کا حق وصول نہ کرلوں......اللہ کے بندو! اللہ سے ڈرو، مجھ سے درگذر کر کے میرا ہاتھ بٹاؤ، نیکی کو پھیلانے اور برائی کا راستہ روکنے میں میری مدد کرو، تمہاری جو خدمات اللہ نے میرے سپرد کی ہیں' ان کے متعلق مجھے نصیحت کرو، میں تم سے یہ بات کہہ رہا ہوں، اور تمہارے لئے اللہ سے مغفرت طلب کر رہا ہوں''۔

فتوحات:

خلیفۂ دوم امیر المؤمنین فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا دورِ حکومت دس سال چھ مہینے اور پانچ دن رہا، حکومتوں کے عروج وزوال کیلئے یہ کوئی بڑی مدت نہیں، مگر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس مختصر عرصے میں اسلامی حکومت کو ایک جانب ایشیا اور دوسری جانب افریقہ کے قلب تک پہنچا دیا......اسلامی فتوحات کا ایک سیلاب تھا جس کے آگے بند باندھنا کسی کے بس میں نہیں تھا، ''قادسیہ'' اور ''یرموک'' جیسی تاریخی جنگیں اسی دور میں لڑی گئیں جن کے نتیجے میں ہمیشہ کیلئے دنیا کا جغرافیہ ہی بدل گیا۔ ساڑھے دس برس کی اس مختصر مدت میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے جو علاقے فتح کئے ان کا رقبہ ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل سے کچھ زیادہ تھا......ایک لاکھ چھتیس ہزار شہر فتح ہوئے، جن میں چار ہزار مساجد تعمیر کی گئیں۔ یوں بہت بڑے پیمانے پر اللہ کی اس سرزمین پر اللہ کے دین کا بول بالا ہوا......اور اہلِ ایمان کو ایسی بے مثال اور یادگار عظمت ورِفعت نصیب ہوئی......جس کی مثال اس کے بعد چشمِ فلک نے کبھی نہیں دیکھی۔

سادگی:

اس قدر بے مثال فتوحات اور عظیم الشان کارناموں کے باوجود سادگی اور زُہد وتقویٰ کا یہ عالم تھا کہ فرشِ خاک پر ہی لیٹتے، کسی پتھر کو اپنا تکیہ بنا لیتے، پیوند لگے ہوئے کپڑے پہنتے، اکثر کسی سالن کے بغیر صرف زیتون کے تیل کے ساتھ ہی خشک روٹی کھا لیتے، زندگی ہر قسم کے کروفر، نمود ونمائش اور ٹھاٹ باٹ سے خالی...... مگر جلال ایسا...... کہ...... کوئی شہنشاہ بھی اس کی تاب نہ لاسکتا تھا...... عبادتِ الٰہی میں اپنی مثال آپ تھے، خشیتِ الٰہیہ کا ہمیشہ غلبہ رہتا...... اور مزاج پر اکثر رقت طاری رہتی تھی۔

فتحِ بیت المقدس کے انتہائی یادگار اور تاریخی موقع پر جب مدینہ منورہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد بیت المقدس کی جانب عازمِ سفر ہوئے تو کیفیت یہ تھی کہ اس طویل سفر کیلئے بیت المال سے محض ایک اونٹ حاصل کیا گیا جس پر وہ خود اور خادم باری باری سواری کرتے رہے۔

اُس وقت روئے زمین کی دونوں طاقتور ترین سلطنتوں یعنی ''فارس'' اور ''روم'' کے مقابلے میں فتح ونصرت کے جھنڈے گاڑنے...... اور پھر اسی کے نتیجے میں فتحِ بیت المقدس کے اس تاریخی موقع پر...... رومیوں کا ایک جمِ غفیر وہاں اُمڈ آیا تھا...... تا کہ مسلمانوں کے فرمانروا اور اس عظیم ترین فاتح کی محض ایک جھلک دیکھ سکیں جس نے بیک وقت قیصر وکسریٰ کا غرور ہمیشہ کیلئے خاک میں ملا دیا تھا...... جس کے ہاتھوں ان کی شان وشوکت کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا تھا، جس کی قیادت میں مٹھی بھر کلمہ گو صحرانشیں آندھی اور طوفان کی مانند ہر طرف چھا گئے تھے...... تب ان سب نے اپنی کھلی آنکھوں سے یہ عجیب وغریب اور ناقابلِ یقین منظر دیکھا کہ یہ عظیم الشان فاتح وکشور کشا...... عظیم اسلامی سلطنت کا والی

وفر مانروا......طویل سفر طے کرنے کے بعد اب بیت المقدس میں داخل ہوتے وقت اُس کی کیفیت یہ ہے کہ......خود پا پیادہ......جبکہ خادم اونٹ پر سوار......مزید یہ کہ اُس کے جسم پر جو لباس ہے......اُس میں ایک دو نہیں......چودہ پیوند لگے ہوئے ہیں......اور جب اس موقع پر کسی نے لباس تبدیل کرنے کا مشورہ دیا تھا......تب اس عظیم فر مانروا نے آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ان تاریخی الفاظ میں مختصر اور دوٹوک جواب دیتے ہوئے یوں کہا تھا ''نَحنُ قَومٌ أَعَزَّنَا اللّٰهُ بِالإِسلَام...... ''یعنی: ''اللہ نے ہمیں جو عزت دی ہے وہ صرف اسلام کی بدولت دی ہے، اور بس......''

کارنامے اور خدمات:

خلیفۂ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس وسیع وعریض اسلامی سلطنت کا نظم ونسق بحسن وخوبی چلانے کی غرض سے متعدد بنیادی اقدامات کئے جن کی اہمیت وافادیت وقت کے ساتھ ساتھ خوب نمایاں ہوتی چلی گئی۔ مثلاً:

۱......ہجری اسلامی کیلنڈر کا آغاز۔

۲......عُمالِ حکومت یعنی مختلف علاقوں کے سرکاری عہدے داروں کا ہمیشہ سختی کے ساتھ محاسبہ اور ان پر کڑی نگاہ رکھنا۔

۳......مفتوحہ علاقوں میں بہت سے نئے شہروں کی تعمیر۔

۴......مفتوحہ علاقوں میں حفاظتی اقدام کے طور پر متعدد نئی فوجی چھاؤنیاں تعمیر کی گئیں جن میں سے ہر چھاؤنی میں ہمہ وقت کم از کم چار ہزار گھوڑے جنگی مقاصد کیلئے تیار رہتے تھے۔

۵......دفاع کو مضبوط ومؤثر بنانے کی غرض سے متعدد نئے قلعے تعمیر کروائے۔

۶......پہلی بار باقاعدہ فوج اور پولیس کا محکمہ قائم کیا گیا۔

۷......سرحدی علاقوں میں گشت کی غرض سے مستقل سرحدی حفاظتی فوج تشکیل دی گئی۔

۸......مستقل احتیاطی فوج تشکیل دی گئی جس میں تیس ہزار گھوڑے تھے۔

۹......فوجیوں کیلئے با قاعدہ وظیفہ اور تنخواہیں مقرر کی گئیں۔

۱۰......ہر فوجی کیلئے ہر چھ ماہ بعد با قاعدہ چھٹی کی سہولت مہیا کی گئی۔

۱۱......با قاعدہ عدالتی نظام رائج کیا گیا' نیز قاضی مقرر کئے گئے۔

۱۲......بیت المال قائم کیا گیا۔

۱۳......رقبوں اور سڑکوں کی پیمائش کی گئی۔

۱۴......مردم شماری کی گئی۔

۱۵......کاشتکاری کا نظام قائم کیا گیا، اس مقصد کیلئے متعدد نہریں کھدوائیں' ملک کے طول وعرض میں آبپاشی کے نظام کو بہتر بنایا گیا۔

۱۶......مفتوحہ علاقوں میں چار ہزار نئی مساجد تعمیر کی گئیں۔

۱۷......مساجد میں روشنی کا انتظام کیا گیا۔

۱۸......اماموں' مؤذنوں' اور خطیبوں کیلئے با قاعدہ وظائف مقرر کئے گئے۔

۱۹......معلمین اور مدرسین کیلئے با قاعدہ وظائف مقرر کئے گئے۔

۲۰......''نظامِ وقف'' قائم کیا گیا۔

۲۱......غلہ واناج ودیگر غذائی اجناس کی حفاظت کی غرض سے ملک کے طول وعرض میں متعدد بڑے بڑے گودام تیار کئے گئے۔

۲۲......اسلامی ریاست کا با قاعدہ سکہ جاری کیا گیا۔

☆......ملکی نظم ونسق سے متعلق ان شاندار کارناموں' بے مثال خدمات' اور یادگار اقدامات

کے علاوہ مزید یہ کہ:

☆......نمازِ تراویح میں مسلمانوں کو ایک امام کی اقتداء میں متحد اور یکجا کیا گیا۔

☆......تاریخِ اسلام میں پہلی بار ''امیر المؤمنین'' کا لقب استعمال کیا گیا، جبکہ اس سے قبل خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کیلئے ''خلیفۃ رسول اللہ'' (یعنی: رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ) کا لقب استعمال کیا جاتا تھا۔

اور پھر خلیفۂ اول کے بعد جب حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے خلافت کا منصب سنبھالا، تو ابتداء میں انہیں ''خلیفۂ خلیفۃِ رسولِ اللہ'' کہا گیا (یعنی: رسول اللہ ﷺ کے خلیفہ کے خلیفہ) لیکن سبھی نے اس اشکال کو شدت کے ساتھ محسوس کیا کہ یکے بعد دیگرے خلفاء کا یہ سلسلہ تو بڑھتا رہے گا......لہٰذا کتنی بار لفظ ''خلیفہ'' کا اضافہ کیا جائے گا؟ چنانچہ غور و فکر کے بعد ''خلیفہ'' کی بجائے پہلی بار حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کیلئے ''امیر المؤمنین'' کا لقب استعمال کیا گیا، اور پھر بعد میں آنے والے خلفاء کیلئے بھی یہی لقب استعمال کیا جاتا رہا۔

عدل و انصاف:

خلیفۂ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کو اس حقیقت کا بخوبی احساس و ادراک تھا کہ بقاء کا راز عدل و انصاف میں ہی مضمر ہے، لہٰذا چھوٹے بڑے اور امیر و فقیر کی رعایت کے بغیر انہوں نے انصاف کے تقاضوں کی ہمیشہ مکمل پاسداری کی اور اس سلسلے میں رہتی دنیا تک اعلیٰ مثال قائم کی، یہی وجہ ہے کہ آج بھی ''عدلِ فاروقی'' کو ضرب المثل سمجھا جاتا ہے......اور اس لحاظ سے حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت کو ''مثالی دور'' تسلیم کیا جاتا ہے۔

رعایا پروری:

فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کی نظر خلافت کی ظاہری شان وشوکت پر نہیں تھی، بلکہ ان کی نظر میں خلافت ''پدرانہ حیثیت'' رکھتی تھی، جیسے ایک باپ اپنی اولاد کا خیال رکھتا ہے' ایسے ہی فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ اپنی رعایا کا خیال رکھتے تھے......آپؓ نے اپنی رعایا کا اور اس بارے میں اللہ کے سامنے جوابدہی کا احساس اس حد تک کیا کہ تاریخ اپنے کسی دور میں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی، اسی احساس کا یہ کرشمہ تھا کہ کمزوروں اور محتاجوں کے جذبات اوران کی تکلیفوں کا صحیح اندازہ لگانے کیلئے آپؓ نے خود کو ہمیشہ انہی کی سطح پر رکھا......راتوں کو اٹھ اٹھ کر شہر کے گلی کوچوں میں گھومتے پھرتے اور لوگوں کے حالات ومشکلات کا بذاتِ خود اندازہ لگاتے......رعیت میں سے کسی کے پاؤں میں اگر کانٹا چبھ جاتا تو اس کی چبھن اور تکلیف عمر اپنے دل میں محسوس کرتے......!!

شہادت:

خلیفۂ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سن ۲۳ ہجری میں جب حج بیت اللہ سے واپسی پر مکہ سے مدینہ کی جانب محوِ سفر تھے' راستے میں ایک جگہ اپنے اونٹ کو بٹھایا، اور زمین پر بیٹھ کر اپنے ہاتھوں سے سنگریزوں کو اِدھر اُدھر ہٹاتے ہوئے آرام کیلئے کچھ جگہ بنائی......اور پھر وہاں اپنی چادر بچھا کر اس پر لیٹ گئے، جب نگاہ آسمان کی جانب اٹھی تو فوراً ہی دونوں ہاتھ بھی آسمان کی جانب بلند ہو گئے......تب اپنے رب سے مناجات کرتے ہوئے یوں دعاء کی: اَللّٰهُمَّ كَبُرَتْ سِنِّي ، وَضَعُفَتْ قُوَّتِي ، وَانتَشَرَتْ رَعِيَّتِي ، فَاقبِضنِي اِلَيكَ......یعنی ''اے اللہ! اب میری عمر زیادہ ہو گئی ہے، قوت بھی

کمزور پڑ چکی ہے، رعایا بھی خوب پھیل چکی ہے، اس لئے اے اللہ! اب تو مجھے بس اپنے پاس بلالے''۔ (۱)

اور پھر مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد مسجدِ نبوی میں خطاب کے دوران اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ سے اپنے لئے شہادت کی دعاء مانگی......لیکن پھر فوراً ہی فرمانے لگے: أَنَّـىٰ لِي الشَّهَـادَة؟ یعنی ''میرے نصیب میں شہادت کہاں؟''

اس جملے سے غالباً مقصد یہ ہوگا کہ مختلف محاذوں پر جو اسلامی افواج اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر مصروفِ جہاد ہیں ......وہ تمام علاقے مدینہ سے بہت دور......سینکڑوں' بلکہ ہزاروں میلوں کی مسافت پر ہیں......لہٰذا محاذِ جنگ سے اس قدر دور یہاں مدینہ میں بیٹھے ہوئے ''شہادت'' کی توقع کس طرح کی جاسکتی ہے......؟ اور پھر قدرے توقف کے بعد خود ہی یوں فرمانے لگے: اِنَّ الَّـذِي سَـاقَـنِي مِن مَكَّةَ اِلَىٰ المَدِينَةِ قَادِرٌ عَلَىٰ أن يَسُـوقَ لِي الشَهَادَةَ اِلَىٰ المَدِينَة یعنی ''وہ اللہ جس نے اپنے فضل وکرم سے مجھے مکہ سے مدینہ پہنچادیا، یقیناً وہ اس بات پر بھی قادر ہے کہ اب میرے لئے ''شہادت'' کو بھی یہیں مدینہ میں ہی پہنچادے''۔ (۲)

اس واقعہ کے بعد محض چندروز ہی گذرے تھے کہ ماہِ ذوالحجہ کے آخری دنوں میں ''ابولولو فیروز'' نامی مجوسی غلام نے آپؓ کے قتل کا منصوبہ بنایا، اس مقصد کیلئے اس نے ایک بڑا زہر آلود خنجر بھی تیار کیا۔ ایک روز نمازِ فجر سے پہلے ہی اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے

(۱) تاریخ عمر بن الخطاب/ ابن الجوزی، صفحہ:۲۰۶۔

(۲) یعنی حضرت عمر رضی اللہ عنہ اصل میں تو مکی تھے، قبیلۂ قریش سے تعلق تھا، یہ تو محض اللہ کی طرف سے احسان تھا کہ انہیں اسلام کی دولت نصیب ہوئی، اور پھر دیگر مسلمانوں کی طرح مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت بھی نصیب ہوئی......اللہ کے اسی احسان کی طرف اشارہ مقصود تھا۔

وہ مسجد کے کسی کونے میں چھپ کر بیٹھ گیا......اور جب نماز کا وقت ہوا......حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ حسبِ معمول امامت کیلئے آگے بڑھے اور نماز شروع کی، ابھی تکبیر ہی کہی تھی کہ ابولولو فیروز نے آگے بڑھ کر خنجر سے کئی وار کئے، لوگوں نے اسے پکڑنے کی کوشش کی تو اس نے اندھا دھند ہر ایک کو نشانہ بنانا شروع کر دیا...... چونکہ مسجد میں سب ہی لوگ غیر مسلح تھے اس لئے اسے پکڑنے میں دقت پیش آئی، اس کے ان حملوں کے نتیجے میں وہاں موجود نمازیوں میں سے تیرہ افراد شدید زخمی ہوئے، جن میں سے چھ افراد شہید ہو گئے......کچھ موقع پر ہی......اور کچھ بعد میں......اس موقع پر قاتل نے جب فرار ہونے کی کوشش کی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اس پر اپنا کمبل ڈال دیا، جس پر اسے نقل وحرکت میں دشواری پیش آنے لگی، اور تب اس نے گرفتاری سے بچنے کیلئے اپنے اسی خنجر سے ہی خودکشی کر لی......اور یوں وہ بدبخت اپنے اس بدترین جرم کے پیچھے کارفرما اصل ''سازش'' کو ہمیشہ کیلئے ''سربستہ راز'' کی شکل میں چھپا گیا۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ جو اس اچانک حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہو جانے کی وجہ سے گر گئے تھے، اب انہوں نے نماز مکمل کرنے غرض سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اشارہ کیا، جس پر انہوں نے آگے بڑھ کر نمازِ فجر مکمل کی، جبکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو فوری طور پر اٹھا کر گھر پہنچایا گیا۔

کچھ وقت گذرنے کے بعد جب طبیعت قدرے سنبھلی تو اپنے سرہانے موجود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار کیا ''بھتیجے! وہ حملہ آور کون تھا، اور اس کا انجام کیا ہوا؟'' اس پر انہوں نے جواب میں یوں کہا ''وہ مجوسی غلام ابولؤلؤ فیروز تھا، اور یہ کہ اس نے خودکشی کر لی ہے''۔

یہ سن کر فرمایا ''اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کسی ایسے شخص نے قتل نہیں کیا جو اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوتا ہو''۔

اس موقع پر مہاجرین وانصار میں سے کبارِ صحابہ نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ''اے امیر المؤمنین! آپ اپنا جانشین مقرر کر دیجئے......تا کہ اختلاف وافتراق کی نوبت نہ آئے''

اس پر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے چھ حضرات کے نام گنواتے ہوئے فرمایا کہ ''رسول اللہ ﷺ کے نزدیک ان چھ حضرات کی خاص حیثیت تھی، آپ ﷺ ان سے ہمیشہ خوش رہے اور تا دمِ آخر راضی ومطمئن رہے ......لہٰذا یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کر لیں''۔ وہ چھ افراد یہ تھے:

۱۔حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔۲۔حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

۳۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ۔۴۔حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔۵۔حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ۔۶۔حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔(۱)

نیز اس موقع پر یہ تاکید بھی فرمائی کہ ان چھ حضرات میں سے کسی ایک کے انتخاب کا یہ کام زیادہ سے زیادہ تین دن کی مدت میں بہر صورت طے پا جائے، تا کہ معاملہ طول نہ پکڑنے پائے......اور یوں منافقین اور خفیہ دشمنوں کو کسی سازش کا موقع نہ مل سکے۔

حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے اس قاتلانہ حملے کے نتیجے میں زخمی ہونے کے بعد یہ تاکید کی تھی کہ نئے خلیفہ کے انتخاب تک ان کی جگہ مسجدِ نبوی میں نماز صہیب پڑھائیں۔ چنانچہ اس دوران' نیز حضرت عمرؓ کی شہادت کے بعد بھی مزید تین دن یعنی نئے خلیفہ کے انتخاب تک مسجدِ نبوی میں امامت کے فرائض مسلسل حضرت صہیب بن سنان الرومیؓ انجام

(۱) اسی نسبت سے یہ چھ حضرات بعد میں ''اصحابِ شوریٰ'' کہلائے۔

دیتے رہے۔(۱)

اس کے بعد حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ نے ان چھ افراد کو بلوایا، اور انہیں نصیحت کرتے ہوئے فرمایا: ''تم میں سے جو شخص خلافت کیلئے منتخب ہو، اسے میں وصیت کرتا ہوں کہ وہ ''انصار'' کے حقوق کا بہت لحاظ رکھے، کیونکہ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کی مدد کی اور مہاجرین کو اپنے گھروں میں ٹھکانہ فراہم کیا، انصار تمہارے محسن ہیں، تمہیں بھی ان کے ساتھ احسان ہی کرنا چاہئے، ان کی بھول چُوک سے جہاں تک ممکن ہو درگذر اور چشم پوشی سے کام لینا''۔

پھر مزید فرمایا: ''تم میں سے جو کوئی خلافت کیلئے منتخب ہو میں اسے ''مہاجرین'' کے ساتھ حسنِ سلوک کی بھی وصیت کرتا ہوں''۔

اور پھر اپنے بیٹے عبداللہ کو ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی خدمت میں یہ کہتے ہوئے بھیجا کہ ''جاؤ...... ان سے میرے لئے رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پہلو میں تدفین کی اجازت طلب کرو''

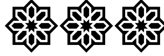
اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما وہاں پہنچے اور اپنے والد یعنی حضرت عمرؓ کی طرف سے یہی گذارش کی...... جسے سننے کے بعد ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی آنکھوں سے آنسو رواں ہو گئے...... اور فرمایا: ''میں اس جگہ کو اپنے لئے محفوظ رکھنا چاہتی تھی...... مگر آج میں عمر کو خود پر ترجیح دوں گی......''

۲۶/ ذوالحجہ سن ۲۳ ہجری بروزِ بدھ قاتلانہ حملے کے نتیجے میں زخمی ہونے کے بعد چوتھے روز یعنی یکم محرم سن ۲۴ ہجری بروز اتوار تریسٹھ برس کی عمر میں رسول اللہ ﷺ کے خاص ساتھی

(۱) حضرت صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات [۲۹۸۔۳۱۳] پر ملاحظہ ہو۔

اور جلیل القدر صحابی خلیفۂ دوم امیر المؤمنین فاروقِ اعظم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے......نمازِ جنازہ حضرت صہیب بن سنان الرومی رضی اللہ عنہ نے پڑھائی ،مسجدِ نبوی میں رسول اللہ ﷺ اور خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پہلو میں سپردِ خاک کئے گئے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۸/ شعبان ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۶/ جون ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ:

☆ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی، خلیفۂ سوم امیر المؤمنین ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی ولادت مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے چھ سال بعد ہوئی، قبیلۂ قریش کے مشہور خاندان ''بنوامیہ'' سے تعلق تھا، سلسلۂ نسب پانچویں پشت میں عبدمناف پر رسول اللہ ﷺ کے نسب سے جاملتا ہے، مزید یہ کہ ان کی نانی ''اُم حکیم'' رسول اللہ ﷺ کے والد گرامی جناب عبداللہ کی جڑواں بہن تھیں۔

☆ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی زندگی زمانۂ جاہلیت میں بھی انتہائی شریفانہ تھی جس کی وجہ سے قبیلۂ قریش میں نیز تمام شہر مکہ میں انہیں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اُس دور میں جب ہر کوئی لہوولعب کا دلدادہ اور شراب کا ازحد رسیا تھا...... مگر ایسے میں بھی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا دامن ہمیشہ لہوولعب سے پاک رہا، اور ان کے لب جامِ شراب سے ہمیشہ ناآشنا رہے۔

☆ مکہ شہر میں دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص دوستی اور قربت تھی، دونوں میں بہت گہرے روابط تھے، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، اور حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ چوتھے شخص تھے جنھوں نے دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام قبول کیا، تب ان کی عمر چونتیس سال تھی۔

☆ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ''السابقین الأولین'' یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر

سبقت لے جانے والوں میں سے تھے، یعنی وہ عظیم ترین افراد جنھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا...... یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں، اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆ مزید یہ کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ'' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ نیز رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو متعدد مواقع پر ''شہادت'' کی خوشخبری بھی سنائی تھی، اور ''مظلومیت'' کی خبر بھی دی تھی۔

☆ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے انتہائی مقرب اور خاص ترین ساتھی ہونے کے علاوہ مزید یہ شرف بھی حاصل تھا کہ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے داماد بھی تھے، رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادیوں حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا اور حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح ایامِ جاہلیت میں ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ سے ہوا تھا، آپ ﷺ نے جب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے نازل شدہ حکم ﴿وَأَنذِرْ عَشِيرَتَكَ الأَقْرَبِينَ﴾ (۱) (یعنی: ''آپؐ اپنے قریبی رشتے داروں کو [اللہ کے عذاب سے] ڈرایئے'') کی تعمیل کے طور پر اپنے خاندان ''بنوہاشم'' کو کوہِ صفا پر جمع کر کے دینِ برحق کی طرف دعوت دی، تو اس موقع پر ابولہب بگڑ گیا، اور یوں کہنے لگا: تَبّاً لَكَ ! أَمَا دَعَوتَنَا إلّا لِهٰذا......؟ یعنی: (نعوذ باللہ) اے محمد! تم ہلاک جاؤ، کیا تم نے ہمیں اسی لئے یہاں بلایا تھا......؟ (۲)

(۱) الشعراء [۲۱۴] (۲) صحیح بخاری [۴۹۷۲] کتاب التفسیر، سورۃ المسد۔

ابولہب کی اس بیہودہ گوئی پر آپؐ انتہائی رنجیدہ ودل گرفتہ ہوئے، جس پر آپؐ کی تسلی ودلجوئی کیلئے سورۃ المسد ﴿تَبّت یَدَا أبِي لَهَب وَتَبَّ......﴾ نازل ہوئی (یعنی: ''ٹوٹ جائیں ابولہب کے دونوں ہاتھ اور وہ خود بھی ہلاک ہوجائے......'')

اس پر ابولہب مزید مشتعل ہوگیا اور اس نے اپنے دونوں بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کو حکم دیا کہ وہ آپؐ کی صاحبزادیوں (حضرت رقیہؓ، وحضرت ام کلثومؓ) کو طلاق دے کر گھر سے نکال دیں، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔(۱)

کچھ عرصہ گذرنے کے بعد آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت رقیہؓ کی شادی اپنے جلیل القدر صحابی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے کردی، ان دونوں نے نبوت کے پانچویں سال مکہ سے حبشہ کی جانب ہجرت کی، جہاں اللہ نے انہیں بیٹا عطاء فرمایا، اس کے بعد نبوت کے دسویں سال ایک غلط فہمی کے نتیجے میں یہ دونوں میاں بیوی حبشہ سے واپس مکہ چلے آئے اور از سرِ نو مشرکینِ مکہ کی طرف سے تکلیفوں اور اذیتوں کے اسی سلسلے سے دوچار ہونا پڑا......اور پھر نبوت کے تیرہویں سال ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے کے بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کی۔

☆ حبشہ میں قیام کے دوران ان دونوں میاں بیوی کے یہاں جس بیٹے کی ولادت ہوئی تھی، اب مدینہ میں قیام کے دوران ان کا یہ لختِ جگر جب چھ سال کا تھا......ایک روز اپنے گھر کے سامنے کھیل کود میں مشغول تھا کہ اس دوران اچانک کسی جانب سے ایک لڑاکا مرغا آیا اور اس بچے کی آنکھ میں چونچ ماری، جس کی وجہ سے چند دن شدید زخمی رہنے

(۱) متعدد مؤرخین کے بقول یہ واقعہ ان دونوں صاحبزادیوں کی رخصتی سے قبل پیش آیا تھا، یعنی ابولہب کے بیٹوں کے ساتھ ابھی محض نکاح ہوا تھا، رخصتی کی نوبت نہیں آئی تھی۔ واللہ اعلم۔

کے بعد یہ بچہ داغِ مفارقت دے گیا......اس کے بعد حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی کوئی اور اولاد نہیں ہوئی۔

☆حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا ہجرتِ حبشہ کے موقع پر اپنی والدہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے دوری اور جدائی کے صدمے کی وجہ سے بیمار رہنے لگی تھیں، اب اپنے اکلوتے کم سن لختِ جگر کی اس اچانک موت نے انہیں نڈھال کر ڈالا......جس پر وہ مستقل صاحبِ فراش ہو گئیں، اور پھر جلد ہی سن دو ہجری میں عین غزوۂ بدر کے روز مدینہ میں ان کا انتقال ہو گیا......تب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خاندانِ نبوت سے رشتہ منقطع ہو جانے پر انتہائی افسردہ ورنجیدہ رہنے لگے، لہٰذا آپؐ نے اپنی دوسری صاحبزادی حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت عثمانؓ بن عفان رضی اللہ عنہ سے کر دیا، اسی دوہرے شرف کی وجہ سے وہ ''ذوالنورین'' (یعنی دونوروں والا) کے لقب سے معروف ہوئے۔(۱)

☆سن پانچ ہجری میں غزوۂ خندق کے بعد جب آپ ﷺ اپنے رب کی طرف سے غیبی اشارہ ملنے پر(۲) اگلے ہی سال یعنی سن چھ ہجری میں عمرے کی ادائیگی کی غرض سے مکہ کی جانب عازمِ سفر ہوئے، اس موقع پر آپؐ جب مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر ''حدیبیہ'' نامی مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مشرکینِ مکہ تو قتل وخونریزی اور فتنہ وفساد پر آمادہ ہیں، جس پر آپؐ نے ان کے ساتھ گفت وشنید کی غرض سے بطورِ سفیر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو روانہ

(۱) حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا کی وفات سن دو ہجری میں ہوئی، اس کے بعد سن تین ہجری میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا نکاح حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا سے ہوا، اور پھر سن ۹ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کی غزوۂ تبوک سے مدینہ واپسی کے فوری بعد حضرت ام کلثوم رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا، جبکہ اس سے محض ایک سال قبل یعنی سن آٹھ ہجری میں آپؐ کی بڑی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔

(۲) تفصیل کیلئے اس آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو ﴿لَقَد صَدَقَ اللّٰهُ رَسُولَهُ الرُّؤيَا بِالحَق﴾ سورۃ الفتح[۲۷]۔

فرمایا، حضرت عثمانؓ جب وہاں پہنچے تو ان لوگوں نے انہیں اپنے پاس روک لیا اور یہ خبر مشہور کر دی کہ ہم نے عثمان کو قتل کر ڈالا ہے...... تب رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''عثمان کے خون کا بدلہ لینا فرض ہے'' اور پھر اس موقع پر آپؐ نے اپنے تمام ساتھیوں سے جاں نثاری وسرفروشی کی وہ تاریخی بیعت لی، جسے ''بیعتِ رضوان'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے(۱) اس موقع پر آپؐ نے اپنا ہی ایک ہاتھ اپنے دوسرے ہاتھ پر رکھتے ہوئے ارشاد فرمایا ''یہ بیعت عثمان کی طرف سے ہے'' یقیناً اس سے رسول اللہ ﷺ کے نزدیک حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی اہمیت اور قدر ومنزلت واضح وثابت ہوتی ہے۔

جبکہ اُدھر شہر مکہ میں ان مشرکین نے حضرت عثمانؓ کو پیشکش کرتے ہوئے کہا ''آپ جب عرصۂ دراز کے بعد مکہ پہنچ ہی گئے ہیں، تو اب آپ بیت اللہ کا طواف تو کر لیجئے''

ان کی طرف سے اس پیشکش کے جواب میں حضرت عثمانؓ نے فرمایا: مَا كُنتُ لأفعَل ، حَتّىٰ يَطُوفَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ ۔ یعنی ''جب تک خود رسول اللہ ﷺ بیت اللہ کا طواف نہیں کر لیں گے اُس وقت تک میں بھی نہیں کروں گا''۔

یقیناً اس سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کیلئے موجزن بے مثال قلبی تعلق اور والہانہ عقیدت ومحبت کا اظہار ہوتا ہے۔

☆ دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے ہی رسول اللہ ﷺ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ سے ''وحی'' نیز دیگر ضروری اور خاص راز کی باتیں تحریر کروایا کرتے تھے، اور پھر اس

(۱) تفصیل کیلئے اس آیت کی تفسیر ملاحظہ ہو ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤمِنِينَ اِذْ يُبَايِعُونَكَ تَحتَ الشَّجَرَةِ ......﴾ سورۃ الفتح [۱۸]

کے بعد بھی طویل عرصہ تک حضرت عثمانؓ ہی ''کتابتِ وحی'' کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے۔ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرمایا کرتی تھیں ''مجھے وہ منظر اب بھی بخوبی یاد ہے کہ رسول اللہ ﷺ عثمان کو اپنے قریب بٹھا کر ان سے ''وحی'' لکھوایا کرتے تھے......''اس کے بعد مزید فرمایا کرتی تھیں: فَوَاللّٰهِ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيُنزِلَ عَبداً مِن نَبِيِّهٖ تِلكَ المَنزِلَةَ اِلّا كَانَ عَلَيهِ كَرِيماً ۔ یعنی ''اللہ کی طرف سے یقیناً اپنے کسی ایسے بندے کو ہی اپنے نبی کا اس قدر خاص قرب عطاء کیا جاسکتا ہے کہ جو اللہ کے نزدیک اس قابل ہو......''۔

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی چند نمایاں خصوصیات:

☆......خشیتِ الٰہیہ:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے مزاج پر خشیتِ الٰہیہ کا غلبہ رہتا تھا، رقت طاری رہتی تھی، اکثر وبیشتر آبدیدہ رہا کرتے تھے، موت' قبر' اور فکرِ آخرت کا جذبہ غالب رہتا، تلاوتِ قرآن کا بہت زیادہ اہتمام کیا کرتے تھے، حافظِ قرآن تھے، خوش الحان تھے، کاتبینِ وحی میں سے تھے۔

☆......تواضع اور عجز وانکسار:

چونکہ ابتداء سے ہی بہت زیادہ مالدار اور خوشحال تھے' حتیٰ کہ اسی وجہ سے ''غنی'' کہلاتے تھے، لہٰذا خادموں اور غلاموں کی بڑی تعداد ہمہ وقت موجود رہا کرتی تھی، لیکن اس کے باوجود اکثر اپنے کام کاج خود ہی کیا کرتے ، رات کو تہجد کیلئے بیدار ہوتے تو وضوء کیلئے پانی کا انتظام خود ہی کر لیا کرتے ، کسی خادم کو نہ جگاتے۔

حضرت حسن بصری رحمہ اللہ فرماتے ہیں: رَأيتُ عُثمَانَ يَقِيلُ فِي المَسجِدِ وَ هُوَ يَومَئِذٍ خَلِيفَة وَ أَثَرُ الحَصَىٰ بِجَنْبِهٖ ۔ یعنی ''میں نے عثمان (رضی اللہ عنہ) کو مسجد نبوی میں فرش پر اس کیفیت میں قیلولہ کرتے دیکھا کہ جسم پر کنکروں کے نشانات نمایاں تھے، حالانکہ وہ اس وقت خلیفہ تھے''۔

یعنی اپنے زمانۂ خلافت کے دوران سادگی وانکسار کا یہ عالم تھا کہ مسجد کے فرش پر لیٹے ہوئے دیکھا، نیز یہ کہ جسم میں کنکر چبھے جا رہے تھے......جبکہ اس وقت ایشیا اور افریقہ کے اکثر حصے پر ان کی حکمرانی تھی۔

☆......سخاوت وفیاضی:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے زمانۂ قبل از اسلام سے ہی تجارت کو اپنا مشغلہ اور ذریعۂ معاش بنایا تھا اور انتہائی امانت و دیانت کے ساتھ تجارت کیا کرتے تھے، لہٰذا کاروبار میں خوب خیر و برکت اور بہت زیادہ خوشحالی وفراوانی تھی، مکہ کے نامور تاجروں اور مالداروں میں ان کا شمار ہوتا تھا، قبولِ اسلام کے بعد ہمیشہ دینِ اسلام کی سربلندی اور مسلمانوں کی فلاح و بہبود کی خاطر نہایت سخاوت وفیاضی اور دریادلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کرتے رہے، مسلمان جب ہجرت کر کے مکہ سے مدینہ پہنچے تو وہاں پینے کے پانی کی سخت قلت اور دشواری کا سامنا کرنا پڑا، میٹھے پانی کا ایک کنواں تھا جو کسی یہودی کی ملکیت تھا، اور وہ پیسے لئے بغیر کسی کو پانی نہیں دیتا تھا، اس وقت عام طور پر مسلمانوں کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ وہ قیمت ادا کر کے پانی حاصل کر سکیں......اس پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنی جیبِ خاص سے بیس ہزار درہم نقد ادا کر کے وہ کنواں اس یہودی سے خرید لیا اور ہمیشہ کیلئے مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا۔

ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد مسجدِ نبوی کی تعمیر کا کام انجام دیا گیا تھا، رفتہ رفتہ مسلمانوں کی تعداد میں اضافے کی وجہ سے یہ مسجد نمازیوں کیلئے ناکافی ہونے لگی، جس پر رسول اللہ ﷺ نے ایک روز خطبۂ جمعہ کے موقع پر اعلان فرمایا: مَن بَنَىٰ لِلّٰهِ مَسجِداً بَنَىٰ اللّٰهُ لَـهٗ بَيتـاً فِـي الجَنَّة (۱) یعنی ''جو کوئی اللہ کیلئے مسجد تعمیر کرے گا، اللہ اس کیلئے جنت میں گھر تعمیر فرمائے گا''۔

یہ ارشادِ نبوی سنتے ہی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اپنی جیبِ خاص سے ادائیگی کر کے مسجد سے متصل بہت سے مکانات ان کے مالکوں سے خرید کر اس جگہ کو مسجد میں شامل کر دیا۔

غزوۂ تبوک کے موقع پر ملکِ عرب خشک سالی کی لپیٹ میں تھا، قحط اور افلاس کے سائے ہر طرف پھیلے ہوئے تھے، اسلامی لشکر کو اشیائے خورد و نوش کی اتنے بڑے پیمانے پر قلت کا سامنا اس سے قبل کبھی نہیں کرنا پڑا تھا، اس نازک صورتِ حال میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے غلہ و اناج سے لدے ہوئے ساڑھے نوسو اونٹ، ستر گھوڑے، نیز ایک ہزار دینار نقد پیش کئے......رسول اللہ ﷺ نے جب یہ منظر دیکھا کہ اتنی بڑی تعداد میں خوراک سے لدے ہوئے اونٹ چلے آرہے ہیں، تو آپؐ نے اپنے صحابۂ کرام سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا: ''لو......تمہارے پاس بھلائی آپہنچی''۔ اور پھر آپؐ نے یوں دعاء فرمائی: ''اے اللہ! میں عثمان سے خوش ہو گیا......تو بھی خوش ہو جا''۔

قبولِ اسلام کے بعد ہر جمعہ کے دن اللہ کی رضامندی و خوشنودی کی خاطر ایک غلام آزاد کیا کرتے تھے، چونتیس سال کی عمر میں جب مشرف باسلام ہوئے تھے، اس کے بعد سے

(۱) صحیح مسلم [۵۳۳] کتاب المساجد و مواضع الصلاۃ، باب فضل بناء المساجد والحث علیہا۔ وغیرہ۔

بیاسی سال کی عمر میں انتقال تک ،یعنی اڑتالیس سال مسلسل یہی معمول جاری رہا......
مزید یہ کہ بہت سی بیواؤں اور یتیموں کی کفالت ونگہبانی مستقل طور پر اپنے ذمے لے رکھی تھی ،غرضیکہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ دینِ اسلام کی نشرواشاعت نیز ضرورتمند مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے ہمیشہ دل کھول کراور بڑے پیمانے پر مالی تعاون کرتے رہے۔

☆......شرم وحیاء:

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ فطری طور پر ہی انتہائی شرمیلے تھے،شکل وصورت بھی بہت اچھی اور جاذبِ نظر تھی،اس پر مزید یہ کہ شرم وحیاء کے غلبے کی وجہ سے چہرے پر ہمہ وقت عجیب سی معصومیت چھائی رہتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے:(لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ وَ خُلُقُ الإِسلَامِ الحَيَاء) (۱)
ترجمہ:(ہر دین کا ایک خاص اخلاق ہوا کرتا ہے،اور دینِ اسلام کا خاص اخلاق ''حیاء'' ہے)۔

یعنی دنیا میں جتنے مذاہب ہیں ان میں سے ہر ایک کے ماننے والوں اور پیروکاروں کا کوئی خاص مزاج ہوا کرتا ہے اوران میں ایسی کوئی خاص صفت یا عادت نمایاں ہوتی ہے جوانہیں دوسرے سبھی انسانوں سے ممتاز کرتی ہے اور جسے ان کی شناخت سمجھا جاتا ہے۔

اسی طرح دینِ اسلام کا بھی ایک خاص امتیازی وصف اورایک خاص پہچان ہے،اور وہ ہے:''شرم وحیاء''۔

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد کی روشنی میں دینِ اسلام میں ''شرم وحیاء'' کی اہمیت' نیز

(۱)ابن ماجہ[۴۱۸۱]

مسلمان کیلئے اس کی ضرورت کو سمجھ لینے کے بعد اب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے بارے میں آپ ﷺ کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو: أَصْـدَقُهُـم حَيَـاءً عُثْـمَـان ۔ (۱) یعنی ''سب سے بڑھ کر سچے حیاء دار تو عثمان ہیں''۔

''حیاء'' کی اس قدر اہمیت' اور پھر حضرت عثمانؓ کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ اتنی بڑی گواہی کہ'' سب سے بڑھ کر سچے حیاء دار تو عثمان ہیں'' اس سے یقیناً حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ کی بڑی منقبت ثابت ہوتی ہے۔مزید یہ کہ آپؐ کے اس ارشاد کی رُو سے یہ بات بھی ثابت ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ کی حیاء مصنوعی اور نقلی نہیں تھی، محض دکھاوے والا معاملہ نہیں تھا...... بلکہ یہ حیاء تصنع اور بناوٹ سے پاک......فطری' سچی' اور خالص تھی......!

ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں: كَـانَ رَسُـولُ اللّـهِ ﷺ مُـضـطَـجِـعاً فِي بَيتِي كَاشِفاً عَن فَخِذَيهِ أو سَاقَيهِ ، فَاستَأذَنَ أَبُوبَكر ، فَـأَذِنَ لَـهُ ، وَهُوَ عَلَىٰ تِلكَ الحَالِ ، فَتَحَدَّثَ ، ثُمَّ استَأذَنَ عُمَرُ ، فَأَذِنَ لَهُ ، وَهُـوَ كَـذٰلِكَ ، فَتَـحَـدَّثَ ، ثُـمَّ استَـأذَنَ عُثمَانُ ، فَجَلَسَ رَسُولُ اللّهِ ﷺ وَسَـوَّىٰ ثِيَابَهُ ، فَدَخَلَ فَتَحَدَّثَ ، فَلَمَّا خَرَجَ قَالَت عَائِشَةُ : يَا رَسُولَ اللّه! دَخَـلَ أَبُـوبَكر فَلَم تَهتَشَّ لَهُ وَلَم تُبَالِ بِهٖ ، ثُمَّ دَخَلَ عُمَرُ فَلَم تَهتَشَّ لَهُ وَلَم تُبَـالِ بِـهٖ ، ثُـمَّ دَخَلَ عُثمَانُ فَجَلَستَ فَسَوَّيتَ ثِيَابَكَ؟ فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : أَلَا أَستَـحِـيْ مِـن رَجُـلٍ تَستَـحِـيْ مِـنـهُ الـمَلَائِـكَةُ ۔ (۲) ترجمہ: ''رسول اللہ ﷺ ایک روز میرے گھر میں لیٹے ہوئے تھے اس حالت میں کہ آپ کی ران سے' یا

(۱) ترمذی [۳۷۹۰] باب مناقب معاذ بن جبل...... (۲) مسلم [۲۴۰۱] باب من فضائل عثمان بن عفان۔

پنڈلی سے کپڑا کچھ ہٹا ہوا تھا۔اس دوران ابوبکر (رضی اللہ عنہ) نے اندر آنے کی اجازت چاہی۔آپؐ نے انہیں اجازت دی، جس پر وہ اندر آئے اور آپؐ کے ساتھ کچھ گفتگو کی، جبکہ اس دوران آپؐ اسی کیفیت میں رہے۔اس کے بعد عمر (رضی اللہ عنہ) نے اندر آنے کی اجازت چاہی، آپؐ نے انہیں بھی اجازت دی، جس پر وہ اندر آئے اور آپؐ کے ساتھ کچھ گفتگو کی، تب بھی آپؐ اسی کیفیت میں ہی رہے۔اس کے بعد عثمان (رضی اللہ عنہ) نے اندر آنے کی اجازت چاہی، تب آپؐ سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور اپنا لباس بھی درست کیا، تب عثمان (رضی اللہ عنہ) اندر داخل ہوئے اور کچھ گفتگو کی۔پھر جب یہ حضرات چلے گئے تو میں نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! ابوبکر (رضی اللہ عنہ) جب اندر آئے تو آپؐ نے ان کی وجہ سے کوئی خاص فکر نہیں کی (یعنی ان کی آمد پر آپ نے اپنی ہیئت یا لباس وغیرہ درست کرنا ضروری نہیں سمجھا)۔پھر عمر (رضی اللہ عنہ) اندر آئے، ان کی آمد پر بھی آپ نے کوئی خاص فکر نہیں کی۔اور پھر عثمان (رضی اللہ عنہ) اندر آئے، تب آپ سنبھل کر بیٹھ گئے اور اپنا لباس بھی درست کیا؟ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''کیا میں اس شخص سے شرم نہ کروں کہ جس سے فرشتے بھی شرماتے ہیں''۔(۱)

نیز حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شرم وحیاء کی وجہ سے کیفیت یہ تھی کہ خلوت میں بھی کبھی برہنہ ہو کر غسل نہیں کیا کرتے تھے۔

نیز یہ کہ قبولِ اسلام کے وقت جب رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی' اس کے بعد کبھی زندگی بھر اپنے اُس ہاتھ (یعنی دائیں ہاتھ) سے شرمگاہ کو نہیں چھوا......اسے

(۱) یعنی اس سے یہ بات واضح ہوئی کہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اس طرح ''شرم وحیاء'' کا پیکر تھے کہ ان کی اس شرم کی وجہ سے فرشتے بھی ان سے شرماتے تھے......اور پھر اسی لئے رسول اللہ ﷺ نے بھی ان کی آمد پر خاص اہتمام فرمایا۔

''شرم وحیاء'' کا مظہر کہا جائے......؟ یا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ عقیدت ومحبت کا اثر کہہ لیا جائے...... بہر حال کیفیت یہی تھی......!

خلافت کیلئے انتخاب:

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے قاتلانہ حملے میں زخمی ہونے کے بعد چھ حضرات کے نام تجویز کرتے ہوئے (جن میں اقرباء پروری کے شائبہ سے بچنے کیلئے اپنے بیٹے عبداللہ، نیز اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو شامل نہیں کیا تھا) یہ وصیت کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کرلیں......'' وہ چھ افراد یہ تھے:

۱۔ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ ۲۔ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔
۳۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ۔ ۴۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ۔ ۵۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ۔ ۶۔ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ۔

نیز اس موقع پر یہ تاکید بھی فرمائی کہ ان چھ حضرات میں سے کسی ایک کے انتخاب کا یہ کام زیادہ سے زیادہ تین دن کی مدت میں بہر صورت طے پا جائے، تاکہ معاملہ طول نہ پکڑنے پائے......اور یوں منافقین اور خفیہ دشمنوں کو کسی سازش کا موقع نہ مل سکے۔

چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے فوری بعد ان چھ حضرات میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنی دستبرداری کا اعلان کر دیا، البتہ اس عزم کا اظہار کیا کہ وہ اس سنگین ترین معاملے کی مسلسل خود نگرانی کرتے رہیں گے (۱) لہٰذا اب انہوں نے مسلسل ان پانچ افراد کے ساتھ ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا......تو ابتداء میں ہی

(۱) متعدد مؤرخین کے بقول حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اس کام کیلئے نگران خود حضرت عمرؓ نے مقرر فرمایا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت کی عظیم ذمہ داری قبول کرنے سے معذرت کر لی...... پھر رفتہ رفتہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے اور پھر حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ نے بھی معذرت کا اظہار کیا...... جس پر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مسلسل حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ اور حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے ملاقاتیں کرتے رہے، لیکن ان دونوں حضرات کی جانب سے کوئی واضح جواب نہ مل سکا...... حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے مقرر کردہ تین دن کی مہلت تیزی کے ساتھ اختتام پذیر ہو رہی تھی...... تب آخر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے مہاجرین وانصار میں سے اکابر صحابہ کا رجحان معلوم کرنے کی غرض سے بار باران کی جانب رجوع کیا، تب اکثریت کا رجحان حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی جانب نظر آیا، جس پر آخر یکم محرم سن ۲۴ ہجری مسجد نبوی میں نماز کے وقت جب تمام اکابرِ صحابہ جمع تھے، حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نیز حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، تب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے معاملے کی نزاکت کی جانب توجہ دلاتے ہوئے مسلمانوں کیلئے جلد از جلد کسی خلیفہ کے انتخاب کی ضرورت واہمیت کے بارے میں مختصر تقریر کی، اس بارے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اس تاکیدی وصیت کا حوالہ بھی دیا کہ ''یہ اہم ترین معاملہ فقط تین دن کی مدت کے اندر طے پا جانا چاہئے''۔ اور پھر اس سلسلے میں اپنی بھرپور کوشش اور جدوجہد کا' نیز اکابرِ صحابہ کے ساتھ اپنی طویل ملاقاتوں اور مسلسل مشاورت کا تذکرہ بھی کیا، اور پھر فرمایا کہ'' اس تمامتر کوشش اور تگ ودو کے نتیجے کے طور پر جو صورتِ حال سامنے آئی ہے وہ یہ کہ اکثریت کا رجحان عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کی جانب ہے......''

یہ کہنے کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے سامنے پہنچ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کی، اور پھر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، ودیگر تمام مسلمانوں نے بھی بیعت کی...... یوں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کے خلیفۂ سوم کی حیثیت سے منتخب کیا گیا۔

کارنامے اور خدمات:

(۱) توسیعِ مسجدِ نبوی:

مدینہ شہر کی آبادی میں مسلسل اضافے کی وجہ سے نمازیوں کیلئے مسجدِ نبوی ناکافی پڑنے لگی تھی، جس پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اس کی توسیع کا فیصلہ کیا۔ چنانچہ یہ کام مسلسل دس ماہ جاری رہا، اس دوران حضرت عثمانؓ اس مقدس کام کی بذاتِ خود نگرانی کرتے رہے اور شب و روز مصروف رہے، آخر اینٹ، چونے، اور پتھر کی یہ نہایت خوشنما اور مستحکم عمارت تیار ہوگئی۔

(۲) فتوحات:

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانے سے عظیم الشان فتوحات کا جو بے مثال سلسلہ چلا آرہا تھا، اب خلیفۂ سوم کے زمانے میں بھی وہی سلسلہ کافی حد تک جاری رہا، خصوصاً ابتدائی چند سالوں میں بڑے پیمانے پر فتوحات ہوئیں، اسلامی لشکر بیک وقت ایک جانب ایشیا اور دوسری جانب افریقہ میں پیش قدمی کرتا رہا، اسلامی ریاست وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی گئی، طرابلس اور مراکش فتح ہوئے، افغانستان، خراسان اور ترکستان کے بہت سے حصے اسلامی ریاست میں شامل ہوئے، آرمینیا اور آذربائیجان کی فتح کے نتیجے میں

اسلامی ریاست کی حدود قوقاز اور کوہِ قاف تک جا پہنچیں۔خلیفۂ دوم کے زمانے میں روئے زمین کی عظیم ترین قوت سلطنتِ فارس کا اگرچہ خاتمہ ہو چکا تھا، البتہ وہاں کا مفرور فرمانروا ''یزدگرد'' اب بھی مسلسل اِدھر اُدھر بھاگ دوڑ میں مشغول تھا، اسے جب موقع ملتا وہ مسلمانوں کے خلاف کوئی نہ کوئی کارروائی کر دیتا...... یوں وقتاً فوقتاً چھوٹی بڑی مختلف چھڑپوں کی نوبت آتی رہتی تھی، آخر اب خلیفۂ سوم کے زمانے میں ''مرو'' کے مقام پر ایک چھڑپ کے دوران وہ مارا گیا...... یوں مسلمانوں کے ہاتھوں فارس کی فتح کی اب تکمیل ہوگئی۔(۱)

(۳) بحری فوج:

فوجی خدمات کے شعبے میں سب سے اہم' نمایاں' اور یادگار اقدام بحری فوج کا قیام تھا، دراصل عظیم الشان فتوحات کے نتیجے میں اسلامی ریاست کی حدود بہت دور دراز تک پھیل چکی تھیں، اب ان کی حفاظت بھی ایک بہت بڑی ذمہ داری تھی، رومی فوج اگرچہ بہت بڑے پیمانے پر مسلمانوں کے ہاتھوں بدترین شکست سے دوچار ہو چکی تھی...... تاہم اب بھی رومیوں کو جب اور جہاں موقع ملتا وہ مسلمانوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کرتے رہتے تھے، اکثر ان کی یہ اشتعال انگیزیاں دور دراز کے علاقوں میں سمندری راستے سے ہوا کرتی تھیں۔

اس چیز کے سدِ باب کیلئے خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ''بحری فوج'' تیار کی۔ یوں تاریخِ اسلام میں پہلی بار بحری فوج کا قیام عمل میں آیا، جس کی وجہ سے اب خشکی سے نکل کر سمندر کی وسعتوں پر بھی مسلمانوں کی بالادستی قائم ہوگئی، اسی بحری فوج

(۱) ''مرو'' (بروزن: عَمرو) موجودہ ترکمانستان کا شہر ہے۔

کے ذریعے رومیوں کے خلاف کئی تاریخی اور فیصلہ کن قسم کی جنگیں سمندر کے پانیوں میں لڑی گئیں، جن کے نتیجے میں متعدد چھوٹے بڑے ساحلی شہر اور جزیرے مسلمانوں نے فتح کئے، جن میں مشہور تاریخی جزیرہ ''قُبرُص'' بھی شامل ہے۔(۱)

(۴) کتابتِ قرآن کریم:

خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی دینی خدمات میں اہم ترین اور یادگار خدمت کتابتِ قرآن کریم کیلئے مخصوص رسم الخط کی تعیین ہے۔ اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ قرآن کریم جو کہ عربی زبان میں ہے، اس کے بہت سے کلمات اس طرح تحریر کئے گئے تھے کہ انہیں ایک سے زائد طریقوں سے پڑھا جا سکتا تھا، اہلِ زبان کیلئے اس میں کوئی دشواری نہیں تھی، لیکن خلیفۂ دوم اور پھر خلیفۂ سوم کے دورِ خلافت میں اسلامی ریاست کی حدود بہت زیادہ وسعت اختیار کر گئیں، غیرعرب دنیا کا بہت وسیع رقبہ اسلامی مملکت میں شامل ہوا، جس کے ساتھ ہی وہاں کے باشندے بھی جو کہ غیرعرب تھے بہت بڑی تعداد میں مسلمان ہوتے چلے گئے، لہٰذا صورتِ حال یہ پیش آئی کہ قرآن کریم کے بہت سے کلمات جو اس طرح تحریر کئے گئے تھے کہ انہیں ایک سے زائد طریقوں سے پڑھنا ممکن تھا' اب غیرعرب چونکہ ان کلمات کے معنیٰ و مفہوم سے ناواقف تھے لہٰذا ان کلمات کی تلاوت کے بارے میں ان میں اختلاف کی نوبت آنے لگی، کوئی ایک طرح پڑھتا...... جبکہ کوئی دوسرا شخص اسی کلمے کو اپنی دانست کے مطابق دوسری طرح پڑھتا...... ظاہر ہے کہ یہ انتہائی حساس معاملہ تھا، کیونکہ یہ کسی عام کتاب کی بات نہیں تھی، بلکہ یہ تو کلام اللہ کا معاملہ تھا۔

سلطنتِ فارس کے ایک دور دراز کے علاقے ''آرمینیا''(۲) کے محاذ پر یہ معاملہ زیادہ

(۱) قبرص یعنی موجودہ Cyprus (۲) آرمینیا موجودہ ''روس'' کے قریب واقع ہے۔

شدت اختیار کر گیا۔ کیفیت یہ ہوئی کہ سپاہی دن بھر محاذِ جنگ پر دشمن کے خلاف برسرِ پیکار رہتے، اور پھر رات کو جب فرصت کے لمحات میسر آتے تو اپنے اللہ سے لَو لگاتے، دعاء ومناجات اور تلاوتِ قرآن کا سلسلہ شروع ہو جاتا......ایسے میں متعدد قرآنی کلمات کے تلفظ کے حوالے سے ان میں باہم اختلاف کی نوبت آتی......اور یہ چیز ان سبھی کیلئے ذہنی وفکری تشویش کا باعث بنتی......قرآن جو کہ اہلِ ایمان کو اتفاق واتحاد کا درس دیتا ہے...... اگر خود اسی قرآن کی تلاوت کے معاملے میں ہی اختلاف کی نوبت آنے لگے......تو سمجھ لینا چاہئے کہ معاملہ کس قدر سنگین اور فوری توجہ طلب ہوگا......

ان دنوں اُس محاذ پر اسلامی لشکر کی سپہ سالاری کے فرائض حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ انجام دے رہے تھے، انہوں نے اس صورتِ حال کی نزاکت کو محسوس کرتے ہوئے اس کے فوری تدارک کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور اسی غرض سے طویل ترین سفر کی مشقت وصعوبت برداشت کرتے ہوئے وہ مدینہ پہنچے، جہاں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اس صورتِ حال سے مطلع کرتے ہوئے اس کے فوری تدارک کا مطالبہ کیا، جس کے نتیجے میں حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کا ایک نیا نسخہ ایسے رسم الخط میں تحریر کرنے کا فیصلہ کیا جس میں وہ تمام کلمات جن کی تلاوت اور تلفظ کے وقت اختلاف کی نوبت آتی تھی ......غور وفکر کے بعد انہیں اس طرح تحریر کیا جائے کہ اس کے بعد اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہے، اور انہیں فقط اسی طرح پڑھا جا سکے جس طرح پڑھنا مقصود ہے۔

چنانچہ اس مقصد کیلئے ہنگامی طور پر اکابر صحابۂ کرام میں سے چند ایسے حضرات پر مشتمل ایک لجنہ (مجلس) تشکیل دی گئی جنہیں قرآنی علوم میں بطورِ خاص بڑی دسترس اور مہارت حاصل

تھی، اور پھر ان منتخب حضرات پر مشتمل اس مجلس کی سربراہی ونگرانی کی عظیم ترین ذمہ داری جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ثابت انصاری رضی اللہ عنہ کو سونپی' جو کہ عرصۂ دراز تک رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں ''کتابتِ وحی'' کا مقدس فریضہ انجام دیتے رہے تھے، اور جو اس سے قبل خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں ''جمعِ قرآن'' کے موقع پر تشکیل دی گئی مجلس کے سربراہ کی حیثیت سے بھی بحسن وخوبی فرائض انجام دے چکے تھے۔

مزید یہ کہ اب کتابتِ قرآن کی غرض سے مخصوص رسم الخط کی تعیین کے اس کام کی خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بذاتِ خود بھی نہایت توجہ وانہماک کے ساتھ نگرانی کرتے رہے، بالخصوص یہ کہ آپؓ خود بھی حافظِ قرآن تھے، نیز عہدِ نبوی میں عرصۂ دراز تک کتابتِ وحی کی مقدس ترین خدمت بھی انجام دیتے رہے تھے، اور یہ کہ قرآن کریم کے ساتھ آپؓ کو خاص شغف بھی تھا۔

چنانچہ انتہائی عرق ریزی اور محنتِ شاقہ کے بعد مخصوص رسم الخط متعین کیا گیا' جو کہ ہمیشہ کیلئے ''رسمِ عثمانی'' کے نام سے معروف ہوا، نیز ہمیشہ کیلئے امت کا اس بات پر اجماع منعقد ہو گیا کہ تا قیامت قرآنی کریم کا کوئی بھی نسخہ تحریر کرتے وقت اسی ''رسمِ عثمانی'' کی پابندی لازمی ہوگی۔

یوں ''رسمِ عثمانی'' کے مطابق قرآن کریم کا ایک نیا نسخہ تحریر کیا گیا، پھر اس کی متعدد نقول تیار کی گئیں، جنہیں مختلف علاقوں اور اقالیم کی جانب ارسال کیا گیا۔

تلاوتِ قرآن جیسے اہم ترین معاملے میں مسلمانوں کو اختلاف وافتراق سے بچانے اور انہیں ایک رسم الخط پر متحد ومتفق کرنے کے حوالے سے خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان

رضی اللہ عنہ کا یہ اقدام یقیناً ''کتاب اللہ'' کی بہت بڑی خدمت تھی ، جسے تا قیامت تمام امتِ مسلمہ پر عظیم احسان کے طور پر ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

''فتنہ......'' اور پھر ''شہادت'':

خلیفۂ سوم ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی انتہائی مظلومیت کی کیفیت میں شہادت کا واقعہ تاریخِ اسلام کا بہت ہی افسوسناک حادثہ اور تا قیامت تمام اہلِ ایمان کو خون کے آنسو رُلانے والا اندوہناک واقعہ ہے۔اس واقعے کو تاریخِ اسلام میں ''فتنہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد یہ اولین فتنہ تھا، جس کے نتائج واثرات اس قدر بھیانک اور دوررس تھے کہ اس ایک فتنے سے آئندہ صدیوں تک مزید کئی فتنے جنم لیتے رہے...... یہ فتنہ عرصۂ دراز تک مختلف شکلیں بدل بدل کر، اُمت کیلئے باہمی اختلاف وافتراق اور بڑے مصائب وآلام کا سبب بنتا رہا......اس فتنے کے نتیجے میں مختلف زمانوں میں مسلمانوں میں باہم خونریز اور تباہ کُن تصادم کی نوبت آتی رہی......اور اسی فتنے کے نتیجے میں ہی امتِ مسلمہ تا قیامت متعدد فرقوں اور گروہوں میں بٹ کر رہ گئی......جس کی وجہ سے امت کی وحدت پارہ پارہ ہوئی اور تقسیم در تقسیم کا لامتناہی سلسلہ چل نکلا۔

اس افسوسناک فتنے کا پس منظر انتہائی مختصر طور پر یوں بیان کیا جاسکتا ہے کہ:

☆......حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ بہت زیادہ شرمیلے، انتہائی نرم مزاج، اور حلیم وبردبار تھے، آپؓ نے جب منصبِ خلافت سنبھالا تو ابتدائی چھ سال تو اسلامی مملکت کے اطراف واکناف میں سابق خلیفہ یعنی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کی سختی کا اثر جاری رہا، جس کی وجہ سے امورِ سلطنت بدستور درست انداز میں چلتے رہے......لیکن رفتہ رفتہ

بدنیت' سازشی' اورشر پسند قسم کے لوگوں نے نئے خلیفہ کے مزاج کو سمجھ لیا، چنانچہ انہوں نے اس صبر وتحمل' نرم دلی ومہربانی' اور حلم وبردباری کا ناجائز فائدہ اٹھایا، اور یوں انہیں سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا موقع مل گیا...... بالفاظِ دیگر بہت سے بدخصلت لوگوں کو اپنے انتہائی شریف النفس اورمہربان خلیفہ کی شرافت راس نہ آئی...... جابجا خفیہ تنظیمیں قائم کرلی گئیں......اور مرورِ وقت کے ساتھ یہ فتنہ مضبوط ہوتا چلا گیا۔

☆ ......خلیفۂ دوم کے زمانے میں بہت بڑے پیمانے پر اسلامی فتوحات کے نتیجے میں حدودِ سلطنت بہت زیادہ وسعت اختیار کرچکی تھیں، رعیت میں اب بہت بڑی تعداد میں عرب وعجم ہر قسم کے لوگ شامل تھے، ان کی زبانیں مختلف تھیں، ان کا پس منظر ایک دوسرے سے جدا تھا، ماضی میں ان کا تعلق مختلف تہذیبوں اور ثقافتوں سے رہا تھا، قبولِ اسلام سے قبل ان کے سابقہ مذاہب وادیان جدا جدا تھے......اور پھر قبولِ اسلام کے بعد کیفیت بھی جدا جدا تھی......کوئی خلوصِ نیت کے ساتھ برضا ورغبت مسلمان ہوا تھا، کوئی کسی دنیاوی مصلحت کے تحت مسلمان ہوا تھا، کوئی محض ''جذبۂ انتقام'' کی بناء پر مسلمان ہوا تھا...... چنانچہ اسلامی فتوحات کے اس سیلِ رواں کو جب بزورِ طاقت روکنے کا کوئی طریقہ نظر نہ آیا تو ان شر پسندوں اور چھپے ہوئے بدخواہوں نے مکر وفریب' سازش' اور نفاق کے ذریعے دینِ اسلام کے خلاف اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کا فیصلہ کیا......اور یوں مسلمانوں کے ہاتھوں میدانِ جنگ میں اپنی گذشتہ ناکامیوں کا بدلہ اب عیاری ومکاری کے ذریعے لینے کی ٹھانی......اور یہ لوگ جگہ جگہ گھوم پھر کر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے خلاف نفرت کے شعلے بھڑکاتے رہے اور اس فتنے کو مسلسل ہوا دیتے رہے۔

☆ ......آخر سن ۳۵ ہجری میں حجِ بیت اللہ کے موقع پر دور دراز کے علاقوں سے یہی شر پسند

لوگ حاجیوں کے روپ میں بہت بڑی تعداد میں حجاز کی جانب روانہ ہوگئے، اس دوران مدینہ کے قریب پہنچنے پر مکہ کی جانب اپنا سفر جاری رکھنے کی بجائے مدینہ کے مضافات میں ہی انہوں نے اپنے خفیہ ٹھکانے بنا لئے۔

اُس موقع پر مدینہ کے عام باشندے بڑی تعداد میں' نیز اکابرِ صحابہ میں سے بھی اکثریت مدینہ میں موجود نہیں تھی، یہ حضرات حجِ بیت اللہ کی غرض سے مکہ گئے ہوئے تھے اور مدینہ شہر تقریباً خالی تھا، جبکہ تمام اسلامی لشکر دور دراز کے ممالک میں مختلف محاذوں پر دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار تھا، خود مدینہ شہر میں (جو اس وقت اولین اسلامی ریاست کا دارالحکومت تھا) کوئی اسلامی فوج موجود نہیں تھی...... کیونکہ وہاں کے تمام باشندے باہم شیر وشکر تھے، وہاں مکمل امن امان اور سکون واطمینان کی فضاء تھی، وہاں کبھی کسی فوج کی ضرورت محسوس ہی نہیں کی گئی تھی...... ایسے میں دور دراز کے علاقوں سے اتنی بڑی تعداد میں یہ فسادی اور شر پسند عناصر حجاجِ بیت اللہ کے بھیس میں اپنے مذموم مقاصد کی تکمیل کی غرض سے وہاں آدھمکے ...... لہٰذا تعداد کے لحاظ سے یہ شر پسند شاید اُس وقت خود مدینہ میں موجود اصل باشندوں سے بھی زیادہ تھے، اس نادر موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے خلیفۂ وقت نیز دیگر مسلمانوں کی حجِ بیت اللہ کے بعد مکہ سے مدینہ واپسی سے قبل ہی وہاں اپنے قدم جما لئے اور اپنی پوزیشن مستحکم کر لی، نیز خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کر لیا جو اِن کی شہادت تک (چالیس روز) مسلسل جاری رہا، اشیائے خورد ونوش کی رسد بند کر دی گئی، بئر رومہ نامی مشہور کنواں جو ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد جب وہاں مسلمانوں کو پینے کے پانی کی شدید قلت کا سامنا تھا، تب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی جیبِ خاص سے نقد بیس ہزار درہم ادا کر کے وہ کنواں ایک یہودی سے خرید

کر مسلمانوں کیلئے وقف کر دیا تھا، اور تب ہی سے (یعنی تقریباً گذشتہ پینتیس سال سے) تمام اہلِ مدینہ مسلسل اسی کنویں سے (بالکل مفت) پانی پی رہے تھے، لیکن اب ان فسادیوں کی آمد کے بعد اسی کنویں کے پانی سے حضرت عثمانؓ اور ان کے اہلِ خانہ کو محروم کر دیا گیا...... یوں اس ظالمانہ محاصرے کے دوران مظلوم خلیفۂ وقت اور ان کے اہلِ خانہ کے شب و روز نہایت عسرت و مشقت کی کیفیت میں بسر ہونے لگے۔

اس دوران کبارِ صحابہ میں سے متعدد حضرات نے بار بار پیشکش کی کہ ''ہم آپ کو کسی طرح خفیہ طور پر یہاں سے نکال لے جائیں......مکہ...... یا کسی اور محفوظ مقام پر پہنچا دیں''۔ لیکن ہر بار حضرت عثمانؓ نے یہی جواب دیا کہ ''میں جوارِ رسول ﷺ نیز ''دارالہجرۃ'' کو چھوڑ کسی اور جگہ ہرگز نہیں جاؤں گا......''

اور جب متعدد کبارِ صحابہ نے بار بار ان فسادیوں اور باغیوں کو بزورِ طاقت وہاں سے رفع دفع کرنے کی اجازت چاہی......تب ہر بار حضرت عثمانؓ نے یہ کہتے ہوئے اجازت دینے سے انکار کیا کہ ''مجھے یہ بات ہرگز گوارا نہیں کہ محض میری جان بچانے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی مسجد کے پڑوس میں خونریزی کا کوئی سلسلہ ہو''۔

☆......دراصل حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا مکمل یقین تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت پہلے سے ہی ایک عہد و پیمان کر رکھا تھا......جس پر وہ سختی کے ساتھ تادمِ زیست قائم رہنا چاہتے تھے......اس بارے میں چند احادیث ملاحظہ ہوں:

☆......عَن أَنَسٍ رَضِيَ اللّٰهُ عَنه: (أَنَّ النَّبِيَّ ﷺ صَعِدَ أُحُداً ، فَتَبِعَهُ أَبُوبَكرٍ وَ عُمَرُ وَعُثمَانُ ، فَرَجَفَ بِهِم ، فَضَرَبَهُ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ بِرِجلِهِ

وَ قَالَ: اُثبُت أُحُد ، فَمَا عَلَيكَ اِلّا نَبِيٌّ وَصِدِّيقٌ وَشَهِيدَانِ)(۱)

ترجمہ: حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ اُحد پہاڑ پر چڑھے، اور پھر آپؐ کے پیچھے ابوبکرؓ عمرؓ اور عثمان (رضی اللہ عنہم) بھی وہاں پہنچ گئے، اُس وقت اُحد پہاڑ کچھ لرزنے لگا......تب آپؐ نے اس پر اپنا پاؤں مارتے ہوئے فرمایا: "اے اُحد ٹھہر جاؤ، کیونکہ اس وقت تم پر ایک نبی، ایک صدیق، اور دو شہید موجود ہیں"

☆......عَن أَبِي مُوسَىٰ الأَشعَرِي رَضِيَ اللّهُ عَنه: (كُنتُ مَعَ النَّبِيّ ﷺ فِي حَائِطٍ مِن حِيطَانِ المَدِينَةِ ، فَجَاءَ رَجُلٌ فَاستَفتَحَ ، فَقَالَ النَّبِيّ ﷺ : اِفتَح لَهُ وَبَشِّرهُ بَالجَنَّةِ ، فَفَتَحتُ لَهُ ، فَاِذَا هُوَ أَبُوبَكرٍ ، فَبَشَّرتُهُ بِمَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ ، فَحَمِدَ اللّهَ ، ثُمَّ جَاءَ رَجُلٌ فَاستَفتَحَ ، فَقَالَ النَّبِيّ ﷺ : اِفتَح لَهُ وَبَشِّرهُ بَالجَنَّةِ ، فَفَتَحتُ لَهُ ، فَاِذَا هُوَ عُمَرُ ، فَبَشَّرتُهُ بِمَا قَالَ النَّبِيُّ ﷺ ، فَحَمِدَ اللّهَ ، ثُمَّ جَاءَ رَجُلٌ فَاستَفتَحَ ، فَقَالَ لِي : اِفتَح لَهُ وَبَشِّرهُ بَالجَنَّةِ عَلَىٰ بَلوَىٰ تُصِيبُهُ ، فَاِذَا عُثمَانُ ، فَأَخبَرتُهُ بِمَا قَالَ رَسُولُ اللّهِ ﷺ ، فَحَمِدَ اللّهَ ، ثُمَّ قَال : اَللّهُ المُستَعَانُ)(۲)

ترجمہ: حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ "ایک بار رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ جب میں مدینہ کے باغوں میں سے کسی باغ میں موجود تھا، تب کسی شخص نے وہاں آکر دروازہ بجایا(۳) اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "اس کیلئے دروازہ کھول دو، نیز اسے جنت کی خوشخبری بھی سنا دو" میں نے دروازہ کھول دیا، وہ ابوبکر تھے، میں نے انہیں

(۱) ابوداؤد[۴۶۵۱] ترمذی[۳۶۹۷] ابن حبان[۶۸۶۵] وغیرہ۔

(۲) بخاری[۳۶۹۳] باب مناقب عثمان بن عفان۔ نیز مسلم[۲۴۰۳]

(۳) یعنی اندر آنے کیلئے اجازت طلب کرنے کی غرض سے دروازے پر دستک دی۔

رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ خوشخبری سنائی، جس پر انہوں نے اللہ کی تعریف بیان کی (یعنی اللہ کا شکر ادا کیا)۔

کچھ دیر بعد پھر کسی شخص نے وہاں آ کر دروازہ بجایا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کیلئے دروازہ کھول دو، نیز اسے جنت کی خوشخبری بھی سنادو'' میں نے دروازہ کھول دیا، وہ عمر تھے، میں نے انہیں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ خوشخبری سنائی، جس پر انہوں نے اللہ کی تعریف بیان کی (یعنی اللہ کا شکر ادا کیا)۔

کچھ دیر بعد پھر کسی شخص نے وہاں آ کر دروازہ بجایا، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس کیلئے دروازہ کھول دو، نیز اسے جنت کی خوشخبری بھی سنادو......ایک آزمائش سے گذرنے کے بعد'' میں نے دروازہ کھول دیا، وہ عثمان تھے، میں نے انہیں رسول اللہ ﷺ کے ارشاد کے مطابق وہ خوشخبری سنائی، نیز یہ بات بھی بتائی کہ جنت کی خوشخبری تو ہے، لیکن ایک آزمائش سے گذرنے کے بعد......جس پر انہوں نے اللہ کی تعریف بیان کی، نیز یہ بھی کہا ''اللہ مددگار رہے''۔

امام یحییٰ بن شرف النووی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: (وَفِيهِ فَضِيلَةُ هؤلَاءِ الثَّلَاثَةِ ...... وَأَنَهُم مِن أَهلِ الجَنَّةِ ...... وَيَستَمِرُّونَ عَلَىٰ الاِيمَانِ وَالهُدَىٰ......) (۱)
یعنی ''اس حدیث سے ان تینوں حضرات [ابوبکر وعمر وعثمان رضی اللہ عنہم اجمعین) کی فضیلت ثابت ہوتی ہے...... نیز یہ کہ یہ تینوں اہلِ جنت میں سے ہیں......اور یہ کہ ایمان اور ہدایت پر تادمِ زیست ثابت قدم رہیں گے''۔

(۱) المنہاج فی شرح صحیح مسلم بن الحجاج (المعروف ''صحیح مسلم بشرح النووی'') جلد: ۱۵۔ صفحہ: ۲۴۳۔ شرح حدیث: ۲۴۰۳۔ کتاب فضائل الصحابہ، باب من فضائل عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

اسی طرح اس حدیث سے رسول اللہ ﷺ کا یہ معجزہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ آپؐ نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ پیش آنے والے اس ''بلویٰ'' یعنی آزمائش کی پیشگی خبر دے دی۔

نیز اس حدیث سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے ہر ارشاد پر، خصوصاً اس ارشاد پر مضبوط اور اٹل ایمان اور تصدیق کا اظہار بھی ہوتا ہے کہ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے اپنے بارے میں اس آزمائش کا تذکرہ سننے کے بعد اللہ سے اس آزمائش کے ٹلنے کی دعاء نہیں کی...... بلکہ اس موقع پر اپنے لئے اللہ سے مدد و استعانت اور صبر و ثبات کی دعاء مانگی......جیسا کہ اس موقع پر ان کی طرف سے اَللّٰہُ المُستَعَان (یعنی اللہ ہی مددگار ہے) کہنے کے علاوہ متعدد روایات میں اَللّٰھُمَّ صَبراً کے الفاظ بھی وارد ہوئے ہیں(۱) یعنی ''یا اللہ تو مجھے اُس آزمائش کے موقع پر صبر و ثبات عطاء فرمانا''۔

مقصد یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے جب اس آزمائش کی خبر دی ہے تو یہ خبر یقیناً درست ہے...... لہٰذا اسے ٹالنے کی فکر یا دعاء کی بجائے اللہ سے اپنے لئے صبر و برداشت، عزیمت واستقامت، اور ہمت وحوصلے کی دعاء مانگی۔

☆...... ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک بار عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: یَا عُثمَان ، لَعَلَّ اللّٰہَ یُقَمِّصُكَ قَمِیصاً ، فَإِن أَرَادَكَ المُنَافِقُونَ عَلیٰ خَلعِہٖ فَلَاتَخلَعهُ لَهُم حَتَّیٰ تَلقَانِي (۲) یعنی ''اے عثمان! اللہ آپ کو ایک خلعت پہنائے گا، تب منافقین

(۱) ابن حبان [۶۹۱۲]

(۲) صحیح دلائل النبوۃ [۵۰۲] نیز: ترمذی [۳۷۰۵] باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔

آپ سے اس خلعت کو اتار دینے کا مطالبہ کریں گے، لیکن آپ اسے مت اتاریئے گا...... تاوقتیکہ آپ [اسے پہنے ہوئے ہی] مجھ سے آملیں''۔

رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد میں ''خلعت'' (لباس) سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے ''خلافت'' مراد لی تھی، لہٰذا باغی ان سے خلافت سے دستبرداری کا جو مسلسل مطالبہ کررہے تھے، اس کے جواب میں وہ رسول اللہ ﷺ کے اسی ارشاد بلکہ اس تاکید پر مضبوطی سے عمل پیرا تھے......یعنی کسی صورت اس ''خلعت'' کو نہیں اتارنا (یعنی خلافت دستبردار نہیں ہونا) کہ جو اللہ نے پہنائی ہے......اور یہ کہ اس دستبرداری کا مطالبہ کرنے والے لوگ برحق نہیں......بلکہ محض منافقین ہیں......!

☆...... عَن ابنِ عُمَرَ : ذَکَرَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِتنَةً ، فَقَالَ : یُقتَلُ فِیهَا هٰذَا مَظلُوماً ، لِعُثمَان ۔ (۱)

ترجمہ: ''حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک بار رسول اللہ ﷺ نے ایک فتنے کا تذکرہ فرمایا، تب آپؐ نے عثمان (رضی اللہ عنہ) کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا: یہ شخص اسی فتنے کے موقع پر مظلومیت کی حالت میں قتل کردیا جائے گا''۔

☆...... عَن مُرَّة بن کعب : سَمِعتُ رَسُولَ اللّٰه ﷺ یَذکُرُ فِتنَةً یَقرُبُها ، فَمَرَّ رَجُلٌ مُقَنَّعٌ بِثَوبٍ ، فَقَالَ : هٰذَا یومَئِذٍ عَلَیٰ الهُدَیٰ ، فَقُمتُ اِلَیهِ ، فَاِذَا هُوَ عُثمَانُ بن عَفَّان ، فَأَقبَلتُ اِلَیهِ بِوَجهِي ، فَقُلتُ : هٰذَا؟ قَالَ: نَعَم ۔(۲)

ترجمہ: ''حضرت مُرّہ بن کعب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک بار میں نے رسول اللہ ﷺ کو ایک ایسے فتنے کا تذکرہ کرتے ہوئے سنا جو جلد ہی ظاہر ہونے والا تھا، اسی دوران

(۱) ترمذی [۳۷۰۸] باب مناقب عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ۔ (۲) ترمذی [۳۷۰۴]

ایک شخص وہاں سے گذرا جس نے کپڑے سے سے اپنا منہ ڈھانپ رکھا تھا، آپؐ نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا''اُس فتنے کے موقع پر یہ شخص ہدایت پر ہوگا''۔تب میں اٹھ کر اس شخص کے قریب پہنچا، میں نے دیکھا کہ وہ تو عثمان بن عفان ہیں، اس پر میں نے آپؐ سے دریافت کیا''یہی شخص؟'' آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا''ہاں ......یہی شخص''۔

غرضیکہ اس فتنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کے یہ تمام ارشادات اور اس موقع پر آپؐ کی طرف سے ہدایات وتنبیہات ...... یہ سب کچھ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے پیشِ نظر تھا، اسی وجہ سے وہ مکمل مطمئن تھے اور صبر وثبات' نیز مکمل عزیمت واستقامت کے ساتھ ان تمامتر مشکلات کا مقابلہ کر رہے تھے، اور اس دوران اکابر صحابہ میں سے جب بھی جس کسی نے بھی کسی بھی شکل میں تعاون کی پیشکش کی' تو آپؓ نے ہمیشہ یہی جواب دیا کہ''میں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ایک عہد و پیمان کر رکھا ہے......میں اسی پر قائم ہوں''۔

ایک روز حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کے دروازے پر موجود مدینہ کے عام مسلمانوں اور ان باغیوں کے درمیان جھڑپ کی نوبت آئی جس کے نتیجے میں فریقین کے متعدد افراد زخمی ہوگئے، تب مدینہ کے باشندے (جن کی تعداد سات سو سے زائد تھی، جن میں متعدد اکابر صحابہ کرام بھی شامل تھے) حضرت عثمانؓ کے گھر کے سامنے جمع ہوئے اور ان سے باغیوں کے خلاف مدافعت کی اجازت چاہی ......لیکن حسبِ سابق اس بار بھی حضرت عثمانؓ نے انکار کیا، اور انہیں سمجھا بجھا کر...... بلکہ خوب اصرار کر کے......واپس روانہ کر دیا۔

اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا، حالات مزید بگڑتے چلے گئے......محاصرہ طول پکڑتا گیا،

فاقے بڑھتے گئے......آخرمسلسل فاقوں کے دوران ایک روز حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا، دن بھر عبادت وتلاوتِ قرآن میں مشغول رہے، جب شام ہوئی تو افطار کیلئے پانی تک میسر نہ آسکا، اسی کیفیت میں تمام رات گذر گئی، دوسری صبح ان کی اہلیہ نائلہ ایک پڑوسن سے خفیہ طور پر کچھ پانی مانگ کر لائیں، اور اپنے شوہر کو پیش کیا، جبکہ طلوعِ صبح سے قبل ہی حضرت عثمانؓ بغیر کچھ کھائے پیئے ہی دوبارہ روزے کی نیت کر چکے تھے......، نمازِ فجر کے بعد قرآن کریم کی تلاوت میں مشغول ہوگئے، اس دوران کچھ دیر کیلئے آنکھ لگ گئی تو خواب میں دیکھا کہ رسول اللہ ﷺ نیز حضرات ابوبکر وعمر رضی اللہ عنہما کسی باغ میں تشریف فرما ہیں، اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے یوں فرما رہے ہیں ''عثمان! آج شام تم روزہ ہمارے ساتھ افطار کرو گے......''

نیند سے بیدار ہوتے ہی صاف ستھرا نفیس لباس زیب تن کیا، اور عبادت میں مشغول ہوگئے، دن بھر یہی کیفیت رہی......نیز اس روز اللہ کی رضامندی وخوشنودی کی خاطر بیس غلام بھی آزاد کئے۔

اتفاق سے اسی روز مدینہ میں یہ خبر گردش کرنے لگی کہ ان باغیوں کی سرکوبی کی غرض سے اسلامی ریاست کے دور دراز کے بعض علاقوں سے متعدد لشکر مدینہ کی جانب رواں دواں ہو چکے ہیں......اس خبر کی وجہ سے باغیوں نے اپنی مذموم کارروائیاں تیز کرنے کی ٹھانی۔

مزید یہ کہ اس موقع پر مدینہ شہر میں موجود کبارِ صحابۂ کرام میں سے متعدد حضرات نے اپنے نوجوان بیٹوں کو حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کی حفاظت پر مأمور کر رکھا تھا، تاکہ ان باغیوں میں سے کوئی کسی صورت اندر داخل نہ ہو سکے، ان نوجوانوں میں بالخصوص حسن بن علی بن ابی طالب، حسین بن علی بن ابی طالب، عبداللہ بن عمر بن

الخطاب، نیز عبداللہ بن زبیر بن العوام (رضی اللہ عنہم اجمعین) پیش پیش تھے (۱)

اسی صورتِ حال میں وہ دن گذرتا رہا، سورج حسبِ معمول اپنا سفر طے کرتے ہوئے اپنی منزل کی جانب بڑھتا رہا، آخر سورج ڈھلنے لگا...... پھر عصر کا وقت ہوا...... اور پھر جب افطار کا وقت بھی قریب آنے لگا...... تو نہ جانے کہاں سے کسی باغی کا چلایا ہوا تیر فضاء میں اُڑتا ہوا آیا...... اور حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے دروازے پر حفاظت کی غرض سے موجود نوجوانوں میں سے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کو آ لگا، جس پر وہ زخمی ہو گئے اور خون بہنے لگا...... یہ منظر دیکھ کر باغی گھبرا گئے اور باہم یوں سرگوشیاں کرنے لگے کہ حسن (رضی اللہ عنہ) زخمی ہو چکے ہیں، نواسۂ رسولؐ ہونے کی وجہ سے ان کی خاص قدر و منزلت ہے، نیز ان کے خاندان بنو ہاشم کا بھی بہت زیادہ اثر و رسوخ ہے...... لہٰذا ان کا زخمی ہو جانا ہمارے لئے خطرے کی گھنٹی ہے...... عین ممکن ہے کہ مدینہ کے سبھی باشندے اب مشتعل ہو جائیں، اور ہمارے خلاف کوئی بڑا فیصلہ کن اقدام کریں، لہٰذا اب مزید تاخیر ہمارے حق میں بہتر نہیں ہوگی، جو کرنا ہے صورتِ حال بگڑنے سے قبل...... بس ابھی فوری طور پر کر لیا جائے۔

اس باہمی مشاورت کے بعد فوری طور پر کچھ باغی عقبی راستے سے خفیہ طور پر حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر سے متصل ابوحزم انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں داخل ہوئے، اور پھر وہاں سے دیوار پھلانگتے ہوئے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کی چھت پر جا پہنچے...... اور پھر وہاں سے گھر کے اندرونی حصے میں اتر گئے...... باہر کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکی، مہاجرین و انصار میں سے متعدد اکابر صحابۂ کرام کے نوجوان بیٹے بدستور وہاں دروازے پر پہرہ دیتے رہے...... لیکن اندر کی صورتِ حال کسی کے وہم و گمان میں بھی

(۱) البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد: ۱۰، صفحہ ۲۹۸۔ تحقیق الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی۔ دار ہجر للطباعۃ والنشر۔

نہیں تھی۔

اُدھر عقبی راستے اور پھر چھت سے ہوتے ہوئے باغی آخر جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ کے گھر کے اندرونی حصے میں پہنچے تو سیدھے اُس مقام کی جانب گئے جہاں حضرت عثمانؓ بیٹھے ہوئے انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ تلاوتِ قرآن میں مشغول تھے......تب ایک سنگدل باغی نے آگے بڑھ کر پوری قوت سے لوہے کی سلاخ پیشانی پر دے ماری......

عجب اتفاق کہ اُس وقت آپ رضی اللہ عنہ یہ آیت تلاوت کررہے تھے ﴿فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللّٰهُ وَهُوَ السَّمِيعُ العَلِيمُ صِبغَةَ اللّٰهِ وَ مَن أَحسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبغَةً وَنَحنُ لَهُ عَابِدُونَ﴾ (۱) یعنی (اللہ عنقریب ان سے آپ کو کافی ہوجائے گا، اور وہ خوب سننے اور جاننے والا ہے، اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا، ہم تو اسی کی عبادت کرنے والے ہیں)

اس آیت کی تلاوت کے ساتھ ہی پیشانی پر جب اس آہنی سلاخ کی ضرب لگی......تو خون بہنے لگا......تب اس بہتے ہوئے خون کے کچھ چھینٹے قرآن کریم کے اس نسخے میں اس آیت پر بھی جا گرے (یعنی: اللہ کا رنگ اختیار کرو، اور اللہ سے اچھا رنگ کس کا ہوگا) (۲)

اس کے بعد ایک اور بدبخت نے آگے بڑھ کر تلوار سے وار کیا، جسے آپؓ نے اپنے ہاتھ پر روکنے کوشش کی، جس پر آپؓ کا ہاتھ کٹ کر بازو سے جدا ہوگیا، تب آپؓ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ''یہ وہی ہاتھ ہے جس نے سب سے پہلے قرآن لکھا تھا'' (۳)

(۱) البقرۃ [۱۳۷-۱۳۸]

(۲) البدایۃ والنہایۃ جلد۱۰، صفحہ: ۳۱۰، نیز: طبقات ابن سعد [۳/۷۴]، نیز: تاریخ دمشق [۴۱۹-۴۲۰]
نیز: تاریخ الطبری [۴/ ۳۳۵-۳۵۶-۳۷۳-۳۷۷]

(۳) یعنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ''کاتبینِ وحی'' میں سے تھے (باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر ملاحظہ ہو)

باغی نے دوبارہ وار کیا، اس بار آپؓ کی اہلیہ نائلہ نے آگے بڑھ کر اپنے ہاتھ پر اس وار کو روکنا چاہا......جس پر ان کے ہاتھ کی انگلیاں کٹ کر دور جاگریں، اس کے بعد ایک باغی نے آپؓ پر تلوار سے پے در پے کئی وار کیے۔

یوں چالیس روز تک مسلسل جاری رہنے والے اس ظالمانہ ومجرمانہ محاصرے کے بعد بالآخر ۱۸/ ذوالحجہ سن ۳۵ ہجری، جمعہ کی شام مغرب سے کچھ قبل (جب افطار کا وقت قریب تھا) خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے انتہائی مظلومیت و بے بسی کی کیفیت میں، بیاسی سال کی عمر میں، اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے۔

باغی جس طرح خفیہ طریقے سے اندر آئے تھے' اُسی طرح اس مجرمانہ کارروائی کے بعد نہایت سرعت کے ساتھ خفیہ طریقے سے غائب ہو گئے...... باہر کسی کو کچھ خبر ہی نہ ہوسکی...... کچھ دیر بعد جب ان کی زخمی اہلیہ نائلہ کے ہوش وحواس قدرے بحال ہوئے تو انہوں نے چیخنا چلانا شروع کیا......تب سبھی لوگ دوڑے ہوئے وہاں پہنچے اور انتہائی المناک اور دلخراش منظر دیکھ کر دم بخود رہ گئے......

بہر حال......جو ہونا تھا وہ ہو چکا......جُبیر بن مطعم رضی اللہ عنہ نے نمازِ جنازہ پڑھائی، اور پھر......تحمل و برداشت...... غیرت وحیاء......اور عصمت وشرافت......کے اس پیکر کو غسل دیئے بغیر......انہی خون آلود کپڑوں میں ہی رات کی تاریکی میں ''بقیع'' میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

بقیہ: حاشیہ صفحہ گذشتہ:

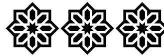
خصوصاً دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں طویل عرصہ تک یہ مقدس ترین خدمت آپؓ ہی کے ذمے تھی، چنانچہ سب سے پہلی بار کتابتِ وحی کی خدمت آپؓ نے ہی انجام دی تھی......اسی بات کی طرف اشارہ مقصود تھا کہ وہ ہاتھ جس نے سب سے پہلے کلام اللہ تحریر کیا تھا، اب وہی ہاتھ کٹا پڑا ہوا تھا......!!

یہ ہے مظلوم عثمان بن عفان (رضی اللہ عنہ) کی المناک داستان......اہلِ ایمان تا قیامت جب بھی یہ داستان پڑھیں گے......تو یقیناً یہ داستان انہیں خون کے آنسو رُلاتی رہے گی۔

خلیفۂ سوم ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ جو اتنا بڑا ظلم ہوا، اور یہ اتنا بڑا جو فتنہ پیش آیا......اس کے برے نتائج' نا قابلِ تلافی نقصانات' اور منفی اثرات آج تک مسلسل جاری وساری ہیں......یہی فتنہ مختلف اوقات میں مختلف شکلیں بدلتا ہوا آگے بڑھتا رہا اور تباہیاں پھیلاتا رہا، جس کے نتیجے کے طور پر کتنے ہی مزید فتنے پیدا ہوتے رہے، باہمی جنگوں اور خونریزیوں کی نوبت آتی رہی۔

غرضیکہ امتِ مسلمہ میں آج تک جو افتراق وانتشار رہے، نفرتوں اور تفرقہ بازیوں کا جو لامتناہی سلسلہ ہے......یہ سب اسی کا اثر ہے......اسی کا نتیجہ ہے......بلکہ اسی کا ''وبال'' ہے......!(۱)

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



(۱) مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: البدایۃ والنہایۃ، از: ابن کثیر، بتحقیق الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی، طبعۃ: دار ہجر للطباعۃ والنشر۔ جلد: ۱۰، صفحات: [۲۷۰-۳۹۸]۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۲۳/ رمضان ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲۱/ جولائی ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی' خلیفۂ چہارم امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ میں قبیلۂ قریش کے مشہور اور معزز ترین خاندان ''بنو ہاشم'' سے تھا، دوسری ہی پشت میں عبدالمطلب پر سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ کے نسب سے جا ملتا ہے، لہٰذا رسول اللہ ﷺ' نیز حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دونوں کے دادا ایک ہی تھے، یعنی ''عبدالمطلب''۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی پیدائش مکہ شہر میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے دس برس قبل ہوئی تھی۔آپؓ ابوطالب کے بیٹے تھے، جو کہ رسول اللہ ﷺ کے مشفق ومہربان چچا بھی تھے اور سرپرست بھی ، چھ سال کی عمر میں جب رسول اللہ ﷺ کی والدہ آمنہ بنت وہب کا انتقال ہوگیا تھا، تب آپؐ اپنے دادا عبدالمطلب کی کفالت میں آ گئے تھے، اور پھر دو سال بعد جب دادا کا انتقال ہوا، تب آپؐ دادا کی وصیت کے مطابق اپنے چچا ابوطالب کی کفالت میں آ گئے تھے، اُس وقت آپؐ کی عمر مبارک آٹھ سال تھی ،ابوطالب نے تا دمِ زیست آپؐ کی کفالت وحفاظت اور سرپرستی وخبر گیری کا فریضہ بحسن وخوبی انجام دیا تھا۔

ابوطالب کے چار بیٹے تھے: طالب ، عقیل ، جعفر، اور علی، جبکہ دو بیٹیاں تھیں: اُم ہانی ، اور جُمّانہ، ابوطالب کثیر العیال اور قلیل المال تھے، ان کی اس تنگدستی کی وجہ دراصل یہ تھی کہ وہ خاندان بنوہاشم کی سربراہی کے علاوہ مزید یہ کہ متولیٔ کعبہ بھی تھے، لہٰذا اُس دور کے رواج کے مطابق جو کچھ بھی انہیں میسر آتا وہ نہایت فراخدلی کے ساتھ حجاجِ بیت اللہ کی خدمت وخبر گیری اور میزبانی میں خرچ کر دیا کرتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے بچپن کے مرحلے سے نکلنے کے بعد جب شباب کی منزل میں قدم رکھا تو اپنے محسن چچا کا ہاتھ بٹانے اور معاشی بوجھ ہلکا کرنے کی غرض سے ان کے چھوٹے بیٹے ''علی'' کو اپنی کفالت میں لے لیا تھا، لہٰذا حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے گھر میں اور خود آپؐ کی نگرانی میں ہی تربیت اور نشوونما پائی تھی، اور پھر اسی تربیت کی جھلک زندگی بھر ان کی شخصیت اور سیرت وکردار میں نمایاں نظر آتی رہی......

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے فوری بعد دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام قبول کرلیا تھا جب ان کی عمر محض دس برس تھی۔ مکہ میں آپ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے بعد کمسن علیؓ ہمیشہ ہر قدم پر آپؐ کے ساتھ رہے، اور کمسنی کے باوجود جو بھی خدمت ان سے بن پڑی...... بلا تردد ہمیشہ ہر ممکن خدمت سرانجام دیتے رہے۔

یہاں تک کہ آپؐ کی بعثت کے بعد اسی طرح مشرکینِ مکہ کے نرغے میں انتہائی نامساعد و پریشان کُن حالات میں تیرہ سال گذر گئے، تب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی جانب سے ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا، ہجرت کی رات مشرکینِ مکہ نے آپؐ کے قتل کا منصوبہ بنا رکھا تھا، اور اپنے اسی ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے آپؐ کے گھر کا محاصرہ کر رکھا تھا...... اُس رات آپؐ نے حضرت علیؓ کو اپنے بستر پر سونے کی تلقین فرمائی تھی...... تاکہ آپؐ کی وہاں سے روانگی کے بعد دشمن اگر اندر جھانک کر دیکھیں تو یہ سوچ کر مطمئن رہیں کہ آپؐ اب تک اپنے گھر میں ہی موجود ہیں اور اپنے بستر پر سو رہے ہیں، لہٰذا دشمن آپؐ کا تعاقب کرنے کی بجائے بدستور اسی جگہ موجود رہیں......

حضرت علیؓ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ آج کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر سونا

گویاقتل گاہ میں سونے کے مترادف ہے......لیکن اس کے باوجود بلاچون وچرااور بلاخوف وخطر آپؐ کے حکم کی تعمیل...... یقیناً اطاعتِ رسولؐ کے حوالے سے، نیز فدائیت کے نقطۂ نگاہ سے ......حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ کا یہ بے مثال اور یادگار کارنامہ تھا......نیز حضرت علیؓ کے اس عمل میں نوجوان نسل کیلئے ہمیشہ کیلئے یہ قیمتی پیغام بھی پوشیدہ ہے کہ اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر وقت پڑنے پر کسی بھی بڑے سے بڑے خطرے کا سامنا کرنے سے گریز نہ کیا جائے۔

رسول اللہ ﷺ کے پاس مشرکینِ مکہ کی بہت سی امانتیں رکھی ہوئی تھیں، آپؐ نے ہجرت کی رات وہ تمام امانتیں حضرت علیؓ کے سپرد کرتے ہوئے یہ تاکید فرمائی کہ ’’اے علی! یہ تمام امانتیں ان کے مالکوں کے حوالے کرنے کے بعد تم مکہ سے نکلنا‘‘

چنانچہ آپؐ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت علیؓ وہ تمام امانتیں ان کے مالکوں تک پہنچانے کے بعد مکہ سے تنِ تنہا پیدل ہی مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے......اس وقت ان کی عمر بائیس سال تھی۔

مدینہ پہنچنے کے کچھ عرصے بعد آپؐ نے اپنی سب سے چھوٹی اور لاڈلی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی شادی حضرت علیؓ کے ساتھ کردی، یوں دونوں باہم رشتۂ ازدواج میں منسلک ہوگئے، آپؐ حضرت فاطمہؓ سے بہت زیادہ محبت رکھتے تھے، ایک بار آپؐ نے اپنی پیاری بیٹی کے بارے میں ارشاد فرمایا: سَيِّدَةُ نِسَاءِ أهلِ الجَنَّة (۱) یعنی ’’فاطمہ جنت میں تمام عورتوں کی سردار ہیں‘‘۔

اللہ نے ان دونوں کو دو بیٹوں حسن اور حسین، نیز دو بیٹیوں ام کلثوم اور زینب سے نوازا......

(۱) ترمذی [۳۷۸۱] باب مناقب ابی محمد الحسن بن علی بن ابی طالب والحسین بن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہما۔

رسول اللہ ﷺ اپنے ان کمسن نواسوں سے بہت زیادہ محبت کیا کرتے تھے ،ایک موقع پر آپؐ نے ان دونوں کے بارے میں ارشادفرمایاتھا: هُمَا رَيحَانَتَايَ مِنَ الدُّنيَا (۱) یعنی''اس دنیامیں یہ دونوں میرے پھول ہیں''۔

نیز آپؐ اپنے داماداور چچازادیعنی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھی ہمیشہ انتہائی شفقت وعنایت کامعاملہ فرمایاکرتے تھے،چنانچہ ایک موقع پرآپؐ نے ان کیلئے ان الفاظ میں دعاءفرمائی: اَللّٰهُمّ وَالِ مَن وَالَاهُ ، وَ عَادِ مَن عَادَاه (۲)یعنی''اے اللہ جوکوئی اس سے دوستی رکھے تو بھی اُس سے دوستی رکھ،اورجوکوئی اس سے دشمنی رکھے تو بھی اُس سے دشمنی رکھ''۔

نیز ایک بارآپؐ نے حضرت علیؓ کومخاطب کرتے ہوئے یہ ارشادفرمایا: أَنتَ أَخِي فِي الدُنيَا وَالآخِرَةِ (۳)یعنی''اے علی! آپ دنیامیں بھی اورآخرت میں بھی میرے بھائی ہیں''۔

ہمہ گیر شخصیت:

اللہ عزوجل نے اپنے اس برگزیدہ بندے یعنی علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کوگوناگوں اوصاف وکمالات سے نوازاتھا،ان کی شخصیت میں جامعیت وہمہ گیری نمایاں نظرآتی تھی،اس چیزکامختصرتذکرہ درجِ ذیل ہے:

☆......شجاعت وبہادری:

شجاعت وبہادری کے لحاظ سے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کاجائزہ لیاجائے توہم

(۱)مسندامام احمد[۸/۵۰] نیز:الأدب المفرد[۸۵] باب''الولد مبخلة ومجبنة''۔ (۲)مسندامام احمد[۲/۱۹۵]
(۳)ترمذی[۳۷۲۰]باب مناقب علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

دیکھتے ہیں کہ میدانِ کارزار میں وہ ہمیشہ پیش پیش نظر آتے رہے، رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے، ہر موقع پر حضرت علیؓ شریک رہے بلکہ پیش پیش رہے اور جرأت وشجاعت کے بے مثال کارنامے دکھاتے رہے......سوائے غزوۂ تبوک کے (سن ۹ ہجری میں) کیونکہ اُس موقع پر آپ ﷺ نے تبوک کی جانب روانگی کے وقت مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنے اہلِ بیت کی حفاظت وخبر گیری کی ذمہ داری سونپی تھی، تب حضرت علیؓ نے عرض کیا تھا کہ: يَا رَسُولَ اللّٰه، هَل تُخَلِّفنِي فِي النِّسَاءِ وَ الصِّبيَان؟ یعنی ''اے اللہ کے رسول! کیا آپ مجھے عورتوں اور بچوں میں چھوڑے جارہے ہیں؟''(۱) اس پر آپؐ نے جواب دیا: أَمَا تَرضَىٰ أن تَكُونَ مِنّي بِمَنزِلَةِ هَارُونَ مِن مُوسَىٰ؟ غَيرَ أَنَّهٗ لَا نَبِيَّ بَعدِي (۲) یعنی ''اے علی! کیا آپ کو یہ بات پسند نہیں کہ آپ کی میرے ساتھ وہی نسبت ہو جو ہارون علیہ السلام کی موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ تھی......؟ ہاں البتہ یہ کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔(۳)

(۱) یعنی اس چیز پر افسوس اور پریشانی کا اظہار کیا......کہ میں میدانِ جنگ میں مردوں کی طرح لڑنے کی بجائے یہاں مدینہ میں بس عورتوں اور بچوں کے ساتھ بیٹھا رہوں......؟؟

(۲) مسند امام احمد [۶/ ۴۳۸] نیز: صحیح بخاری، کتاب فضائل الصحابہ، باب مناقب علی بن ابی طالب۔

(۳) یعنی حضرت موسیٰ وہارون ہارون علیہما السلام دونوں بھائی تھے، اور جب اللہ کے حکم کی تعمیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس راتوں کیلئے کوہِ طور پر گئے تھے ''تورات'' حاصل کرنے کی غرض سے، تب اس موقع پر انہوں نے حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر فرمایا تھا، لہٰذا اس مثال سے رسول اللہ ﷺ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بطورِ تسلی یہ یاددہانی کرانا چاہتے تھے کہ جس طرح وہ دونوں حضرات آپس میں بھائی تھے، اسی طرح ہم بھی آپس میں (چچازاد) بھائی ہیں، نیز یہ کہ جس طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام حضرت ہارون علیہ السلام کو اپنا جانشین مقرر کر کے گئے تھے......اسی طرح اے علی میں آپ کو جانشین مقرر کر کے جارہا ہوں......لہٰذا اس میں افسردگی کی تو کوئی بات نہیں ہے، بلکہ یہ تو خوشی کی بات ہے اور بڑا اعزاز ہے......ہاں ان دونوں حضرات میں (جاری)

الغرض غزوۂ تبوک کے موقع پر خود رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ شریک نہیں ہوئے تھے......جبکہ اس کے سوا باقی ہر غزوے میں آپؓ شریک رہے، بلکہ پیش پیش رہے، اور شجاعت و جرأت کے بے مثال جوہر دکھاتے رہے۔

خصوصاً (سن سات ہجری میں) غزوۂ خیبر کے موقع پر حضرت علیؓ کا کردار ہمیشہ نا قابلِ فراموش تصور کیا جاتا رہے گا......جب اسلامی لشکر کی وہاں آمد کے موقع پر خیبر کے یہودی قلعہ بند ہوکر بیٹھ گئے تھے، محاصرہ کافی طول پکڑ چکا تھا، صورتِ حال کافی سنگین اور باعثِ تشویش تھی......اس دوران فریقین کے مابین متعدد چھوٹی بڑی جھڑپوں کی نوبت آتی رہی، تاہم کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہ ہوسکا......آخر ایک روز رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: ''لَأُعطِيَنَّ الرّايَةَ غَداً رَجُلاً يُحِبَّ اللّهَ وَ رَسُولَهُ وَ يُحُبُّهُ اللّهُ وَ رَسُولُهُ ''یعنی''کل میں جھنڈا ایسے شخص کو عطاء کروں گا جو اللہ اور رسول سے محبت کرتا ہے' اور اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں''

ظاہر ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ بہت بڑی خوشخبری تھی، اور بہت بڑی گواہی تھی اُس شخص کے بارے میں کہ جسے کل علم سونپا جانا تھا اور سپہ سالاری وقیادت کی ذمہ داری جس کے حوالے کی جانی تھی......اس کے حق میں یہ بہت بڑی گواہی تھی کہ وہ ''اللہ اور رسول ﷺ سے محبت کرتا ہے، نیز اللہ اور رسول بھی اس سے محبت کرتے ہیں''۔

چنانچہ لشکر میں موجود بڑے بڑے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے وہ رات اسی آرزو

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

اور ہم دونوں میں ایک فرق ضرور ہے، وہ یہ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح حضرت ہارون علیہ السلام کو بھی اللہ کی طرف سے نبوت عطاء کی گئی تھی، جبکہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے۔

میں گذاری کہ کاش کل صبح رسول اللہ ﷺ میرا نام پکاریں......اور جب صبح کا سورج طلوع ہوا، تو رسول اللہ ﷺ کی آواز گونجی ''أینَ عَلي ؟'' یعنی ''علی کہاں ہیں؟'' تب حضرت علی رضی اللہ عنہ حاضرِ خدمت ہوئے، رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں عَلَم (جھنڈا) عطاء فرمایا، نیز فتح اور خیر و برکت کی دعائیں دیتے ہوئے انہیں رخصت فرمایا۔

رسول اللہ ﷺ کے حکم کی تعمیل میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدمی کرنے لگے، آمنا سامنا ہوا، کافی سنسنی خیز اور اعصاب شکن قسم کی جنگ لڑی گئی۔

اس موقع پر یہودی فوج کی قیادت ''مرحب'' نامی شخص کر رہا تھا' جس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا، اور جس کی بہادری کے بڑے چرچے تھے......مزید یہ کہ وہ اُس دور کا بڑا نامی گرامی پہلوان بھی تھا۔

چنانچہ اس نے انتہائی غرور و تکبر کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو للکارا، جواب میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس پر ایسا بھرپور وار کیا کہ غرور و تکبر کا وہ پتلا...... پلک جھپکتے میں ہی زمیں بوس ہو گیا، اور پھر آخر تمام شہر ''خیبر'' مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہو گیا، اور یوں رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر سمیت کامیاب و کامران واپس مدینہ تشریف لے آئے۔

خلاصۂ کلام یہ کہ تمام غزوات کے موقع پر' بالخصوص ''غزوۂ خیبر'' کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی خدمات' جرأت و شجاعت' اور جذبۂ سرفروشی یقیناً تاریخِ اسلام کا سنہری باب ہے۔

☆......عبادت اور منبر و محراب:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ زہد و تقویٰ' تعلق مع اللہ' خشیتِ الٰہیہ' شب بیداری

وتہجد گذاری' دنیاومافیہا سے دور......الگ تھلگ......رات کے اندھیروں میں اپنے اللہ سے لَو لگانے ......اوراس کے سامنے گریہ وزاری......دعاءومناجات......اورآہ وفریاد کے حوالے سے بہت بلندترین مقام پر تھے۔

☆......دنیا سے بے رغبتی:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دنیاوی مال ودولت اورشان وشوکت سے ہمیشہ دوررہے، دنیا سے بے رغبتی ،سیدھی سادھی زندگی ،صبروقناعت، نام ونموداورشہرت سے گریز،آپؓ کے مزاج کا خاصہ تھا......چنانچہ ایک بارآپؓ مدینہ میں مسجدِ نبوی میں فرش پرہی محوِ آرام تھے......اورآپؓ کا جسم خاک آلود بھی ہورہاتھا......کہ اس دوران رسول اللہ ﷺ آپ کوتلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے،آپ ﷺ نے جب یہ منظردیکھاتوانتہائی پیار اورشفقت سے علیؓ کومخاطب کرتے ہوئے آپ ﷺ نے یوں آوازدی: قُم یَا أبَا تُرَاب......یعنی''اے مٹی والے......اُٹھو......''۔

☆......حکمت ودانش:

اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی طرف سے علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کوبے مثال حکمت ودانش اورفہم وفراست سے بہرہ مندفرمایا گیاتھا،چنانچہ آپؓ کے اقوالِ زریں اورارشادات وفرمودات طالبانِ حق کیلئے مشعلِ راہ کی حیثیت رکھتے ہیں،گویا آپؓ حکمت ودانش کا چلتا پھرتاخزانہ اوربحرِ بیکراں تھے،یہی وجہ ہے کہ آپؓ زندگی بھرحکمت ودانش کے موتی بکھیرتے رہے۔

☆......بے مثال علمی استعداد:

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی طرف سے عطاءفرمودہ بے مثال علمی استعداداورقابلیت وصلاحیت کی وجہ سے مرجعِ عام وخاص تھے،فقہائےصحابہ میں انہیں

ممتاز و منفرد مقام و مرتبہ حاصل تھا، بڑے بڑے جلیل القدر صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) مختلف دینی مسائل کے حل کیلئے ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، بالخصوص خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اپنے زمانۂ خلافت کے دوران مختلف دینی معاملات، فقہی مسائل، اور شرعی احکام کے بارے میں بکثرت ان سے مشاورت کیا کرتے تھے، اسی بارے میں ان کا یہ مقولہ مشہور ہے: لَولَا عَلِيٌّ لَهَلَكَ عُمَرُ یعنی "اگر علی نہ ہوتے تو عمر (یعنی میں خود) تو بس مارا ہی گیا تھا......"

مزید یہ کہ حضرت علیؓ کی یہ بے مثال علمی استعداد کسی خاص علم تک محدود نہیں تھی...... بلکہ وہ خالص دینی و شرعی علوم ہوں...... یا علم کا کوئی بھی شعبہ اور کوئی بھی صنف ہو...... ہر شعبے میں یہی کیفیت نظر آتی تھی، بالخصوص علم القضاء، علم الفرائض (۱) نیز عربی ادب، لغت، اور صرف و نحو کے میدان میں آپؓ کو حجت تسلیم کیا جاتا تھا، عربی لغت اور صرف و نحو کے بڑے بڑے پہنچے ہوئے ماہرین آپؓ ہی کے تلامذہ میں سے تھے۔ (۲)

ان تمامتر اوصاف و کمالات کی وجہ (توفیقِ الٰہی کے بعد) یقیناً یہی تھی کہ حضرت علیؓ نے اپنے زمانۂ بچپن سے رسول اللہ ﷺ کی وفات تک تقریباً تیس سال کا طویل عرصہ آپ ﷺ کی صحبت و معیت میں گذارا، اسی طویل اور مسلسل صحبت و معیت کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ حضرت علیؓ انتہائی بلند پایہ عالمِ دین تسلیم کئے جاتے تھے، فقہ و اجتہاد میں انہیں کامل دسترس، غیر معمولی مہارت، اور مکمل بصیرت حاصل تھی۔

اس علمی مقام و مرتبے کے ساتھ ساتھ مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت و تربیت کی بدولت آپؓ اخلاق و کردار اور اعلیٰ انسانی اقدار کے لحاظ سے بھی نہایت عمدہ و اعلیٰ شخصیت کے

(۲) "علم القضاء" یعنی قاضی (جج) کی حیثیت سے مختلف مقدمات کے عدالتی فیصلے صادر کرنا۔ جبکہ "علم الفرائض" یعنی "علمِ میراث"۔ (۲) مثلاً ابوالأسود الدؤلی...... وغیرہ......

مالک تھے۔رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپؓ کی رفاقت اور صحبت ومعیت کا یہ مبارک سلسلہ جس کی ابتداء زمانۂ طفولیت سے ہوئی تھی......آپ ﷺ کی وفات ،اور پھر تجہیز و تکفین ،حتیٰ کہ آپ ﷺ کے جسدِ اطہر کو قبر مبارک میں اتارنے کے مراحل تک یہ سلسلہ جاری وساری رہا تھا۔

خلافت کیلئے انتخاب:

رسول اللہ ﷺ تادمِ آخر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے انتہائی مسرور و مطمئن رہے اور زندگی بھر شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے رہے۔

آپ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت علیؓ کو خاص حیثیت اور قدر و منزلت حاصل رہی ،حضرت ابوبکرؓ اہم فقہی امور میں ان سے مشاورت کرتے رہے اور ان کی اصابتِ رائے پر مکمل یقین واطمینان کا اظہار کرتے رہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی اپنے دورِ خلافت میں بکثرت حضرت علیؓ سے مشاورت کیا کرتے تھے،فتحِ بیت المقدس کے یادگار اور تاریخی موقع پر جب سلطنتِ روم کی طرف سے یہ مطالبہ کیا گیا تھا کہ فریقین کے مابین ''معاہدہ'' کے موقع پر مسلمانوں کے خلیفہ خود بیت المقدس آئیں ......تب حضرت عمرؓ نے اکابر صحابۂ کرام سے اس سلسلہ میں مشورہ کیا تھا اور ان کی رائے دریافت کی تھی ،اس موقع پر بعض حضرات نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ''اے امیر المؤمنین! آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے ،تاکہ رومیوں کو یہ احساس ہو کہ ہم مسلمان ان کا ہر مطالبہ تسلیم کرنا ضروری نہیں سمجھتے ،اور یوں ان پر ہماری مزید ہیبت قائم ہو جائے۔

جبکہ حضرت علیؓ نے یہ مشورہ دیا تھا کہ ''اے امیرالمؤمنین! آپ کو وہاں جانا چاہئے، تاکہ اس طرح فریقین کے مابین خیرسگالی اور باہمی اعتماد واطمینان کے جذبات پروان چڑھ سکیں''۔

حضرت عمرؓ نے اسی رائے کو پسند کرتے ہوئے خود بیت المقدس جانے کا فیصلہ فرمایا تھا، اور مدینہ سے اپنی اس غیرموجودگی کے موقع پر حضرت علیؓ کو ہی اپنا نائب وجانشین مقرر کیا تھا۔

اور پھر حضرت عمرؓ جب قاتلانہ حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہوگئے تھے، تب اپنی شہادت سے قبل آپؓ نے اپنے جانشین کے طور پر جن چھ افراد کے نام تجویز کرتے ہوئے یہ وصیت کی تھی کہ یہی چھ افراد باہمی مشاورت کے بعد تین دن کے اندر آپس میں سے ہی کسی کو ''منصبِ خلافت'' کیلئے منتخب کرلیں......انہی چھ افراد میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔(۱)

اسی طرح خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران بھی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو بدستور یہی قدرومنزلت حاصل رہی، حضرت عثمانؓ مختلف دینی وانتظامی امور میں ہمیشہ حضرت علیؓ سے مشاورت کرتے رہے، جبکہ حضرت علیؓ بھی ہمیشہ ان کی معاونت کرتے رہے، خصوصاً باغیوں نے جب شورش برپا کی؛ اس نازک

(۱) وہ چھ افراد یہ تھے: حضرت عثمان بن عفان، حضرت علی بن ابی طالب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت طلحہ بن عبیداللہ، حضرت زبیر بن العوام۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔ اسی نسبت سے یہ حضرات بعد میں ''اصحابِ شوریٰ'' کہلائے۔ واضح ہو کہ اقرباء پروری کے شائبہ سے بچنے کی خاطر حضرت عمرؓ نے ان اصحابِ شوریٰ میں اپنے بیٹے عبداللہؓ نیز اپنے بہنوئی حضرت سعید بن زیدؓ کو شامل نہیں کیا تھا، حالانکہ حضرت سعیدؓ ''عشرہ مبشرہ'' میں سے تھے۔

ترین موقع پر حضرت علیؓ ہی بار بار مختلف تدبیروں کے ذریعے ان باغیوں کو سمجھانے بجھانے اور رفع دفع کرنے کی کوششیں کرتے رہے...... مزید یہ کہ اُن دنوں حضرت علیؓ نے اپنے دونوں جوان بیٹوں یعنی حضرت حسن، نیز حضرت حسین رضی اللہ عنہما کو مسلسل حضرت عثمان کے گھر کی نگرانی پر مقرر کئے رکھا...... تاکہ شرپسند کوئی موقع پا کر گھر کے اندر داخل نہ ہو سکیں، غرضیکہ ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں باہم بڑی محبتیں اور قربتیں رہیں، اور آپس میں یہ ہمیشہ شیر وشکر کی مانند رہے۔

اور پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے گھر کے طویل محاصرے کے بعد آخر جب انہیں نہایت بیدردی کے ساتھ شہید کر دیا گیا...... اور یہ المناک خبر حضرت علیؓ تک پہنچی تو آپؓ حیرت زدہ رہ گئے، اور انتہائی رنجیدہ ودل گرفتہ ہو گئے، حتیٰ کہ شدتِ غم کی وجہ سے آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے...... کیونکہ باقی تمام صحابۂ کرام کی طرح یہ خبر ان کیلئے بھی بالکل غیر متوقع تھی، دراصل اس بغاوت اور فتنے کے موقع پر ان سبھی حضرات کا یہی خیال تھا کہ یہ وقتی معاملہ ہے...... کیونکہ دور دراز کے علاقوں سے آئے ہوئے یہ باغی کچھ عرصے بعد تنگ آکر خود ہی واپس لوٹ جائیں گے...... نیز یہ کہ ان باغیوں کی سرکوبی کی غرض سے بعض دور دراز کے علاقوں سے اسلامی لشکر کی مدینہ کی جانب روانگی کی خبریں بھی موصول ہو رہی تھیں...... لہٰذا ان تمام حضرات کا یہی خیال تھا کہ اس معاملے کا کوئی نہ کوئی مناسب حل ضرور نکل آئے گا...... یا...... زیادہ سے زیادہ یہ کہ اس فتنے کی آگ کو بجھانے کی غرض سے حضرت عثمانؓ خود ہی ''منصبِ خلافت'' سے دستبرداری اختیار کر لیں گے...... کیونکہ باغیوں کا محض یہی مطالبہ تھا...... جان لینے دینے کا تو وہاں کوئی معاملہ ہی نہیں تھا...... لیکن اب جو کچھ ہو گیا...... یعنی حضرت عثمانؓ کا قتلِ ناحق...... اور وہ بھی اس قدر بھیانک طریقے سے

اور اس قدر وحشیانہ انداز میں...... یہ تو کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا، لہٰذا اس غیر متوقع ظلم وبربریت کی وجہ سے دیگر تمام صحابۂ کرام کی مانند حضرت علیؓ بھی انتہائی صدمے اور رنج وغم کی کیفیت سے دوچار تھے۔

خلیفۂ سوم امیر المؤمنین ذوالنورین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے اس المناک واقعے کے بعد ایک اہم ترین معاملہ یہ درپیش تھا کہ منصبِ خلافت کی ذمہ داری اب کون سنبھالے گا......؟ ظاہر ہے کہ اُس معاشرے میں یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں تھی کہ حضرت علیؓ سے بڑھ کر کوئی اور اس منصب کا اہل نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ لوگوں نے بار بار حضرت علیؓ کے سامنے اس بات کا مطالبہ اور اصرار کیا کہ آپ یہ منصب سنبھال لیجئے...... لیکن حضرت علیؓ ہر بار یہی جواب دیتے رہے کہ ''ہمارے خلیفہ قتل کر دیئے گئے......اور میں ان کی جگہ منصبِ خلافت سنبھال کر بیٹھ جاؤں...... مجھے ایسا کرتے ہوئے شرم محسوس ہوتی ہے......لہٰذا کسی اور کو تلاش کرو......'' لوگوں کی طرف سے اصرار......جبکہ حضرت علیؓ کی طرف سے معذرت اور انکار...... چندروز یہی سلسلہ چلتا رہا......آخر مہاجرین وانصار میں سے سرکردہ افراد پر مشتمل متعدد حضرات نے حضرت علیؓ سے ملاقات کی اور انہیں منصبِ خلافت سنبھالنے پر آمادہ کیا......تب آپؓ نے ان کی بات کو رد کرنا مناسب نہیں سمجھا اور اپنی طرف سے آمادگی کا اظہار کیا۔

اور یوں سن ۳۵ ہجری میں ماہِ ذوالحجہ کے آخری دنوں میں مدینہ منورہ میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھالی۔

☆......**منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد:**

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے حصے میں یہ نازک ترین ذمہ داری ایسے وقت میں

آئی تھی کہ جب چہار سوشدید اضطراب اور بے چینی کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا...... ہر نئے دن کے ساتھ ہی نئی سازش اور نئی شورش جنم لیتی تھی......انہی شر انگیز قسم کے حالات میں خلیفۂ چہارم کے دورِ خلافت کا آغاز ہوا۔

اس موقع پر سب سے اہم اور نازک ترین معاملہ جو فوری طور پر درپیش تھا، وہ قاتلینِ عثمانؓ کی گرفتاری اور پھر انہیں قرار واقعی سزا دینے کا معاملہ تھا......لیکن یہ کوئی آسان معاملہ نہیں تھا، کیونکہ صورتِ حال انتہائی پیچیدہ تھی، باغی اب بھی بدستور کافی طاقتور تھے، اور پھر یہ کہ جہاں بلوہ ہو' ماردھاڑ' قتل و غارتگری' افراتفری' جہاں ہزاروں انسانوں کا جمِ غفیر ہو...... وہاں تو شاید خود بلوائیوں اور فسادیوں کو بھی درست اندازہ نہیں ہوسکتا کہ کس نے کس کو قتل کیا؟ لہٰذا محض افواہ یا سنی سنائی بات کی بنیاد پر کسی کو مجرم قرار دینا، اور پھر اسے سزا بھی دینا، یہ کسی صورت مناسب نہیں تھا، بلکہ وہاں تو تمام شرعی وعدالتی تقاضوں کی تکمیل لازمی تھی۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت علیؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد اس معاملے کو فی الحال کچھ عرصہ کیلئے ملتوی کرنا مناسب سمجھا، تاکہ اس شورش زدہ ماحول میں قدرے بہتری آجائے، مرورِ وقت کے ساتھ معاملات پر گرفت بھی نسبتاً بہتر اور مضبوط ہوجائے، مزید یہ کہ اس خونِ ناحق کے حوالے سے جو اسرار ہیں ...... جو پوشیدہ گوشے ہیں......اور جو خفیہ حقائق ہیں......وہ قدرے کُھل کر سامنے آجائیں، تب مکمل خوداعتمادی کے ساتھ بھرپور طریقے سے اس معاملے کی طرف توجہ دی جائے۔

مگر صد افسوس کہ ہر گذرتے ہوئے لمحے کے ساتھ یہ معاملہ نازک تر اور سنگین ترین ہوتا چلا گیا......پیچیدگیاں بڑھتی ہی رہیں ......جس قدر سلجھانے کی کوشش کی گئی' اسی قدر الجھنیں بڑھتی گئیں، نوبت بایں جا رسید......کہ...... ہر نئی صبح طلوع ہونے والے نئے

سورج کے ساتھ ہی ایک نیا فتنہ بھی طلوع ہوجاتا۔

فتنوں اور سازشوں سے بھرپور اس گھٹن زدہ ماحول میں ایک اہم حقیقت یہ تھی کہ ان تمامتر مشکلات کی اصل آماجگاہ مدینہ سے کافی دوردراز کے علاقے تھے، اور یہ کہ یہاں اس قدر دور مدینہ میں رہتے ہوئے اس بگاڑ کی اصلاح کافی مشکل تھی، اسی حقیقت کا احساس وادراک کرتے ہوئے حضرت علیؓ نے اب مدینہ سے انہی دوردراز کے علاقوں کی طرف نقل مکانی کا ارادہ کیا، تاکہ وہاں قریب رہتے ہوئے ان فتنوں کا بہتر طریقے سے قلع قمع کیا جاسکے۔

چنانچہ حضرت علیؓ نے ماہِ ربیع الثانی سن ۳۶ ہجری میں مدینہ میں نوسو جانبازوں پر مشتمل ایک لشکر تیار کیا، اور خود اس کی قیادت کرتے ہوئے ابتدائی طور پر بصرہ کی طرف کوچ کرنے کا اعلان کیا۔

اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین میں سے متعدد حضرات' بالخصوص حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اس پریشان کُن صورتِ حال میں اُن شورش زدہ علاقوں کی جانب روانگی کا ارادہ ترک کردینے کا مشورہ دیا۔

لیکن حضرت علیؓ نے اس سلسلہ میں معذرت کا اظہار کیا......اور پھر مدینہ سے عین روانگی کے وقت حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ نے بے ساختہ آگے بڑھ کر آپؓ کے گھوڑے کی لگام تھام لی اور اسے روک لیا، اور پھر بڑے ہی حسرت آمیز لہجے میں یوں کہا کہ: ''اے امیرالمؤمنین! اگر آپ ایک بار مدینہ سے چلے گئے تو......پھر شاید آپ زندگی میں دوبارہ کبھی رسول اللہ ﷺ کا یہ شہر مدینہ' رسول اللہ ﷺ کی یہ مسجد' اور یہ منبرومحراب......نہیں دیکھ سکیں گے''، اس کے بعد مزید یہ بھی کہا ''اگر آپ آج اس شہر مدینہ کو چھوڑ کر چلے گئے......تو

پھر شاید قیامت تک دوبارہ کبھی یہ شہر مدینہ مسلمانوں کا دارالخلافہ نہیں بن سکے گا......"(۱)
اس پر لشکر میں سے کسی جوشیلے شخص نے آگے بڑھ کر حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ کے ساتھ کچھ تلخ کلامی کی......جس پر حضرت علیؓ نے اسے تنبیہ کی اور اس حرکت پر ناگواری کا اظہار کیا......اور پھر حضرت عبداللہ بن سلامؓ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے حسبِ سابق اپنا فیصلہ تبدیل کرنے کے بارے میں معذرت کا اظہار کیا......اور پھر ان سب کی نگاہوں کے سامنے وہاں سے بصرہ کی جانب روانہ ہوگئے۔

اور پھر بصرہ میں کچھ عرصہ قیام کے بعد وہاں سے مزید آگے کوفہ چلے گئے (۲) لیکن وہاں پہنچنے کے بعد بھی صورتِ حال میں کوئی بہتری نہ آسکی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنی تمام مدتِ خلافت کے دوران روزِ اول سے روزِ آخر تک سکون کا کوئی ایک لمحہ بھی میسر نہ آسکا...... پانچ سال کے عرصے پر محیط آپؓ کا یہ تمامتر زمانۂ خلافت داخلی فتنوں، شورشوں، سازشوں، افتراق وانتشار، اور خانہ جنگیوں کی نذر ہوگیا۔

مشکل در مشکل کے اس لامتناہی سلسلے کے حوالے سے ایک اہم حقیقت جسے ذہن نشیں رکھنا ضروری ہے، وہ یہ کہ خلیفۂ چہارم امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سے قبل گذشتہ خلفاء، بالخصوص پہلے دونوں خلفاء کو منصبِ خلافت جب ملا، اُس وقت صورتِ حال یہ تھی کہ ان کی رعیت میں سے بہت بڑی اکثریت خود حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی کی تھی......جو بڑی حد تک ان کے ہم خیال اور ہم مزاج تھے......

(۱) اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا......

(۲) بصرہ موجودہ عراق کا مشہور شہر ہے۔۔جبکہ کوفہ عراق کے موجودہ شہر "نجف" سے بالکل متصل واقع تھا، اب یہ نام غیر معروف ہوتا جارہا ہے، البتہ اس شہر کی باقیات بڑے پیمانے پر نجف کے گردونواح میں موجود ہیں۔

اس بات کو یوں سمجھنا چاہئے کہ جس طرح کسی کلاس روم میں بعض اوقات کوئی استاد نظم وضبط برقرار رکھنے کی غرض سے وہاں موجود طلبہ میں سے ہی کسی کو ''مانیٹر'' مقرر کر دیتا ہے۔ اُس موقع پر صورتِ حال یہ ہوتی ہے کہ وہ مانیٹر جن طلبہ کی ''مانیٹرنگ'' یا نگرانی اور دیکھ بھال کر رہا ہوتا ہے......وہ سب اس کے اپنے دوست اور ساتھی' اس کے ہم جماعت' ہم عصر' اور ہم عمر ہوا کرتے ہیں......وہ سب ایک ہی استاد سے تعلیم حاصل کر رہے ہوتے ہیں ، ایک ہی کتاب اور ایک ہی نصاب پڑھ رہے ہوتے ہیں، ایک ہی ادارے کے وہ طلبہ ہوا کرتے ہیں......ان کی تعلیم وتربیت ایک ہی انداز سے ہو رہی ہوتی ہے......ان کی سوچ' ان کے انداز واطوار' ان کے خیالات وافکار' ان کے اہداف' ان کے ارادوں' نیز ان کے اغراض ومقاصد میں بڑی حد تک مماثلت ویگانگت ہوا کرتی ہے......لہٰذا خود انہی کے اس ساتھی ''مانیٹر'' کو اپنے ان ہم جماعت طلبہ کی نگرانی' یا ان کے ساتھ کسی قسم کی کوئی مفاہمت' یا کوئی معاملہ طے کرنے میں قطعاً کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

لیکن اگر کبھی بعد میں طویل زمانہ گذر جانے کے بعد اسی مانیٹر کو اپنے انہی ہم جماعت طلبہ کی بجائے ان کی اولاد میں سے کسی کے ساتھ کوئی معاملہ طے کرنے کی نوبت آجائے ...... تو صورتِ حال یقیناً بہت مختلف ہوگی......

یا جس طرح دو بھائیوں میں باہم کس قدر محبتیں اور قربتیں ہوا کرتی ہیں......ہمیشہ دکھ سکھ کے ساتھی......بلاتکلف اور بلاجھجک ہمیشہ ایک دوسرے کے سامنے صاف صاف حالِ دل بیان کر دینے والے......

لیکن اگر بعد میں کبھی انہی میں سے ایک بھائی کو اپنے دوسرے بھائی کی بجائے اس کی اولاد کے ساتھ کوئی مفاہمت کرنی پڑے، یا کوئی معاملہ طے کرنے کی نوبت آئے......تب

یقیناً وہ بات نہیں ہوگی جو خود بھائیوں میں آپس میں تھی ...... قدرت کا یہی نظام ہے......

بعینہٖ اسی طرح خلیفۂ چہارم سے قبل گذشتہ خلفاء' بالخصوص پہلے دو خلفاء' کے دور میں صورتِ حال یہ تھی کہ ان کی رعیت میں غالب اکثریت اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تھی، جو ان کے ہم خیال اور ہم مزاج تھے، ایمان واخلاص' زہد وتقویٰ' للّٰہیت وفنائیت' فکرِ آخرت' امانت ودیانت' حق گوئی وراست بازی' دنیا کے حقیر مال ومتاع سے بے رغبتی' غرضیکہ ہر لحاظ سے ان سب کا معیار ایک ہی جیسا تھا...... ان سبھی کی تربیت خود خاتم الأنبیاء واشرف المرسلین نے فرمائی تھی...... ان سبھی نے اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دین براہِ راست خود اللہ کے رسول ﷺ سے ہی سیکھا تھا...... آپؐ کی صحبت ومعیت' کسبِ فیض کے وہ مبارک سلسلے اور آپؐ کا وہ فیضانِ نظر...... یہی وہ بے مثال شرف تھا...... اور یہی وہ اعلیٰ ترین اعزاز تھا...... جس نے انہیں تمام بنی نوعِ انسان میں یکتائے روزگار بنادیا تھا...... لہٰذا ان گذشتہ (دو) خلفاء کو اپنے ہی ان مخلص دوستوں اور ساتھیوں پر مشتمل اپنی اس رعیت کے ساتھ مفاہمت اور معاملات طے کرنے میں ...... نیز انتظامی معاملات چلانے میں کسی دقت کا ...... کسی سازش کا...... کسی شورش کا...... سامنا نہیں کرنا پڑا......

جبکہ اس کے برعکس خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے جب منصبِ خلافت سنبھالا تو دنیا بدلی ہوئی تھی...... ماحول بدلا ہوا تھا...... لوگوں کے مزاج بدلے ہوئے تھے...... اور پھر بالخصوص مدینہ سے بصرہ اور پھر کوفہ منتقل ہوجانے کے بعد تو اس ناگوار تبدیلی میں مزید شدت آچکی تھی، مدینہ میں تو اب بھی کافی تعداد میں اہلِ خیر موجود تھے...... مبارک ہستیاں بکثرت نظر آتی تھیں...... لیکن سینکڑوں میل کی مسافت پر واقع اس نئی جگہ پر تو ہر طرف ناآشنا ہی نظر آتے تھے، نئی نئی شکلیں، نامانوس اور اجنبی چہرے، جن کے مزاج

مختلف، انداز بدلے ہوئے، اخلاق و عادات جداگانہ، عمر رسیدہ اور تربیت یافتہ شخصیات کی بجائے نوجوانوں کی ٹولیاں ......نا تجربہ کار......ناقص تربیت......جوش عروج پر......لیکن ہوش کا فقدان......مزید یہ کہ ان میں سے اکثریت نومسلموں کی ......یہی وہ صورتِ حال تھی جس کی وجہ سے حضرت علیؓ اکثر بیتے دنوں کو یاد کر کے......نیز رسول اللہ ﷺ کو...... اور اپنے پرانے احباب کو یاد کر کے رنجیدہ وافسردہ ہو جایا کرتے تھے۔

حضرت علیؓ کو یہ بات بخوبی یاد تھی کہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں ''شہادت'' اور پھر ''جنت'' کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا......لہٰذا وہ اپنے اللہ کی رضا کی خاطر صبر وشکر اور ہمت و استقامت کے ساتھ ......بس اللہ سے لَو لگائے ہوئے......سب کچھ برداشت کر رہے تھے......کوئی شکوہ نہیں تھا......کوئی فریاد نہیں تھی......کوئی آہ و بکاء نہیں تھی......بس خاموشی کے ساتھ سب کچھ دیکھتے ہوئے اسی انجام کی طرف......اور اسی منزل کی جانب بڑھ رہے تھے......کہ......جو اس فانی و عارضی دنیا میں اکثر ''اللہ والوں'' کا مقدر رہی ہے۔

اسی لئے اُن دنوں اکثر اپنے ایک ہاتھ سے اپنی داڑھی کو تھامے ہوئے اور دوسرے ہاتھ سے اپنی پیشانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یوں کہا کرتے تھے: لَتُخْضَبَنَّ هٰذِهٖ مِنْ هٰذِهٖ ...... یعنی ''عنقریب یہ (یعنی میری داڑھی) یہاں (یعنی میری پیشانی سے بہنے والے خون) سے رنگی جائے گی......''(۱)

اور پھر اسی پُر آشوب دور میں بالآخر بدنامِ زمانہ ''خوارج'' کا ایک گروہ جسے کچھ عرصہ قبل ہی ''نہروان'' کے میدان میں حضرت علیؓ کے ہاتھوں بدترین اور رسوا کن شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، اس گروہ نے اپنی اسی شکست کا انتقام لینے کی غرض سے حضرت علیؓ کے قتل

(۱) البدایہ والنہایہ، جلد: ۴۔ صفحہ: ٦۔ بتحقیق الدکتور عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی۔ دار الہجر للطباعۃ والنشر۔

کی ٹھانی......اورغوروفکر کے بعد یہ ذمہ داری ''ابن مُلجَم'' کوسونپی گئی......جوکہ اس مذموم مقصد کی تکمیل کی خاطر کوفہ جا پہنچا......اوروہاں آمد کے بعد کسی مناسب جگہ روپوش ہوکراس ناپاک ارادے کوعملی جامہ پہنانے کی غرض سے خفیہ طور پر تیاری میں مشغول ومنہمک ہوگیا، وہاں قیام کے دوران ایک ماہ تک مسلسل روزانہ بلاناغہ وہ اپنی تلوارکوزہرآلودکرتا رہا، نیزاس دوران وہ حضرت علیؓ کی نقل وحرکت ودیگرمعمولاتِ زندگی کا بغور جائزہ بھی لیتا رہا۔
آخرایک روزجب ماہِ رمضان کی سترہ تاریخ تھی،نمازِفجر سے قبل اندھیرے کافائدہ اٹھاتے ہوئے وہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے گھر سے مسجد کی طرف جانے والی گلی کے ایک موڑ پرچھپ کر بیٹھ گیا......حضرت علیؓ کا یہ معمول تھا کہ نمازِ فجر کیلئے گھر سے مسجد کی طرف روانگی کے موقع پراس گلی میں حَيَّ عَلَىٰ الصَّلَاة کی صدابلندکرتے جاتے تھے،تاکہ جوکوئی خوابِ غفلت میں مبتلا ہو وہ اس طرف متوجہ ہوجائے اورنماز کیلئے تیاری کرے......اس چیز سے اس بدبخت کیلئے اپنے ناپاک منصوبے کی تکمیل میں مزیدسہولت ہوگئی،چنانچہ جب اس نے حَيَّ عَلَىٰ الصَّلَاة کی یہ صداسنی تووہ مزید چوکس اور خوب مستعد ہوگیا،تلوار پراپنی گرفت خوب مضبوط کرلی......جیسے ہی حضرت علیؓ اُس موڑ پر پہنچے اس نے اچانک سامنے نمودار ہوکراپنی اس زہرآلودتلوار سے آپؓ کے سرپربھرپور وار کیا......جس کے نتیجے میں آپؓ شدید زخمی ہوکرگرپڑے(۱)اورآپؓ کے سر سے مسلسل خون بہنے لگا......
اس المناک واقعہ سے تقریباً پینتیس سال قبل غزوۂ خندق کے یادگاراورتاریخی موقع پرجب مشرکینِ مکہ کا نامورشہسوار''عبدوُد''جس کی بہادری کے بڑے چرچے تھے......اورجس کی

(۱)بعض مؤرخین کے بقول قاتل نے یہ حملہ حضرت علیؓ کے مسجد میں داخل ہونے کے بعد کیا تھا......واللہ اعلم۔

بڑی ہیبت ودہشت تھی......ایک موقع پر جب وہ خندق پار کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا، اور مسلمانوں کے سامنے پہنچ کرانہیں للکارر ہاتھا،تب رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کواس کے مقابلے کیلئے نکلنے کاحکم دیا تھا،اس حکم کی فوری تعمیل کرتے ہوئے آپؓ بلاخوف وخطرغروروتکبر کےاُس پتلے کےسامنے جا کھڑے ہوئے تھے......عبدِوُد نےآپؓ پرتلوار کا بھرپوروار کیا تھا،جس کے نتیجے میں آپؓ کےسرمیں کاری زخم آیا تھااور بڑی مقدار میں خون بہنے لگا تھا،اسی کیفیت میں آپؓ نے پلٹ کراس دشمنِ خداپرایسا بھرپوروار کیا تھا کہ چشم زدن میں وہ زمین بوس ہوگیا تھا۔

پینتیس سال کاطویل عرصہ گذرجانے کے بعداب کوفہ میں دوبارہ آپؓ کےسرمیں عین اس مقام پرکہ جہاں اُس پرانے زخم کانشان بدستور باقی تھا......اسی جگہ اب تلوار کی ضرب لگی اوراُسی طرح بڑی مقدار میں خون بہنے لگا۔

لوگوں کوجب اس افسوسناک ترین صورتِ حال کی اطلاع ملی تودیکھتے ہی دیکھتے وہاں جمِ غفیراکٹھا ہوگیا،حضرت علیؓ کواٹھا کرگھرلے جایا گیا......جبکہ قاتل ''ابن مُلجَم'' نے جائے واردات سےفرارہونے کی کوشش کی،تاہم وہاں موجودمجمع نےاسےموقع پرہی دبوچ لیا۔

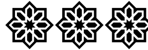
حضرت علی رضی اللہ عنہ اس قاتلانہ حملے میں شدیدزخمی ہونے کے بعددودن موت وزیست کی کشمکش میں مبتلارہے......اس دوران آپؓ نے عام لوگوں کو'اوربالخصوص اپنے صاحبزادگان ودیگراہلِ بیت کومتعددوصیتیں فرمائیں،اپنے قاتل کے بارے میں وصیت کرتے ہوئےفرمایا کہ''اگرمیری موت واقع ہوگئی توشرعی قوانین کی مکمل پاسداری کرتے ہوئےصرف اسے جائزسزادینا،اس سےزیادہ اسے یااس کےافرادِخانہ میں سےکسی کوکوئی گزندنہ پہنچانا......اوراگرمیں زندہ رہاتومیں خودفیصلہ کروں گا کہ اسےسزادی جائے،یا

معاف کر دیا جائے......"

انہی دنوں متعدد افراد نے آپؓ سے یہ مطالبہ کیا کہ "اے امیر المؤمنین! آپ اپنا کوئی جانشین تو مقرر کر دیجئے" مگر آپؓ نے ایسا کرنے سے معذرت کی......اور کسی کو اپنا جانشین مقرر نہیں فرمایا۔

آخر کوفہ میں اسی قاتلانہ حملے کے نتیجے میں زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے ۲۱/ رمضان سن ۴۰ ہجری تریسٹھ برس کی عمر میں امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے اللہ سے جا ملے۔ آپؓ کے صاحبزادگان حضرت حسن رضی اللہ عنہ، حضرت حسین رضی اللہ عنہ، محمد بن الحنفیہ رحمہ اللہ، نیز بھتیجے حضرت عبداللہ بن جعفر رضی اللہ عنہما نے غسل اور تجہیز و تکفین کے فرائض انجام دیئے۔ نمازِ جنازہ حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں آپؓ کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۶/ شوال ۱۴۳۵ھ، مطابق ۲/ اگست ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کا تعلق شہر مکہ میں قبیلۂ قریش کے ایک معزز خاندان سے تھا، ان کی شخصیت قدرتی وفطری طور پر انتہائی پرکشش تھی، چہرہ روشن، بدن دبلا پتلا، اور قد دراز تھا، لوگ انہیں اس دبلی پتلی اور لمبی تلوار سے مشابہ قرار دیا کرتے تھے جو اپنے دبلے پن کے باوجود اپنی تیز دھار اور بھرپور کاٹ کی وجہ سے دشمنوں کیلئے پیغامِ اجل ہوا کرتی ہے۔

☆ مکہ شہر میں دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص دوستی اور قربت تھی، دونوں میں بہت گہرے روابط تھے، چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نتیجے میں ہی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے تھے۔

☆ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ''السابقین الأولین'' یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے، یعنی وہ عظیم ترین افراد جنہوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا...... یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں، اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆ مزید یہ کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ'' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ قبولِ اسلام کے بعد تکالیف ' مصائب وآلام ' اور آزمائشوں کا دور شروع ہوا...... دینِ اسلام کے اسی ابتدائی دور میں جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاءرسانیوں کا سلسلہ عروج پر تھا، تب نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، انہی مہاجرینِ حبشہ میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

☆ مکی دور ہو...... یا ہجرتِ حبشہ...... اور پھر ہجرتِ مدینہ کے بعد کا دور...... کفارِ مکہ کی طرف سے اہلِ ایمان کے خلاف سازشوں اور اذیت رسانیوں کے سلسلے مختلف شکلوں میں بدستور جاری ہی رہے...... ایسے میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ راہِ حق میں ہر قدم پر اور ہر موڑ پر ان تمامتر مصائب وآلام کا بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے...... جسمانی...... مالی...... نفسیاتی...... غرضیکہ ہر قسم کی تکالیف اور آزمائشوں کا نہایت جرأت وبہادری کے ساتھ سامنا کرتے رہے۔

☆ آخر ایک ایسا دن بھی آیا...... کہ جب معاملہ حد سے گذر گیا...... ایسی آزمائش سامنے آ کھڑی ہوئی...... کہ جس کا تصور بھی جان لیوا ہے...... ہجرت کے دوسرے سال ''بدر'' کے میدان میں جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ دشمنوں پر انتہائی بہادری ودلیری کے ساتھ جھپٹ رہے تھے...... کیفیت یہ تھی کہ وہ جس طرف لپکتے اُدھر دشمنوں کی صفوں کی صفیں اُلٹ جاتیں...... یوں وہ مسلسل کبھی بجلی بن کر دشمن پر گر رہے تھے...... اور کبھی قہر بن کر ٹوٹ رہے تھے...... ایسے میں وہاں ایک ایسا شخص تھا جو بار بار ان کے سامنے آ جاتا...... گویا اس نے بس انہی پر نظر رکھی ہوئی تھی...... یہ اس سے بچتے...... وہ پھر سامنے آ جاتا...... یہ کتراتے مگر وہ پھر راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا، انہیں للکارتا کہ '' آؤ...... میرا سامنا کرو، ذرہ میرے

ساتھ قوت آزمائی کر کے دیکھو......''

آخرایک جگہ اس شخص نے ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا راستہ روک لیا اور بار بار للکارا......اب ابوعبیدہؓ کے پاس کوئی چارہ نہیں تھا، اس نے اپنی تلوار بلند کی، ابوعبیدہؓ نے بھی بلند کی، دونوں تلواریں پوری قوت کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرائیں، اور پھر ظاہر ہے کہ نتیجہ تو وہی برآمد ہونا تھا، یعنی ایک غالب اور دوسرا مغلوب......چنانچہ ابوعبیدہؓ فاتح وغالب رہے، یوں وہ شخص ابوعبیدہؓ کے ہاتھوں ''بدر'' کے میدان میں مارا گیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس موقع پر کتنی کوشش کی تھی اس شخص سے کترانے کی......مگر اس نے تو مجبور ہی کر دیا تھا......

وہ شخص کون تھا؟ ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کیلئے یہ کتنی بڑی آزمائش تھی، اگر کوئی سنے گا، تو شاید یقین نہیں کرے گا......اور اگر یقین کرے گا......تو پھر شاید اپنے ہوش وحواس برقرار نہیں رکھ سکے گا......کیونکہ یہ شخص ابوعبیدہؓ کا باپ تھا......مشرک......دراصل ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کو قتل نہیں کیا......بلکہ ''باطل'' کو قتل کیا......جو اُن کے مشرک باپ کے روپ میں ان کے مقابل آکھڑا ہوا تھا......اور بار بار انہیں للکار رہا تھا(۱)

☆سن دو ہجری میں پیش آنے والے اس ''غزوۂ بدر'' کے فوری بعد اگلے ہی سال جب مشرکینِ مکہ اپنے لاؤلشکر سمیت دوبارہ چلے آئے......جس کے نتیجے میں حق وباطل کے درمیان دوسرا معرکہ یعنی ''غزوۂ اُحد'' پیش آیا، اس موقع پر مسلمان جب اپنی ہی ایک اجتہادی غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے......مسلمانوں کی یقینی فتح اب شکست میں

(۱) متعدد مفسرین کے بقول آیت ﴿لَاتَجِدُ قَوماً یُؤمِنُونَ بِاللّٰہِ وَالیَومِ الآخِرِ یُوَآدُّونَ مَن حَآدَّ اللّٰہَ وَرَسُولَہٗ وَلَوکَانُوا آبَاءَ ھُم ......﴾ (المجادلہ:۲۲) میں حضرت ابوعبیدہؓ کے ساتھ پیش آنے والے اسی واقعے کی طرف اشارہ مقصود ہے۔

تبدیل ہوگئی......جس کی وجہ سے مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی وافراتفری کا سامنا کرنا پڑا......اپنی صفوں میں وہ نظم وضبط برقرار نہ رکھ سکے......کسی کو کسی کی خبر نہ رہی...... باہم رابطہ براقرار نہ رہ سکا......اور وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر......اِدھر اُدھر منتشر اور سراسیمہ ہوگئے......

اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرکینِ مکہ نے اپنی تمام توجہ اس جانب مرکوز کردی جہاں رسول اللہ ﷺ موجود تھے......اس نازک ترین موقع پر چند مٹھی بھر جاں نثار......جو آپؐ کے گرد دیوانہ وار......تیروں اور نیزوں کی بوچھاڑ کو اپنے ہاتھوں اور سینوں پر روکتے ہوئے......آپؐ کی حفاظت کا فریضہ انجام دے رہے تھے......انہی جاں نثاروں اور سرفروشوں میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

اور پھر اس جنگ کے اختتام پر کیفیت یہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی جبینِ اقدس پر گہرا زخم آیا تھا جس سے خون بہہ رہا تھا......چند دندان مبارک شہید ہوگئے تھے......رُخِ انور پر کسی بدبخت مشرک کی تلوار کی ایسی زوردار ضرب لگی تھی کہ جس کی وجہ سے زرہ کی چند کڑیاں آپؐ کے رُخسار مبارک میں پیوست ہوگئی تھیں اور کافی اندر گہرائی تک چلی گئی تھیں......

تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے زرہ کی یہ کڑیاں آپؐ کے رخسار مبارک سے نکالنے کی بہت کوشش کی......لیکن کامیابی نہ ہوسکی......آخر انہیں مخاطب کرتے ہوئے ابوعبیدہؓ فرمانے لگے: أُقسِمُ عَلَيكَ أن تَترُكَ لِي ذَلِكَ ...... یعنی ''اے ابوبکر! میں آپ کو اللہ کی قسم دے کر کہتا ہوں کہ آپ یہ کام مجھ پر چھوڑ دیجئے......''

چنانچہ اب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اسی کوشش میں مشغول ہوگئے......لیکن کوئی کامیابی نہ ہوسکی......تب آخر انہوں نے ان کڑیوں کو اپنے دانتوں سے جکڑ کر پوری قوت سے کھینچا،

جس کے نتیجے میں وہ کڑیاں تو رسول اللہ ﷺ کے رُخسار مبارک سے باہر آ گئیں......البتہ ساتھ ہی ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے سامنے کے دونوں دانت بھی ٹوٹ کر باہر آ گئے......

یوں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت و پاسبانی کا مقدس ترین فریضہ دل و جان سے سرانجام دیتے رہے......نہایت جوش و جذبے کے ساتھ...... اور اخلاص ولگن کے ساتھ آپ ﷺ کی مجلس میں حاضری......استفادہ......اور کسبِ فیض میں ہمیشہ ہی مشغول و منہمک رہے......

''اَمین الاُمّۃ''

رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر یہ یادگار ارشاد فرمایا: اِنّ لِکُلِّ أُمَّةٍ أَمِیناً ، وَاِنّ أَمِینَنَا أیّتُهَا الأُمَّةُ أَبُو عَبَیدَةُ بنُ الجَرَّاح ۔ (۱)

یعنی''ہر امت کا ایک ''امین'' ہوا کرتا ہے، اور اے امت! ہمارے ''امین'' ابوعبیدہ بن الجراح ہیں''۔

مقصد یہ کہ ہر امت میں کوئی شخص بطورِ خاص بہت بڑا ''امین'' ہوا کرتا ہے......اس تمام امتِ مسلمہ کے وہ خاص اور بہت بڑے ''امین'' ابوعبیدہؓ ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اس یادگار ارشاد سے یقیناً حضرت ابوعبیدہ الجراح رضی اللہ عنہ کا مقام و مرتبہ خوب واضح و ثابت ہو جاتا ہے......

نیز جیسا کہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: جَاءَ أَهلُ نَجرَانَ اِلَیٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ ، فَقَالُوا : یَا رَسُولَ اللّٰه ! اِبعَثْ اِلَینَا رَجُلاً أَمِیناً ، فَقَالَ : لَأَبعَثَنَّ اِلَیکُم رَجُلاً أَمِیناً حَقَّ أَمِین ، حَقَّ أَمِین ...... فَا ستَشْرَفَ

(۱) صحیح بخاری[۳۷۴۴] باب مناقب ابی عبیدة بن الجراح رضی اللہ عنہ۔ نیز: صحیح مسلم[۲۴۱۹]

أَصحَابُهُ ، فَبَعثَ أَبَا عُبَیدَةَ ۔(۱)

یعنی ''ایک بار نجران والوں کا وفد رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور عرض کیا کہ اے اللہ کے رسول! آپ ہمارے ہمراہ کسی ایسے شخص کو روانہ فرمائیں جو ''امین'' ہو...... تب آپؐ نے فرمایا: میں تمہاری طرف ایک ایسے شخص کو روانہ کروں گا جو واقعی اور برحق ''امین'' ہوگا...... جو واقعی اور برحق ''امین'' ہوگا...... آپؐ کا یہ ارشاد سن کر آپؐ کے صحابۂ کرام اس چیز کی تمنا کرنے لگے...... تب آپؐ نے ابوعبیدہ بن الجراح کو ان کے ہمراہ روانہ فرمایا''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد سننے کے بعد متعدد اکابر صحابہ اس بات کی حسرت اور تمنا کرنے لگے کہ کاش آپؐ اس کام کیلئے مجھے منتخب فرمائیں...... کیونکہ آپؐ نے پیشگی یہ خوشخبری سنادی تھی کہ میں اس مقصد کیلئے ایک ایسے شخص کو منتخب کروں گا جو واقعی ''امین'' ہوگا...... لہٰذا یہ تو خود آپؐ کی طرف سے بہت بڑی گواہی اور خوشخبری تھی اُس شخص کے حق میں کہ جسے منتخب کیا جانا تھا...... اور تب اس موقع پر آپؐ نے اس کام کیلئے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ کو منتخب فرماتے ہوئے اس وفد کے ہمراہ روانگی کا حکم دیا۔

یقیناً اس سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی بڑی فضیلت و منقبت ثابت ہوتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران دور دراز کے علاقوں میں مشرکین و مخالفین کے مختلف قبائل وقتاً فوقتاً سرکشی دکھایا کرتے تھے، جس پر ان کی سرکوبی کی غرض سے آپؐ فوجی مہمات روانہ کیا کرتے تھے...... اُن دنوں متعدد بار ایسا ہوا کہ آپؐ نے اسلامی لشکر کا سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا...... اور یوں ان کی سپہ سالاری میں لشکر منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوا...... حالانکہ اس لشکر میں بڑے بڑے صحابۂ کرام، حتیٰ کہ حضرت

(۱) صحیح بخاری [۳۷۴۵] نیز: صحیح مسلم [۲۴۲۰] عن حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ۔

ابوبکراورحضرت عمر (رضی اللہ عنہم اجمعین) جیسی جلیل القدر شخصیات بھی موجود ہوا کرتی تھیں۔

ایسے ہی ایک یادگار موقع پر جب حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت لشکر مدینہ سے بہت دور......منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں تھا......متعدد اکابر صحابہ بھی ان کی زیرِ قیادت پیش قدمی کررہے تھے......اس دوران لشکر اپنا راستہ بھٹک گیا، جس کی وجہ سے غیر متوقع طور پر سخت پریشانی اور شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، خوراک کا ذخیرہ کافی کم پڑ گیا، اس نازک ترین صورتِ حال میں سپہ سالار کی حیثیت سے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خوراک کی تقسیم کا کام خود سنبھال لیا، اور تب آپؓ ہر سپاہی کو روزانہ صرف ایک کھجور بطورِ خوراک دیا کرتے، نیز یہ کہ دوسروں کی طرح خود بھی روزانہ محض ایک کھجور پر ہی اکتفاء کیا کرتے۔(۱)

یوں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ ہمیشہ ہی راہِ حق میں ہر قسم کی تکالیف کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے......اور یہ سلسلہ تو دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے ہی جاری تھا......کہ آخر آپؓ ''السابقین الاولین'' میں سے تھے......ابتدائی دور کی وہ رونگٹے کھڑے کردینے والی اورلرزہ انگیز قسم کی آزمائشیں، مصائب وآلام کے وہ طویل سلسلے، ہجرتِ حبشہ......پھر ہجرتِ مدینہ......اور پھر ''بدر'' و ''اُحد'' کے میدان میں ان کی جاں نثاری اور سرفروشی کی بے مثال داستانیں......ان تمامتر آزمائشوں اور تکلیفوں کے باوجود، ابوعبیدہؓ

(۱) سن آٹھ ہجری میں روانہ ہونے والے اس لشکر کو ''سریۃ الخبط''، نیز ''سریۃ سِیف البحر'' کے نام سے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ صحیح بخاری/کتاب المغازی میں باب ''غزوۃ سِیف البحر وہم یتلقون عیر اًلقریش، وامیرہم ابوعبیدہ'' کے تحت اس بارے میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی حدیث[۴۳۶۰] میں مفصل تذکرہ موجود ہے۔

کے قدم راہِ حق میں کبھی نہ ڈگمگائے۔

یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے اس جاں نثار ساتھی سے ہمیشہ خوش رہے......اور تا دمِ آخر انتہائی مسرور و مطمئن رہے...... یونہی وقت کا سفر جاری رہا......حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا۔

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا جاں گداز واقعہ جب پیش آیا......تب ہر طرف رنج والم کی کیفیت طاری تھی......فضاء انتہائی سوگوار تھی...... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا......ہوش وحواس جواب دے رہے تھے......

اس نازک ترین صورتِ حال میں مزید ایک اور بہت ہی نازک اور حساس ترین معاملہ جو درپیش تھا......وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اب آپ کا جانشین کون ہوگا......؟

اسی بارے میں گفت وشنید کی غرض سے مسلمان بڑی تعداد میں مسجدِ نبوی سے متصل ہی ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' نامی مقام پر جمع تھے......تبادلۂ خیال کا سلسلہ جاری تھا......(۱)

اسی دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے اس نازک موقع پر ''فتنہ وافتراق'' سے بچنے' اور اتفاق واتحاد کو بہر صورت قائم رکھنے کی اہمیت وضرورت کے بارے میں مختصر گفتگو کی ، اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ' نیز حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''یقیناً یہی دو حضرات رسول اللہ ﷺ کی جانشینی کے قابل ہیں......لہٰذا میرا مشورہ یہ ہے کہ ان میں سے کسی ایک کے ہاتھ پر جلد از جلد بیعت کر لی جائے......''

(۱) ''سقیفہ بنی ساعدہ'' نامی یہ تاریخی مقام مسجدِ نبوی کی توسیع کے بعد اب مسجد کے اندر شامل ہے۔

حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کی یہ بات سُن کر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا:''ہم میں سے کس کا دل اس بات کو گوارا کرے گا کہ وہ شخص (یعنی حضرت ابوبکرصدیقؓ) جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ہماری امامت کیلئے منتخب فرمایا تھا......اس کے ہوتے ہوئے کسی اور کو اس منصب کیلئے منتخب کیا جائے......؟

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ...... اور پھر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کی......اور پھر رفتہ رفتہ دیگر تمام مسلمانوں نے بھی بیعت کی......

اس واقعے سے جہاں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا تواضع وانکسار' اخلاص' زہد وتقویٰ' اور ایثار ظاہر ہوتا ہے......وہیں یہ بات بھی خوب واضح وثابت ہوجاتی ہے کہ حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر انسان کی نظر میں ان کی کتنی بڑی اہمیت اور قدر ومنزلت تھی......یعنی حضرت ابوبکرؓ کی نظر میں حضرت عمرؓ کی طرح حضرت ابوعبیدہؓ بھی رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور خلیفۃ المسلمین کے عظیم ترین منصب کیلئے نہایت مناسب اور موزون ترین شخصیت تھے......

☆خلیفۂ اول حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ ممتاز ومنفرد مقام ومرتبہ حاصل رہا......انہیں ہمیشہ حضرت ابوبکرؓ کے قریبی ترین ساتھی اور مشیرِ خاص کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا......(۱)

☆اُس دور میں روئے زمین کی عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ روم کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً جارحیت اور اشتعال انگیزی کا سلسلہ خود رسول اللہ ﷺ کے زمانے سے

(۱) حضرت ابوبکرؓ کی دعوت وکوشش کے نتیجے میں ہی تو حضرت ابوعبیدہؓ مشرف باسلام ہوئے تھے، لہٰذا دونوں میں خاص محبت وتعلق فطری چیز تھی۔

ہی چلا آرہا تھا......جس کے نتیجے میں ''غزوۂ موتہ'' اور پھر تاریخی اور یادگار ''غزوۂ تبوک'' کی نوبت آئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما (جو اس وقت بالکل نوعمر تھے) کی زیرِ قیادت ایک لشکر سلطنتِ روم کے ایک علاقے (موجودہ اُردن) کی جانب روانہ فرمایا تھا......لیکن ابھی یہ لشکر مدینہ شہر کے مضافات میں ہی تھا کہ آپؐ کی طبیعت کی ناسازی کی اطلاع ملنے پر یہ لشکر اسی جگہ رک گیا اور اس کی روانگی کو ملتوی کر دیا گیا......اور پھر اسی دوران آپؐ کی رحلت کا جاں گداز واقعہ پیش آ گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اولین جانشین اور خلیفۃ المسلمین کی حیثیت سے ذمہ داریاں سنبھالیں تو نازک ترین صورتِ حال......اور ہر طرف سے اُمڈتے ہوئے اندرونی و بیرونی خطرات کے باوجود......اس لشکر کو ملکِ شام کی جانب روانہ فرمایا۔

اس کے بعد سن بارہ اور پھر سن تیرہ ہجری میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے مختلف اوقات میں مختلف افراد(۱) کی زیرِ قیادت متعدد لشکر سلطنتِ روم کی جانب روانہ کئے، اسی دوران ایک لشکر حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت بھی روانہ کیا گیا۔

یہ تمام لشکر سلطنتِ روم (موجودہ ملکِ شام، اردن، فلسطین، اور لبنان وغیرہ) کے مختلف علاقوں میں مختلف اطراف سے نہایت برق رفتاری کے ساتھ پیش قدمی کرتے ہوئے آخر باہم جا ملے، تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے حکم پر ان تمام لشکروں کو حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں یکجا کر دیا گیا......تا کہ اب روئے زمین کی عظیم

(۱) مثلاً: عمرو بن العاص، شرحبیل بن حسنہ، یزید بن ابی سفیان......وغیرہم......رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ترین قوت یعنی ''سلطنتِ روم'' کے خلاف فیصلہ کن کارروائی کی جا سکے۔

چنانچہ اس کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مسلمانوں نے رومیوں کے خلاف بڑی یادگار جنگیں لڑیں......جن میں سب سے زیادہ تاریخی اور فیصلہ کن قسم کی جنگ ''یرموک'' تھی......جو سن تیرہ ہجری میں لڑی گئی، اور جو مسلمانوں کے ہاتھوں سلطنتِ روم کے ہمیشہ کیلئے زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی، جس سے ہمیشہ کیلئے دنیا کا نقشہ ہی بدل گیا......اس تاریخی جنگ کے موقع پر اسلامی لشکر چوبیس ہزار......جبکہ رومیوں کا لشکر ایک لاکھ بیس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھا......مسلمان اپنے وطن سے دور......جبکہ دشمن اپنے ہی وطن میں اور اپنی ہی سرزمین پر تھا۔

انہی دنوں جنگِ یرموک سے کچھ قبل اُدھر مدینہ میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتقال ہو گیا، جس پر ان کی وصیت کے مطابق خلافت کی ذمہ داریاں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سنبھال لیں......جو کہ خود رسول اللہ ﷺ اور پھر خلیفۂ اول کے دور میں بھی مشاورت کے فرائض انجام دیتے چلے آرہے تھے، یہی وجہ تھی کہ تمام معاملات پر ان کی گہری نگاہ رہتی تھی اور نہایت باریک بینی سے تمام امور کا جائزہ لیا کرتے تھے۔

چنانچہ خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالنے کے بعد ملکی نظم و نسق سے متعلق متعدد امور میں انہوں نے کچھ تبدیلیاں کیں......اسی ضمن میں ایک بڑی تبدیلی یہ کی کہ ملکِ شام میں رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ان کے اس منصب سے معزول کر کے ان کی جگہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کرنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ اس سلسلے میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے

نام خط تحریر کیا اور حضرت خالد بن ولیدؓ کی جگہ بطورِ سپہ سالار ذمہ داریاں سنبھالنے کی تاکید کی۔

جن دنوں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے یہ خط حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو موصول ہوا......اُن دنوں مسلمان نہایت زور وشور کے ساتھ حضرت خالدؓ کی سپہ سالاری میں سلطنتِ روم کے خلاف انتہائی نازک اور فیصلہ کن جنگ ''یرموک'' کیلئے تیاریوں میں مشغول تھے......تیاری آخری مراحل میں تھی اور جذبات عروج پر تھے......لہٰذا خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ کی طرف سے یہ مکتوب ملنے کے بعد حضرت ابوعبیدہؓ بڑی کشمکش میں مبتلا ہوگئے......کیونکہ ایسے نازک موقع پر سپہ سالارِ اعلیٰ کی تبدیلی سے متعلق اس حکم کی تعمیل...... یہ اتنا بڑا اقدام......لشکر میں اتنی بڑی تبدیلی......یہ چیز فی الحال کسی طرح مناسب نہیں تھی، کیونکہ اس طرح اسلامی لشکر میں باہم اختلاف وافتراق اور رنجش وتلخی پیدا ہوسکتی تھی اور اس نازک موقع پر یہ معاملہ مسلمان سپاہیوں کیلئے حوصلہ شکنی اور پست ہمتی کا سبب بن سکتا تھا۔

چنانچہ اس صورتِ حال کو مدِنظر رکھتے ہوئے حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے موصول شدہ اس مکتوب اور اس کے مضمون کے بارے میں مکمل خاموشی اختیار کی......اور اس معاملے کو اس جنگِ یرموک کے بعد تک ملتوی کرنے کا فیصلہ فرمایا۔

چنانچہ جنگِ یرموک کا جب اختتام ہوا اور یہ نازک ترین مرحلہ بخیر وخوبی طے کرلیا گیا، تب ایک روز حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے اس بارے میں نہایت ادب اور محبت کے ساتھ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اطلاع دی......اس پر حضرت خالدؓ نے جواب میں نہایت عزت واحترام کے ساتھ انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: یَرحَمُكَ اللّٰهُ یَا

أبَـا عُبَيـدَة ، مَا مَنَعَكَ أن تُخبِرَنِي حِينَ جَاءَكَ هٰذَا الكِتَابُ؟ یعنی ''اے ابوعبیدہ! اللہ آپ پر رحم فرمائے......آپ کو جب یہ خط موصول ہوا تھا اُسی وقت آپ نے مجھے اس بارے میں مطلع کیوں نہیں فرما دیا......؟''

جواب میں ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اِنِّـي كَرِهتُ أن أكسِرَ عَلَيكَ حَربَكَ...... یعنی ''مجھے یہ بات گوارا نہیں تھی کہ میں آپ کو اس بارے میں مطلع کر کے آپ کی جنگی تیاریوں کی راہ میں کسی پریشانی کا سبب بنوں......''

اور پھر مزید فرمایا: وَمَـا سُـلـطَـانَ الدُّنيَا نُرِيد ، وَلَالِلدُّنيَا نَعمَل ، وَكُلُّنَا فِي الـلّـهِ اِخوَة...... یعنی ''ہمیں کسی دنیاوی شان و شوکت کا کوئی لالچ نہیں ہے، اور نہ ہی یہ دنیا ہمارا مطلوب و مقصود ہے......ہم سب تو بس اللہ کی راہ میں بھائی بھائی ہیں......''

تب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے تمام لشکر کو مطلع کیا کہ ''دیکھو اب یہ ابوعبیدہ ہمارے نئے سپہ سالار ہیں''۔ نیز اس موقع پر ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے ساتھ اپنی عقیدت و محبت اور وفاداری کے اظہار کے طور پر مزید یہ الفاظ بھی کہے: اِنِّـي سَـمِـعــتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَقُول : أمِينُ هٰذِهِ الأُمَّةِ أبُو عُبَيدَة ۔ یعنی ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''اس امت کے خاص امین ابوعبیدہ ہیں''۔

اس پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ یوں گویا ہوئے: وَاِنِّـي سَـمِعتُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ يَـقُـول: خَالِدُ بنُ الوَلِيدِ سَيفٌ مِن سُيوفِ اللّٰهِ ۔ (۱) یعنی ''میں نے رسول اللہ ﷺ کو یوں ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے کہ ''خالد بن ولید تو اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار ہیں''

(۱) الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب لابن عبدالبر، صفحہ ۵۱۱۔ الرقم المسلسل: ۱۸۱۹۔ بحوالہ مسند امام احمد: ۴/۹۰۔

اور یوں اس اہم موقع پران دونوں جلیل القدر شخصیات نے تمام لشکر کے سامنے ایک دوسرے کیلئے خیر سگالی' عقیدت ومحبت' اورادب واحترام کے جذبات کا اظہار کیا۔

اس کے بعد نئے سپہ سالار یعنی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت سلطنتِ روم کے خلاف مسلسل پیش قدمی اورفتوحات کا یہ سلسلہ جاری رہا...... حتیٰ کہ سن پندرہ ہجری میں انہی کی سپہ سالاری میں ''دمشق'' فتح ہوا، اور پھر ''فتحِ بیت المقدس'' کا انتہائی یادگاراورعظیم الشان واقعہ پیش آیا۔

اس یادگاراورتاریخی موقع پر جب رومیوں کے ساتھ ایک معاہدے کے نتیجے میں رومیوں کی طرف سے بیت المقدس کی چابی اب مسلمانوں کے حوالے کی جانی تھی، تب خلیفۂ دوم حضرت عمرؓ نے مدینہ میں حضرت علیؓ کواپنا نائب مقرر فرمایا تھا اورخود مدینہ سے طویل سفر طے کرتے ہوئے بیت المقدس پہنچے تھے۔

اُس وقت حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ تمام اسلامی لشکر کے سپہ سالارِاعلیٰ تھے...... بلکہ اُن دنوں انہیں ''اَمیرالاُمراء'' کے لقب سے بھی یاد کیا جاتا تھا...... کیونکہ مختلف علاقوں میں بڑی تعداد میں موجود اسلامی لشکروں کے سپہ سالار انہی کی زیرِ نگرانی فرائض انجام دے رہے تھے، نیز یہ کہ سلطنتِ روم کے اس قدر وسیع وعریض مفتوحہ علاقوں میں (۱) انہی کا حکم چل رہا تھا......رومیوں کے چھوڑے ہوئے تمام خزانے انہی کے قدموں میں تھے۔

لیکن اس کے باوجود خلیفۂ وقت امیرالمؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جب مدینہ منورہ سے بیت المقدس تشریف لائے اور وہاں انہوں نے اپنی طرف سے مقرر فرمودہ سپہ سالارِاعلیٰ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا اس قدر سیدھا سادھا طرزِ زندگی دیکھا،

(۱) یعنی موجودہ ملکِ شام (سوریہ) اردن' فلسطین' لبنان' اورترکی کا بڑا حصہ......

تو بہت زیادہ متأثر ہوئے......اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے بیساختہ یہ الفاظ کہے :
غَیَّرتْنَا الدُّنیَا کُلَّنَا ...... غَیرَكَ یَا أبَا عُبَیدَۃ...... یعنی ''اے ابوعبیدہ! اس دنیاوی خوشحالی و فراوانی نے ہم سب ہی کو بدل کر رکھ دیا ہے......سوائے آپ کے......''
خلیفۂ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ تو پہلے ہی اپنے پرانے ساتھی حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت سے بہت زیادہ متأثر تھے، اب بیت المقدس سے واپسی کے بعد مزید متأثر ہوگئے، چنانچہ اب وہ مدینہ میں بسا اوقات ان کا ذکرِ خیر کیا کرتے تھے۔(۱)

وفات:

حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت سلطنتِ روم کے طول و عرض میں مختلف علاقوں میں مسلمانوں کی پیش قدمی اور تاریخی فتوحات کا یہ عظیم الشان سلسلہ زور و شور کے ساتھ جاری رہا......اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا۔
آخر انہی دنوں ملکِ شام میں طاعون کی مہلک وباء پھیل گئی......جسے تاریخ میں ''طاعونِ

(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سے کس قدر متأثر تھے......اس کا اندازہ اس واقعے سے بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ حضرت عمرؓ جب قاتلانہ حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہوگئے تھے، بچنے کی امید کم تھی، تب اکابرِ صحابہ میں سے متعدد شخصیات نے یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیر المؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کردیجئے'' اس پر حضرت عمرؓ نے فوری جواب یہ دیا تھا کہ: لو کان أباعبیدۃ حیّاً لاستخلفتہ یعنی ''آج اگر ابوعبیدہ بقیدِ حیات ہوتے تو میں بس انہی کو اپنا جانشین مقرر کرتا'' اور پھر آپؓ نے چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہ چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کرلیں (یعنی: حضرت عثمان بن عفان۔ حضرت علی بن ابی طالب۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف۔ حضرت سعد بن ابی وقاص۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ۔ حضرت زبیر بن العوام۔ رضی اللہ عنہم اجمعین)۔

عمواس'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے(۱) یہ جان لیوا مرض بہت بڑے پیمانے پراموات کا سبب بنا......دیکھتے ہی دیکھتے ہی بہت بڑی تعداد میں لوگ اس کی لپیٹ میں آ کر لقمۂ اجل بنتے چلے گئے۔

انہی دنوں ایک روز اچانک حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کو خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے خط موصول ہوا، جس میں نہایت سختی کے ساتھ یہ تاکید کی گئی تھی کہ ''آپ فوراً جلد از جلد میرے پاس یہاں مدینہ چلے آیئے......کیونکہ ایک بہت ہی ضروری معاملے میں میں آپ سے فوری مشورہ کرنا چاہتا ہوں......''

نیز اس خط میں یہ بھی لکھا تھا کہ ''میرا یہ خط آپ کو اگر صبح کے وقت موصول ہو تو شام سے پہلے روانہ ہو جایئے......اور اگر شام کے وقت موصول ہو تو صبح سے پہلے روانہ ہو جایئے......''

(۱) کہا جاتا ہے کہ اس طاعون کی ابتداء چونکہ بیت المقدس کے قریب ''عمواس'' نامی بستی سے ہوئی تھی، لہٰذا اسی مناسبت سے یہ ''طاعون عمواس'' کے نام سے معروف ہو گیا، اس طاعون کی لپیٹ میں آنے کی وجہ سے وہاں موجود اسلامی لشکر میں پچیس ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے......جن میں بہت بڑی اکثریت حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تھی......متعدد اہلِ علم کے بقول رسول اللہ ﷺ نے مختلف اوقات میں قربِ قیامت کی جو متعدد علامات بیان فرمائیں......ان میں اس ''طاعون عمواس'' کا تذکرہ بھی ہے......ملاحظہ ہو حدیث: أُعـدُد سِتّـاً بَينَ يَدَي السَاعةِ یعنی ''قیامت سے قبل چھ چیزیں شمار کرنا'' اور پھر اسی حدیث میں ان چھ چیزوں میں سے ایک یہ چیز بیان فرمائی: ثُـم فَتـحُ بَيـتِ الـمَـقـدِس ، ثُمَ مَوتَانِ يَأخُذُ فِيكُم كَقُعَاصِ الغَنَم...... یعنی ''پھر فتحِ بیت المقدس، پھر ایک بیماری ظاہر ہوگی جس کے نتیجے میں تم لوگ اس قدر بڑے پیمانے پر موت کا شکار ہو جاؤ گے کہ جس طرح بکریاں مہلک بیماری پھیل جانے کی وجہ سے نہایت سرعت کے ساتھ بہت بڑی تعداد میں مرجایا کرتی ہیں......'' (صحیح بخاری[۳۲۱۲] کتاب الجزیۃ والموادعۃ مع اہل الحرب، باب ما یُحذر من الغدر......) چونکہ اسی حدیث میں اس علامت کو فتحِ بیت المقدس کے فوری بعد بیان کیا گیا ہے لہٰذا متعدد اہلِ علم کے بقول اس علامت سے یہی طاعون عمواس ہی مراد ہے جو فتحِ بیت المقدس کے فوری بعد ظاہر ہوا تھا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحریر کردہ اس خط کا مضمون پڑھتے ہی فوری طور پر حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ سمجھ گئے کہ ''نہ ہی کوئی ضروری کام درپیش ہے اور نہ کسی اہم معاملے میں کوئی مشاورت مقصود ہے...... بلکہ بات یہ ہے کہ حضرت عمرؓ مجھے اس مہلک طاعون سے بچانا چاہتے ہیں......''

چنانچہ فوری طور پر جواب تحریر کیا کہ ''اے امیر المؤمنین آپ کا حکم سر آنکھوں پر......لیکن...... آپ سے میری یہ گذارش ہے کہ مجھے میرے ساتھیوں اور سپاہیوں کے ساتھ یہیں رہنے کی اجازت دی جائے......میرا جینا مرنا انہی کے ساتھ ہے......باقی اللہ کی مرضی......''

مدینہ میں جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحریر کردہ یہ مکتوب موصول ہوا......تو اسے پڑھ کر وہ بیساختہ رونے لگے...... یہ منظر دیکھ کر دیگر صحابۂ کرام پریشان ہو گئے......اور حضرت عمر کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ سمجھے کہ شاید اس خط میں حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کے انتقال کی خبر ہے...... چنانچہ انہوں نے دریافت کیا کہ: ''کیا ابوعبیدہ کا انتقال ہو گیا ہے......؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''انتقال تو نہیں ہوا......البتہ اب آثار کچھ ایسے ہی ہیں......''

اس کے بعد مختصر عرصہ ہی گذرا تھا کہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ طاعون کی لپیٹ میں آ گئے، چند دن موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد بیت المقدس کے قریب ''بَیسان'' نامی بستی میں سن اٹھارہ ہجری میں اٹھاون سال کی عمر میں امین الامہ حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس ان کے درجات بلند فرمائیں۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۹/ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۳/ اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أَنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تعلق شہر مکہ میں قبیلۂ قریش کے مشہور خاندان ''بنوزہرہ'' سے تھا(۱) مکہ شہر میں ان کی ولادت رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے تقریباً دس سال بعد ہوئی۔

☆ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ''السابقین الأولین'' یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے، یعنی وہ عظیم ترین افراد جنہوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا......یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں، اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆ مزید یہ کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ'' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ مکہ شہر میں دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے سے قبل ہی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ خاص دوستی اور قربت تھی، دونوں میں بہت گہرے روابط تھے، چنانچہ ظہورِ اسلام کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نتیجے میں ہی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے۔

☆ قبولِ اسلام کے بعد تکالیف، مصائب وآلام، اور آزمائشوں کا دور شروع ہوا......دینِ

(۱) اسی خاندان ''بنوزہرہ'' سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب کا بھی تعلق تھا۔

اسلام کے اسی ابتدائی دور میں جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاءرسانیوں کا سلسلہ عروج پر تھا......تب نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، انہی مہاجرینِ حبشہ میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

☆اور پھر ہجرتِ مدینہ کے موقع پر دیگر تمام مسلمانوں کی طرح حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی مدینہ منورہ آپہنچے، جہاں رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین وانصار کے مابین مؤاخات کے موقع پر انہیں اور سعد بن الربیع الانصاریؓ کو ''رشتۂ اُخوت'' میں منسلک فرمادیا۔

☆اس رشتۂ اخوت میں بندھ جانے کے بعد حضرت سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا: ''دیکھئے عبدالرحمٰن، میرے پاس خوب مال ودولت ہے، وہ ہم آپس میں تقسیم کرلیتے ہیں، نیز میرے پاس کھجوروں کے دو باغ بھی ہیں، ان میں سے جو آپ کو پسند آئے وہ آپ لے لیجئے''۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے اپنے انصاری بھائی کی اس مخلصانہ پیشکش پر ان کا خوب شکریہ ادا کیا......اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ فِي مَالِك...... ولٰكِن دُلَّنِي عَلَىٰ السُوق...... یعنی ''اللہ آپ کے مال میں مزید خیر وبرکت عطاءفرمائے......آپ بس مجھے ذرہ بازار کا راستہ دکھا دیجئے......''

یوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ......نیز دیگر تمام مہاجرین نے اپنے انصاری بھائیوں کی اس مہمان نوازی، حسنِ اخلاق، شرافت، فراخدلی اور بے مثال ایثار سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی......بلکہ ان پر بوجھ بننے کی بجائے محنت ومشقت کا راستہ اختیار کیا......اور جلد از جلد خود اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کی جدوجہد میں مشغول

ہو گئے۔

چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے بھی مدینہ میں ''تجارت'' کو اپنا ذریعۂ معاش بنایا......شب وروز کی محنت وکوشش کے نتیجے میں ان کے مالی حالات کافی بہتر ہوتے چلے گئے۔

☆ خوشحالی وفراوانی جب نصیب ہوئی تو انہوں نے ایک انصاری خاتون کے ساتھ شادی بھی کر لی......تب ایک روز یہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو کیفیت یہ تھی کہ ان کے لباس پر خوشبو کے کچھ اثرات تھے......رسول اللہ ﷺ نے یہ خوشگوار تبدیلی دیکھی تو تعجب کی کیفیت میں......اور نہایت شفقت بھرے انداز میں ......انہیں مخاطب کرتے ہوئے دریافت فرمایا: ''اے عبدالرحمٰن، کیا تم نے شادی کر لی ہے......؟'' اس پر عبدالرحمٰنؓ نے عرض کیا ''جی ہاں ......اے اللہ کے رسول......'' تب آپؐ نے دریافت فرمایا ''اپنی دلہن کو تم نے مہر میں کیا چیز دی ہے؟'' عرض کیا: وَزنَ نَوَاةٍ مِن ذَهَب یعنی ''کھجور کی گٹھلی کے وزن کے برابر سونا'' تب آپؐ نے تاکیدی انداز میں فرمایا: أَوْلِم وَلَو بِشَاةٍ یعنی ''ولیمہ ضرور کرنا......اگرچہ محض ایک بکری ہی کیوں نہ ہو'' اور پھر اسی موقع پر آپؐ نے انہیں دعائے خیر دیتے ہوئے یہ ارشاد بھی فرمایا: بَارَكَ اللّٰهُ لَكَ ۔ یعنی ''اللہ تمہیں خیر وبرکت عطاء فرمائے'' (۱)(۲)

(۱) صحیح بخاری، کتاب النکاح۔ باب کیف یُدعیٰ للمتزوج۔ حدیث: ۵۱۵۵۔ فتح الباری، ج:۹ ص:۲۲۱۔

(۲) مقصد یہ کہ اس خوشی کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو یہ تاکید فرمائی کہ دعوتِ ولیمہ ضرور کرنا......ساتھ ہی انہیں خیر وبرکت کی دعاء بھی دی، تاکہ دعوتِ ولیمہ میں اگر کچھ مال خرچ ہوا......تو اس خیر وبرکت کے ذریعے اس کی تلافی ہو جائے......نیز اس موقع پر یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ ان جلیل القدر شخصیات کی سادگی ملاحظہ ہو......کہ شادی کے موقع پر کسی بڑی تقریب کا کوئی اہتمام نہیں ہے (حاشیہ آگے......)

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابی عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اس دعائے خیر و برکت سے جو نوازا......اور پھر اس مبارک دعاء کا جو اثر ظاہر ہوا......اس بارے میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: فَأقبَلَتِ الدُّنيَا عَلَيَّ ، حَتَّىٰ رَأَيتُنِي لَو رَفَعتُ حَجَراً لَتَوَقَّعتُ أن أجِدَ تَحتَهُ ذَهَباً أو فِضَّةً ۔ یعنی''اس دعائے خیر کے بعد دنیاوی نعمتیں خود بخود میرے پاس آتی ہی چلی گئیں، یہاں تک کہ مجھے یہ گمان ہونے لگا کہ اگر میں کوئی پتھر بھی اٹھاؤں گا تو اس کے نیچے سے میرے لئے سونا یا چاندی برآمد ہوگا''۔

☆ ہجرتِ مدینہ کے بعد جلد ہی جب غزوات کی نوبت آئی تو حق و باطل کے درمیاں پہلی یادگار جنگ یعنی ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر، اور پھر دوسری جنگ ''اُحد'' کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شریک' بلکہ پیش پیش رہے، اور شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھاتے رہے، بالخصوص ''غزوۂ اُحد'' کے موقع پر جب مسلمان اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے، ہر طرف افراتفری پھیل گئی، تب اس نازک ترین صورتِ حال میں مٹھی بھر چند افراد جو رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ موجود تھے، انہی میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اس موقع پر انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھائیں، بہت چوٹیں کھائیں، تلواروں اور تیروں کے بہت سے زخم لگے، لیکن ان کی بہادری اور ثابت قدمی میں کوئی فرق نہ آیا، پائے استقامت میں ذرہ برابر لغزش نہیں آئی......اور پھر جنگ کے اختتام پر جب میدانِ جنگ سے نکلے تو کیفیت یہ تھی کہ جسم کے

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

کوئی دھوم دھڑ کا نہیں ہے، فضول خرچی اور جھوٹی شان وشوکت کا وہاں کوئی تصور نہیں ہے......رسول اللہ ﷺ تک کو بھی خبر ہی نہ ہوسکی......لیکن کوئی شکوہ نہیں، کوئی رنجش نہیں...... یقیناً اس سادگی میں امت کیلئے بڑا لمحۂ فکریہ ہے۔

مختلف مقامات پر بیس سے زیادہ کاری زخم لگے ہوئے تھے۔

''بدر'' اور پھر ''اُحد'' کے بعد بھی رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شریک رہے، بلکہ پیش پیش رہے، اور شجاعت وجرأت کے خوب جوہر دکھاتے رہے۔

☆ سن چھ ہجری میں رسول اللہ ﷺ نے ''دُومۃ الجندل'' کی جانب لشکر کی روانگی کے وقت حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو اس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا، اس موقع پر آپ ﷺ نے نہایت شفقت ومحبت کے ساتھ خود اپنے دستِ مبارک سے ان کے سر پر عمامہ باندھا، اور پھر دعائے خیر وبرکت کے ساتھ انہیں روانہ فرمایا۔ (۱)

☆ یوں دینِ اسلام کی سربلندی کی خاطر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ روزِ اول سے ہی قدم قدم پر مصائب وآلام کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے...... ہجرتِ حبشہ ہو...... یا ہجرتِ مدینہ...... مشرکین ومخالفین کے خلاف غزوات ہوں ...... یا کوئی بھی موقع ہو...... ہر موقع پر...... اور ہر آزمائش میں...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ بے مثال استقامت اور جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے رہے، آزمائش کی ہر گھڑی

(۱) ''دومۃ الجندل'' مدینہ منورہ سے شمال کی جانب تقریباً چھ سو کلومیٹر کے فاصلے پر سعودی عرب کے موجودہ شہر ''الجوف'' کے قریب واقع ہے۔ عہدِ نبوی میں اس علاقے کی جانب متعدد بار لشکر روانہ کئے گئے تھے، جن میں سے ایک موقع پر (سن پانچ ہجری میں) خود رسول اللہ ﷺ بھی شریک تھے، جبکہ اس کے بعد سن چھ ہجری میں دوبارہ لشکر روانہ کیا گیا تھا حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی سپہ سالاری میں۔ ملاحظہ ہو: الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، باب: عبدالرحمٰن۔ الرقم المسلسل: [۱۵۳۰]۔ ص: ۴۴۲۔ نیز: البدایہ والنہایہ لابن کثیر، ج: ۴۔ فصل فی السرایا التی کانت فی سنۃ ست من الہجرۃ۔

میں بڑی سے بڑی سے قربانی پیش کرنے کیلئے ہمہ وقت آمادہ وتیار رہے۔

☆جس طرح مختلف غزوات کے موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ پیش پیش رہے اور جسمانی طور پر تکالیف اور ہر قسم کی صعوبتیں ومشقتیں برداشت کرتے رہے......اس سے بھی بڑھ کر قابلِ ذکر' اِن کی وہ قربانیاں ......اور......وہ خدمات ہیں جو ہمیشہ ہر موقع پر یہ اپنے ''مال ودولت'' کے ذریعے انجام دیتے رہے، رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے جو دعائے خیر وبرکت فرمائی تھی......اس کے نتیجے میں دیکھتے ہی دیکھتے بڑی سرعت کے ساتھ ان کے مال میں خیر وبرکت کے آثار خوب نظر آنے لگے تھے، خوب فراوانی اور خوشحالی تھی، اللہ کے دیئے ہوئے اس مال میں سے عبدالرحمٰن بن عوفؓ ہمیشہ اللہ کے بندوں کی فلاح وبہبود کی خاطر......نیز اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر......خصوصاً مختلف غزوات کے موقع پر خوب دل کھول کر، اور بڑی ہی سخاوت وفیاضی کے ساتھ مال ودولت خرچ کرتے رہے......اور یوں راہِ حق میں جسمانی قربانیوں کے ساتھ ساتھ مالی قربانیوں کی بھی ایک طویل داستان رقم کر گئے۔

خصوصاً سن ۹ ہجری میں پیش آنے والے تاریخی غزوۂ تبوک کے موقع پر جب قحط کا زمانہ چل رہا تھا، مال واسباب' اسلحہ' خوارک' غرضیکہ ہر لحاظ سے بڑی تنگی وعسرت کا سامنا تھا(۱) اس موقع پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے دوسو اُوقیہ خالص سونا بطورِ تعاون پیش کیا تھا(۲)

☆اور پھر یہ لشکر رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت مدینہ سے اپنی منزلِ مقصود یعنی ''تبوک'' کی

(۱) جیسا کہ خود قرآن کریم میں اس موقع کیلئے ''ساعۃ العسرۃ'' یعنی مشکل کی گھڑی کے الفاظ وارد ہوئے ہیں ملاحظہ ہو:﴿لَقَد تَابَ اللّٰهُ ...... الَّذِينَ اتَّبَعُوهُ فِي سَاعَةِ العُسرَةِ ......﴾ سورۃ توبہ،آیت:[۱۱۷]

(۲) ایک اوقیہ تقریباً ۳۰ گرام کے برابر ہے۔دوسو اوقیہ یعنی تقریباً چھ ہزار گرام۔

جانب رواں دواں ہوگیا، یہ طویل ترین مسافت طے کرنے بعد جب یہ لشکر تبوک پہنچا تو وہاں ایک اور بہت بڑی فضیلت وسعادت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی منتظر تھی۔

ہوا یہ کہ ایک روز جب فجر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا، رسول اللہ ﷺ قضائے حاجت کی غرض سے کچھ دور تشریف لے گئے تھے، جبکہ اسلامی لشکر میں موجود سب ہی افراد وہاں نماز باجماعت کی غرض سے موجود تھے......ایسے میں یہ اندیشہ پیدا ہونے لگا کہ کہیں نمازِ فجر کا وقت نہ نکل جائے، اب سب ہی لوگ تشویش میں مبتلا ہو گئے، کچھ لوگوں نے اصرار کیا کہ ہمیں نماز قضاء نہیں کرنی چاہیے، رسول اللہ ﷺ کو شاید کسی وجہ سے تاخیر ہوگئی ہے، اگر آپؐ کو اس بات کا علم ہوگا کہ ہم سب نے محض آپؐ کے انتظار میں نماز قضاء کردی ہے، تو یقیناً آپؐ ناراض ہوں گے، لہٰذا ہمیں اب نماز پڑھ لینی چاہیے۔

جبکہ دیگر کچھ لوگوں کا اصرار یہ تھا کہ ہمیں بہرصورت رسول اللہ ﷺ کا انتظار کرنا چاہیے......

یہی صورتِ حال جاری تھی کہ اس دوران کچھ لوگوں نے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ سے امامت کیلئے خوب اصرار کیا......اور پھر تقریباً زبردستی انہیں امامت کیلئے آگے بڑھا دیا، جس پر حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز باجماعت کا آغاز ہوا۔

اسی دوران رسول اللہ ﷺ بھی تشریف لے آئے......اور تب آپؐ نے دیگر تمام افراد کی طرح عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ہی اُس روز نمازِ فجر ادا کی......اور یوں اس تاریخی ''غزوۂ تبوک'' کے موقع پر یہ اتنی بڑی سعات بھی ان کے حصے میں آئی۔(۱)

(۱) رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے آخری دنوں میں جب خود آپؐ کے حکم پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسجد نبوی میں امامت کا فریضہ انجام دیا کرتے تھے......اُن دنوں ایک بار جب آپؐ کو اپنی طبیعت میں قدرے افاقہ محسوس ہوا تھا تو آپؐ ایک طرف اپنے محترم چچا حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر......)

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں یوں ہمیشہ ہی آپؐ کے ساتھ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ کا یہ تعلقِ خاطر، یہ محبتیں اور قربتیں اسی طرح برقرار رہیں اور اسی کیفیت میں شب وروز کا یہ سفر جاری رہا۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ نہایت ذوق وشوق اور اہتمام والتزام کے ساتھ آپؐ کی خدمت میں حاضری، خدمت گذاری، علمی استفادہ، اور کسبِ فیض میں مشغول ومنہمک رہے...... اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی ان کیلئے محبتوں اور عنایتوں کا مبارک سلسلہ ہمیشہ جاری رہا، آپؐ تادمِ آخر ان سے انتہائی مسرور ومطمئن رہے...... یہاں تک کہ اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ گذر گیا۔

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

دوسری طرف اپنے چچازاد اور داماد یعنی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے کندھوں کا سہارا لئے ہوئے مسجد تشریف لائے تھے، اس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امامت کر رہے تھے، انہوں نے جب آپؐ کے قدموں کی آہٹ محسوس کی تو نماز میں ہی اپنی جگہ سے پیچھے ہٹنے لگے، جس پر آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں پیچھے نہ ہٹنے کا اشارہ کیا...... پھر آپؐ حضرت ابوبکرؓ کی دائیں جانب بیٹھ کر نماز میں شامل ہو گئے، اور اب اس نماز کی کیفیت یہ ہوئی کہ حضرت ابوبکرؓ آپؐ کی اقتداء کرنے لگے، جبکہ تمام مقتدی حضرت ابوبکرؓ کی تکبیروں پر نماز ادا کرنے لگے۔

مقصد یہ کہ اُس موقع پر خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کی اقتداء کرنے لگے......

جبکہ یہاں غزوۂ تبوک کے موقع پر صورتِ حال یہ پیش آئی کہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ جب نماز شروع کر چکے تھے...... تب رسول اللہ ﷺ جماعت میں شامل ہوئے اور ان کی اقتداء میں پوری نمازِ فجر ادا کی۔ ایسی مثال غالبًا اور کسی موقع پر نہیں مل سکے گی کہ کسی نبی نے غیر نبی کی اقتداء میں کوئی نماز پڑھی ہو...... واللہ اعلم۔

عہدِ نبوی کے بعد اب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی انہیں دینی، علمی، معاشرتی، سیاسی، غرضیکہ ہر حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل رہی اور انہیں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے خاص دوست، قریبی ساتھی، اور مشیرِ خاص کی حیثیت سے دیکھا جاتا رہا۔

مکہ شہر میں دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دنوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت وکوشش کے نتیجے میں ہی تو حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ مشرف باسلام ہوئے تھے، لہٰذا ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں گہری محبت وقربت یقیناً فطری چیز تھی۔

اور پھر خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی یہی حیثیت اور ممتاز ومنفرد مقام ومرتبہ برقرار رہا، یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ جب نمازِ فجر کی امامت کے دوران قاتلانہ حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہوگئے تھے، تب انہوں نے فوری طور پر نماز مکمل کرنے کی غرض سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کو اپنی جگہ آگے بڑھا دیا تھا۔

نیز اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو مسجد سے گھر منتقل کئے جانے کے بعد، اُن کی نازک حالت کے پیشِ نظر، اکابرِ صحابہ میں سے متعدد شخصیات نے جب یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیر المؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کردیجئے'' تب آپؓ نے جن چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کرلیں......ان چھ افراد میں حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ بھی شامل تھے۔

اور پھر اسی پر اکتفاء نہیں...... بلکہ مزید یہ کہ ان چھ جلیل القدر شخصیات پر مشتمل اس ''مجلسِ

شوریٰ'' کی سربراہی کیلئے حضرت عمرؓ نے ان میں سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا تھا۔(۱)

☆ یوں حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کو خود رسول اللہ ﷺ کے مبارک زمانے میں' نیز اس کے بعد خلیفۂ اول' اور پھر خلیفۂ دوم کے زمانۂ خلافت میں بھی اس معاشرے میں انتہائی قدر و منزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا...... نیز حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی وہی کیفیت اور وہی معمولات جاری رہے...... کہ...... دینِ اسلام اور مسلمانوں کی دینی و علمی' سماجی' اور بالخصوص مالی خدمات کے معاملے میں ہمیشہ پیش پیش رہے...... زمانۂ جنگ کے موقع پر اسلامی لشکر کی تیاری کیلئے گراں قدر عطیات پیش کیا کرتے...... زمانۂ امن اور عام حالات میں عام مسلمانوں کی فلاح و بہبود کیلئے انتہائی سخاوت و فیاضی' انسان دوستی' اور دریا دلی کا مظاہرہ کیا کرتے۔

ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب یہ بات تمام لوگوں میں ضرب المثل بن گئی کہ مدینہ شہر میں ہر کسی انسان کا ضرور کسی نہ کسی شکل میں عبدالرحمٰن بن عوفؓ کے مال کے ساتھ تعلق ہے...... کیونکہ ان کا یہ معمول تھا کہ مدینہ شہر میں جو خوشحال اور صاحبِ حیثیت افراد تھے' ان کیلئے یہ وقتاً فوقتاً خیرسگالی اور باہمی اخوت و محبت کے اظہار کے طور پر ہدایا و تحائف روانہ کیا کرتے، ضرورت مندوں کو روپیہ پیسہ بطورِ قرض دیا کرتے...... جو نادار اور مفلس قسم کے لوگ تھے' بڑے پیمانے پر صدقات و خیرات کے ذریعے ہمیشہ ان کی مدد و اعانت کیا کرتے تھے...... الغرض اُس دور میں مدینہ شہر میں آباد ہر شخص کا عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے مال و دولت کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں تعلق ضرور تھا، ہدایا و تحائف' قرض' اور یا پھر

(۱) باقی پانچ افراد یہ تھے: حضرت عثمان بن عفان۔ حضرت علی بن ابی طالب۔ حضرت سعد بن ابی وقاص۔ حضرت طلحہ بن عبیداللہ۔ حضرت زبیر بن العوام۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

صدقہ وخیرات کی شکل میں۔

☆ اُس معاشرے میں بالخصوص تین قسم کے افراد ایسے تھے جن پر عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ بہت زیادہ دریا دلی کے ساتھ اپنا مال ودولت خرچ کیا کرتے تھے:

پہلی قسم: تمام ''بدری'' حضرات، یعنی وہ جلیل القدر شخصیات جنہیں حق وباطل کے درمیان لڑی جانے والی اولین اوراہم ترین جنگ یعنی ''غزوۂ بدر'' میں شرکت کا شرف نصیب ہوا۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ ہمیشہ پابندی کے ساتھ ان کی خدمت میں قیمتی تحائف بھیجتے رہتے تھے۔

دوسری قسم: قبیلۂ قریش کے خاندان ''بنوزہرہ'' سے تعلق رکھنے والے افراد (کیونکہ خودعبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی خاندان ''بنوزہرہ'' سے تھا)۔(۱)

تیسری قسم: اُمہات المؤمنین، یعنی رسول اللہ ﷺ کی ازواجِ مطہرات۔ رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے بعد حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تمام امہات المؤمنین کی ضروریاتِ زندگی کا بہت زیادہ خیال رکھا کرتے تھے، ہمیشہ ان سبھی کی خدمت میں اشیائے خوردونوش ودیگر اشیائے ضرورت، نیز قیمتی ہدایا وتحائف ارسال کرتے رہنا ان کا روزمرہ کا معمول تھا، بالخصوص ہر سال حجِ بیت اللہ کے موقع پر یہ ان کے ہمراہ جاتے، دورانِ سفر ہر طرح سے ان کی ضروریات کا خیال رکھتے، خوب خدمت بجالاتے، اُن کیلئے عمدہ ترین سواریوں کا انتظام، نیز ہر طرح ان کی راحت وآرام اور قیام وطعام کا بندوبست خود اپنی ذاتی نگرانی میں کیا کرتے۔

ظاہر ہے کہ امہات المؤمنین رضوان اللہ علیہن کی خدمت اوران کی خبر گیری بذاتِ خود بہت

(۱) اسی خاندان ''بنوزہرہ'' سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب کا بھی تعلق تھا۔

بڑی سعادت تھی......مزید یہ کہ اس سے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف کی ایک اور بڑی سعادت مندی یہ بھی ظاہر ہوتی ہے کہ امہات المؤمنین کوان پرکس قدر اعتماد تھااور مکمل بھروسہ تھا۔

☆یوں ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان کیلئے جودعائے خیروبرکت فرمائی تھی، اس کے نتیجے میں ان کی خوشحالی وفراوانی میں حیرت انگیز طور پر مسلسل اضافہ ہوتا ہی چلا گیا......اور یہ اللہ کے دیئے ہوئے اس مال میں سے ہمیشہ دینِ اسلام کی سربلندی، اور مسلمانوں کی خیروخوبی کیلئے مسلسل انتہائی سخاوت وفیاضی کے ساتھ خرچ کرتے رہے۔

مگر یہ تمام مال ودولت اور روپیہ پیسہ انہیں اللہ کی یاد سے، یا دینی فرائض کی ادائیگی سے کبھی غافل نہ کرسکا، نہ ہی ان کے مزاج میں کسی قسم کی خرابی، بگاڑ، یا تکبروغرور کا سبب بن سکا۔

☆اپنی زندگی کے آخری ایام میں انہیں اکثر یہ فکر لاحق رہتی کہ اللہ نے جو مجھے اس قدر مال ودولت اور خوشحالی وفراوانی سے نواز رکھا ہے، کہیں ایسی بات تو نہیں کہ اللہ نے مجھے سب کچھ بس اسی عارضی وفانی دنیا میں ہی دے دیا ہو، اور وہاں آخرت کی ابدی ودائمی زندگی میں میرے لئے فقط محرومی ہو......یہ بات سوچ کر بہت زیادہ پریشان ہوجاتے، اکثر رقت طاری ہوجاتی......اور تب اللہ کی راہ میں مزید صدقہ وخیرات کرتے......یوں ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا یہ سلسلہ آخری ایام میں بہت زیادہ بڑھ گیا تھا۔

چنانچہ انہی دنوں (سن ۳۲ ہجری میں) یہ واقعہ بھی پیش آیا کہ جب کُل تین سو تیرہ ''بدری'' حضرات میں سے ایک سو بقیدِ حیات تھے......تب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ان (ایک سو بدری حضرات) میں سے ہر ایک کی خدمت میں نقد چار سو دینار بطورِ ہدیہ

ارسال کئے......جوکہ یقیناً بہت خطیر رقم تھی......(۱)

انہی دنوں ایک بار ملکِ شام سے ان کا تجارتی قافلہ مدینہ پہنچا، یہ قافلہ سامانِ تجارت سے لدے ہوئے سات سواونٹوں پر مشتمل تھا......بڑی تعداد میں خُدام وملازمین بھی ہمراہ تھے......مال واسباب سے لدے ہوئے یہ سات سواونٹ اوران کے چلانے اور ہنکانے والے ......ودیگر ملازمین......جب مدینہ پہنچے ......اوروہاں مختلف گلیوں اورمحلوں سے گذرتے ہوئے جب یہ سب آگے بڑھ رہے تھے......توان کی نقل وحرکت اورشوروغل کی وجہ سے عجب سماں بندھ گیا......ہرکوئی گھر سے نکل کر حیرت سے اس قافلے کو تکنے لگا......

ایسے میں کسی نے اس قافلے کی جانب دیکھتے ہوئے عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے بارے میں کوئی ایسی بات کہی جس سے یہ مفہوم سمجھ میں آتا تھا کہ ''عبدالرحمٰن بن عوف تو بس اب دنیاداری میں ہی کھوکر رہ گئے ہیں......''

جلد ہی یہ بات کسی طرح عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ تک پہنچ گئی......ابھی وہ قافلہ مدینہ شہر میں اپنی آخری منزل تک پہنچا بھی نہیں تھا......مال واسباب ان اونٹوں سے اتارنے کی ابھی نوبت بھی نہیں آئی تھی......کہ کسی تاخیر کے بغیر فوراً ہی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنی جگہ سے اٹھے، اورنہایت سرعت وبے چینی کی کیفیت میں اس قافلے کے پاس پہنچے، اوروہاں موجود تمام افراد کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یہ الفاظ کہے: ''لوگو! تم سب گواہ رہنا کہ میں اپنے یہ تمام (سات سو) اونٹ بمع سامان' اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں......''

(۱) اُس زمانے کا دینار (جسے اصطلاح میں اسلامی دینار کہا جاتا ہے) ساڑھے چار گرام خالص سونے کے برابر تھا (400X4.5=1800) ایک سو افراد میں سے ہرایک کو چار سو دینار......یعنی اٹھارہ سو گرام خالص سونے کے برابر......

شب وروزاور ماہ وسال کا یہ سفر جاری رہا......سن ۳۲ ہجری میں ایک دن جب حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے روزہ رکھا ہوا تھا......افطار کا وقت جب قریب آیا، خادم نے افطار کا سامان اور کھانا وغیرہ پیش کیا......اس کھانے پر جب نظر پڑی تو انتہائی اداس ہوگئے، مزاج پر رقت طاری ہوگئی، دسترخوان پر کچھ مہمان بھی موجود تھے، انہوں نے جب ان کی یہ اچانک افسردگی و پریشانی دیکھی تو اس چیز کی وجہ دریافت کی......

تب عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی آنکھوں سے آنسو چھلکنے لگے......اور گلوگیر آواز میں یوں گویا ہوئے: ''مصعب بن عمیر تو مجھ سے بہت اچھے تھے......اللہ کے ہاں ان کا مقام و مرتبہ مجھ سے زیادہ تھا......لیکن اس کے باوجود کیفیت یہ ہوئی کہ آج سے تقریباً تیس سال قبل ''اُحد'' کے میدان میں رسول اللہ ﷺ کی معیت میں جب ہم انہیں کفن پہنا رہے تھے، تب کیفیت یہ تھی کہ ہم ان کا سر ڈھانپتے تو پاؤں ظاہر ہوجاتے...... پاؤں ڈھانپنے کی کوشش کرتے تو سر اور چہرہ ظاہر ہوجاتا......آخر اس ناکام کوشش کے بعد......بس اسی طرح، اس ادھورے اور پھٹے پرانے سے کفن میں ہی ہم نے انہیں سپردِ خاک کردیا......حالانکہ وہ تو مجھ سے بہت اچھے تھے......مگر پھر بھی اس حالت میں وہ دنیا سے رخصت ہوئے۔

اتنا کہنے کے بعد عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ خوب پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے...... اور پھر تھوڑی دیر بعد جب طبیعت کچھ سنبھلی تو یوں بولے ''مصعب بن عمیر کا تو یہ حال......جبکہ میرے پاس یہ اس قدر مال ودولت کی فراوانی......کہیں ایسا نہو کہ اللہ نے مجھے سب کچھ بس یہیں اس فانی وعارضی دنیا میں ہی دے دیا ہو......اور وہاں آخرت میں میرے لئے اب کچھ نہو......نہ جانے وہاں اللہ کے پاس میرا اب کیا بنے گا......؟'' (۱)

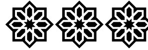
(۱) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات [۳۷۹-۳۹۶] پر ملاحظہ ہو۔

یہ سوچ تھی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی......اور یہ جذبہ تھا......جس کی وجہ سے مال و دولت کی فراوانی وخوشحالی اور ہر قسم کے دنیاوی مال واسباب کی بہتات کے باوجود ان کے مزاج میں کسی خرابی کی بجائے......اوران کے اخلاق وکردار میں کسی فساد کی بجائے......اپنے اللہ کے ساتھ تعلق مزید مضبوط و مستحکم کرنے کی لگن......اللہ کے سامنے جوابدہی کا ہمہ وقت احساس......نیز اللہ کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک اوران کی مدد واعانت کا جذبہ ہر گذرتے ہوئے لمحے کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا ہی چلا گیا۔

اسی کیفیت میں آتے جاتے موسموں کا یہ سفر جاری رہا......آخر سن ۳۲ ہجری میں ۷۵ سال کی عمر میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہو گیا......خلیفۂ وقت امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ، حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ، حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ، ودیگر متعدد کبارِ صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین نے مل کر تجہیز وتکفین کے فرائض انجام دیئے، نمازِ جنازہ ان کی وصیت کے مطابق خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے پڑھائی......اور پھر مدینہ منورہ کے قبرستان ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا......

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ انتہائی عظیم المرتبت اور جلیل القدر صحابی حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ اپنے اللہ سے جا ملے......

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے درجات بلند فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۲۳/ ذوالحجہ ۱۴۳۵ھ، مطابق ۱۷/ اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا تعلق شہر مکہ میں قبیلۂ قریش کے مشہور خاندان ''بنوزہرہ'' سے تھا، اسی خاندان سے رسول اللہ ﷺ کی والدہ ماجدہ آمنہ بنت وہب کا بھی تعلق تھا......مزید یہ کہ ان دونوں شخصیات (یعنی رسول اللہ ﷺ کی والدہ اور سعد بن ابی وقاص) میں قرابت داری کا تعلق بھی تھا۔

☆ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ''السابقین الأولین''، یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے، یعنی وہ عظیم ترین افراد جنھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا......یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں، اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆ مزید یہ کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ''، یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ شہر مکہ میں جب ''نورِ نبوت'' چمکا اُن دنوں سعد محض سولہ برس کے نوجوان تھے...... اگرچہ ان کی زندگی کا وہ نوجوانی کا دور تھا، کہ جب مزاج میں عموماً بے فکری اور لا اُبالی پن کا غلبہ ہوا کرتا ہے......غور وفکر کی طرف زیادہ رجحان نہیں ہوتا......لیکن اس کے باوجود سعد اکثر غور وفکر میں ڈوبے رہتے......مجموعی طور پر وہ اپنی قوم کی عادات، ان کے عقائد ونظریات، نیز ان کی اخلاقی ومعاشرتی کیفیات سے قطعاً مطمئن نہیں تھے۔

اسی دوران جب وہاں شہر مکہ میں کفر وشرک اور معصیت وضلالت کی تاریکیوں کے درمیان ''نورِ نبوت'' جگمگانے لگا......تب بہت جلد ہی اس نور کی کرنیں نوجوان سعد کے دل کو بھی منور کرنے لگیں......

ایک روز سعد نے خواب میں خود کو اس کیفیت میں دیکھا کہ چہار سو بہت گہرا اندھیرا چھایا ہوا ہے......اور اس اندھیرے میں وہ نہایت پریشانی کے عالم میں بھٹکتے پھر رہے ہیں......پھر اچانک ایک روشنی نظر آئی' جسے دیکھ کر یہ خوش ہونے لگے......جب یہ اُس روشنی کی طرف بڑھے تو انہیں اس میں تین انسانی سائے دکھائی دیئے،مزید قریب جا کر جب دیکھا تو انہوں نے انہیں پہچان لیا......وہ زید بن حارثہ' علی بن ابی طالب' اور ابوبکر صدیق (رضی اللہ عنہم اجمعین) تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کے کافی خوشگوار مراسم تھے،چنانچہ اگلے ہی روز جب ان سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے اپنا وہ خواب ان کے سامنے بیان کیا......جس پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں بہت کچھ بتایا......رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بارے میں انہیں مطلع کیا،اور اس حقیقت سے بھی انہیں آگاہ کیا کہ ہم تین افراد جنہیں تم نے خواب میں اندھیرے کی بجائے روشنی میں دیکھا ہے،ہم تینوں (زید بن حارثہ' علی بن ابی طالب' اور خود ابوبکر صدیق) کفر وشرک کے اندھیروں سے نکل کر اب ''ایمان'' کی روشنی میں آچکے ہیں......

اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے انہیں بھی قبولِ اسلام کی دعوت دی......تب انہیں اپنا وہ خواب مزید شدت کے ساتھ یاد آنے لگا......اور پھر کسی تردد کے بغیر یہ اپنے دوست ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی معیت میں روانہ ہوگئے......

اُس وقت رسول اللہ ﷺ مکہ شہر کے مشہور محلّہ ''اجیاد'' میں ایک پہاڑی گھاٹی میں تشریف فرما تھے، یہ دونوں حضرات جب وہاں پہنچے تو انہوں نے دیکھا کہ اُس وقت دونو جوان' یعنی زید بن حارثہ' اور علی بن ابی طالب (رضی اللہ عنہما) بھی وہیں آپؐ کی خدمت میں موجود تھے۔

چنانچہ سعد بن ابی وقاص نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا، رسول اللہ ﷺ کے سامنے کلمۂ حق پڑھتے ہوئے دینِ اسلام قبول کیا......رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد وہ محض ساتواں دن تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے اس نوجوان سعد بن ابی وقاص کے قبولِ اسلام پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا......آپ ﷺ کو اس نوجوان کی شخصیت میں شرافت ونجابت کے آثار بہت نمایاں نظر آرہے تھے......آپ ﷺ کی دوررس نگاہیں سعد کے سراپا میں مستقبل کی ایک بہت ہی عظیم اور تاریخ ساز شخصیت کا مشاہدہ کررہی تھیں......آپ ﷺ کو مکمل یقین ہو چلا تھا کہ پہلی رات کا یہ چھوٹا سا چاند......بہت جلد چودھویں کے چاند کی مانند پوری آب وتاب کے ساتھ اُفق پر جگمگائے گا......

مزید یہ کہ آپ ﷺ کو اس بات کا علم تھا کہ اس نوجوان کا آپ ﷺ کی پیاری والدہ کے ساتھ کچھ رشتے داری کا تعلق بھی تھا......یوں گویا سعد آپ ﷺ کیلئے ایک طرح ''ماموں'' کی حیثیت بھی رکھتے تھے......عمر میں تو اگر چہ یقیناً سعد آپؐ سے کافی چھوٹے ہی تھے، لیکن بہر حال رشتے میں ''ماموں'' تھے، اور ''ماموں'' تو سبھی کو بہت ہی اچھے لگا کرتے ہیں...... خصوصاً جبکہ ''ماں'' کا انتقال بھی ہو چکا ہو......

لہٰذا رسول اللہ ﷺ کو بھی اپنے ماموں ''سعد'' بہت ہی اچھے لگتے تھے......یہی وجہ تھی کہ

آئندہ چل کر ایک بار کافی بعد کے زمانے میں جب آپؐ اپنے کچھ ساتھیوں کے ہمراہ کسی جگہ تشریف فرما تھے......ایسے میں دور سے سعد آتے ہوئے دکھائی دیئے......تب آپؐ نے اپنے ان ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے بیساختہ یہ الفاظ کہے: هٰـذَا خَـالِـي...... فَلیُرِنِي امرُؤٌ خَالَهٗ...... یعنی ''دیکھو......یہ میرے ماموں چلے آرہے ہیں......ہے کوئی جو اِن جیسا اچھا ماموں مجھے دکھا سکے......'' مقصد یہ کہ میرے ماموں کی تو بس شان ہی نرالی ہے......ہے کوئی جسے ایسا اچھا ماموں نصیب ہو......؟؟

☆ ''السابقین الاولین'' یعنی دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں دعوتِ حق پر لبیک کہنے والے دیگر تمام افراد کی طرح سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو بھی بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا......تاہم ان ''بیرونی مشکلات'' اور قدم قدم پر مختلف انواع واقسام کی آزمائشوں کے علاوہ ان کیلئے مزید ایک بہت بڑی آزمائش خود ان کے گھر کے اندر سامنے آکھڑی ہوئی......

وہ مشکل ترین اور اعصاب شکن قسم کی آزمائش یہ تھی کہ سعد اپنے ماں باپ کے انتہائی لاڈلے اور چہیتے تھے، خصوصاً اپنی ماں کے ساتھ انہیں بہت زیادہ محبت تھی......لمحہ بھر کیلئے بھی انہیں ماں کی جدائی گوارا نہیں تھی......

سعد کی ماں کو جب اپنے لاڈلے نورِ نظر کے قبولِ اسلام کی خبر ملی تو وہ بہت زیادہ خفا ہوگئی...... اپنے بیٹے کو بہت سمجھایا کہ ''دیکھو! اپنے باپ دادا کے دین سے منہ نہ موڑو......'' لیکن سعد پر کوئی اثر نہ ہوا......آخر سعد کی ماں نے کھانا پینا چھوڑ دیا، روز بروز نقاہت بڑھتی گئی، اور صحت بگڑتی چلی گئی......سعد سے یہ منظر دیکھا نہیں جاتا تھا۔

آخر ایک روز سعد کی ماں نے اپنے لاڈلے بیٹے کو اپنے قریب بٹھایا...... پیار سے سر پر ہاتھ

پھیرا......اور پھر ڈبڈباتی آنکھوں اور حسرت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے بولی: يَا بُنَيَّ ! لَتَدَعَنَّ دِينَكَ الجَدِيدَ ...... أو لَا آكُل وَ لَا أشرَب حَتّىٰ أمُوت، فَيَتَفَطَّر فُؤادُكَ حُزناً عَلَيَّ ، وَيَأكُلُكَ النَدَمُ عَلَىٰ فِعلَتِكَ الّتِي فَعَلتَ ، وَتُعَيّرُكَ النَّاسُ بِهَا أبَدَ الدَّهرِ...... یعنی ''اے میرے بیٹے! تم اپنا یہ نیا دین چھوڑ دو......ورنہ یاد رکھنا کہ میں ہرگز ہرگز نہ کچھ کھاؤں گی نہ کچھ پیوں گی......یہاں تک کہ اسی طرح میں موت کے منہ میں چلی جاؤں گی......تب میری اس طرح موت کے غم میں تمہارا دل چھلنی ہو جائے گا......غم تمہیں کھا جائے گا......رہتی دنیا تک ہمیشہ ہمیشہ لوگ تمہیں طعنہ دیا کریں گے......''

یعنی لوگ تمہیں ہمیشہ اس بات کا طعنہ دیا کریں گے کہ تمہاری وجہ سے تمہاری ماں کا اس قدر افسوسناک انجام ہوا......ان طعنوں سے تم کبھی اپنی جان نہیں چھڑا سکو گے......اس غم کی وجہ سے تمہارا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا......اور تم زندگی بھر کیلئے ضمیر کے قیدی بن کر رہ جاؤ گے......!

ظاہر ہے کہ سعد کیلئے یہ بہت تکلیف دہ صورتِ حال تھی، ماں کی حالت دیکھی نہیں جاتی تھی، کئی دن گذر گئے......سعد بار بار ماں کی خوشامد کرتے......منت سماجت کرتے......کہ ''ماں کچھ کھا لو......کچھ پی لو......'' مگر ماں بھی اپنے فیصلے پر قائم رہی......اور یوں شب و روز گذرتے چلے گئے......

آخر ایک روز سعد نے اپنی ماں کو مخاطب کرتے ہوئے پُرعزم اور فیصلہ کن انداز میں یوں کہا: يَا أُمّاه......اِنّي عَلَىٰ شَدِيدِ حُبّي لَكِ ......لَأشَدُّ حُبّاً لِلّهِ وَرَسُولِهِ ...... یعنی ''اے امی جان......بیشک مجھے آپ سے بہت شدید محبت ہے......مگر اس سے بھی بڑھ

کہ میرے دل میں اللہ اور رسول کیلئے محبت ہے......''

سعد کی ماں نے جب اپنے بیٹے کی زبانی یہ الفاظ سنے......اس کا یہ عزم دیکھا، اور دوٹوک فیصلہ جان لیا......تب وہ سمجھ گئی کہ اس کا لاڈلا بیٹا دینِ اسلام سے اب کبھی برگشتہ ہونے والا نہیں......لہٰذا اس نے اپنی ضد چھوڑ دی اور معمول کے مطابق کھانا پینا شروع کر دیا......

بیشتر مفسرین کے بقول اسی واقعے کی وجہ سے ہی قرآن کریم کی یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿وَوَصَّينَا الاِنسَانَ بِوَالِدَيهِ حَمَلَتهُ أُمُّهٗ وَهناً عَلَىٰ وَهنٍ وَّفِصَالُهٗ فِي عَامَينِ أنِ اشكُرلِي وَلِوَالِدَيكَ اِلَيَّ المَصِيرُ وَاِن جَاهَدَاكَ عَلَىٰ أَن تُشرِكَ بِي مَا لَيسَ لَكَ بِهٖ عِلمٌ فَلَا تُطِعهُمَا وَصَاحِبهُمَا فِي الدُّنيَا مَعرُوفاً وَاتَّبِع سَبِيلَ مَن أَنَابَ اِلَيَّ ثُمَّ اِلَيَّ مَرجِعُكُم فَأُنَبِّؤُكِم بِمَا كُنتُم تَعمَلُونَ﴾ (۱)

ترجمہ: (ہم نے انسان کو اس کے ماں باپ کے متعلق یہ تاکید کی ہے......[کیونکہ] اس کی ماں نے کمزوری پر کمزوری برداشت کر کے اسے پیٹ میں رکھا، اور دو سال میں اس کا دودھ چھوٹتا ہے......کہ تم میرا شکر ادا کرو اور اپنے ماں باپ کا، تم سب کو آخر میری ہی طرف لوٹ کر آنا ہے۔ اور اگر وہ تم پر یہ دباؤ ڈالیں کہ تم میرے ساتھ کسی کو شریک قرار دو جس کی تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں، تو ان کی بات نہ مانو، اور دنیا میں ان کے ساتھ بھلائی سے رہو، اور ایسے شخص کا راستہ اپناؤ جس نے میرے ساتھ لَو لگا رکھی ہو، پھر تم سب کو میرے ہی پاس لوٹ کر آنا ہے، اُس وقت میں تمہیں بتاؤں گا کہ تم کیا کرتے رہے ہو)۔

مقصد یہ کہ ان آیات میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے انسان کو اپنے والدین کے ساتھ حسنِ سلوک اور اطاعت وفرمانبرداری کی تاکید کی گئی ہے، ہاں البتہ اگر وہ اپنی اولاد کو اللہ

(۱) لقمان [۱۴-۱۵]

کے ساتھ شرک پر مجبور کریں (جیسا کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ صورتِ حال پیش آئی تھی) تب اس بارے میں ان کی اطاعت نہ کی جائے......مگر اس کے باوجود دنیاوی زندگی میں ان کے ساتھ خوش اخلاقی اور خوش اسلوبی کا معاملہ ہی رکھا جائے، ان کی دل آزاری اور ان کی شان میں گستاخی و بدسلوکی سے مکمل اجتناب کیا جائے (اگرچہ وہ مشرک ہوں، بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اولاد کو بھی اللہ کے ساتھ شرک پر مجبور بھی کرتے ہوں)۔

چنانچہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنی ماں کی طرف سے دینِ اسلام سے دستبرداری و بیزاری کا یہ مطالبہ تو تسلیم نہیں کیا......البتہ وہاں مکی زندگی میں وہ مسلسل اپنے والدین کے ساتھ ہی رہے اور ہر طرح ان کی خدمت اور خبر گیری کے فرائض بحسن وخوبی انجام دیتے رہے۔

☆ سعد کا ایک چھوٹا بھائی تھا، جس کا نام ''عُمیر'' تھا، اس دوران سعد کی کوششوں کے نتیجے میں وہ بھی مسلمان ہو گیا تھا......اور یہ چیز سعد کیلئے بہت ہی مسرت اور حوصلہ افزائی کا سبب بنی تھی۔

☆ دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں وہاں مکہ شہر میں اسی طرح شب و روز کا یہ سفر جاری رہا، آزمائشوں کے سلسلے بھی چلتے رہے......آخر اسی کیفیت میں نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ایک روز اپنا آبائی وطن چھوڑا......اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر باد کہا......اپنے عزیز و احباب......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انتہائی محبت کرنے والے وہ ماں باپ......ان سبھی کو چھوڑ دیا......اللہ اور اس کے رسول ؐ کی محبت کے مقابلے میں ان تمام محبتوں کو قربان کر دیا، اور محض اپنے کم سن چھوٹے بھائی

عُمیر کا ہاتھ تھامے ہوئے مکہ شہر سے روانہ ہو گئے......اور مسلسل سفر کرتے ہوئے یہ دونوں بھائی اسی طرح ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے ہوئے آخر......ایک نئی جگہ......اور ایک نئی منزل پر جا پہنچے......یعنی مدینہ منورہ...... جہاں ایک نئی صبح کا سورج طلوع ہوا اور یوں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

☆ ہجرتِ مدینہ کے بعد دوسرے سال ہی مشرکینِ مکہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی حسرت دل میں لئے ہوئے جب مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ ہوئے...... یہ اطلاع ملنے پر مسلمان بھی مدینہ سے روانہ ہوئے......''بدر'' کے مقام پر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین اولین معرکہ پیش آیا......اس موقع پر دیگر تمام اہلِ ایمان کی طرح حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی...... اپنے چھوٹے بھائی عمیر کا ہاتھ تھامے ہوئے ......مدینہ سے بدر پہنچے ...... بڑا بھائی اور چھوٹا بھائی......اُس روز دونوں ہی کا جذبہ قابلِ دید تھا......لیکن جنگ کے آغاز سے قبل ان سر بکف مجاہدین کی صفیں مرتب کرتے وقت رسول اللہ ﷺ کی نظر جب عمیر پر پڑی......تو آپؐ نے اس کی کم سنی کے باعث اسے واپس لوٹ جانے کو کہا......تب عمیر نے رونا شروع کر دیا...... یہ کیفیت دیکھ کر آخر آپؐ نے اسے واپس بلا لیا اور اس کی کم سنی کے باوجود اس تاریخی غزوے میں شرکت کی اجازت مرحمت فرما دی۔ معمولی جھڑپوں کے بعد آخر جب عام یلغار ہوئی ،تو جذبۂ سرفروشی سے سرشار یہ دونوں بھائی بڑی ہی بے جگری سے لڑے،اور خوب ثابت قدمی وبہادری کا مظاہرہ کیا۔ اور پھر جنگ کے اختتام پر جب بدر کے میدان سے مدینہ کی طرف واپسی کا مرحلہ آیا تو اب اس مرحلے پر سعد اکیلے تھے......کم سن عمیر کو اس اولین غزوے میں اللہ کے حبیب ﷺ کے جھنڈے تلے لڑتے ہوئے......شہادت کا عظیم رُتبہ نصیب ہوا تھا......لہٰذا سعد......جو کہ

مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے وقت اپنے چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے ہوئے روانہ ہوئے تھے......اور پھر اس غزوۂ بدر کیلئے مدینہ سے روانگی کے موقع پر بھی اُس کا ہاتھ تھامے ہوئے ہی نکلے تھے......لیکن اب بدر سے واپس مدینہ روانگی کا جب موقع آیا......تو اب سعد تنہا ہی تھے......افسردہ ......اور......رنجیدہ......چھوٹے بھائی عمیر کو بدر کے میدان میں ہی سپردِ خاک کرتے ہوئے ......اللہ ارحم الراحمین کے حوالے کیا......اور پھر اس کی یادوں کا طوفان دل میں چھپائے ہوئے ......جدائی کا درد آنکھوں میں سجائے ہوئے ...... بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیئے ......اور پھر اسی کیفیت میں سعد واپس مدینہ پہنچے......جبکہ چھوٹا بھائی عمیر ہمیشہ کیلئے بس وہیں ''بدر'' میں ہی رہ گیا......(۱)

☆مشرکینِ مکہ کو بدر کے میدان میں مسلمانوں کے ہاتھوں جس بدترین شکست وپسپائی اور ذلت ورسوائی کا سامنا کرنا پڑا تھا......اس پر مسلمانوں سے اپنی اس شکست کا انتقام لینے کی غرض سے اگلے ہی سال (سن تین ہجری میں) وہ دوبارہ چلے آئے، چنانچہ مدینہ شہر سے متصل مشہور ومعروف ''اُحد'' نامی پہاڑ کے دامن میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین یہ دوسری جنگ لڑی گئی۔

ابتداء میں مسلمان یہ جنگ تقریباً جیت ہی چکے تھے......لیکن پھر اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے ان کی یہ فتح شکست میں تبدیل ہوگئی......تب مسلمان اپنی صفوں میں نظم وضبط برقرار نہ رکھ سکے......باہم رابطہ بھی منقطع ہوگیا......لشکر میں ہر طرف بدنظمی اور افراتفری پھیل گئی......اور یوں مسلمانوں کو بڑی ہی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا......

(۱) اللہ جنت الفردوس میں ان دونوں بھائیوں کے درجات بلند فرمائے......اور ہمیں وہاں ان کی صحبت ومعیت عطاء فرمائے......

اس افراتفری کے ماحول میں کہ جب سبھی بکھر چکے تھے......سراسیمگی وانتشار کی کیفیت طاری تھی......ایسے میں مٹھی بھر چند افراد جو بدستور رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے بڑی ہی بے جگری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کر رہے تھے......ان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو یہ یادگار اور عظیم ترین شرف بھی حاصل ہے کہ دینِ اسلام کے ظہور کے بعد اللہ کی راہ میں تیر چلانے والے یہ پہلے انسان تھے......تیراندازی میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، ان کا نشانہ کبھی چوکتا نہیں تھا، اُس روز رسول اللہ ﷺ کی حفاظت ودفاع کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے ہوئے سعدؓ نے بہت زیادہ تیر چلائے، مسلسل تیراندازی کی وجہ سے اُس روز کتنی ہی کمانیں ان کے ہاتھوں میں ٹوٹیں......ان کا چلایا ہوا ہر تیر نشانے پر لگتا، اور ہر تیر کے ساتھ ہی کوئی نہ کوئی مشرک ڈھیر ہو جاتا......اُس روز ایک موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سعد کو مخاطب کرتے ہوئے یہ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے تھے: اِرمِ یَا سَعْد......فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي ...... یعنی ''اے سعد......یونہی تیر چلاتے رہو......میرے ماں باپ تم پر قربان......''

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سعد بن ابی قاص رضی اللہ عنہ کی یادداشت میں ہمیشہ کیلئے پیوست ہو کر رہ گئے......آخری سانس تک یہ الفاظ سعد کے کانوں میں گونجتے رہے، اور ان الفاظ کو یاد کر کے سعد فرطِ مسرت سے ہمیشہ جھوم جھوم اٹھتے تھے۔

اسی بارے میں حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: مَا جَمَعَ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَبَاهُ وَ أُمَّهُ اِلّا لِسَعْد ، قَالَ لَهُ يَومَ أُحُد : ((اِرمِ فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي))۔ یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے کبھی کسی کو یہ الفاظ نہیں کہے کہ ''میرے ماں باپ

تم پر قربان'' سوائے سعد کے' آپؐ نے انہیں اُحد کے موقع پر یہ الفاظ کہے''۔(۱)
اسی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے سعدؓ کیلئے یہ دعاء بھی فرمائی تھی کہ: اَللّٰھُمّ سَدِّدْ رَمیَتَہٗ وَ أَجِبْ دَعْوَتَہٗ (۲) یعنی''اے اللہ! تو سعد کے تیر کو نشانے پر لگا، اور اس کی دعاء کو قبول فرما''۔

چنانچہ آپؐ کی اسی دعاء کا یہ اثر تھا کہ سعدؓ انتہائی ماہر نشانے باز ہونے کے علاوہ مزید یہ کہ ''مستجاب الدعوات'' بھی تھے۔

''غزوۂ بدر'' اور پھر ''غزوۂ اُحد'' کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شریک رہے اور شجاعت و بہادری کے بے مثال جوہر خوب خوب دکھاتے رہے۔

☆......اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا، حتیٰ کہ ہجرت کے دسویں سال ''حجۃ الوداع'' کے تاریخی موقع پر جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ موجود تھے، تب وہاں مناسکِ حج سے فراغت کے بعد مدینہ کی جانب واپسی سے قبل ہی یہ بیمار پڑ گئے، رفتہ رفتہ ان کی بیماری کافی شدت اختیار کر گئی...... یہانتک کہ انہیں اس بات کا اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں مکہ میں ہی میری موت واقع نہو جائے...... چونکہ تمام اہلِ ایمان کیلئے یہ حکم تھا کہ وہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر جائیں......اور یہ حکم ظاہر ہے کہ فتحِ مکہ سے قبل کے زمانے میں تھا کہ جب مکہ دارالحرب تھا، جبکہ سن آٹھ ہجری میں فتحِ مکہ کا یادگار واقعہ پیش آنے کے بعد یہ حکم باقی نہیں رہا تھا......لیکن سعدؓ کو بہر حال یہ فکر لاحق ہوئی......کہ کہیں

(۱) مشکاۃ المصابیح[۶۱۱۷] باب مناقب العشرۃ، بحوالۂ ترمذی۔
(۲) مشکاۃ المصابیح[۶۱۱۵] باب مناقب العشرۃ، بحوالہ: شرح السنۃ۔

مدینہ کیلئے واپسی سے قبل ہی یہیں مکہ میں ہی میری موت واقع نہو جائے......گویا ان کے نزدیک یہ ناپسندیدہ چیز تھی۔

چنانچہ انہی دنوں ان کے شدتِ مرض کے زمانے میں وہاں مکہ میں ہی رسول اللہ ﷺ ایک روز جب خود ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے......تب درجِ ذیل صورتِ حال پیش آئی جو سعد رضی اللہ عنہ نے خود اپنی زبانی بیان کی ہے:

جَـاءَ نِـي رَسُـولُ اللّٰهِ ﷺ يَعُودُنِي عَامَ حَجَّةِ الوَدَاعِ مِن وَجَعٍ اِشتَدَّ بِي، فَـقُـلـتُ: يَا رَسُولَ اللّٰه! اِنِّي قَد بَلَغَ بِي مِنَ الوجَعِ مَا تَرىٰ ، وَأَنَا ذُو مَالٍ، وَلَا يَـرِثُنِي اِلّا ابنَةٌ لِي، أَفَأَتَصَدَّقُ بِثُلُثَي مَالِي؟ قَالَ: لَا ۔ قُلتُ : فَالشّطرُ يَا رَسُـولَ اللّٰه؟ فَقَالَ: لَا ۔ قُلتُ : فَالثُّلُثُ يَا رَسُولَ اللّٰه؟ قَالَ: الثُّلُثُ كَثِير ، اِنَّكَ اِن تَـذَر وَرَثَتَكَ أَغْـنِيَـاءَ خَيـرٌ مِن أَن تَذَرَهُم عَالَةً يَتَكَفَّفُونَ النَّاسَ ، وَاِنَّكَ لَن تُنفِق نَفَقَةً تَبتَغِي بَهَا وَجهَ اللّٰهِ اِلّا أُجِرتَ عَلَيهَا ، حَتّىٰ مَا تَجعَلُ فِـي فِيِّ امرَأَتِكَ ، قَال: فَقُلتُ : يَا رَسُولَ اللّٰه! أُخَلّفُ بَعدَ أَصحَابِي؟ قَال: اِنَّكَ لَـن تُـخَـلَّف فَتَـعـمَـلَ عَـمَلاً تَبتَـغِي بِهٖ وَجهَ اللّٰهِ اِلّا ازدَدتَ بِهٖ دَرَجَةً وَرِفـعَةً ، وَلَـعَلّكَ أَن تُخَلَّف ، حَتّىٰ يَنتَفِعَ بِكَ أَقوَامٌ ، وَيُضَرُّ بِكَ آخَرُونَ، الـلّٰهُـمّ أَمـضِ لِأَصحَابِي هِجرَتَهُم ، وَلَا تَرُدَّهُم عَلَىٰ أَعقَابِهِم، لٰكِنَّ البَائِس سَعدُ بن خَولَة ، يَرثِي لَهٗ رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ أَن مَاتَ بِمَكَّة) (۱)

ترجمہ: (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں): ''حجۃ الوداع کے سال جب

(۱) صحیح بخاری [۲۷۴۲] کتاب الوصایا۔ نیز: صحیح مسلم [۱۶۲۸] کتاب الوصیۃ، باب الوصیۃ بالثلث (الفاظ قدرے مختلف ہیں)

امام نووی نے ریاض الصالحین میں یہ حدیث [۶] باب الاخلاص واحضار النیۃ میں ذکر کی ہے۔

میں شدید بیمار ہو گیا تھا' تب رسول اللہ ﷺ میری عیادت کیلئے تشریف لائے، اُس موقع پر میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول! اس درد کی وجہ سے میری جو حالت ہو چکی ہے وہ تو آپ کے سامنے ہی ہے...... اور میں صاحبِ مال ہوں، جبکہ میری اکلوتی بیٹی (۱) کے سوا اور کوئی میرا وارث نہیں ہے، لہٰذا کیا میں اپنا دو تہائی مال [یعنی تین میں سے دو حصے] اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں'' تب میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول آدھا مال......؟ آپؐ نے فرمایا ''نہیں'' تب میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے رسول ایک تہائی مال [یعنی تین میں سے ایک حصہ]؟ آپؐ نے فرمایا ''ایک تہائی بہت کافی ہے'' (پھر آپؐ نے مزید فرمایا): اگر تم اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ کر جاؤ تو یہ بہت بہتر ہے بنسبت اس کے کہ تم انہیں مفلس و کنگال چھوڑ کر جاؤ...... کہ وہ لوگوں پر بوجھ بنے رہیں اور ان کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں..... تم جب بھی اللہ کی خوشنودی کی خاطر جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو' حتیٰ کہ جو لقمہ تم اپنی بیوی کے منہ میں ڈالتے ہو' اس پر تمہیں اللہ کی طرف سے اجر و ثواب عطاء کیا جائے گا...... تب سعد کہتے ہیں کہ ''میں نے آپؐ سے دریافت کیا'' کیا میں اپنے ساتھیوں کے بعد تنہا (یہاں مکہ میں ہی) رہ جاؤں گا؟ آپؐ نے فرمایا'' تم اگر اپنے ساتھیوں کے بعد تنہا رہ بھی گئے (تب بھی تمہارے لئے بہتری ہی ہے کیونکہ) جب بھی تم محض اللہ کی رضا کی خاطر جو بھی عمل انجام دو گے' اُس سے تمہارے درجات میں زیادتی اور بلندی ہی ہوگی، نیز شاید تمہیں (اللہ کی طرف سے اس دنیا میں) مزید زندگی عطاء کی جائے، تب کچھ لوگوں (یعنی اہلِ حق) کو تم سے فائدہ پہنچے گا جبکہ دوسرے کچھ لوگوں (یعنی اہلِ باطل) کو تم سے نقصان پہنچے گا۔ پھر آپؐ نے دعاء فرمائی:

(۱) سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی اس بیٹی کا نام ''عائشہ'' تھا۔

یا اللہ! تو میرے اصحاب کی ہجرت کو جاری (یعنی پورا) فرما دے، اور انہیں ان کی ایڑیوں کے بل واپس نہ لوٹانا، ہاں البتہ قابلِ رحم تو سعد بن خولہ ہیں، اُن کیلئے رسول اللہ ﷺ دعائے رحمت فرمایا کرتے تھے کیونکہ وہ مکہ میں ہی فوت ہوگئے تھے'' (یعنی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت نہیں کر سکے تھے)۔

☆......اس حدیث سے درجِ ذیل فوائد سمجھ میں آتے ہیں:

(۱)......رسول اللہ ﷺ کا حسنِ اخلاق اور اپنے اصحاب کی عیادت......مزید یہ کہ اس مقصد کیلئے آپؐ کا خود چل کر جانا۔

(۲)......مریض کی عیادت کی فضیلت۔

(۳)......زندگی کے ہر شعبے میں، حتیٰ کہ صدقہ وخیرات اور انفاق فی سبیل اللہ جیسے مقدس ترین کام میں بھی ''اعتدال'' کو ملحوظ رکھنا۔

(۴)......وارثوں کے حق کی اہمیت، نیز ان کیلئے فکر اور جستجو، اور انہیں دوسروں کی محتاجی ومفلسی سے بچانے کی ضرورت......نیز وارثوں کے حق کی حفاظت کی غرض سے ''ثُلُث'' یعنی محض ایک تہائی مال صدقہ یا وقف کرنے پر اکتفاء......اور اس سے زیادہ صدقہ کرنے کی ممانعت۔(۱)

(۵)......اہلِ علم سے مشاورت کی ضرورت واہمیت، جس طرح حضرت سعد بن ابی وقاص

(۱) بلکہ اہلِ علم کے بقول وارثوں کے ہوتے ہوئے ''ثلث'' یعنی ایک تہائی صدقہ یا وقف کر دینا خلافِ اولیٰ ہے، کیونکہ رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر سعد بن ابی وقاصؓ کو اس کی اجازت تو دی (جبکہ اُس وقت سعدؓ کی وارث محض ایک ہی بیٹی تھی) لیکن ساتھ ہی یہ بھی فرمایا: ''الثلث کثیر، یعنی ٹھیک ہے ایک تہائی تم صدقہ کر سکتے ہو مگر یہ بھی بہت زیادہ ہے'' لہٰذا اہلِ علم کے بقول ثلث کی اجازت تو ہے، مگر یہ خلافِ اولیٰ ہے، جبکہ رُبع یعنی چوتھائی حصہ اولیٰ یعنی بہتر ہے۔ ملاحظہ ہو: شرح ریاض الصالحین۔ از: محمد بن عثیمین: ج:اصفحہ [۶۰-۶۱]۔

رضی اللہ عنہ نے اپنا مال صدقہ کرنے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ سے مشورہ کیا اور آپؐ کی رائے معلوم کی۔

(۶)......مریض کے سامنے ایسی گفتگو کی جائے جو اس کیلئے ہمت وتقویت، تسلی، اور حوصلہ افزائی کا سبب بنے، اس پر خوشگوار نفسیاتی اثرات مرتب ہوں، امید مضبوط ہو اور مایوسی وناامیدی کا خاتمہ ہو، جیسا کہ اس موقع پر سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو موت کا اندیشہ لاحق تھا......جبکہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ایسی باتیں ارشاد فرمائیں جن سے ان کے دل میں یہ امید پیدا ہونے لگی کہ میں تو ابھی شاید کافی عرصہ مزید زندہ رہوں گا...... یہاں تک کہ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ شاید تمہیں (اللہ کی طرف سے اس دنیا میں) مزید زندگی گذارنے کا موقع دیا جائے......تب کچھ لوگوں (یعنی اہلِ حق) کو تمہارے ذریعے بڑا فائدہ، جبکہ دیگر کچھ لوگوں (یعنی اہلِ باطل) کو تمہارے ذریعے نقصان پہنچے گا''۔

نیز یہ کہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ سے یہ دریافت کیا تھا کہ ''میری محض ایک ہی بیٹی ہے، لہٰذا کیا میں اپنا دو تہائی مال اللہ کی راہ میں صدقہ کر دوں؟''

جبکہ سعدؓ کے اس استفسار کے جواب میں آپؐ نے ''مفرد'' کی بجائے ''جمع'' کے صیغے کے ساتھ یہ ارشاد فرمایا تھا کہ ''اگر تم اپنے ''وارثوں'' کو خوشحال چھوڑ کر جاؤ......'' یعنی یہ بھی ایک طرح حوصلہ افزائی تھی کہ فی الحال تو محض ایک ہی وارث ہے......لیکن آئندہ مزید وارث بھی ہو سکتے ہیں......یعنی اس مرض کے بعد ان شاء اللہ دوبارہ صحت وتندرستی......مزید آل و اولاد......اور طویل زندگی نصیب ہوگی......جو کہ کارناموں سے بھرپور بھی ہوگی......کہ اہلِ حق کو سعدؓ کے وجود سے بڑا فائدہ......جبکہ اہلِ باطل کو بڑا نقصان پہنچے گا......!(۱)

اسی کیفیت میں وقت کا سفر جاری رہا......سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ تو ابتداء سے ہی راہِ حق میں ہر قسم کی سختیوں اور آزمائشوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے چلے آ رہے تھے...... ہر آزمائش میں سرخرو اور کامیاب ہو کر نکلتے......جس کے نتیجے میں ان کا مقام و مرتبہ مزید بلند ہو جاتا......سب سے پہلے تو دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیاں......پھر خود اپنے ہی گھر کے اندر ماں کی طرف سے بھوک ہڑتال کا وہ تکلیف دہ سلسلہ......پھر گھر بار اور سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ سے ہجرت......پھر غزوۂ بدر کے موقع پر چھوٹے بھائی کی شہادت......اور اس غم پر صبر سے کام لینا اور بس اللہ سے اجر و ثواب کی امید باندھ لینا......پھر اُحد کے موقع پر دن بھر مسلسل تیر اندازی......اور پھر تکلیفوں اور آزمائشوں سے بھرپور انہی یادوں کے درمیان آخر......کانوں میں گونجتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے وہ یادگار الفاظ: اِرمِ یَـا سَـعْـد......فِدَاكَ أَبِي وَأُمِّي ...... یعنی ''اے سعد......یونہی تیر چلاتے رہو......میرے ماں باپ تم پر قربان......'' اور تب اس

حاشیہ از صفحہ گذشتہ:

(۱) اور پھر ایسا ہی ہوا......بہت سی آل واولاد......بہت سے وارث......طویل زندگی......حتیٰ کہ تمام مہاجرین میں سے سب سے آخر میں وفات......تاریخی کارنامے اور عظیم فتوحات......

یہاں یہ تذکرہ بھی مناسب ہوگا کہ اس واقعے میں اگرچہ عین ممکن ہے کہ اللہ کی طرف سے بذریعۂ وحی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کے بارے میں شاید رسول اللہ ﷺ کو یہ خبر دے دی گئی ہو کہ اللہ کو ان کیلئے ابھی طویل زندگی مقصود ہے......نیز یہ کہ آئندہ زندگی میں یہ بڑے عظیم اور تاریخی قسم کے کارنامے انجام دیں گے......تاہم اس کے باوجود مریض کی عیادت کے موقع پر اسلامی ادب بہرحال یہی ہے کہ مریض کے سامنے ایسی گفتگو ہی کی جائے جس سے اس کی طبیعت پر مثبت اور خوشگوار اثرات مرتب ہوں......

(۲) اس حدیث سے متعلق مزید تفصیلات اور فوائد کیلئے ملاحظہ ہو: شرح ریاض الصالحین۔از: محمد بن عثیمین: ج:۱ صفحہ [۴۱-۶۰] نیز: فتح القوی المتین بفوائد ریاض الصالحین۔

اتنے بڑے اعزاز کو یاد کر کے سعدؓ ماضی کی تمام تلخیوں اور مصائب و آلام کے اس تمام سلسلے کو بھول جاتے اور ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی......

وقت کا پہیہ چلتا رہا......حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری، کسبِ فیض، استفادہ، نیز آپؐ کی خدمت و پاسبانی کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا......آپؐ کی طرف سے بھی سعدؓ کیلئے محبتوں اور شفقتوں کے سلسلے مسلسل جاری رہے......حتیٰ کہ اسی کیفیت میں آپؐ کا مبارک دور گذر گیا......آپؐ تا دمِ آخر سعدؓ سے انتہائی خوش اور مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

☆......رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو وہی بلند ترین مقام و مرتبہ حاصل رہا اور اس معاشرے میں ان کی وہی قدر و منزلت برقرار رہی......خلیفۂ اول کے مشیرِ خاص اور انتہائی قریبی دوست کی حیثیت سے انہیں دیکھا جاتا رہا......ظاہر ہے کہ ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں بہت قدیم تعلق تھا اور پرانی شناسائی اور دوستی تھی......حتیٰ کہ مکہ شہر میں دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے دعوت کے نتیجے میں ہی تو سعد رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تھے......جب ان کی عمر محض سولہ برس تھی......

☆......اور پھر خلیفۂ اول کے انتقال کے بعد جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ دوم کی حیثیت سے منصبِ خلافت سنبھالا......تب کچھ ایسے حالات پیدا ہوتے چلے گئے جن سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ خالقِ ارض و سماء نے سعدؓ کے نصیب میں بہت زیادہ

عظمت و رِفعت لکھی ہوئی ہے......اور یہ کہ سن دس ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ جو یادگار الفاظ ارشاد فرمائے تھے: وَلَعَلَّكَ أن تُخَلَّف ، حَتّیٰ یَنتَفِعَ بِكَ أقوَامٌ ، وَیُضَرُّ بِكَ آخَرُونَ، یعنی ''اے سعد! شاید تمہیں (اللہ کی طرف سے اس دنیا میں) مزید زندگی عطاء کی جائے......تب کچھ لوگوں (یعنی اہلِ حق) کو تم سے فائدہ......جبکہ دوسرے کچھ لوگوں (یعنی اہلِ باطل) کو تم سے نقصان پہنچے گا......'' شاید آپ ؐ کی اس پیشین گوئی کی تکمیل کا وقت اب آ چکا تھا......

☆......اس بات کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ اُس دور میں روئے زمین پر دو عظیم ترین قوتیں تھیں، سلطنتِ روم اور سلطنتِ فارس، ان دونوں میں سے سلطنتِ روم کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف مسلسل جارحیت کے نتیجے میں خود رسول اللہ ﷺ کے دور میں ہی غزوۂ مؤتہ اور پھر تاریخی غزوۂ تبوک کی نوبت آئی تھی، نیز آپ ؐ نے آخری ایام میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سپہ سالاری میں رومیوں کے خلاف مناسب تادیبی کارروائی کی غرض سے ایک لشکر کی روانگی کا حکم دیا تھا......جو کہ آپ ؐ کی رحلت کے فوری بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے منصبِ خلافت سنبھالنے کے بعد اپنی منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہو گیا تھا......اور پھر خلیفۂ اول کے دور میں رومیوں کے خلاف یہ سلسلہ جاری رہا، متعدد چھوٹی بڑی جنگوں کی نوبت آتی رہی۔

اور پھر خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں یہ سلسلہ مزید تقویت پکڑ گیا......حتیٰ کہ اُس دور میں سن تیرہ ہجری میں مشہور و معروف تاریخی ''جنگِ یرموک'' اور پھر سن پندرہ ہجری میں ''فتحِ دمشق'' اور اس کے فوری بعد ''فتحِ بیت المقدس'' کے یادگار اور اہم ترین واقعات پیش آئے۔

☆......دوسری طرف روئے زمین کی دوسری بڑی قوت یعنی ''سلطنتِ فارس'' کی طرف سے بھی مسلمانوں کے خلاف وقتاً فوقتاً مختلف مقامات پر جارحیت اوراشتعال انگیزیوں کا سلسلہ جاری تھا، جس کے نتیجے میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے مایۂ ناز سپہ سالار سیف اللہ خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سن گیارہ ہجری میں یمامہ کے علاقے میں مسیلمہ کذاب کی طرف سے بہت بڑے پیمانے پر برپا کردہ شورش کی نہایت کامیابی کے ساتھ مکمل سرکوبی کے بعد' اب انہیں سلطنتِ فارس کی طرف روانگی کا حکم دیا تھا، اورتب وہ اس حکم کی تعمیل میں فارس پہنچے تھے، اور وہاں مختلف علاقوں میں نہایت کامیابی کے ساتھ پیش قدمی کرتے چلے گئے تھے، اور پھر سن تیرہ ہجری میں حضرت ابوبکرؓ نے انہیں فارس کی بجائے اب سلطنتِ روم کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر کی سپہ سالاری کے فرائض سنبھالنے کی غرض سے ملکِ شام کی طرف کوچ کر جانے کی ہدایت کی تھی۔

الغرض سلطنتِ فارس کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جارحیت کے اس سلسلے کی روک تھام کی غرض سے کئے جانے والے مختلف اقدامات کے باوجود اہلِ فارس وقتاً فوقتاً مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے رہتے تھے، اور خلیفۂ اول کے دور میں یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا......

اور پھر خلیفۂ دوم کے دورِ خلافت میں جب اہلِ فارس نے یہ منظر دیکھا کہ یہ مٹھی بھر مسلمان کس قدر تیز رفتاری کے ساتھ سلطنتِ روم کے ماتحت علاقوں (اردن ،فلسطین ،شام ، لبنان ،وغیرہ) میں رومیوں کی عظیم الشان قوت کو روندتے ہوئے مسلسل آندھی اور طوفان کی مانند پیش قدمی کرتے چلے جارہے ہیں......تب ''سلطنتِ فارس'' کے ایوانوں میں کھلبلی مچ گئی......اورانہیں اب یہ پریشانی ستانے لگی کہ کہیں ان مسلمانوں کے ہاتھوں ہمارا

بھی یہی انجام نہو......لہٰذا اب انہوں نے مسلمانوں کے خلاف اپنی جارحیت اور اشتعال انگیزیوں کے سلسلے مزید تیز تر کر دیئے ، اور پھر یہ سلسلہ روز بروز بڑھتا ہی رہا، حتیٰ کہ اسی سلسلے میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑا، چار ہزار سپاہی شہید ہو گئے ، جن میں سے ستر صحابۂ کرام تھے۔ (۱)

جب یہ افسوسناک خبر مدینہ پہنچی تو اب خلیفۂ وقت حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا، اتنا بڑا نقصان، ایک ہی دن میں چار ہزار سپاہیوں کی شہادت......؟ اگر چہ عین ایسے وقت میں کہ جب مسلمان سلطنتِ روم کے خلاف بہت بڑے پیمانے پر برسرِ پیکار تھے......ایسے میں اب دوسری بڑی قوت یعنی سلطنتِ فارس کے خلاف محاذ آرائی میں مزید اضافہ...... بظاہر کوئی دانشمندی نہیں تھی......اور اس میں بڑے خطرات پوشیدہ تھے......

لیکن اس کے باوجود......فارسیوں کی طرف سے اب مسلمانوں کے خلاف ظلم وزیادتی کا اور اتنی بڑی جارحیت کا یہ افسوسناک واقعہ جو پیش آیا......تو اس کے نتیجے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے بیک وقت ''سلطنتِ روم'' کے ساتھ ساتھ اب ''سلطنتِ فارس'' سے بھی فیصلہ کن ٹکر لینے کا خطرناک اور یادگار فیصلہ کر ہی لیا......

☆......اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے سلطنتِ فارس کی جانب روانہ کرنے کی غرض سے ایک نیا لشکر تیار کیا......اور خود اس کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے

(۱) یہ واقعہ تاریخ میں ''وقعۃ الجسر'' کے نام سے معروف ہے۔تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو: البدایۃ والنہایۃ ، ج:۷۔وقعۃ جسر ابی عبید الثقفی ومقتل امیر المسلمین وخلق کثیر منہم ۔نیز: تاریخ الاسلام للذہبی، ج:۳۔ص:۱۲۶۔
یہ افسوسناک واقعہ سن تیرہ ہجری میں جنگِ یرموک کے چالیس روز بعد......موجودہ عراق میں قادسیہ اور حیرہ کے درمیان کسی مقام پر دریائے فرات کے ایک پل کے قریب پیش آیا تھا۔

فارس کی جانب روانگی کا فیصلہ کیا۔

مدینہ میں موجود اکابر صحابہ کو جب حضرت عمرؓ کے بارے میں یہ اطلاع ملی کہ وہ خود اس لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے جانا چاہتے ہیں......تب وہ سب بڑی تشویش میں مبتلا ہو گئے، ان میں سے متعدد حضرات نے حضرت عمرؓ سے ملاقات کی ، اور انہیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ ''آپ کا خود مدینہ سے اس قدر دور......سلطنتِ فارس کے خلاف جنگ کی غرض سے جانا کسی صورت مناسب نہیں ہے''۔

لیکن حضرت عمرؓ نے کسی کی بات نہیں سنی اور اپنے فیصلے پر قائم رہے، بلکہ مزید یہ کہ اس چیز کا باقاعدہ اعلان کرتے ہوئے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کو اپنی اس غیر موجودگی کے دوران مدینہ میں اپنا نائب بھی مقرر کر دیا۔

دوسری جانب حضرات اکابر صحابہ بدستور اپنی اسی رائے پر قائم رہے، اور بڑی تشویش میں مبتلا رہے، اس بارے میں ان میں باہمی صلاح مشورے کا سلسلہ چلتا رہا، اور انہوں نے یہ طے کیا کہ ہم امیر المؤمنین (عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ) کو کسی صورت اتنی دور نہیں جانے دیں گے، آخر انہوں نے طے کیا کہ حضرت عمرؓ کو قائل کرنے کیلئے کوئی ایسا شخص تلاش کیا جائے جس کی بات کو وہ رد نہ کر سکیں، اور پھر باہم غور و فکر کے بعد ان تمام اکابر صحابۂ کرام نے سوچا کہ یہ کام عبدالرحمٰن بن عوف (رضی اللہ عنہ) کے ذمے لگایا جائے، ان کی بات کو حضرت عمرؓ رد نہیں کریں گے۔ چنانچہ یہ کام عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کے ذمے لگایا گیا، جس پر انہوں نے حضرت عمرؓ سے اس بارے میں بات کی اور تمام اکابر صحابہ کے موقف کی شدید تائید کرتے ہوئے وہی مطالبہ دہرایا کہ آپ خود اس لشکر کی قیادت کرتے ہوئے دارالخلافہ (مدینہ منورہ) سے اتنی دور کسی صورت نہیں جائیں گے......''۔

اورتب واقعی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی بات کو نہ ٹال سکے، اوران کا مشورہ منظور کرتے ہوئے اپنا فیصلہ تبدیل کرلیا، البتہ شرط یہ رکھی کہ "مجھے اس مقصد کیلئے کوئی مناسب ترین شخص مہیا کیا جائے، جو یہ کام عین میری مرضی کے مطابق انجام دے سکے......"۔

حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے جب تمام اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا، تو وہ سب خوش بھی ہوئے کہ حضرت عمرؓ نے اپنا فیصلہ تبدیل کرلیا ہے، لیکن ساتھ ہی اب وہ سب اس نئی پریشانی کا شکار ہوگئے، کہ کوئی مناسب آدمی تلاش کیا جائے، ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی بڑی ذمہ داری تھی، اورانتہائی خطرناک کام تھا، سلطنتِ فارس کے خلاف باقاعدہ بڑی جنگ کی غرض سے روانہ ہونے والے اس اولین لشکر کی سپہ سالاری، اس مقصد کیلئے بے انتہاء جرأت وشجاعت' استقامت' تجربہ' فنونِ حرب میں بے مثال مہارت' صلاحیت' بہت بڑی ہمت، نیز بہت بڑے دل گردے کی ضرورت تھی۔

مزید پریشانی یہ کہ اس مقصد کیلئے اگر کوئی خود کو پیش کرے ......یا......کسی دوسرے کا نام تجویز کرے، بہرصورت اگر خدانخواستہ لشکر کو وہاں پہنچنے کے بعد ناکامی وہزیمت کا سامنا کرنا پڑا، یا اور کوئی بھی مصیبت کھڑی ہوگئی، تو ذمے دار کون ہوگا......؟؟ یہی وجہ تھی کہ مدینہ میں تمام اکابر صحابہ اب انتہائی شش وپنج کی کیفیت میں پھنس کر رہ گئے تھے......

دو چار روز اسی کیفیت میں گذر گئے، کسی کی طرف سے کوئی جواب نہ آیا، حضرت عمرؓ انتظار ہی کرتے رہے، آخر ایک روز انہوں نے اکابر صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے خود ہی فرمایا "میں نے وہ مناسب ترین شخص تلاش کرلیا ہے......آپ سب دیکھتے رہئے گا......کہ

وہ شخص عنقریب اللہ کے دشمنوں پر......بس......شیر کی مانند جھپٹے گا......''

حضرت عمرؓ کی زبانی یہ بات سننے کے بعد تمام شہر مدینہ میں تجسس پھیل گیا کہ دیکھیں وہ کون شخص ہے؟ اور اسی کیفیت میں چند روز مزید گذر گئے، اس دوران نہ کسی نام کا اعلان ہوا، نہ ہی لشکر روانہ ہوا......تب ایک روز حضرت عمرؓ نے تجسس کی اس کیفیت کو محسوس کرتے ہوئے فرمایا ''بات یہ ہے کہ میں نے اس عظیم مقصد کیلئے جس شخص کو منتخب کیا ہے' وہ اتفاقاً اس وقت مدینہ میں نہیں ہے، بلکہ طائف گیا ہوا ہے، میں نے اسے وہاں سے جلد واپسی کیلئے پیغام بھجوایا ہے''۔

لوگوں نے اصرار کیا کہ ''اے امیرالمؤمنین! اس عظیم شخص کا نام تو بتا دیجئے'' اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ ''اس شخص کا نام ہے ''سعد بن ابی وقاص''۔

☆......چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی طرف سے پیغام موصول ہونے کے بعد جلد ہی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ طائف سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے اور پھر ایک روز اُس لشکر کی قیادت کرتے ہوئے، مدینہ سے فارس کی جانب رواں دواں ہو گئے۔

☆......''نرالا لشکر'':

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جس لشکر کی قیادت کر رہے تھے، یہ بڑا ہی نرالا لشکر تھا، اس وجہ سے نہیں کہ اس میں جنگجوؤں یا سپاہیوں کی تعداد بہت زیادہ تھی، یا سامانِ حرب کی بڑی فراوانی تھی......نہیں ......ایسی تو کوئی بات نہیں تھی۔ البتہ اس کے باوجود یہ لشکر نرالا اس وجہ سے تھا کہ یہ بہت مبارک شخصیات پر مشتمل تھا، مثلاً:

☆......اس لشکر میں ننانوے ''بدری'' حضرات تھے، یعنی جنہوں نے سن دو ہجری میں حق

وباطل کے درمیان اولین اور اہم ترین ''غزوۂ بدر'' میں شرکت کی تھی۔

☆......تین سو پندرہ ''رضوانی'' حضرات تھے، یعنی سن پانچ ہجری میں ''بیعتِ رضوان'' کے یادگار موقع پر جنہوں نے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر جاں نثاری کی بیعت کی تھی۔

☆......تین سو حضرات ایسے تھے جو سن آٹھ ہجری میں ''فتحِ مکہ'' کے یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔

☆......سات سو افراد وہ تھے جو اُس وقت مدینہ منورہ میں موجود اکابر صحابۂ کرام میں سے بڑی ہی جلیل القدر شخصیات کے نوجوان بیٹے تھے۔

لہٰذا یہ لشکر نہ صرف یہ کہ انتہائی تاریخی تھا...... بلکہ مزید یہ کہ انتہائی ''مبارک'' بھی تھا۔

سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اس مبارک لشکر کی قیادت کرتے ہوئے......اللہ کا نام لے کر...... بڑی ہی شان اور آن کے ساتھ اللہ کے حبیب ﷺ کے پیارے شہر مدینہ سے روانہ ہو گئے۔

روانگی کے وقت اگرچہ یہ لشکر مختصر تھا، تاہم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی مختلف علاقوں میں مسلمانوں کو یہ پیغام بھجوا دیا تھا کہ جب یہ لشکر ان کے علاقوں سے گذرے تو خوب زیادہ سے زیادہ تعداد میں لوگ اس لشکر میں شامل ہوں، چنانچہ راستے میں مختلف علاقوں سے بڑی تعداد میں لوگ نہایت جوش و خروش کے ساتھ اس لشکر میں شامل ہوتے چلے گئے، نیز ملکِ شام کے مختلف علاقوں میں رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر میں سے بھی سپاہیوں کی بڑی تعداد اب ملکِ شام سے روانہ ہو کر راستے میں کسی مناسب مقام پر اس لشکر سے آملی، یوں اب اس لشکر کی تعداد تیس ہزار سپاہیوں تک جا پہنچی۔

طویل اور تھکا دینے والا سفر طے کرنے کے بعد یہ لشکر جب سلطنتِ فارس کی حدود سے متصل علاقے میں پہنچا تو دشمن کے خلاف آئے دن چھوٹی بڑی جھڑپوں اور مختلف جنگوں کا سلسلہ چل نکلا۔

قادسیہ کے میدان میں: (۱)

آخران جنگوں اورجھڑپوں کے بعد، جب یہ لشکر ''قادسیہ'' کے مقام پر پہنچا، تب زمین وآسمان کے خالق ومالک نے اپنے اس بندے ''سعد بن ابی وقاص'' سے ایسے عظیم الشان کام لئے، کہ جن کی بدولت ان کا نام ہمیشہ کیلئے تاریخ میں عظیم ترین شخصیت ...... اور بالخصوص اسلامی تاریخ کے ایک ''روشن ستارے'' کی حیثیت سے محفوظ ہوگیا۔

''قادسیہ'' کے میدان میں کیفیت یہ تھی کہ مسلمان تیس ہزار تھے......اپنے وطن اور اپنے گھر سے بہت دور...... پردیس میں......اجنبی جگہ پر......جبکہ کیل کانٹے سے لیس مجوسی فوج ایک لاکھ بیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی...... ہرقسم کے سامانِ حرب وضرب کی خوب بہتات تھی......جغرافیائی صورتِ حال سے انہیں خوب واقفیت بھی تھی کہ وہ اپنے ہی وطن میں تھے......ان کے اس لشکرِ جرار میں ستر جنگی تربیت یافتہ دیوپیکر ہاتھی بھی تھے......ان کا سپہ سالار بڑا ہی نامی گرامی پہلوان ''رُستم فرخ زاذ'' تھا جس کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا، نیز ان کے دیگر بڑے نامور اور تجربہ کار جنگجو اور شہسوار بھی بڑی تعداد میں اس لشکر میں موجود تھے جن میں سے خاص طور پر مہران' بہرام' ہرمزان' اور جالینوس' کی بہادری کے خوب چرچے تھے اور ان کی بڑی دہشت تھی......

یوں سن پندرہ ہجری میں......قادسیہ کے میدان میں بڑے ہی گھمسان کا رَن پڑا......انتہائی

(۱) ''قادسیہ'' موجودہ عراق کا مشہور شہر ہے۔

تاریخی اور خطرناک ترین جنگ لڑی گئی جو کہ مسلسل تین دن تین رات جاری رہی، اس دوران مسلمان سپاہی بغیر کسی توقف کے رات دن مسلسل لڑتے ہی رہے...... مسلمانوں کے گھوڑوں نے اس سے قبل کبھی ہاتھی دیکھے ہی نہیں تھے، لہٰذا گھوڑے بار بار بدک جاتے، یہ بہت ہی نازک اور پریشان کُن صورتِ حال تھی...... سن تیرہ ہجری میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں سلطنتِ روم کے خلاف لڑی جانے والی ''جنگِ یرموک'' کے بعد اب یہ خطرناک ترین جنگ تھی، جو قادسیہ کے میدان میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں سلطنتِ فارس کے خلاف لڑی جارہی تھی۔

آخر اللہ کے فضل وکرم سے مسلمانوں کو یادگار اور فیصلہ کن فتح نصیب ہوئی...... ایسی عظیم الشان فتح کہ جو درحقیقت روئے زمین کی عظیم ترین قوت ''سلطنتِ فارس'' کے دائمی زوال کا پیش خیمہ ثابت ہوئی...... نیز اس یادگار فتح کی بدولت ہمیشہ کیلئے اُس تمام خطۂ زمین کا جغرافیہ بدل گیا...... بلکہ دنیا کا نقشہ ہی ہمیشہ کیلئے تبدیل ہوگیا...... قادسیہ کے میدان میں مجوسیوں کا نامی گرامی سپہ سالار ''رستم فرخ زاد'' مارا گیا، جبکہ مسلمانوں کے سپہ سالار حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہمیشہ کیلئے تاریخِ اسلام کا ایک روشن باب اور ''درخشندہ ستارہ'' بن گئے۔

☆...... اُدھر قادسیہ سے تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کے فاصلے پر مدینہ منورہ میں مسلمانوں کے خلیفہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ''جنگِ قادسیہ'' کے نتیجے اور انجام کے بارے میں کچھ جاننے کیلئے انتہائی بیتاب تھے، انہیں کسی صورت قرار نہیں آرہا تھا، یہی وجہ تھی کہ وہ ہر روز علی الصباح مدینہ شہر سے باہر نکل کر دور اس راستے پر پہنچ جایا کرتے جو ملکِ فارس کی طرف سے آتا تھا...... تاکہ شاید اُس طرف سے آتا ہوا کوئی سپاہی، کوئی مسافر، یا کوئی بھی

انسان نظر آئے......اوراس سے اس بارے میں کوئی بات معلوم ہو سکے......اور پھر دن بھراسی طرح انتظار کے بعد جب شام ڈھلنے لگتی تو وہ واپس مدینہ لوٹ آتے......

ایک روز وہ اسی طرح جب شہر سے باہر شدت سے کسی کی آمد کے منتظر تھے......اس دوران انہیں ایک اونٹ سوار نظر آیا' جو کہ بڑی تیز رفتاری کے ساتھ مدینہ شہر کی جانب محوِ سفر تھا...... تب انہوں نے اسے روکنے کی کوشش کرتے ہوئے اس سے دریافت کیا کہ ''تم کہاں سے آرہے ہو؟'' اُس سوار نے رکے بغیر فقط اتنا کہا ''من سعد'' یعنی ''سعد کی طرف سے......'' تب حضرت عمرؓ نے بڑی بیقراری اور بے چینی کی کیفیت میں اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا ''یا عبداللہ حدّثنی'' یعنی ''اے اللہ کے بندے! مجھے کچھ بتاؤ تو سہی'' جواب میں اس نے فقط اتنی بات کہی ''ہزم اللہ العدو'' یعنی ''اللہ نے دشمن کو شکست سے دوچار کیا ہے'' اوراس کے ساتھ ہی فوراً اس نے اپنے اونٹ کو ایڑ لگائی اور دوبارہ برق رفتاری کے ساتھ مدینہ شہر کی جانب رواں دواں ہو گیا......تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بھی مسلسل اس کے پیچھے اپنا اونٹ دوڑاتے رہے......اوراسے پکارتے رہے......لیکن اس نے ایک نہ سنی......

آخراسی کیفیت میں جب وہ اونٹ سوار مدینہ شہر کی حدود میں داخل ہوا، کچھ آبادی کے آثار نظر آنے لگے......تب اس کے پیچھے پیچھے اونٹ دوڑاتے ہوئے حضرت عمرؓ پر جب لوگوں کی نگاہ پڑی......تو یہ لوگ (یعنی مدینہ شہر کے باشندے) حضرت عمرؓ کے ساتھ سلام ودعاء وغیرہ کرنے لگے......اس پر اس شخص کو کچھ اندازہ ہونے لگا کہ شاید یہی حضرت عمرؓ ہیں......اورتب وہ پریشان ہو گیا......اورمعذرت کرتے ہوئے کہنے لگا ''معاف کیجئے گا اے امیر المؤمنین......میں آپ کو پہچان نہیں سکا......چونکہ ہمارے سپہ سالار سعد بن ابی وقاص کا حکم یہی تھا کہ ان کی طرف سے تحریر کردہ یہ خط جلد از جلد امیر المؤمنین تک پہنچایا

جائے ، لہٰذا میں نے راستے میں آپ سے زیادہ گفتگو نہیں کی ، اور نہ ہی میں آپ کو پہچان سکا......

اور پھر اس شخص نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی طرف سے تحریر کردہ وہ مکتوب خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے حوالے کیا' جس میں سعدؓ کی طرف سے ''فتحِ قادسیہ'' کے عظیم ترین واقعے کی اطلاع تحریر تھی۔

حضرت عمرؓ نے نہایت بیتابی کے ساتھ وہ خط پڑھا......اور پھر فوراً ہی اندرونِ مدینہ کی طرف پیش قدمی کرتے ہوئے بآوازِ بلند یہ اعلان فرمایا ''الصلاۃ جامعۃ'' یعنی نماز تیار ہے (مقصد یہ کہ سبھی لوگ نماز کیلئے جلد از جلد مسجد میں جمع ہو جائیں) اور پھر اس عظیم الشان اور تاریخی فتح یعنی ''فتحِ قادسیہ'' کی خوشی میں خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی امامت میں مسجدِ نبوی میں ''نمازِ شکر'' ادا کی گئی' جس میں مدینہ کے باشندوں نے بہت بڑی تعداد میں اور نہایت جوش وجذبے کے ساتھ شرکت کی' اور اس اتنی بڑی نعمت پر اللہ رب العزت کے حضور سر بسجود ہو کر بھیگی پلکوں کے ساتھ اس ربِ کریم کا شکر ادا کیا......

''فتحِ قادسیہ'' کا یادگار واقعہ دراصل مسلمانوں کیلئے آئندہ بڑی کامیابیوں اور تاریخی فتوحات کا' جبکہ فارس والوں کیلئے مستقل زوال وانحطاط اور شکست وہزیمت کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

فتحِ مدائن: (۱)

فتحِ قادسیہ کے بعد کچھ عرصہ وہاں انتظامی امور اور دیگر مختلف معاملات کی ترتیب وتنظیم میں گذر گیا ، اس کے بعد سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے خلیفۂ وقت امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ سے سلطنتِ فارس کے علاقوں میں مزید

(۱) ''مدائن'' موجودہ بغداد سے تقریباً چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر واقع تھا ، اس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

پیش قدمی کی اجازت طلب کی...... چنانچہ خلیفۂ وقت کی طرف سے اجازت ملنے پر اسلامی لشکر نے مزید پیش قدمی کا سلسلہ شروع کیا، چھوٹے بڑے مختلف علاقے' بستیاں' اور شہر یکے بعد دیگرے فتح ہوتے چلے گئے۔

آخر سن سولہ ہجری میں ایک دن ایسا بھی آیا کہ جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ روئے زمین کی عظیم ترین قوت ''سلطنتِ فارس'' کے دارالحکومت......اور اُس دور کے انتہائی عظیم الشان اور پرشکوہ شہر ''مدائن'' کی فصیل کے سامنے کھڑے تھے......ہزاروں میل دور مکہ کے گلی کوچوں میں کھیل کود کر جوان ہونے والا یہ انسان......وہاں مکہ میں اپنی ماں کی بھوک ہڑتال کے صدمے برداشت کرنے والا یہ شخص......بدر کے میدان میں اپنے چھوٹے اور بہت ہی لاڈلے بھائی کو خود اپنے ہی ہاتھوں سپردِ خاک کر دینے کے انتہائی تکلیف دہ مرحلے سے گذرنے والا یہ شخص......اُحد کے میدان میں دن بھر تیر چلا چلا کر ہلکان ہو جانے والا یہ شخص......آج ایک عظیم ترین کارنامہ انجام دینے کی غرض سے ...... ایک نئی تاریخ رقم کرنے کی غرض سے......قدرت نے اسے یہاں ''مدائن'' کی فصیل کے سامنے لا کھڑا کیا تھا......آج وہ یہاں اپنی آنکھوں سے عجیب وغریب مناظر کا مشاہدہ کر رہا تھا......گذشتہ ایک ہزار سال سے مسلسل انتہائی مطلق العنانی اور بڑے ہی جاہ وجلال کے ساتھ فارس پر حکمرانی کرنے والے ''ساسانی'' خاندان کی ترقی وعروج' شان وشوکت ...... یہ سب کچھ سمٹ کر اس تاریخی شہر مدائن میں......اپنی تمامتر رونقوں اور رعنائیوں کے ساتھ جلوہ افروز تھا......حدِ نگاہ تک آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے شاہی محلات کا ایک عجیب وغریب سلسلہ تھا......جن کے درودیوار سے صدیوں کی شان وشوکت جھلک رہی تھی، ساسانی خاندان سے تعلق رکھنے والے فارسی ''شہنشاہوں'' کا رعب اور دبدبہ جھانک رہا تھا

انہی عظیم الشان شاہی محلات میں ایک محل وہ بھی تھا کہ جہاں محض دس سال قبل انتہائی غرور وتکبر اور بداخلاقی وبدمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کسریٰ خسرو پرویز نے رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک محض اس لئے چاک کر ڈالا تھا، اور پرزے پرزے کر کے پھینک دیا تھا کہ اس میں سب سے اوپر اللہ عزوجل کا نام تحریر تھا، کسریٰ یہ چیز برداشت نہیں کر سکا تھا کہ اللہ کا نام اوپر، اور کسریٰ کا نام نیچے تحریر کیا گیا تھا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ وہاں مدائن شہر کی فصیل کے سامنے کھڑے ہوئے ان شاہی محلات اور نظروں کو خیرہ کر دینے والی ان عمارات کی جانب دیکھتے رہے......اور تب وہ بے اختیار......تصور کی دنیا میں کھو گئے......آج سے تیرہ سال قبل کا وہ منظر نگاہوں کے سامنے گھومنے لگا، جب ''خندق'' کھودتے وقت ایک سخت چٹان کسی سے ٹوٹ نہیں رہی تھی......تب خود رسول اللہ ﷺ نے اس پر ایک ضرب لگائی تھی......جس سے وہ چٹان پاش پاش ہو گئی تھی، اور تب فاصلے سمیٹ دیئے گئے تھے......رسول اللہ ﷺ کی نگاہیں کسی جانب ٹک کر رہ گئی تھیں، لوگوں نے جب حیرت سے اُس جانب دیکھا تو انہیں کچھ نظر نہیں آیا تھا، البتہ اُس موقع پر اللہ عزوجل کی قدرت سے رسول اللہ ﷺ کو وہاں مدینہ سے ہزاروں میل کی مسافت پر واقع سلطنتِ فارس کے عظیم بادشاہوں اور تاجداروں کے انہی عظیم الشان محلات کا مشاہدہ کرایا گیا تھا......گویا اللہ کی طرف سے یہ بشارت تھی کہ ''اے ہمارے نبی! آپ نے یہ جو اپنی کدال سے اس چٹان پر ضرب لگائی ہے اس کے نتیجے میں محض یہی چٹان ہی نہیں ٹوٹی......بلکہ آپ اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لیجئے......بہت جلد روئے زمین کی اس عظیم ترین قوت کے ان عظیم بادشاہوں اور تاجداروں کے یہ بڑے بڑے عالیشان محلات، اور ان کی یہ پرشکوہ عمارات آپ کی امت کے قدموں میں ہوں گی......''۔

اور پھر اسلامی لشکر کی طرف سے یلغار ہوئی......اعصاب شکن جنگ کی نوبت آئی...... آخر سلطنتِ فارس کا یہ دارالخلافہ اور تاریخی شہر ''مدائن'' مسلمانوں کے ہاتھوں فتح ہوا...... شہر میں داخل ہونے اور پھر وہاں اپنا قبضہ مستحکم کر لینے کے بعد سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے سب سے پہلے اپنے سپاہیوں اور لشکریوں سمیت وہاں ''نمازِ شکر'' ادا کی۔

اس تاریخی شہر کی فتح کے بعد وہاں صدیوں سے سلطنتِ فارس پر راج کرنے والے بڑے بڑے نامی گرامی بادشاہوں اور تاجداروں کے وہ بیش قیمت خزانے' کسریٰ کا تاج' اس کی پوشاک' اور بے حد وحساب قیمتی ترین جواہرات ونوادرات ...... یہ سب کچھ بہت بڑی مقدار میں بطورِ غنیمت مسلمانوں کے ہاتھ آیا۔

اور جب اتنی بڑی مقدار میں یہ قیمتی ترین خزانے' سونا چاندی' زیورات وجواہرات' کسریٰ کا تاج' اس کے کنگن' اس کی پوشاک' شاہی خاندان کے نوادرات......اور بھی بہت کچھ...... یہ تمام چیزیں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے مسلمانوں کے دارالخلافہ یعنی مدینہ منورہ میں خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو بھجوائیں، تاکہ وہاں اسلامی بیت المال میں یہ سب کچھ جمع کر دیا جائے...... چنانچہ یہ مالِ غنیمت جب مدینہ پہنچا......حضرت عمرؓ نیز دیگر اکابر صحابہ کرام نے جب یہ منظر دیکھا......تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا ...... اور تب ان سب کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے اور بڑی ہی خوشگوار حیرت کا اظہار کرتے ہوئے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں یہ تاریخی کلمات کہے: اِنَّ قوماً أرسَلُوا ھٰذا لَذُو أَمَانَةٍ ...... یعنی ''وہ لوگ جنہوں نے یہ سب کچھ یہاں ہماری طرف

بھیج دیا ہے......وہ تو یقیناً بڑے ہی امانتدار ہیں......''

اتفاقاً اُس وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قریب ہی حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زبانی جب حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کے بارے میں یہ تعریفی کلمات سنے تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے برجستہ نہایت ہی قیمتی اورآبِ زر سے لکھے جانے کے قابل یہ الفاظ کہے: یَا أَمِیرَ الْمُؤمِنِینَ! اِنَّكَ عَفَفْتَ، فَعَفَّتْ رَعِیَّتُكَ...... یعنی ''اے امیرالمؤمنین! چونکہ آپ خود امانتدار ہیں' لہٰذا آپ کی رعیت بھی امانتدار ہے......''(۱)

☆......کسریٰ کے کنگن سُراقہ کے ہاتھوں میں:

ملکِ فارس سے آئے ہوئے ان بیش قیمت خزانوں اورنوادرات وجواہرات میں وہاں کے بادشاہ ''کسریٰ'' کے قیمتی ترین کنگن بھی موجود تھے۔خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نظر جب ان پر پڑی توانہوں نے فوراًسُراقہ بن مالک کو بلوایا، اورخود اپنے ہاتھوں سے یہ بیش قیمت کنگن اسے پہنائے۔(۲)

(۱) لہٰذا اگر کوئی یہ چاہتا ہے کہ اس کی رعیت' اس کے ماتحت کام کاج انجام دینے والے افراد' اوراس کے اہل وعیال ہرقسم کی خیانت وبددیانتی سے مکمل پرہیز کریں......اورخوب امانتدار اور دیانتدار بن کر رہیں......تو اسے چاہئے کہ پہلے وہ خود یہی خوبی اپنائے......اس کا لازمی اوریقینی اثر یہی ہوگا کہ اس کے ماتحت افراد' نیز اس کے اہل وعیال میں بھی یہی خوبی پیدا ہوجائیگی......ورنہ......جیسا کہ مثال مشہور ہے ''الناس علیٰ دین ملوکہم'' یعنی ''لوگ اپنے بادشاہوں کے دین پر ہی چلا کرتے ہیں'' یعنی لوگ اپنے بڑوں کے جوطور طریقے دیکھتے ہیں' خود بھی وہی طور طریقے اپنالیا کرتے ہیں......!

(۲) برسوں پہلے (فتحِ مدائن سے تقریباً ۱۷سال قبل) ہجرتِ مدینہ کے موقع پر مشرکینِ مکہ کی طرف سے اعلان کردہ بڑے انعام کے لالچ میں سُراقہ بن مالک المدلجی جب تعاقب کرتا ہوا رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ہمسفر یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے بالکل قریب آپہنچا تھا......(باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر......)

کوفہ شہر کی بنیاد:

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ جب سلطنتِ فارس کا دارالحکومت ''مدائن''، فتح کر چکے اور وہاں مسلمانوں کا قبضہ خوب مستحکم ہو چکا، تب خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں یہ پیغام بھیجا کہ مدائن فتح ہو جانے کے بعد اسے اپنا مستقل مرکز نہ بنایا جائے، بلکہ اس مقصد کیلئے کسی مناسب جگہ کا انتخاب کر کے وہاں ایک نیا شہر بسایا جائے۔

چنانچہ اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اپنے چند معاونین کے ہمراہ مناسب مقام کی تلاش شروع کی، اور اس مقصد کیلئے کافی تگ ودو اور غور وفکر کا سلسلہ چلتا رہا، آخر ان حضرات کو دریائے فرات کے کنارے ایک جگہ کافی پسند آئی، اور پھر انہوں نے (۱۷ھ ہجری میں) وہاں نیا شہر آباد کیا، جسے بہت بڑی فوجی چھاؤنی ہونے کے علاوہ ایک جدید اور خوب ترقی یافتہ شہر کی حیثیت سے دیکھا جانے لگا، اس نئے شہر کا نام تھا ''کوفہ''۔

نیا بسایا گیا یہ شہر ''کوفہ'' اپنی جغرافیائی اہمیت کے ساتھ ساتھ بہت جلد دینی، علمی، ادبی، وسیاسی

حاشیہ از صفحہ گذشتہ:

اور تب اس کے گھوڑے نے اچانک ٹھوکر کھائی تھی......اور وہ آپؐ کی حقانیت وصداقت کو پہچان چکا تھا......اُس موقع پر آپ ﷺ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے کہ ''سُراقہ......اُس وقت تمہاری کیا کیفیت ہوگی جب کسریٰ کے کنگن تمہارے ہاتھوں میں ہوں گے......؟''۔یہی وجہ تھی کہ فتحِ مدائن کے بعد وہاں سے مدینہ پہنچنے والے قیمتی مالِ غنیمت میں جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نگاہ کسریٰ کے کنگن پر پڑی......تب انہوں فوری طور پر سُراقہ کو بلوایا اور خود اپنے ہاتھ سے اسے یہ کنگن پہنائے......یوں رسول اللہ ﷺ کی پیشین گوئی درست ثابت ہوئی......کیونکہ......وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ......!

غرضیکہ ہر لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔ (۱) (۲)

☆......حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے یہ نیا شہر ''کوفہ'' بسانے کے بعد خود بھی اسی میں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی......چنانچہ انہوں نے وہاں کافی عرصہ گذارا......لیکن آخر وہ وہاں سے واپس مدینہ چلے آئے......اور زندگی کا یہ سفر اسی طرح جاری رہا......

مدینہ واپسی کے بعد بھی انہیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، ''فاتحِ ایران'' نیز ''جنگِ قادسیہ'' کے یہ ہیرو......اب ہمیشہ کیلئے تاریخِ اسلام کے عظیم ترین ہیرو کی حیثیت اختیار کر چکے تھے......اللہ رب العزت نے یہ اتنی بڑی عزت اور ایسا عظیم الشان مقام و مرتبہ اپنے اس بندے کے نصیب میں لکھا ہوا تھا۔

☆......ایک زمانہ وہ تھا کہ جب سعد بالکل نوعمر تھے، مکہ میں قبیلۂ قریش کے معزز ترین خاندان ''بنوزہرہ'' سے تعلق رکھنے والے ایک بہت ہی خوشحال گھرانے میں اپنے والدین کے یہ انتہائی لاڈلے اور چہیتے نورِ نظر تھے......دن بھر اپنے ہم عمر نوجوانوں کے ہمراہ مکہ کے گلی کوچوں میں کھیل کود میں مشغول رہا کرتے تھے......

اور پھر ایک روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ انہیں اپنے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے آئے تھے، اور تب ان کا دل ایمان کے نور سے جگمگا اٹھا تھا......اُس وقت

---

(۱) کوفہ شہر موجودہ عراق کے دارالحکومت بغداد سے جنوب کی جانب تقریباً ایک سوستر کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے، موجودہ مشہور شہر ''نجف'' سے بالکل متصل اس کے آثار آج بھی موجود ہیں۔

(۲) کوفہ شہر کی سیاسی حیثیت وجغرافیائی اہمیت کا اندازہ لگانے کیلئے یہی بات بہت کافی ہے کہ خلیفۂ چہارم امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اپنا دارالخلافہ مستقل طور پر مدینہ سے کوفہ منتقل کر لیا تھا...... جبکہ اس شہر کی دینی، علمی وادبی اہمیت اس بات سے بخوبی واضح ہوتی ہے کہ اس شہر سے تعلق رکھنے والے بڑے بڑے نامور علماء، فقہاء، محدثین، ادباء وخطباء کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے......امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا تعلق بھی اسی شہر سے ہی تھا۔

یہ محض سولہ برس کے نوجوان تھے......ان کے قبولِ اسلام کی وجہ سے تمام مشرکینِ مکہ ان کے دشمن بن گئے تھے......گھر سے باہر ایذاء رسانیوں کے وہ سلسلے ......اور پھر خود اپنے گھر کے اندر بھی دکھ اور اذیت کے وہ مراحل ......جب ماں کھانا پینا چھوڑ کر بیٹھ گئی...... کمزوری ونقاہت کی وجہ سے بستر سے لگ گئی......پھر ایک روز چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے ہوئے مکہ سے روانگی......اپنے آبائی شہر سے جدائی......پھر چھوٹے بھائی کا ہاتھ تھامے ہوئے مدینہ سے بدر کی جانب روانگی......پھر خود اپنے ہاتھوں اسے وہاں بدر کے میدان میں سپرد خاک کرنے کا جاں گداز مرحلہ......اور پھر وہاں سے تنہا مدینہ کی جانب واپسی...... پھر اُحد کے موقع پر دن بھر مسلسل تیراندازی......اور پھر حجۃ الوداع کے موقع پر وہ تکلیف دہ بیماری ......حتیٰ کہ نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ انہیں موت کا اندیشہ لاحق ہونے لگا تھا......تب رسول اللہ ﷺ ان کی عیادت کیلئے تشریف لائے تھے......آپؐ نے اس موقع پر انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ الفاظ ارشاد فرمائے تھے: لَعَلّكَ أن تُخَلَّف ، حَتّىٰ يَنتَفِعَ بِكَ أقـوَامٌ ، وَيُـضَرٌّ بِكَ آخَرُونَ، یعنی ''اے سعد......شاید تمہیں (اللہ کی طرف سے اس دنیا میں) مزید زندگی عطاء کی جائے......تب کچھ لوگوں (یعنی اہلِ حق) کو تم سے بڑا فائدہ...... جبکہ دوسرے کچھ لوگوں (یعنی اہلِ باطل) کو تم سے بڑا نقصان پہنچے گا......''

اور پھر بعینہٖ ایسا ہی ہوا تھا......روئے زمین کی عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ فارس کے خاتمے کی شکل میں اہلِ حق کو سعدؓ کے ذریعے بہت بڑا فائدہ ' جبکہ اہلِ باطل کو بہت بڑا نقصان پہنچا تھا۔

☆ حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی اس بیماری کے دوران حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ سے دریافت فرما رہے تھے کہ ''اے اللہ کے رسول! میری فقط ایک ہی

بیٹی ہے، وہی تنہا میری وارث ہے، جبکہ میں صاحبِ مال (خوشحال) ہوں، لہٰذا کیا میں اپنا دوتہائی مال صدقہ کردوں؟'' تب رسول اللہ ﷺ نے جواب میں یہ ارشادفرمایا تھا'' اگر تم اپنے ''وارثوں'' کوخوشحال چھوڑکر جاؤ تو یہ بہت بہتر ہے بنسبت اس کے کہ تم انہیں مفلس وکنگال چھوڑ کر جاؤ......کہ وہ لوگوں پر بوجھ بنے رہیں اوران کے سامنے ہاتھ پھیلاتے رہیں......''

یعنی سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے تو فقط ایک وارث یعنی اپنی اکلوتی بیٹی کا تذکرہ کیا تھا لیکن جواب میں رسول اللہ ﷺ نے ''وارثوں'' یعنی جمع کا لفظ استعمال کیا تھا......اور پھر ایسا ہی ہوا......اس واقعے کے بعد اللہ نے سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مزید بہت سی اولاد عطاء کی، جن میں بہت سے بیٹے بھی تھے (جن میں سے عمارؔ' مُصعبؔ ' محمدؔ' اور عمرؔ کا تذکرہ کتبِ تاریخ میں ملتا ہے) نیز بہت سی بیٹیاں بھی تھیں۔

☆ اسی طرح حجۃ الوداع کے موقع پر اپنی اس بیماری کے دوران سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو تو اپنی موت کا اندیشہ لاحق ہو چکا تھا......لیکن اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی گفتگو سے انہیں کچھ امید ہو چلی تھی کہ شاید ابھی اللہ کو میرے لئے مزید زندگی منظور ہے......چنانچہ اس کے بعد بہت طویل عرصے تک وہ زندہ سلامت رہے......تمامتر نعمتوں کے ساتھ......اور تمامتر عزت واحترام اور قدر و منزلت کے ساتھ......اوراس دوران مسلسل انتہائی اہم اور تاریخی کارنامے انجام دیتے رہے، مسلمانوں کے بڑے بڑے لشکروں کی قیادت کرتے رہے، دشمنوں کے بڑے بڑے شہر اور قلعے فتح کرتے رہے......حتیٰ کہ اس قدر طویل عمر پائی کہ تمام حضرات مہاجرین میں سے سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔

☆ کوفہ میں طویل قیام کے بعد سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی جب مدینہ واپسی ہوئی،

تب وہاں مدینہ شہر میں ان کی وہی حیثیت اور قدر و منزلت بدستور برقرار رہی......حتیٰ کہ خلیفۂ دوم امیرالمؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قاتلانہ حملے کے نتیجے میں جب شدید زخمی ہو گئے......بچنے کی امید کم تھی......تب اکابرِ صحابہ میں سے متعدد شخصیات نے یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیرالمؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کر دیجئے......''اس پر حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کر لیں......ان چھ افراد میں حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

☆ کوفہ سے مدینہ واپسی کے بعد اب سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کا زیادہ وقت اللہ کی عبادت و خلوت نشینی میں بسر ہونے لگا تھا......اسی کیفیت میں شب و روز کا سفر جاری رہا، وقت کے ساتھ ساتھ ضعف اور کمزوری بھی بڑھتی چلی گئی۔

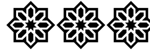
اپنی زندگی کے آخری دنوں میں ایک روز اپنے گھر والوں سے کہا کہ'' فلاں جگہ میرا ایک صندوق رکھا ہے' وہ لے آؤ'' چنانچہ وہ صندوق حاضر کیا گیا، سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے ان سب کے سامنے وہ صندوق کھولا......تو اس میں سے ایک نہایت ہی بوسیدہ' خستہ حال' اور بہت ہی پرانا لباس برآمد ہوا......ان کے اہل و عیال ابھی حیرت میں گم صم یہ منظر دیکھ ہی رہے تھے کہ سعدؓ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''میری طرف سے یہ وصیت یاد رکھنا کہ میری وفات کے بعد مجھے اس لباس میں کفن دیا جائے'' تب وہ سبھی افراد مزید حیرت و تعجب کی کیفیت میں اور استفہامیہ انداز میں ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے......بالخصوص یہ کہ تمامتر خوشحالی و فراوانی کے باوجود......اس قدر پرانے اور بوسیدہ لباس میں تکفین اور پھر تدفین کی یہ خواہش اور یہ وصیت......؟ تب ان کی اس حیرت کو محسوس

کرتے ہوئے اس عظیم ترین انسان یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: ''غزوۂ بدر میں شرکت کے موقع پر میں نے یہی لباس پہن رکھا تھا، اُس دن سے آج تک میں نے یہ لباس اپنے کفن کیلئے سنبھال کر رکھا ہوا ہے، اور میں چاہتا ہوں کہ اللہ کے سامنے میں اسی لباس میں پیش ہوں......''۔

یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے غزوۂ بدر سے لے کر اپنے انتقال تک یعنی تقریباً ترپن (۵۳) سال سے مسلسل یہ لباس اسی مقصد کیلئے سنبھال کر رکھا ہوا تھا۔

اور پھر چندروز بعد اللہ کا یہ عظیم سپاہی' رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی' تاریخِ اسلام کا یہ روشن ستارہ' یعنی حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سن پچپن ہجری میں بیاسی سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے منہ موڑ گئے اور اپنے اللہ سے جا ملے......مدینہ منورہ کے قبرستان ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔(۱)

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معیت وصحبت عطاء فرمائیں۔



(۱) تمام مہاجرین حضرات میں سے سب سے آخر میں ان کا انتقال ہوا۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۵/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۹/اکتوبر ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت طلحہ بن عبیداللہ التَیمی رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت طلحہ بن عبیداللہ التیمی رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ شہر میں قبیلۂ قریش کے خاندان ''بنوتَیم'' سے تھا(۱) مکہ شہر میں ان کی ولادت رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت کے تقریباً پچیس سال بعد ہوئی۔

☆حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ ''السابقین الأ ولین''یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے،یعنی وہ عظیم ترین افراد جنھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا......یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے،ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں' اورانہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأ ولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆مزید یہ کہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ''یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

اُس دور میں قبیلۂ قریش کے دیگر معزز و بااثر افراد کی طرح طلحہ بن عبیداللہ کا ذریعۂ معاش بھی تجارت تھا، چنانچہ تجارتی قافلوں کے ہمراہ مکہ سے ملکِ شام کی جانب آمدورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔

ایسے ہی ایک تجارتی سفر کے دوران جب طلحہ بن عبیداللہ ملکِ شام کے شہر بُصریٰ کے ایک پُررونق بازار میں اپنے ساتھیوں کے ہمراہ موجود تھے،اُس وقت بازار میں تجارت خوب

(۱)خلیفۂ اول حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا،محلّہ ''مسفلہ''میں......

زوروں پرتھی، خرید وفروخت کا سلسلہ عروج پر تھا، ان کے ساتھی بڑی دلچسپی کے ساتھ خوب بڑھ چڑھ کر بولیاں لگا رہے تھے...... بے پناہ رش اور تاجروں کے اس شور کی وجہ سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی......(۱)

اسی دوران اچانک طلحہ بن عبیداللہ کی سماعت سے ایک ایسی آواز ٹکرائی جس میں محض ان کیلئے ہی نہیں...... بلکہ تمام دنیائے انسانیت کیلئے بڑی خوشگوار تبدیلی کا پیغام تھا......

ہوا یہ کہ ملکِ شام کے اُس بازار میں خرید وفروخت کے اس سلسلے کے دوران انہوں نے دیکھا کہ ایک ضعیف ونحیف اور عمر رسیدہ راہب (پادری) ہر آنے جانے والے کو روک روک کر اس سے یہ پوچھ رہا ہے کہ ''ارے کوئی مجھے بتائے کہ تاجروں کی اس بھیڑ میں کیا کوئی ایسا تاجر بھی ہے جس کا تعلق مکہ کی سرزمین سے ہو؟''

بوڑھے راہب کی زبانی یہ سوال سن کر طلحہ بن عبیداللہ چونک اٹھے......اور اس کے قریب جا کر کہا کہ ''جی ہاں...... میں مکہ کا باشندہ ہوں''

تب اس بوڑھے راہب نے ان سے دریافت کیا ''کیا تمہارے شہر مکہ میں ''احمد'' کا ظہور ہو چکا ہے؟''

انہوں نے جواب میں اس سے پوچھا ''کون احمد؟''

راہب نے کہا ''عبداللہ بن عبدالمطلب کا بیٹا''

اور پھر اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا '' آجکل یہ وہی زمانہ چل رہا ہے جس میں ان کا ظہور طے ہے، وہ آخری نبی ہیں، ان کا ظہور تمہارے شہر میں ہوگا، اور پھر وہ ایک ایسی سرزمین کی طرف ہجرت کر جائیں گے جہاں بکثرت کھجوروں کے باغ ہوں گے''۔

(۱) اُس زمانے میں ملکِ شام روئے زمین کی عظیم ترین قوت ''سلطنتِ روم'' کا حصہ تھا، اور وہاں کے باشندے دیگر تمام رومیوں کی مانند دینِ نصرانیت کے پیروکار تھے۔

اس بوڑھے راہب کی یہ بات طلحہ بن عبیداللہ کے دل میں پیوست ہوگئی......اور وہ اپنے ساتھیوں کی واپسی کا انتظار کئے بغیر ان سے پہلے ہی اکیلے ملکِ شام سے مکہ کی طرف روانہ ہوگئے، اور یہ طویل ترین مسافت تنہا طے کرتے ہوئے مکہ آ پہنچے......

مکہ شہر میں آمد کے بعد اپنے گھر پہنچتے ہی گھر والوں سے دریافت کیا'' کیا میری غیر موجودگی میں یہاں مکہ شہر میں کوئی خاص واقعہ رونما ہوا ہے؟''

گھر والوں نے جواب دیا کہ'' ہاں! آپ کی غیر موجودگی میں محمد بن عبداللہ نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے......اور اس معاملے میں ابوبکر ان کے ہمنوا بن گئے ہیں''

طلحہ بن عبیداللہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے کہ محمد بن عبداللہ (ﷺ) انتہائی راست باز اور دیانت دار انسان ہیں......لہٰذا وہ سوچنے لگے کہ جس شخص (یعنی محمد بن عبداللہ ﷺ) نے آج تک کبھی زندگی میں جھوٹ نہیں بولا......وہ اب کس طرح جھوٹ بول سکتا ہے؟

طلحہ بن عبیداللہ رسول اللہ ﷺ کی امانت و دیانت اور راست بازی کے علاوہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے حسنِ اخلاق اور شریفانہ طور طریقوں سے بھی خوب واقف اور بہت متأثر تھے، لہٰذا اپنے گھر والوں کی زبانی جب یہ بات سنی کہ ابوبکر نے محمد بن عبداللہ کا دین اپنا لیا ہے تو مزید متأثر ہوئے ......اور دل ہی دل میں سوچنے لگے کہ تمام شہر مکہ کے یہ دونوں انتہائی سچے اور شریف ترین انسان بیک وقت کسی غلط بات پر متفق ہو جائیں......یہ نہیں ہوسکتا''۔

انہی خیالات میں گم طلحہ بن عبیداللہ اولین فرصت میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس پہنچے، اُن سے پیغمبرِ اسلام اور دینِ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں، تب ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بارے میں انہیں مطلع کیا......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی زبانی آپ ﷺ کی بعثت کے بارے میں جاننے کے بعد طلحہ

بن عبیداللہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو وہ تمام باتیں بتائیں جو اسی بارے میں انہوں نے وہاں مکہ سے بہت دور ملکِ شام میں...... بوڑھے راہب سے سنی تھیں...... تب ابوبکر رضی اللہ عنہ خوشگوار حیرت میں مبتلا ہو گئے......

اور پھر فوراً ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے دوست طلحہ بن عبیداللہ کو ہمراہ لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے...... جہاں آپ ﷺ نے طلحہ کے سامنے اللہ کے کلام کی چند آیات پڑھ کر سنائیں، اور پھر دین و دنیا میں خیر و خوبی کی بشارت دیتے ہوئے انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی...... آپؐ کی یہ مبارک گفتگو سن کر طلحہ کا دل ایمان کے نور سے جگمگانے لگا، اور تب انہوں نے آپؐ کے سامنے اپنے قبولِ اسلام کا اقرار و اظہار کرتے ہوئے یہ کلمات کہے ''اشھدأن لا الٰہ الا اللہ، واشھدأ نک عبداللہ ورسولہ'' یعنی ''میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور میں گواہی دیتا ہوں کہ آپؐ اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔

دینِ اسلام کا وہ بالکل ابتدائی دور تھا...... کہ جب دینِ اسلام قبول کرنا موت کو دعوت دینے کے مترادف تھا...... مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیوں اور بدسلوکیوں کے وہ لامتناہی سلسلے...... طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو بھی ان تمام تر جان لیوا...... صبر آزما...... انتہائی مشکل ترین اور تکلیف دہ مراحل سے گذرنا پڑا...... مگر ان کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئی، راہِ حق میں تمام آزمائشوں اور ہر قسم کی تکلیفوں کا خندہ پیشانی کے ساتھ سامنا کرتے رہے...... حتیٰ کہ اسی کیفیت میں تیرہ سالہ مکی دور گذر گیا...... ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے پر دیگر مسلمانوں کی طرح حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے بھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہوئے اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر باد کہا، اور سب کچھ

چھوڑ چھاڑ کر خالی ہاتھ نئی منزل......یعنی مدینہ جا پہنچے...... جہاں مہاجرین وانصار کو باہم ''رشتۂ مؤاخاۃ'' میں پروتے وقت رسول اللہ ﷺ نے انہیں انصارِ مدینہ میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کا بھائی بنایا۔ (۱)

☆ ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد محض اگلے سال ہی جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف جنگیں مسلط کرنے کا سلسلہ شروع ہوا......جس کے نتیجے میں حق وباطل کے درمیان پیش آنے والے اولین معرکہ یعنی غزوۂ بدر سے چندروز قبل رسول اللہ ﷺ نے حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کو مشرکینِ مکہ کے لشکر کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کی غرض سے مدینہ شہر سے باہر کہیں بھیج رکھا تھا......اوراسی دوران غزوۂ بدر کا اہم ترین واقعہ پیش آ گیا......لہٰذا حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ غزوۂ بدر میں شرکت نہیں کر سکے تھے...... البتہ اس کے باوجود آپؐ نے انہیں اجر وثواب کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

غزوۂ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے' ہر غزوے کے موقع پر حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت حاضر اور شریک رہے اور اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر ہمیشہ بے مثال شجاعت وبہادری کا مظاہرہ کرتے رہے......

بالخصوص غزوۂ بدر کے بعد محض اگلے ہی سال یعنی سن تین ہجری میں غزوۂ اُحد کے موقع پر ان کا کردار یقیناً تاریخِ اسلام کے ایک ناقابلِ فراموش باب کی حیثیت رکھتا ہے......

غزوۂ اُحد کے موقع پر کیفیت یہ ہوئی کہ ابتداء میں مسلمان یہ جنگ تقریباً جیت ہی چکے تھے، لیکن پھر اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے ان کی یہ فتح شکست میں تبدیل ہوگئی......تب مسلمان

(۱) حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی خاص بات یہ ہے کہ بعد میں غزوہ تبوک کے موقع پر ان کیلئے ''قبولیتِ توبہ'' کا واقعہ وجہِ شہرت بن گیا۔سورہ ''توبہ'' کا یہ نام اسی واقعے کی نسبت سے ہے۔ملاحظہ ہو[۴۸۳۔۵۰۸]۔

اپنی صفوں میں نظم وضبط برقرار نہ رکھ سکے......باہم رابطہ بھی منقطع ہوگیا......لشکر میں ہر طرف بدنظمی اورافراتفری پھیل گئی......اوریوں مسلمانوں کو بڑی ہی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا......

اس افراتفری کے ماحول میں کہ جب سبھی بکھر چکے تھے......سراسیمگی وانتشار کی کیفیت طاری تھی......ایسے میں مٹھی بھر چندافراد جو بدستور رسول اللہ ﷺ کے گرد گھیرا ڈالے ہوئے بڑی ہی بے جگری کے ساتھ دشمنوں کا مقابلہ کررہے تھے......ان میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے......اس دوران ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ محض تنہا رہ گئے تھے،مشرکین اس دوران آپؐ کونشانہ بنانے کی سرتوڑ کوشش کرتے رہے، بالخصوص اُن کی طرف سے تیراندازی کا سلسلہ بہت زوروں پرتھا......ایسے میں حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ مسلسل رسول اللہ ﷺ کے سامنے ڈھال بنے رہے، نیز اس نازک ترین موقع پر، تیروں کی اس بوچھاڑ کے درمیان......نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ اس طرف آتے ہوئے بہت سے تیروں کو انہیں اپنے ہاتھوں پرروکنا پڑا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کا ایک بازو ہمیشہ کیلئے مفلوج ہوگیا۔

نیز اس نازک ترین صورتِ حال میں ایک موقع ایسا آیا کہ حفاظتی اقدام کے طور پر رسول اللہ ﷺ نسبتاً ایک محفوظ مقام کی جانب منتقل ہونا چاہتے تھے،وہ مقام کچھ بلندی پر تھا، وہاں تک پہنچنے کیلئے ایک بڑی چٹان کے اوپر سے گذرنا ضروری تھا......آپ ﷺ اُس وقت لہولہان تھے،سر سے خون بہہ رہا تھا،رُخِ انور پر بھی کاری زخم آیا تھا،نقاہت بہت زیادہ تھی......لہٰذا آپؐ کو اس چٹان پر چڑھنے میں بڑی دشواری پیش آرہی تھی،،تب حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کو اپنی پشت پراٹھالیا......اورساتھ ہی مستقل طور

پر کبھی دشمنوں کی طرف سے آنے والے کسی تیر کو روکتے......کبھی تعاقب میں آنے والے کسی مشرک کو رفع دفع کرتے......حالانکہ اس وقت وہ خود زخموں سے چور اور بہت زیادہ نڈھال تھے......ایک ہاتھ بالکل شل ہو چکا تھا......لیکن ان تمامتر مشکلات کے باوجود اُس وقت انہوں نے آپؐ کو مسلسل اپنی پشت پر اٹھائے رکھا......حتیٰ کہ اسی کیفیت میں انتہائی دشوار گذار پہاڑی راستے پر چلتے ہوئے اُس بلند چٹان پر چڑھے اور آپؐ کو اس محفوظ مقام تک پہنچایا جہاں آپؐ پہنچنا چاہتے تھے......اور تب آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا: أوجَبَ طَلحَة یعنی ''طلحہ کیلئے تو جنت لازمی ہو چکی'' (۱)

رسول اللہ ﷺ کو اپنی پشت پر اٹھائے محفوظ مقام پر پہنچانے کے بعد حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ زخموں سے چور اور لہولہان ہونے کی وجہ سے خود کو سنبھال نہ سکے اور فوراً ہی نڈھال ہو کر گر گئے......چونکہ وہ مقام نسبۃً بلندی پر واقع تھا' لہٰذا جب یہ گرے تو بیہوشی کی کیفیت میں لڑھکتے ہوئے نیچے کسی گڑھے میں جا پڑے......

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''اُحد کے دن جب ہر طرف افراتفری پھیلی، تب کسی کو کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ کہاں ہے اور کیا ہو رہا ہے؟ پھر جب صورتِ حال قدرے بہتر ہوئی تو میں رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا......اسی دوران مجھے ابوعبیدہ بن الجراح (رضی اللہ عنہ) مل گئے، وہ بھی آپؐ کو ہی تلاش کر رہے تھے، اور پھر ہم دونوں مل کر آپؐ کو تلاش کرتے رہے......آخر ایک بلند جگہ پر آپؐ ہمیں نظر آئے، ہم دونوں وہاں پہنچے، آپؐ کی کیفیت یہ تھی کہ جبینِ اقدس پر زخم تھا، روئے مبارک لہولہان تھا، زرہ کی چند کڑیاں رخسار مبارک میں پیوست تھیں......لیکن اس کیفیت کے باوجود آپؐ نے نیچے ایک گڑھے

(۱) ترمذی [۳۷۴۸] کتاب المناقب، باب مناقب ابی محمد طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ۔ نیز ملاحظہ ہو: الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب، ص: ۳۵۹۔ الرقم المسلسل: ۱۲۵۵۔

کی جانب اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ''پہلے ذرہ اپنے اس ساتھی کی خبر لےلو'' تب ہم نے دیکھا اُس گڑھے میں طلحہ بیہوش پڑے تھے، ایک ہاتھ تیروں سے بری طرح چھلنی تھا اور بالکل مفلوج ہو چکا تھا، تمام جسم لہولہان تھا، تب ہم نے طلحہ کو وہاں سے اٹھا کر نسبۃً مناسب مقام کی طرف جب منتقل کیا تو اس وقت ہمیں ان کے جسم پر مختلف مقامات پر چھوٹے بڑے ستر سے زائد زخم نظر آئے......''

غزوۂ اُحد کے اس تاریخی موقع پر حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ نے جس طرح جاں فشانی وسرفروشی کا مظاہرہ کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مدافعت وحمایت کا مبارک ترین فریضہ سرانجام دیا تھا...... یقیناً اسی کا نتیجہ تھا کہ آپؐ نے ایک باران کی طرف اشارہ کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا تھا: مَن سَرَّهُ أن يَنظُرَ اِلَىٰ شَهِيدٍ يَمشِي عَلَىٰ وَجهِ الأرضِ فَليَنظُر اِلَىٰ طَلحَةَ بنِ عُبَيدِ اللّٰه ۔ (۱) یعنی ''جس کسی کی یہ خواہش ہو کہ وہ کسی ایسے شہید کو دیکھے جو [زندہ سلامت] زمین پر چل پھر رہا ہو' تو وہ طلحہ بن عبید اللہ کو دیکھ لے''۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے جب بھی غزوۂ اُحد کا تذکرہ ہوتا تو آپؓ بیساختہ فرمایا کرتے تھے: ذٰلِكَ كُلُّهُ كَانَ يَومُ طَلحَة ۔ یعنی ''وہ تمام دن تو بس طلحہ ہی کا دن تھا''۔

مقصد یہ کہ اُس روز طلحہ نے جس طرح سرفروشی وجاں نثاری کا مظاہرہ کیا تھا اُس کی وجہ سے گویا غزوۂ اُحد اور طلحہ بس ہمیشہ کیلئے لازم وملزوم ہو کر رہ گئے ہیں۔

شب وروز اور آتے جاتے موسموں کا یہ سفر جاری رہا...... حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ

(۱) ترمذی [۳۷۳۹] کتاب المناقب، باب مناقب ابی محمد طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ۔

کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری، کسبِ فیض، استفادہ، نیز آپؐ کی خدمت و پاسبانی کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا......آپؐ کی طرف سے بھی طلحہؓ کیلئے محبتوں اور شفقتوں کے مبارک سلسلے مسلسل جاری رہے......حتیٰ کہ اسی کیفیت میں آپؐ کا مبارک دور گذر گیا......آپؐ تادمِ آخر ان سے انتہائی خوش اور مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

☆رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت طلحہ بن عبداللہ رضی اللہ عنہ کو وہی بلند ترین مقام و مرتبہ حاصل رہا اور اس معاشرے میں ان کی وہی قدر و منزلت برقرار رہی......خلیفۂ اول کے مشیرِ خاص اور انتہائی قریبی دوست کی حیثیت سے انہیں دیکھا جاتا رہا......ظاہر ہے کہ ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں بہت قدیم تعلق تھا اور پرانی شناسائی تھی......حتیٰ کہ مکہ شہر میں دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت کے نتیجے میں ہی تو طلحہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تھے......(۱)

☆اور پھر خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی ان کی یہی حیثیت اور قدر و منزلت برقرار رہی......حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قاتلانہ حملے کے نتیجے میں جب شدید زخمی ہو گئے تھے......بچنے کی امید کم تھی......تب اکابرِ صحابہ میں سے متعدد شخصیات نے یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیر المؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کر دیجئے......''اس پر حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب

(۱) مزید یہ کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داماد بھی تھے۔

کرلیں......انہی چھ افراد میں حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

دوسرا پہلو: بے مثال سخاوت وفیاضی:

گذشتہ سطور میں رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کی شخصیت اور ابتدائے اسلام سے خلفائے راشدین کے دور تک ان کی سیرت اور حالاتِ زندگی کا ' اور بالخصوص دینِ برحق کی رفعت وسربلندی کی خاطر ان کی بے مثال جرأت وشجاعت ' راہِ حق میں پیش آنے والے آلام ومصائب پر صبر وتحمل اور بھرپور عزیمت واستقامت کا تذکرہ کیا گیا۔

جبکہ ان کی مبارک شخصیت کا ایک اور پہلو بھی قابلِ ذکر ہے ،اوروہ ہے ان کی سخاوت وفیاضی......

حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ اپنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور سے ہی تجارت پیشہ تھے، رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بالکل ابتدائی دنوں میں یہ ایک تجارتی سفر کے موقع پر ہی ملکِ شام گئے ہوئے تھے جب وہاں انہوں نے ایک بوڑھے راہب کی زبانی یہ عجیب وغریب بات سنی تھی کہ آخری نبیؐ کی بعثت کا وقت آچکا ہے، اور یہ کہ ان کی بعثت مکہ شہر میں ہوگی...... بوڑھے راہب کی یہی بات ان کے قبولِ اسلام کا سبب بنی تھی۔

الغرض اپنے وسیع کاروباری وتجارتی سلسلے کی وجہ سے طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ کافی مالدار اور خوشحال تھے، لہٰذا ہمیشہ ہی دینِ اسلام کی سربلندی ' نیز اللہ کے بندوں کی خیر وخوبی اور فلاح وبہبود کیلئے خوب دریادلی اور فیاضی کے ساتھ اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے، فقراء ومساکین کی خوب دل کھول کر مدد واعانت کیا کرتے تھے۔ ان کی اسی انسان دوستی ' جذبۂ ہمدردی ' انفاق فی سبیل اللہ ' اور سخاوت وفیاضی کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نے انہیں "طلحۃ

الخیر'' (یعنی بہت زیادہ خیر والے طلحہ) نیز ایک موقع پر ''طلحہ الفیاض'' (یعنی انتہائی سخی طلحہ) کے لقب سے یاد فرمایا تھا۔

ایک بار انہیں ملکِ یمن میں اپنے کسی تجارتی سلسلے سے سات لاکھ درہم نقد موصول ہوئے، اتنی بڑی رقم موصول ہونے کے بعد رات بھر بے چین رہے......ان کی اہلیہ ام کلثوم نے اس پریشانی اور بے چینی کی وجہ دریافت کی، تب انہوں نے جواب دیا کہ ''میرے گھر میں سات لاکھ درہم نقد رکھے ہوئے ہیں...... مجھے یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ کہیں یہ مال و دولت مجھے میرے اللہ سے دور نہ کردے''

طلحہؓ کی یہ بات سن کر اہلیہ نے کہا ''کیا میں آپ کو ایک ترکیب بتاؤں......جس کی بدولت یہ مال آپ کو اللہ سے دور کرنے کی بجائے مزید قریب کردے گا؟''

طلحہؓ نے کہا: ''ضرور بتاؤ''

تب اہلیہ بولیں ''یہ تمام مال آپ فقراء و مساکین میں تقسیم کردیجئے''

اپنی اہلیہ محترمہ کی زبانی یہ بات سن کر طلحہؓ بیساختہ بولے ''عظیم باپ کی عظیم بیٹی نے کس قدر عظیم مشورہ دیا ہے''۔ (۱)

اور پھر صبح کا سورج طلوع ہوتے ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے اس نیک بخت خاتون، یعنی اپنی اہلیہ محترمہ کے اس مشورے پر عمل کرتے ہوئے مدینہ شہر میں موجود فقراء و مساکین میں اس رقم کی تقسیم کا مبارک کام شروع کیا......حتیٰ کہ یہ تمام رقم (سات لاکھ درہم) اس ایک دن میں ہی ان فقراء میں تقسیم کردی گئی۔

(۱) ''عظیم باپ''، یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ......مقصد یہ کہ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی اہلیہ ام کلثوم رضی اللہ عنہا، حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی، نیز ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کی بہن تھیں۔

وفات:

☆......۳۵ھ ہجری میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے آخری ایام میں باغیوں نے جب شورش برپا کی، اور یہ معاملہ طول پکڑتا چلا گیا......تب آخران باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا انتہائی المناک واقعہ پیش آیا......جس کی وجہ سے امتِ مسلمہ پہلی بار اتحاد واتفاق کی بجائے افتراق وانتشار کا شکار ہوگئی......اس فتنے کے نتائج بڑے ہی بھیانک نکلے، اوراس کے نقصانات بہت زیادہ دوررس ثابت ہوئے، رفتہ رفتہ اسی فتنے کے نتیجے میں ہی بہت سے نئے نئے فتنے سر اٹھاتے چلے گئے......جو کہ دراصل اسی فتنے (یعنی حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کا قتلِ ناحق) کا ہی تسلسل تھا' جو شکلیں بدل بدل کر مختلف اوقات میں' مختلف مقامات پر ظاہر ہوتا چلا جارہا تھا۔

سن ۳۶ ہجری میں بصرہ کے قریب دریائے فرات کے کنارے پیش آنے والے ایسے ہی ایک انتہائی افسوسناک واقعے (جو کہ تاریخ میں ''جنگِ جمل'' کے نام سے معروف ہے) کے موقع پر جب حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے......جنگ کے آغاز سے قبل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (جو کہ اس وقت مسلمانوں کے خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے فرمانروا اور امیر المؤمنین تھے) کی نگاہ جب حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ پر پڑی تو وہ ان کے قریب آئے اور سرگوشی کے انداز میں ان سے کچھ بات چیت کی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو سے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ انتہائی متأثر ہوئے......فوری طور پر وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا، اوراس تمام معاملے

سے مکمل علیحدگی اختیار کر لینے کا اعلان کیا کہ جو ایک بڑی غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہو گیا تھا، خطرناک اور پیچیدہ قسم کی یہ غلط فہمیاں' نیز سازشوں کے یہ تمام تانے بانے دراصل خفیہ دشمنوں' بدخواہوں' اور سازشی وفسادی قسم کے عناصر کے بُنے ہوئے تھے...... یہ سازشی لوگ تو یقیناً یہی چاہتے تھے کہ فتنے کی یہ آگ اسی طرح بھڑکتی ہی رہے...... اہلِ ایمان دوبارہ کبھی باہم متفق ومتحد نہ ہو سکیں، اور باہمی خونریزیوں کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے......

لہٰذا ان بدخواہوں نے جب یہ منظر دیکھا کہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ تو اس معاملے سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں...... تب انہیں حضرت طلحہؓ کا یہ فیصلہ اور یہ اقدام پسند نہیں آیا...... اور انہیں اپنی اس تمام سازش کی ناکامی کا اندیشہ لاحق ہونے لگا...... اور تب ان سے یہ سب کچھ برداشت نہ ہو سکا، اور ان کے اس مجمع میں سے کسی شخص نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کو باقاعدہ نشانہ بناتے ہوئے ان پر تیر چلایا...... جس کے نتیجے میں یہ زخمی ہو گئے، اور خون بہت زیادہ بہہ جانے کی وجہ سے موقع پر ہی ان کا انتقال ہو گیا......

ایک وقت وہ بھی تھا کہ جب اس واقعے سے تینتیس سال قبل...... بہت دور وہاں مدینہ میں غزوۂ اُحد کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی خاطر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے آنے والے تیروں کے سامنے کسی چٹان کی مانند ڈٹے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ کی طرف آتے ہوئے ان تیروں کو مسلسل اپنے ہاتھوں پر روکتے رہے تھے...... لیکن اس سب کچھ کے باوجود وہ زندہ سلامت ہی رہے تھے...... جبکہ آج یہاں ...... مدینہ سے بہت دور...... بصرہ کے قریب...... فقط ایک تیر ہی جان لیوا ثابت ہوا...... کیونکہ اب پیغامِ اجل آ چکا تھا......

اور یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت طلحہ بن عبید اللہ رضی اللہ عنہ سن چھتیس ہجری میں اٹھاون سال کی عمر میں (بصرہ شہر کے مضافات میں) اپنے اللہ سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معیت وصحبت سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۰/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۳/نومبر ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت زبیر بن العوّام رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ میں قبیلۂ قریش کے خاندان ''بنواسد'' سے تھا، ان کی والدہ صفیہ بنت عبدالمطلب رسول اللہ ﷺ کی پھوپھی تھیں، یعنی آپؓ رسول اللہ ﷺ کے پھوپھی زاد بھائی تھے۔

نیز حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت اسماء رضی اللہ عنہا کے شوہر تھے۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی ولادت مکہ شہر میں ہوئی، حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کے بیٹے ''محمد'' اکثر یوں کہا کرتے تھے کہ ''میرے والد طلحہ' نیز زبیر بن العوام' علی بن ابی طالب' اور سعد بن ابی وقاص (رضی اللہ عنہم اجمعین) کی ولادت مکہ شہر میں ایک ہی سال ہوئی تھی''، یعنی ولادت کے لحاظ سے یہ تمام حضرات ہم عمر تھے۔

☆حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ''السابقین الأولین''، یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے، یعنی وہ عظیم ترین افراد جنھوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا...... یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں' اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

☆مزید یہ کہ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ''، یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ ظہورِ اسلام سے قبل ہی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مابین خاص قریبی تعلقات اور گہرے مراسم تھے، لہٰذا اسی دوستی کی وجہ سے حضرت ابوبکرؓ نے دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دنوں میں انہیں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بارے میں آگاہ کیا، اور انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی، جس کے نتیجے میں حضرت زبیر رضی اللہ عنہ اس دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہوگئے۔

☆ حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو یہ شرف حاصل تھا کہ انہوں نے دینِ اسلام کی رفعت وسربلندی، نیز پیغمبرِ اسلام کی حمایت ونصرت کی خاطر سب سے پہلے اپنی تلوار بلند کی، مکہ شہر میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت مبارکہ کے بعد بالکل ابتدائی دن جب چل رہے تھے، تب ایک روز یہ صورتِ حال پیش آئی کہ مشرکینِ مکہ میں سے کسی نے یہ افواہ اُڑادی کہ (نعوذ باللہ) محمد (ﷺ) قتل کردیئے گئے ہیں......اُس وقت زبیر بالکل ہی نوعمر تھے، لیکن اس کے باوجود جب انہوں نے یہ خبر سنی، تو ان سے رہا نہ گیا......اور اپنی کم سنی کے باوجود ننگی تلوار لہراتے ہوئے ......رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے، آخر ایک جگہ جب آپؐ سے ملاقات ہوئی اور آپ کو زندہ سلامت اور بخیر وعافیت دیکھا......تب یہ مطمئن ہوگئے۔

البتہ رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی (ہاتھ میں برہنہ تلوار لہراتے ہوئے) تو آپؐ نے وجہ دریافت فرمائی......تب نوعمر زبیرؓ نے وجہ بیان کرتے ہوئے اُس افواہ کے بارے میں بتایا......نیز آپ کی خیریت وعافیت اور سلامتی سے متعلق اپنی فکر اور تشویش سے آگاہ کیا......جس پر آپؐ نے انہیں دعائے خیر دی۔

☆ دینِ اسلام کے اسی ابتدائی دور میں جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیوں کا

سلسلہ عروج پر تھا......تب نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، انہی مہاجرینِ حبشہ میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے......اور پھر نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا، تب دیگر تمام مسلمانوں کی طرح حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی مدینہ منورہ آپہنچے......

☆ ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ ودیگر مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ تشریف آوری کے فوری بعد ایک تکلیف دہ صورتِ حال یہ پیش آئی کہ کافی عرصے تک ان مہاجرین حضرات کے ہاں کسی بچے کی ولادت نہیں ہوئی......مدینہ شہر میں چونکہ مقامی عرب آبادی کے علاوہ یہودی بھی بڑی تعداد میں آباد تھے، جو کہ صدیوں سے نسل در نسل وہیں مستقل طور پر مقیم تھے، اور جو کہ رسول اللہ ﷺ نیز آپؐ کے ساتھی مسلمانوں کی مدینہ آمد پر سخت نالاں تھے......اور اتفاق یہ کہ جادو ٹونے میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی، یہی ان کا پسندیدہ ترین مشغلہ تھا، اور اس حوالے سے انہیں بڑی شہرت بھی حاصل تھی (۱)

چنانچہ جب کافی عرصہ اسی کیفیت میں گذر گیا کہ مکہ سے ہجرت کر کے آنے والے کسی مسلمان گھرانے میں کسی بچے کی ولادت نہیں ہوئی......تب ان یہودِ مدینہ نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ افواہ پھیلا دی کہ ''ہم نے ان مسلمانوں پر جادو کر دیا ہے، اور یوں ہم نے جادو کے ذریعے ان کی مستقل نسل بندی کر دی ہے، لہٰذا اب آئندہ ان کے ہاں کوئی اولاد نہیں ہوگی، اور یوں رفتہ رفتہ ان کا خود بخود خاتمہ ہو جائے گا''۔

(۱) حتیٰ کہ ان یہودِ مدینہ نے خود رسول اللہ ﷺ پر بھی جادو کیا تھا، جس پر معوذتین (یعنی قل اعوذ برب الفلق، اور قل اعوذ برب الناس) نازل ہوئی تھیں، اور آپؐ ہمیشہ یہ سورتیں پڑھ کر اپنے او پر دم کیا کرتے تھے۔

مسلمان چونکہ راسخ العقیدہ تھے......لہٰذا اس افواہ پر انہوں نے کان نہیں دھرے، لیکن بہرحال وہ بھی انسان ہی تھے، طبعی طور پر انہیں بھی اولاد کی خواہش تھی......لہٰذا جوں جوں وقت گذرتا گیا، یہود کی طرف سے یہ افواہ تقویت پکڑتی گئی ،اور مسلمانوں کیلئے یہ چیز تشویش کا باعث بنتی چلی گئی۔

آخر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد حضرت زبیر بن العوام اوران کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء بنت ابی بکر الصدیق (رضی اللہ عنہم اجمعین) کو اللہ نے بیٹے سے نوازا، جس کا نام عبداللہ رکھا گیا، چونکہ تمام مہاجرین حضرات کی مدینہ آمد کے بعد......اور پھر یہ کہ عرصۂ دراز اور طویل انتظار اور بے چینی کے بعد......مزید یہ کہ یہودیوں کی طرف سے مسلمانوں کی بذریعۂ جادو نسل بندی کی افواہ اُڑائے جانے کے بعد یہ پہلا نومولود تھا، لہٰذا اس کی ولادت رسول اللہ ﷺ کیلئے' اس بچے کے والدین کیلئے' نیز تمام مسلمانوں کیلئے انتہائی مسرت و شادمانی کا سبب بنی، اس روز مسلمان دن بھر خوشی کا اظہار کرتے رہے ،ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے رہے، اوراس روز مدینہ کے گلی کوچے اللہ اکبر کی صداؤں سے گونجتے رہے......(۱)

☆ ہجرتِ مدینہ کے بعد جلد ہی جب غزوات کی نوبت آئی تو رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے ، ہر غزوے کے موقع پر حضرت زبیرؓ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شریک رہے، بلکہ پیش پیش رہے، اور شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھاتے رہے۔

(۱) اس بچے (عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما) کی ولادت تو مسلمانوں کیلئے انتہائی مسرت کا سبب بنی تھی، سبھی نے بہت زیادہ خوشیاں منائی تھیں، لیکن صد افسوس کہ (حجاج بن یوسف کے مظالم کے نتیجے میں) اس بچے کی (مکہ میں) وفات کا واقعہ انتہائی دردناک تھا اور تمام اہلِ ایمان کو یہ واقعہ برسوں' بلکہ صدیوں خون کے آنسو رُلاتا رہا تھا۔

☆غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمان اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے تھے، اور ہر طرف افراتفری پھیل گئی تھی، مسلمانوں کو بہت زیادہ پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، اور وہ سب شدید صدمے کی کیفیت سے دوچار تھے......

ایسے میں جنگ کے خاتمے کے فوری بعد مسلمانوں کو یہ تشویش لاحق ہوئی کہ ہماری اس کیفیت اور شکست وریخت کو محسوس کرتے ہوئے ایسا نہ ہو کہ مشرکینِ مکہ اس موقع سے فائدہ اٹھانے کی خاطر دوبارہ ہم پر حملہ آور ہو جائیں......لہٰذا اس چیز کے سدِ باب کی غرض سے رسول اللہ ﷺ نے اپنے اصحاب سے مشاورت اور غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ فرمایا کہ مسلمانوں کا ایک دستہ مشرکینِ مکہ کے تعاقب میں روانہ کر دیا جائے تا کہ ان پر خوف طاری ہو جائے......

ظاہر ہے کہ اس وقت مسلمان جس جسمانی ونفسیاتی کیفیت سے دوچار تھے، اور جس طرح انہیں شکست وریخت کا سامنا تھا......وہ سبھی زخموں سے چور تھے......ایسے میں اب دوبارہ اسی دشمن کے تعاقب میں نکل کھڑے ہونا...... یہ بہت دل گردے کا......اور انتہائی جان جوکھوں کا کام تھا......

لیکن بہر حال جب رسول اللہ ﷺ نے اس چیز کا فیصلہ فرما ہی لیا......تو اب ستر مسلمانوں کا ایک دستہ فوری طور پر تیار کیا گیا اور اس کی قیادت کیلئے آپؐ نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا، چنانچہ یہ دستہ اُحد کے میدان سے ہی فوری طور پر مشرکینِ مکہ کے تعاقب میں روانہ ہو گیا......

مکہ کی طرف پلٹتے ہوئے مشرکین نے جب مسلمانوں کے اس دستے کو اپنے تعاقب میں آتا دیکھا......تو وہ مسلمانوں کی ہمت وشجاعت، بلند حوصلہ، اور عزیمت واستقامت دیکھ کر

حیرت زدہ رہ گئے......ان میں سے کچھ لوگ یوں کہنے لگے کہ اتنی بڑی شکست کے بعد مسلمان کبھی ہمارے تعاقب کی جرأت نہیں کرسکتے، لہٰذا ضرور انہیں کہیں سے کوئی بڑی بھرپور مدد ملی ہے، لہٰذا یہ کوئی تازہ دم دستہ ہمارے تعاقب میں چلے آرہا ہے......اور عین ممکن ہے کہ اس کے پیچھے مزید دستے بھی چلے آرہے ہوں......

الغرض مسلمانوں کے اس بروقت اقدام کی وجہ سے مشرکینِ مکہ پر مسلمانوں کی طرف سے خوف اور رعب طاری ہوگیا، جس کی وجہ سے انہوں نے یہ طے کیا کہ ہمیں راستے میں کہیں رکے بغیر جلد از جلد واپس مکہ پہنچنا چاہئے......چنانچہ اب انہوں نے اپنی واپسی کی رفتار مزید تیز کردی اور سیدھے مکہ پہنچ کر ہی دم لیا......اور یوں مسلمان ان کے دوبارہ حملہ آور ہوجانے کے اندیشے سے محفوظ و مطمئن ہوگئے۔

☆غزوۂ احزاب (خندق) کے موقع پر جب مشرکینِ مکہ' نیز دیگر بہت سے عرب قبائل مسلمانوں پر حملہ آور ہونے کی غرض سے بہت بڑی تعداد میں مدینہ آپہنچے تھے، کیفیت یہ تھی کہ جدھر نگاہ اٹھتی تھی بس چہار سو دشمن کی فوج ہی نظر آتی تھی......اس بیرونی دشمن کی طرف سے لاحق خطرے کے علاوہ مزید یہ کہ اندرونی خفیہ دشمنوں' بالخصوص یہودِ مدینہ کے طاقتور قبیلے ''بنوقُریظہ'' کی طرف سے مسلمانوں کو بہت زیادہ تشویش لاحق تھی، ایسی اطلاعات بھی مل رہی تھیں کہ اس قبیلے نے مشرکینِ مکہ کے ساتھ خفیہ معاہدہ کر رکھا ہے، اور یہ منصوبہ تیار کیا گیا ہے کہ جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں پر بھرپور حملہ کیا جائے گا، اور ہر طرف خوب افراتفری ہوگی......تب موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مدینہ شہر کے اندر یہ یہودی فتنہ برپا کریں گے، مسلمانوں کے گھروں پر حملے کریں گے، ان کی املاک کو لوٹیں گے، نیز ان کی عورتوں اور بچوں کو قتل کر ڈالیں گے......

یہودِ مدینہ کے ان ناپاک عزائم سے رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمان بخوبی آگاہ ہو چکے تھے، لہٰذا اب یہ بہت نازک صورتِ حال تھی، ایک طرف خندق کے اُس پار صف آرا بیرونی دشمن کی طرف سے کسی بھی وقت بڑا حملہ متوقع تھا، دوسری طرف خود مدینہ شہر کے اندر اِن خفیہ دشمنوں کی طرف سے اچانک بڑی جارحیت کا اندیشہ تھا......ایسے میں مسلمانوں کو اپنے بیوی بچوں کے بارے میں بڑی تشویش لاحق تھی......

اسی صورتِ حال کے درمیان ایک رات رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادفرمایا: مَن يَأْتِينِي بِخَبَرِ بَنِي قُرَيظَة؟ یعنی''ہے کوئی جو مجھے بنوقریظہ کے بارے میں خبر لاکردے؟''اس پر حضرت زبیرؓ نے عرض کیا''اے اللہ کے رسول! میں حاضر ہوں''

چونکہ یہ کام بہت زیادہ خطرناک تھا، تنہا خفیہ طور پر بنوقریظہ کے محلے میں جانا، وہاں صورتِ حال کا جائزہ لینا، کسی بھی طرح ان کے عزائم اور خفیہ منصوبوں کا کھوج لگانا، اور پھر اسی طرح چھپتے چھپاتے وہاں سے واپس آنا......مزید اتفاق یہ کہ وہ رات بھی انتہائی بھیانک تھی، اندھیرا بہت زیادہ تھا، ہرطرف تیز طوفانی ہواؤں کے جھکڑ چل رہے تھے، سردی انتہائی عروج پر تھی......

یہی وجہ تھی کہ ایسے میں یہ کام انجام دینا بہت جان جوکھوں کا کام تھا......لہٰذا رسول اللہ ﷺ کے استفسار پر جب حضرت زبیرؓ نے آمادگی ظاہر کرتے ہوئے خود کو اس کام کیلئے پیش کیا، تو اس کے باوجود آپ ﷺ نے اپنا یہی سوال دہرایا......دوسری بار بھی وہاں موجود تمام افراد میں سے حضرت زبیرؓ نے ہی جواب دیا کہ''میں حاضر ہوں''۔اور پھر آپ ﷺ نے تیسری بار یہی سوال دہرایا، تب تیسری بار بھی حضرت زبیرؓ نے ہی جواب دیا کہ''میں حاضر ہوں''

تب رسول اللہ ﷺ نے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو ضروری ہدایات دے کر بنوقریظہ کی جانب روانہ فرمایا، اور اس موقع پر آپؐ نے یہ یادگار ترین الفاظ ارشاد فرمائے: لِكُلِّ نَبِيٍّ حَوَارِيٌّ وَحَوَارِيِّي الزُّبَير (۱) یعنی "ہر نبی کا ایک حواری ہوا کرتا ہے، اور میرے حواری زبیر ہیں"۔ (۲)

وقت کا یہ سفر جاری رہا...... حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری، کسبِ فیض، استفادہ، نیز آپؐ کی خدمت و پاسبانی کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا...... آپؐ کی طرف سے بھی زبیرؓ کیلئے محبتوں اور شفقتوں کے مبارک سلسلے مسلسل جاری رہے...... حتیٰ کہ اسی کیفیت میں آپؐ کا مبارک دور گذر گیا...... آپؐ تادمِ آخر ان سے انتہائی خوش اور مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

☆ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو وہی بلند ترین مقام و مرتبہ حاصل رہا اور اس معاشرے میں ان کی وہی قدر و منزلت برقرار رہی...... خلیفۂ اول کے مشیرِ خاص اور انتہائی قریبی دوست کی حیثیت سے انہیں دیکھا جاتا رہا...... ظاہر ہے کہ ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں بہت قدیم تعلق تھا اور پرانی شناسائی تھی، حتیٰ کہ مکہ شہر میں دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں خود حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی دعوت کے

(۱) ☆ صحیح بخاری [۳۷۱۹] کتاب فضائل الصحابہ۔ ☆ صحیح مسلم [۲۴۱۵] ☆ الاستیعاب فی معرفۃ الاصحاب، الرقم المسلسل: ۸۵۴۔

(۲) "حواری" یعنی بہت خاص دوست۔

کے نتیجے میں ہی تو حضرت زبیر رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تھے......(۱)

☆ اور پھر خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی ان کی یہی حیثیت اور قدر و منزلت برقرار رہی......حتیٰ کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ قاتلانہ حملے کے نتیجے میں جب شدید زخمی ہوگئے......بچنے کی امید کم تھی......تب اکابرِ صحابہ میں سے متعدد شخصیات نے یہ اصرار کیا تھا کہ ''اے امیرالمؤمنین آپ اپنا کوئی جانشین مقرر کردیجئے......'' اس پر حضرت عمرؓ نے جن چھ افراد کے نام گنواتے ہوئے یہ تاکید کی تھی کہ یہی چھ افراد باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی کو منصبِ خلافت کیلئے منتخب کرلیں، ان چھ افراد میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

وفات:

☆......۳۵ھ میں باغیوں اور شرپسندوں نے جب خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے گھر کا محاصرہ کیا، اور پھر انہی باغیوں کے ہاتھوں حضرت عثمانؓ کی شہادت کا المناک واقعہ پیش آیا......اور پھر عرصۂ دراز تک اس المناک واقعے کے بھیانک نتائج واثرات مختلف فتنوں کی شکل میں مسلسل ظاہر ہوتے رہے......

۳۶ھ میں بصرہ کے قریب دریائے فرات کے کنارے ایسا ہی ایک افسوسناک واقعہ پیش آیا جو کہ دراصل یقیناً ''فتنۂ قتلِ عثمان'' ہی کا لازمی نتیجہ تھا......اس افسوسناک واقعے (جو کہ تاریخ میں ''جنگِ جمل'' کے نام سے معروف ہے) کے موقع پر جب حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ بھی وہاں موجود تھے، تب جنگ کے آغاز سے قبل حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ (جو کہ اس وقت مسلمانوں کے خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے فرمانروا اور امیرالمؤمنین

(۱) مزید یہ کہ حضرت زبیر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داماد بھی تھے۔

تھے) کی نگاہ جب حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ پر پڑی تو وہ ان کے قریب آئے اور سرگوشی کے انداز میں ان سے کچھ بات چیت کی۔

حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی اس گفتگو سے حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ انتہائی متأثر ہوئے ......اورفوری طور پر وہاں سے چلے جانے کا فیصلہ کیا،اوراس تمام معاملے سے مکمل علیحدگی اختیار کر لینے کا اعلان کیا کہ جو ایک بڑی غلط فہمی کے نتیجے میں پیدا ہو گیا تھا۔

جن فسادیوں' بدخواہوں' اور سازشی عناصر کی مسلسل ریشہ دوانیوں کی وجہ سے یہ فتنہ اس قدر خطرناک شکل اختیار کر گیا تھا،اوراس صورتِ حال پر وہ انتہائی مسرور وشاداں تھے......اب انہوں نے جب حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جیسی اہم شخصیت کو وہاں سے واپس لوٹتے ہوئے دیکھا تو انہیں اپنی تمام سازش خطرے میں نظر آنے لگی......اوران سے یہ منظر برداشت نہ ہوسکا......تب ان میں سے ابن جرموز نامی ایک شخص اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ خفیہ طور پر ان کے تعاقب میں روانہ ہو گیا،حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ تنہا اپنے گھوڑے پر سوار اُس مقام سے جو کہ بصرہ شہر کے قریب تھا' بہت دور اپنی منزل یعنی مدینہ کی جانب روانہ ہو گئے......ابن جرموز اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مسلسل تعاقب میں رہا،جبکہ اس دوران حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو اس چیز کا اندازہ نہیں ہوسکا کہ کوئی دشمن ان کے تعاقب میں ہے۔آخر''وادی السباع'' نامی ایک مقام پر جب یہ اپنے گھوڑے سے اترے اور نماز میں مشغول ہو گئے تب ان دشمنوں نے موقع غنیمت جانا،اورعقب سے اچانک حملہ کر دیا......جس کے نتیجے میں یہ زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے موقع پر ہی شہید ہو گئے۔

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سن چھتیس

ہجری میں بصرہ کے قریب اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے اللہ سے جا ملے۔
بصرہ کے قریب ایک بستی میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا، وہ بستی انہی کی طرف نسبت کی وجہ سے آج بھی ''الزبیر'' کے نام سے معروف ہے۔
ان کی تجہیز و تکفین کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے جو اس موقع پر مسلسل ان کیلئے دعائے خیر کرتے رہے اور تحسین آمیز کلمات کے ساتھ ان کا ذکرِ خیر کرتے رہے۔
اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کے درجات بلند فرمائیں، اور ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے نوازیں۔آمین۔(۱)

(۱) عجیب اتفاق ہے کہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ اور حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہما کے حالاتِ زندگی میں بڑی حد تک مماثلت پائی جاتی ہے، دونوں ''السابقین الاولین'' میں سے تھے، دونوں ''عشرہ مبشرہ'' میں سے تھے، دونوں ہم عمر اور ہم عصر تھے، دونوں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے داماد تھے، دونوں ''اصحابِ شوریٰ'' یعنی ان چھ جلیل القدر شخصیات میں شامل تھے جنہیں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اپنے بعد خلافت کے منصب کیلئے منتخب فرمایا تھا، دونوں کی ایک ہی واقعے میں بصرہ کے قریب ایک ہی جیسے حالات میں شہادت ہوئی......حتیٰ کہ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک موقع پر ان دونوں کے بارے میں یہ ارشاد فرمایا تھا: طَلحَة وَ الزُبَیر جَارَايَ فِي الجَنَّة یعنی ''طلحہ اور زبیر دونوں جنت میں میرے پڑوسی ہیں''۔ترمذی[۳۷۴۱]عن علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔کتاب المناقب۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۳/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۶/نومبر ۲۰۱۴ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ شہر میں قبیلۂ قریش کے مشہور خاندان ''بنوعدی'' سے تھا(۱) حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا تعلق بھی اسی خاندان سے تھا،لہٰذا دونوں میں قرابت داری تھی،سعید کے والد زید' اور حضرت عمرؓ باہم چچازاد بھائی تھے،سعید کی اہلیہ فاطمہ بنت خطاب رضی اللہ عنہا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔

☆حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ ''السابقین الأ ولین''یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والوں میں سے تھے،یعنی وہ عظیم ترین افراد جنہوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا......یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام ومرتبہ ہے،ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں' اور انہیں قرآن کریم میں ''السابقین الأ ولین'' کے نام سے یاد کیا گیا ہے۔

(۱) خاندان ''بنوعدی'' مکہ کے مشہور محلّہ ''شُبیکہ''میں آباد تھا۔

(۲) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بہن فاطمہ رضی اللہ عنہا سعید رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں،جبکہ سعید کی بہن عاتکہ بنت زید رضی اللہ عنہا (جن کی فہم وفراست اور علم وادب کی مکہ میں بڑی شہرت تھی) کی شادی عبداللہ بن ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہما کے ساتھ ہوئی تھی، جوکہ سن آٹھ ہجری میں فتحِ مکہ اور پھر غزوۂ حنین کے فوری بعد غزوۂ طائف کے موقع پر شدید زخمی ہوگئے تھے،اور پھر مدینہ واپسی کے بعد انہی زخموں کے نتیجے میں شہید ہوگئے تھے،تب ان کی بیوہ عاتکہ بنت زید یعنی سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی بہن' حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آ گئی تھیں،اور پھر یکم محرم سن ۲۴ ہجری میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد ان کی شادی حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ سے ہوگئی تھی۔

☆ مزید یہ کہ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ ''عشرہ مبشرہ'' یعنی ان دس خوش نصیب ترین افراد میں سے تھے جنہیں اس دنیا کی زندگی میں ہی رسول اللہ ﷺ نے جنت کی خوشخبری سے شادکام فرمایا تھا۔

☆ سعید کے والد (زید بن عمرو بن نفیل) مشرکینِ مکہ کی بت پرستی وگمراہی اوراخلاقی بے راہ روی سے سب سے بہت زیادہ دلبرداشتہ وبیزار تھے، نیز رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل ہمیشہ تلاشِ حق میں سرگرداں رہا کرتے ......اسی تلاشِ حق میں ہی انہوں نے متعدد بار ملکِ شام کا سفر کیا، وہاں راہبوں سے ملاقاتیں کرکے دینِ نصرانیت' اور کبھی یہودیت کے بارے میں معلومات حاصل کرتے رہے، لیکن مطمئن نہیں ہوسکے......

☆ اُس دور میں انتہائی رونگٹے کھڑے کردینے والی ایک برائی جو عرب معاشرے میں عام تھی' وہ یہ کہ وہ لوگ عار کے ڈر سے اپنی نوزائیدہ بچیوں کو خود اپنے ہی ہاتھوں زندہ درگور کردیا کرتے تھے۔

سعید کے والد زید نے یہ معمول بنا رکھا تھا کہ جس کسی کے بارے میں انہیں یہ بات معلوم ہوتی کہ وہ اپنی بیٹی کو زندہ درگور کرنے والا ہے...... یہ اس کے پاس پہنچ جاتے، اوراس سے وہ بیٹی ہمیشہ کیلئے اپنی کفالت میں لے لیتے، اور خود اس کی پرورش کیا کرتے...... یوں زید کی زیرِ کفالت بڑی تعداد میں ایسی بچیاں پرورش پایا کرتی تھیں۔

☆ مکہ شہر میں اُن دنوں زید کے بارے میں یہ بات مشہور تھی کہ عزیزواقارب اوردوستوں کے ساتھ میل جول اور ملاقات کی غرض سے آمدورفت کے موقع پر یہ کسی کے گھر میں گوشت نہیں کھایا کرتے تھے، اور یوں کہا کرتے تھے کہ ''اللہ کا نام پڑھے بغیر جو جانور ذبح کیا گیا ہو' اس کا گوشت کھانا حرام ہے، تم لوگ اللہ کے نام کی بجائے اپنے بتوں کے نام پر جانور

قربان کیا کرتے ہو......لہٰذا میں تمہارے ان جانوروں کا گوشت نہیں کھاؤں گا''۔

ایک روز مکہ میں کوئی بڑا عالی شان میلہ لگا ہوا تھا، بہت رش تھا اور بڑی رونق تھی، بڑے بڑے مالدار اور صاحبِ حیثیت افراد اور خوشحال قسم کے لوگ وہاں موجود تھے، جنھوں نے نفیس لباس زیب تن کر رکھے تھے، سروں پر قیمتی پگڑیاں سجا رکھی تھیں، نیز ان کی عورتیں بھی خوب زیورات سے آراستہ اور زرق برق لباس پہنے ہوئے بڑی تعداد میں ان کے ہمراہ تھیں، یوں یہ امیر کبیر اور سردار قسم کے لوگ اپنی خواتین اور بچوں کے ہمراہ وہاں اِتراتے پھر رہے تھے......مزید یہ کہ ان کے ہمراہ بڑی تعداد میں قیمتی جانور بھی موجود تھے، جنہیں انہوں نے خوب سجا رکھا تھا، ان کے گلوں میں ہار اور پاؤں میں گھنگرو ڈال رکھے تھے۔

زید ہر سال ہی اس میلے کے موقع پر اس قسم کے مناظر دیکھا کرتے تھے، اس سال بھی حسبِ معمول یہی تمام مناظر ان کی آنکھوں کے سامنے موجود تھے......تب ان سے رہا نہ گیا...... اور انہوں نے وہاں موجود ان بڑے بڑے سردارانِ قریش کی موجودگی میں سب کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یوں کہنا شروع کیا: ''لوگو! تمہیں کیا ہو گیا ہے؟ ان جانوروں کو اللہ نے پیدا کیا ہے، اسی اللہ نے آسمان سے پانی برسایا تو ان جانوروں کو اپنی پیاس بجھانا نصیب ہوا، اسی اللہ نے ہی زمین سے سبزہ اُگایا جسے کھا کر یہ جانور اپنی بھوک مٹانے کے قابل ہو سکے، پھر یہ کہاں کی عقلمندی ہے کہ تم ان جانوروں کو اللہ کے نام کی بجائے اپنے ان بتوں کے نام پر قربان کیا کرتے ہو......؟''

زید کی یہ باتیں سن کر وہ سردارانِ قریش سخت برہم ہوئے، انہیں خوب برا بھلا کہا، اور سخت لہجے میں تنبیہ کرتے ہوئے کہا ''بہت ہو چکا......آئندہ کبھی ایسی فضول باتیں نہ کرنا...... ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا......'' یوں زید کو ڈرا دھمکا کر خاموش کر دیا گیا۔

اُس ماحول سے بیزار زید نے ’’ تلاشِ حق‘‘ کی جستجو جاری رکھی......اسی سلسلے میں انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اپنے اردگرد ایسے لوگوں کوتلاش کیا جائے جواس معاملے میں ان کے ہمخیال ہوں......اور پھر تلاشِ بسیار کے بعد آخرانہیں مکہ میں تین افراد ایسے ملے جوشرک وبت پرستی سے بیزاری کے سلسلے میں ان کے ہم خیال نکلے، وہ تین افراد یہ تھے، ورقہ بن نوفل ،عبداللہ بن جحش ، اورعثمان بن حارث،اور پھر کچھ عرصہ بعد اُمیمہ بنت عبدالمطلب (رسول اللہﷺ کی پھوبھی) بھی ان میں شامل ہوگئیں ۔(۱)

اس دوران زید مسلسل تلاشِ حق کی خاطر جستجو میں مشغول ومنہمک رہے،نصرانیت اور یہودیت کی تعلیمات کے بارے میں انہوں نے بہت زیادہ غوروفکر کیا،لیکن ان کا دل یہ گواہی دیتا تھا کہ بس ’’دینِ ابراہیم‘‘ ہی اصل اور برحق دین ہے......

مکہ شہر میں وہ رات دن اپنی آنکھوں سے بیت اللہ کا نظارہ ومشاہدہ کیا کرتے تھے،اور یہ سوچ کرانتہائی افسردہ ہوجایا کرتے تھے کہ یہ بیت اللہ جس کے معمار حضرت ابراہیم علیہ السلام تھے،ان کا تعمیر کردہ یہ مبارک گھر ہمارے اپنے ہی شہر میں ہے، ہماری نگاہوں کے سامنے ہے،مگرافسوس کہ وہ دینِ ابراہیم جس کی بنیاد ’’توحید‘‘ پر تھی......اس دینِ برحق کے

(۱)انہی دنوں ورقہ بن نوفل بھی مسلسل تلاشِ حق میں مشغول تھے، بالآخر رسول اللہﷺ کی بعثت سے محض چندروز قبل انہوں نے شرک سے توبہ کرکے دینِ نصرانیت اختیار کرلیا تھا،اس کے بعد جب رسول اللہﷺ کی بعثت ہوئی توام المؤمین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا آپﷺ کوہمراہ لئے ہوئے ورقہ کے پاس پہنچی تھیں،اورآپؐ کی بعثت سے متعلق تمام صورتِ حال بیان کی تھی،جس پر ورقہ نے آپؐ کی بعثت ورسالت کی تصدیق کی تھی ، اور پھر محض چندروز بعد ہی ان کی وفات ہوگئی تھی۔

جبکہ عبداللہ بن جحش رسول اللہﷺ کی پھوپھی اُمیمہ بنت عبدالمطلب کے بیٹے اورام المؤمنین حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے بھائی تھے، کچھ ہی عرصے بعد جب رسول اللہﷺ کی بعثت ہوئی تو یہ مسلمان ہوگئے تھے، اور پھر سن تین ہجری میں غزوۂ اُحد کے موقع پرشہید ہوگئے تھے۔

بارے میں معلومات حاصل کرنے کا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا......کوئی وسیلہ دکھائی نہیں دیتا، البتہ اسی کیفیت میں شرک و بت پرستی سے مکمل اجتناب کرتے ہوئے وہ اپنی دانست کے مطابق اللہ وحدہ لاشریک لہ کی عبادت کیا کرتے......لیکن یہ کہ دینِ ابراہیم کے مطابق اس ایک اللہ کی عبادت کا اصل کیا طریقہ ہے؟ نیز اس دین کی مزید کیا تفصیلات ہیں؟ اس بارے میں وہ مسلسل غور وفکر میں گم رہا کرتے تھے۔

اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا......اس دوران رسول اللہ ﷺ سے بھی ان کا تعارف اور میل جول کا سلسلہ جاری رہا، تاہم اس وقت تک رسول اللہ ﷺ کو نبوت و رسالت سے سرفراز نہیں کیا گیا تھا۔

ایک بار جب اسی سلسلے میں جستجو اور تلاش کی غرض سے وہ ملکِ شام گئے ہوئے تھے' تب وہاں اسی بارے میں کسی راہب کے ساتھ کچھ تبادلۂ خیال کی نوبت آئی، راہب نے ان کی گفتگو سننے اور ان کے خیالات جاننے کے بعد کہا: ''اے مکہ والے......تمہاری باتیں سننے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ جس دین کی تمہیں تلاش ہے' وہ ''دینِ ابراہیم'' ہے۔ تم اس کی تلاش میں سرگرداں ہو، لیکن اس دین کا اب اس دنیا میں کوئی وجود باقی نہیں رہا......''

اور پھر اس راہب نے مزید کہا: ''ہاں البتہ تمہارے ہی شہر مکہ میں عنقریب ایک ایسی شخصیت کا ظہور ہونے والا ہے جو اللہ کے حکم سے اس ''دینِ ابراہیم'' کی تجدید کرے گا، لہٰذا میری نصیحت یہ ہے کہ تم جلد از جلد واپس مکہ روانہ ہو جاؤ''۔

راہب کی زبانی یہ بات سننے کے بعد زید کو یوں محسوس ہوا گویا متاعِ گمشدہ مل گئی ہو، اور گوہرِ مقصود ہاتھ آ گیا ہو......چنانچہ انہوں نے فوراً ہی واپسی کی تیاری کی، اور ملکِ شام سے شہر مکہ کی جانب رواں دواں ہو گئے......!

اس سفر کے دوران راستے میں کسی ویران مقام پر رہزنوں کے ایک گروہ نے ان کے قافلے پر حملہ کر دیا، جس کے نتیجے میں ان کے ساتھیوں میں سے کوئی مارا گیا اور کوئی زخمی ہوا، زید بھی بری طرح زخمی ہوئے، اور ان پر نزع کی کیفیت طاری ہونے لگی، ایسے میں جب آخری سانسیں چل رہی تھیں' زید نے نگاہ آسمان کی جانب اٹھائی، اپنے دونوں لرزتے ہوئے ہاتھ فضاء میں بلند کئے، اور پھر کپکپاتے ہونٹوں سے یہ دعاء کی: اَللّٰھُمّ اِن کُنتَ حَرَمْتَنِي مِن هٰذَا الخَير فَلَاتَحْرِم مِنه ابنِي سَعِيداً یعنی "اے اللہ! میں تو اس خیر سے محروم ہی رہ گیا...... لیکن اب تو میرے بیٹے سعید کو اس خیر سے محروم نہ رکھنا" اور اس کے ساتھ ہی زید نے آخری ہچکی لی اور دنیائے فانی سے کوچ کر گئے۔

زید کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ دعاء اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی بارگاہ میں مقبول ہوئی، چنانچہ اس کے بعد محض چند روز ہی گذرے تھے کہ مکہ میں دینِ اسلام کا سورج طلوع ہوا، رسول اللہ ﷺ نے اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جب دنیا والوں کو اللہ کا پیغام پہنچانے اور دینِ برحق کی طرف دعوت دینے کا مبارک سلسلہ شروع فرمایا...... تب زید کے بیٹے سعید اُن خوش نصیب ترین افراد میں شامل تھے جنہوں نے بہت جلد اس دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام قبول کر لیا تھا۔

دراصل سعید بن زید کی تو آنکھ ہی اس گھرانے میں کھلی تھی جہاں مشرکینِ مکہ کے اس ماحول سے مکمل بیزاری و بے رغبتی پائی جاتی تھی، سعید کی تربیت ایسے باپ کی زیرِ نگرانی ہوئی تھی جو زندگی بھر تلاشِ حق میں سرگرداں رہا تھا، اور پھر اسی حق کی جستجو میں ہی دورانِ سفر اس نے اپنی جان دے دی تھی......

رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق پر دل و جان سے لبیک کہتے ہوئے سعید محض تنہا ہی مسلمان

نہیں ہوئے تھے' بلکہ ان کے ہمراہ ان کی اہلیہ فاطمہ بنت خطاب بھی مسلمان ہوگئی تھیں، جوکہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بہن تھیں۔

قبولِ اسلام کے بعد مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیوں کے سلسلے زور وشور کے ساتھ شروع ہوگئے، مشرکین ومخالفین نے سرتوڑ کوشش کی کہ سعید کسی طرح دینِ اسلام سے منحرف ہوجائیں، اور دوبارہ اپنے پرانے دین کواپنالیں......اس مقصد کیلئے ترغیب وترہیب سمیت تمام حربے آزمائے گئے، لیکن مشرکینِ مکہ اپنی اس کوشش میں کامیاب نہوسکے......بلکہ الٹایہ صورت ہوئی کہ ان دونوں میاں بیوی نے مشرکینِ مکہ سے ان کی ایک انتہائی اہم اور بااثر ترین شخصیت کوچھین لیا......یعنی عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ)

ہوایوں کہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں جب مسلمانوں کے شدید دشمن تھے، انہی دنوں جب انہیں یہ بات معلوم ہوئی کہ ان کی اپنی بہن (فاطمہ بنت خطاب) اور بہنوئی (سعید بن زید) مسلمان ہوچکے ہیں......تب وہ انتہائی غیظ وغضب کی کیفیت میں بہن کے گھر پہنچے تھے، جہاں اس وقت حضرت خباب بن الأرت رضی اللہ عنہ ان دونوں کوقرآن پڑھارہے تھے، عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کوآتا دیکھ کر خباب تو کہیں چھپ گئے تھے، البتہ عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) نے اس موقع پر بہن اور بہنوئی کے ساتھ بہت سختی ودرشتی کا معاملہ کیا......لیکن بالآخر جب انہوں نے وہاں قرآن کریم کی وہ آیات پڑھیں جواس وقت ان کی بہن اور بہنوئی پڑھ رہے تھے......(۱) تب دیکھتے ہی دیکھتے عمر بن خطاب (رضی اللہ عنہ) کے دل کی دنیا بدل گئی، اور پھر اگلے ہی لمحے وہ دینِ اسلام قبول کرنے اور کلمۂ توحید پڑھنے کی خاطر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں

(۱) سورہ طٰہٰ کی ابتدائی آیات۔

حاضری کی غرض سے کوہِ صفا سے متصل ''دارالأرقم'' کی جانب راونہ ہوگئے تھے......
اور پھر صورتِ حال یہ ہوئی تھی کہ مشکلات سے بھرپور اس ابتدائی دور میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا قبولِ اسلام مسلمانوں کیلئے بڑی تقویت کا باعث بنا تھا، جبکہ کفار و مشرکین کے حوصلے پست ہوگئے تھے......اور بے اختیار وہ یوں کہنے لگے تھے کہ ''آج مسلمانوں نے ہم سے بدلہ لے لیا''۔

☆ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جب مسلمان ہوئے تب ان کی عمر محض بیس برس تھی، قبولِ اسلام کے بعد سے وہ ہمیشہ دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی خدمت' نیز دینِ برحق کی رفعت و سربلندی کیلئے ہر ممکن کوشش کرتے رہے، اوراس راستے میں پیش آنے والے تمامتر مصائب وآلام کا خندہ پیشانی کے ساتھ مقابلہ کرتے رہے۔

☆ نبوت کے تیرہویں سال ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے کے بعد رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمانوں کی طرح حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر باد کہا اور مدینہ جا پہنچے، اور پھر ہجرت کے دوسرے ہی سال سے جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف مسلسل جارحیت کا آغاز ہوا تو حق و باطل کے مابین اولین معرکہ یعنی غزوۂ بدر کے موقع پر یہ شرکت نہیں کر سکے تھے، اوراس کی وجہ یہ ہوئی تھی کہ ان دنوں خود رسول اللہ ﷺ نے انہیں اور حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ (۱) کو مشرکینِ مکہ کے لشکر کی نقل وحرکت پر نظر رکھنے کی غرض سے مدینہ سے باہر کسی مقام کی جانب بھیجا ہوا تھا، اور پھر ان کی واپسی سے قبل ہی غزوۂ بدر کا تاریخی واقعہ پیش آگیا تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے ان دونوں حضرات کو اس غزوے میں شرکت کے اجر وثواب کی خوشخبری سے شادکام

(۱) حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کا تذکرہ گذشتہ صفحات [۱۹۵-۲۰۸] میں گذر چکا ہے۔

فرمایا تھا۔

البتہ غزوۂ بدر کے بعد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے' ہر غزوے کے موقع پر حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت حاضر اور شریک رہے اور اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر ہمیشہ بے مثال شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے رہے......

وقت کا یہ سفر جاری رہا......حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری' کسبِ فیض' استفادہ' نیز آپ ﷺ کی خدمت و پاسبانی کا یہ سلسلہ اسی طرح چلتا رہا......آپ ﷺ کی طرف سے بھی سعیدؓ کیلئے محبتوں اور شفقتوں کے مبارک سلسلے مسلسل جاری رہے......حتیٰ کہ اسی کیفیت میں آپ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا، آپ ﷺ تا دمِ آخر ان سے ہمیشہ انتہائی خوش اور مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

☆ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دور میں بھی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کو وہی بلند ترین مقام و مرتبہ اور وہی قدر و منزلت حاصل رہی......خلیفۂ اول کے مشیرِ خاص اور انتہائی قریبی دوست کی حیثیت سے انہیں دیکھا جاتا رہا......اور پھر یہی کیفیت باقی خلفاء کے دور میں بھی رہی۔

حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں پیش آنے والے تمام غزوات (ماسوائے غزوۂ بدر) کے موقع پر انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ شرکت کرتے رہے' بلکہ پیش پیش رہے، یہی صورتِ حال عہدِ نبوی کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں برقرار رہی، بالخصوص خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت

میں فتوحات کا جو ایک عظیم الشان سلسلہ تھا، اس موقع پر سعیدؓ ہمیشہ بھرپور جذبۂ ایمانی کے ساتھ شریک رہے اور بے مثال شجاعت و بہادری کے جوہر دکھاتے رہے، خصوصاً سن تیرہ ہجری میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں رومیوں کے خلاف لڑی جانے والی انتہائی یادگار اور فیصلہ کن ''جنگِ یرموک'' کے موقع پر' اور پھر سن چودہ ہجری میں حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں ''فتحِ دمشق'' اور پھر سن پندرہ ہجری میں ''فتحِ بیت المقدس'' کے یادگار موقع پر بھی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر میں موجود تھے۔

سلطنتِ روم کے خلاف محاذ پر اسلامی لشکر کے سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ نے ''فتحِ دمشق'' کے بعد انہیں دمشق شہر کا والی (فرمانروا) مقرر فرمایا تھا، لہٰذا دمشق جیسے اہم ترین' انتہائی تاریخی اور قدیم شہر کی مسلمانوں کے ہاتھوں فتح کے بعد اس شہر کے اولین حکمران حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ تھے۔(۱)

اس کے بعد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ طویل عرصہ تک اسی تاریخی شہر دمشق میں ہی مقیم رہے اور وہاں کے فرمانروا کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔

اور پھر کافی عرصہ گذر جانے کے بعد حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ دمشق سے واپس مدینہ منورہ لوٹ آئے...... جہاں شب و روز کا یہ سفر جاری رہا......اب وہ کافی عمر رسیدہ اور ضعیف بھی ہو چکے تھے......

آخر ۵۱ھ میں چند روزہ علالت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ' ستر سال کی عمر میں' مدینہ منورہ میں اس دنیائے فانی سے کوچ کر

(۱) دمشق بنوامیہ کے طویل دور میں مسلمانوں کا دارالخلافہ رہا، موجودہ دور میں یہ شہر ملکِ شام (عربی میں سوریہ، انگریزی میں Syria) کا دارالحکومت ہے۔

گئے اور اپنے اللہ سے جا ملے، تجہیز و تکفین کے فرائض حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیرِ نگرانی انجام دیئے گئے اور پھر مدینہ منورہ کے قبرستان ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔(۱)

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی معیت وصحبت سے سرفراز فرمائیں۔



(۱) حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ کی تجہیز و تکفین کے موقع پر تمام اکابر صحابہ میں سے محض حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی موجودگی کی وجہ یہ تھی کہ اس وقت تک تمام اکابر صحابہ کا انتقال ہو چکا تھا، ان میں سے فقط حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ ہی باقی رہ گئے تھے، اور پھر چار سال بعد یعنی ۵۵ھ میں ان کا بھی انتقال ہو گیا تھا، ان کا مفصل تذکرہ ملاحظہ ہو صفحات [۱۵۷-۱۹۴]



الحمد للہ آج بتاریخ ۱۸/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱۱/نومبر ۲۰۱۴ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی پیدائش مکہ شہر میں ہوئی تھی جہاں ان کا تعلق حبشی غلاموں کے ایک خاندان سے تھا، سردارانِ قریش میں سے ایک نامور شخصیت اُمیہ بن خلف کے یہ غلام تھے، اُس دور میں غلاموں کی جو زندگی ہوا کرتی تھی' ویسی ہی زندگی یہ بھی گذار رہے تھے، شب وروز بلا چون و چرا اپنے آقا کی خدمت اور اس کیلئے محنت و مشقت ...... اور بس ...... یہی ان کی زندگی تھی ......

انہی دنوں مکہ شہر میں رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے چرچے ہونے لگے، تب سردارانِ قریش آپؐ کی باتوں کا مذاق اُڑایا کرتے، خوب تماشا بنایا کرتے، اور ان بیہودہ حرکات میں بلال کا آقا امیہ بن خلف سب ہی سے پیش پیش ہوا کرتا تھا، آپؐ کے بارے میں نازیبا الفاظ کا استعمال' اور اخلاق سے گرے ہوئے کلمات ...... یہی امیہ کا روزمرہ کا معمول تھا۔

بلال کے کانوں تک یہ تمام باتیں پہنچتی رہتی تھیں، دینِ برحق کی طرف دعوت دیتے ہوئے رسول اللہ ﷺ مکہ والوں کو جو کچھ کہا کرتے تھے...... وہ بھی ...... نیز جواب میں سردارانِ قریش آپؐ کے بارے میں جو کچھ کہا کرتے تھے...... وہ بھی ......

اس حوالے سے ایک عجیب وغریب بات جو اُن دنوں بلال نہایت شدت کے ساتھ محسوس کیا کرتے تھے' وہ یہ کہ ان کا آقا امیہ بن خلف' نیز اس کے ہمنوا رؤسائے قریش رسول اللہ ﷺ کا خوب مذاق بھی اڑایا کرتے تھے...... لیکن ساتھ ہی وہ اکثر و بیشتر آپس میں ایک دوسرے کو مخاطب کرتے ہوئے یوں بھی کہا کرتے تھے کہ ''بخدا ہم نے کبھی محمد (ﷺ) کو جھوٹ بولتے ہوئے نہیں سنا، خیانت کرتے ہوئے نہیں دیکھا، غداری' بیوفائی' اور وعدہ

خلافی کرتے ہوئے نہیں پایا......''

تب بلال کو بڑی حیرت ہوتی کہ یہ لوگ رسول اللہ ﷺ کا مذاق بھی اڑاتے ہیں، جھٹلاتے بھی ہیں، بیہودہ گوئی بھی کرتے ہیں، ایذاء بھی پہنچاتے ہیں......لیکن باہم ہمیشہ آپؐ کے اعلیٰ اخلاق وکردار کی خوب تعریف بھی کیا کرتے ہیں......یہ تو بڑا ہی عجیب معاملہ تھا۔

بلال اکثر ان رؤسائے قریش کو اسی بارے میں باہم سرگوشیاں کرتے ہوئے سنتے......ان کی سماعت سے وقتاً فوقتاً ان کی باتیں ٹکراتی رہتیں، آخر کافی دنوں تک ان کی یہ سرگوشیاں مسلسل سنتے رہنے کے بعد بلال اس نتیجے پر پہنچے کہ یہ تمام رؤسائے قریش رسول اللہ ﷺ کی حقانیت وصداقت سے خوب واقف ہیں اور مزید یہ کہ اس چیز کے معترف بھی ہیں......لیکن اس کے باوجود یہ جو آپؐ کی مخالفت اور بغض وعناد پر کمر بستہ ہیں......ان کی اس حرکت کے پیچھے دو اسباب کارفرما ہیں:

پہلا سبب یہ کہ یہ لوگ اپنے آباؤاجداد کے دین کو ترک کر کے دینِ اسلام قبول کر لینے کو اپنے آباؤاجداد کے ساتھ' نیز ان کے دین کے ساتھ غداری وبے وفائی تصور کرتے ہیں، جو کہ انہیں کسی صورت قبول نہیں۔

دوسرا سبب یہ کہ انہیں یہ خوف لاحق ہے کہ دینِ اسلام قبول کر لینے اور رسول اللہ ﷺ کو اللہ کا نبی تسلیم کر لینے کی صورت میں انہیں دینِ اسلام کی تعلیمات کی پیروی کرنا ہوگی، آپؐ کا اتباع کرنا ہوگا......تب ان کی اپنی ''سرداری'' کا کیا بنے گا......؟

اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا......رفتہ رفتہ بلال کے دل میں یہ خواہش پیدا ہونے لگی کہ کسی طرح رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی جائے، اور ان کی گفتگو براہِ راست سنی جائے۔

چنانچہ ایک روز موقع پا کر بلال رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، آپؐ سے

ملاقات ہوئی، آپؐ کی مبارک گفتگوسنی، جس پر بلال انتہائی متأثر ہوئے، اور دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے۔

بلالؓ کے قبولِ اسلام کی خبر مشہور ہوتے ہی بڑے بڑے رؤسائے قریش کے غیظ وغضب کی انتہاء نہ رہی، خصوصاً بلالؓ کا آقا اُمیہ بن خلف تو آگ بگولہ ہوگیا...... تکبر وغرور اور غصے کی وجہ سے اس کا برا حال ہوگیا، اور وہ یوں کہنے لگا کہ ''میرا یہ حقیر سا غلام...... اس کی یہ جرأت...... کہ اس نے میرا دین چھوڑ کر محمد (ﷺ) کا دین اپنالیا......'' یعنی اس نے اس بات کو اپنے لئے بہت بڑی بے عزتی اور ذلت ورسوائی کا ذریعہ سمجھا کہ میرا کوئی غلام میرے ہی دین سے منہ موڑ کر کسی اور کا دین اختیار کرلے۔

اور پھر وہ اپنے دوستوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے یوں کہنے لگا: اِنَّ شَمسَ ھٰذَا الیَومَ لَن تَغرُبَ اِلّا وَ یَغرُبُ مَعَھَا اِسلَامُ ھٰذَا العَبْدِ الآبِق ، لَابَأس...... یعنی ''کوئی بات نہیں...... آج کا سورج غروب ہونے کے ساتھ ہی میرے اس نافرمان اور گستاخ غلام کا اسلام بھی غروب ہوجائے گا''

بلالؓ کے مشرک اور بدمزاج آقا نے تو بلالؓ کے بارے میں' نیز دینِ اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ کیا تھا کہ ''آج غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی اس غلام کا یہ نیا دین بھی ہمیشہ کیلئے غروب ہوجائے گا''۔ لیکن راہِ حق میں بلالؓ کی ثابت قدمی نے ثابت کردکھایا کہ ان کے اسلام کا سورج کبھی غروب نہیں ہوا...... تادمِ آخران کا دل ایمان کے نور سے جگمگاتا ہی رہا، البتہ ان کا وہ مغرور وبدبخت آقا جس دین پر تھا، یعنی کفر وشرک اور معصیت وضلالت...... اس باطل کا سورج رفتہ رفتہ مکہ شہر سے ہمیشہ کیلئے غروب ہوگیا......

اس ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کرنے والوں کو جن شدید ترین مشکلات سے دوچار

ہونا پڑتا تھا......وہی تمام مشکلات حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے سامنے بھی آکھڑی ہوئیں......سردارانِ قریش کی طرف سے تکالیف اورایذاء رسانیوں کاایک لامتناہی سلسلہ تھا، چنانچہ کبھی ان کی پشت ننگی کرکے دہکتے ہوئے انگاروں پرلٹادیاجاتا،کبھی شدیدگرمی میں تپتی ہوئی ریت پرلٹاکرسینے پربھاری پتھررکھ دیاجاتاتاکہ حرکت نہ کرسکیں، کبھی پاؤں میں رسیاں ڈال کردن بھرمکہ کی پتھریلی اورآگ اگلتی ہوئی گلیوں میں گھسیٹا جاتا......لیکن ظلم وستم اوروحشیت وبربریت کےاس تمامترسلسلے کے باوجود بلالؓ کے پائے استقامت میں کبھی لغزش نہ آئی......وحشیت وبربریت کےاس لامتناہی سلسلے کے دوران شدتِ تکلیف کی وجہ سےاکثران پرغشی طاری ہوجایاکرتی،اورجب وہ ذرہ ہوش میں آتے ......توان کی زبان پر''اَحد......اَحد'' کاوردجاری ہوجاتا،یعنی''اللہ ایک ہے......اللہ ایک ہے''۔

ظلم وستم کایہ سلسلہ یونہی چلتارہا......ایک روزان جلادصفت اورسنگدل سردارانِ قریش میں سےکسی کوبلالؓ کی حالت دیکھ کرکچھ رحم آگیا،تب اس نے یہ پیشکش کی کہ''دیکھوبلال!تم ہمارےخداؤں کے بارے میں بس ایک بارکوئی اچھی بات کہہ دو......یوں کہہ دوکہ اصل بڑاخداتویقیناًاللہ ہی ہے......مگریہ بھی چھوٹے خداہیں،تب ہم تمہیں زدوکوب کرنے کایہ سلسلہ بندکردیں گے''۔

نیزاس کے بعدبھی مسلسل سردارانِ قریش یوں کہتے رہے کہ''دیکھوبلال!ہماری عزت کاسوال ہے،ہماری عزت خطرے میں ہے،لوگ کیاکہیں گے کہ یہ اتنے بڑے بڑے ناموراورطاقتورترین رؤسائےقریش......یہ سب کےسب......اپنے ہی ایک معمولی سے غلام کےسامنے عاجزاوربےبس ہوگئے......لہٰذااے بلال!بس ایک بارہمارےخداؤں

کے بارے میں تم کوئی اچھی بات کہہ دو...... یوں ہماری بھی عزت رہ جائے گی ...... اور تمہاری بھی جان چھوٹ جائے گی''۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کیلئے اس مسلسل عذاب سے جان چھڑانے کا یہ سنہری موقع تھا، لیکن اس کے باوجود انہوں نے بغیر کسی ادنیٰ تردد کے فوری طور پر اور دوٹوک انداز میں ان کی اس پیشکش کو صاف ٹھکرا دیا...... اور پھر اس کے بعد اسی کیفیت میں وہاں مکہ میں وقت گذرتا رہا...... رؤسائے قریش کی طرف سے بلالؓ کیلئے زدوکوب اور ایذاء رسانیوں کا سلسلہ عروج پر ہو...... یا پیار ومحبت کے ساتھ پیشکش کا کوئی موقع ہو...... ہمیشہ ہی بلالؓ بڑے ہی جذباتی انداز میں اپنا وہی نغمۂ جاوداں گنگناتے رہے یعنی ''اَحد...... اَحد''۔

بلالؓ کی بے مثال استقامت کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ ان کا آقا اُمیہ اب اکثر انہیں یوں کہا کرتا کہ ''دیکھو بلال! اب تو مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ تم سے زیادہ یہ عذاب خود میں بھگت رہا ہوں...... میری عزت برباد ہو رہی ہے...... میں بڑی مصیبت میں پھنسا ہوا ہوں...... اس لئے بس ایک بار ہمارے بتوں کی بس تھوڑی سی تعریف کر دو'' لیکن بلالؓ کی طرف سے وہی جواب، یعنی ''اَحد، اَحد'' کا ورد سن کر اُمیہ کے شعور وجدان میں' اور اس کے دل ودماغ میں ایک زلزلہ سا برپا ہونے لگتا......!

ایک روز اسی طرح شدید گرمی کے دنوں میں تپتی دوپہر میں جب بلالؓ کے آقا اُمیہ بن خلف نے انہیں جھلسا دینے والی ریت پر لٹا رکھا تھا اور ایذاء رسانی کا وہی پرانا سلسلہ جاری تھا کہ اسی دوران اتفاقاً وہاں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا گذر ہوا، انہوں نے جب یہ دردناک منظر دیکھا تو ان کے اٹھتے ہوئے قدم اسی جگہ رک گئے، اور پھر انہوں نے اُمیہ اور اس کے ساتھیوں کو بآوازِ بلند مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا: أَتَقتُلُونَ رَجُلاً أَنْ

يَقُولَ رَبِّـيَ اللّهَ؟ یعنی ''کیا تم مار ڈالو گے اس شخص کو محض اس وجہ سے کہ یہ یوں کہتا ہے کہ ''میرا رب اللہ ہے؟''(۱)

اس کے بعد اُمیہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے یوں کہا خُـذ أكثَـرَ مِـن ثَـمَـنِهٖ وَاترُكهُ حُـــرّاً ...... یعنی ''اے اُمیہ! تم اس کی قیمت سے بھی زیادہ رقم مجھ سے وصول کرلو اور اسے آزاد کردو''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس پیشکش کو اُمیہ نے اپنے بڑی خوش قسمتی سمجھا کہ اس طرح اس کی عزت بچ گئی...... مزید یہ کہ وہ سبھی رؤسائے قریش تھے ہی تجارت پیشہ لوگ، اور اس وجہ سے ہمیشہ اسی فکر میں رہا کرتے تھے کہ کس طرح زیادہ سے زیادہ منافع کمایا جائے...... اور بس...... یہی ان کا مشغلہ اور ان کا مطلوب و مقصود تھا۔

چنانچہ اس نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اس پیشکش کو فوراً ہی قبول کرلیا، اور تب حضرت ابوبکرؓ نے بلا تاخیر فوری طور پر منہ مانگی قیمت اُمیہ کو ادا کی اور بلالؓ کو اس سے خرید لیا، اور پھر اسی وقت وہیں کھڑے کھڑے اُمیہ اور اس کے ساتھیوں کے سامنے ہی بلالؓ کو آزاد بھی کردیا...... اور پھر یہ دونوں وہاں سے چل دیئے۔

تب اُمیہ اپنی خفت مٹانے کی غرض سے پیچھے سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ کو آواز دے کر یوں کہنے لگا ''اگر آپ محض ایک اُوقیہ (۲) کے عوض بلال کو مجھ سے مانگتے تب بھی میں

(۱) یہ دراصل سورہ غافر/مؤمن کی ایک آیت کا حصہ ہے، جس میں فرعون اور اس کے کارندوں کی طرف سے اہلِ ایمان کے ساتھ روا رکھے جانے والے مظالم کے تذکرہ کے ضمن میں ایسے ہی ایک واقعے کا تذکرہ ہے۔ تفصیل کیلئے سورہ غافر/مؤمن میں آیت [۲۸] کی تفسیر ملاحظہ ہو۔

(۲) اُوقیہ اس دور میں سونے چاندی کے وزن کیلئے استعمال ہونے والا ایک پیمانہ تھا، جو کہ آجکل کے تیس گرام کے برابر تھا، یعنی معمولی سی مقدار (تقریباً تین تولہ)۔

ضرور اسے آپ کے ہاتھ فروخت کر دیتا...... کیونکہ یہ تو ہے ہی ایسا بیکار اور بے قیمت غلام"
حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خوب جانتے تھے کہ اُمیہ کی اس بیکار اور فضول بات کا جواب دینے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے...... مگر پھر بھی انہوں نے اسے جواب دیتے ہوئے فرمایا "بلال کی جو منہ مانگی قیمت میں نے تمہیں ادا کی ہے، اگر تم اس سے زیادہ کا تقاضا کرتے، تب بھی میں ضرور بلال کو تم سے خرید لیتا"۔

اس کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے ہمراہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، آپؐ کو جب اس تمام صورتِ حال کی اطلاع ہوئی تو آپؐ نے ظالم اُمیہ کے شکنجے سے بلالؓ کی آزادی پر انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا۔

☆ اور پھر مکی دور گذرتا رہا...... سن تیرہ نبوی میں ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے پر رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام مسلمان اپنا آبائی شہر مکہ اور اپنا سب ہی کچھ چھوڑ کر محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے۔ انہی مہاجرین حضرات میں حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

☆ مدینہ پہنچنے کے بعد اب اس نئے ماحول میں نئی زندگی کا جب آغاز ہوا تو رسول اللہ ﷺ نے وہاں اس نئے معاشرے کے استحکام اور نوزائیدہ اسلامی مملکت کو مضبوط بنیادوں پر استوار کرنے کی غرض سے فوری طور پر چند بنیادی قسم کے اقدامات کئے، جن کے اثرات وثمرات بہت ہی مفید ترین اور دور رس ثابت ہوئے......

انہی فوری اور بنیادی قسم کے اقدامات میں سے ایک اقدام یہ تھا کہ مسجدِ نبوی کی تعمیر کا مقدس ترین کام انجام دیا گیا، جس میں عام مسلمانوں کے شانہ بشانہ خود آپؐ بھی بنفسِ نفیس محنت ومشقت فرماتے رہے اور لکڑی، پتھر، مٹی، وغیرہ سامانِ تعمیر اپنے کندھوں پر ڈھوتے

رہے......

جب مسجد کی تعمیر مکمل ہو چکی تو اب اس میں نماز با جماعت کی ادائیگی کا مرحلہ آیا' تاکہ اللہ کے حکم کی تعمیل کے ساتھ ساتھ اسلامی معاشرے میں باہمی اُخوت ومحبت' مساوات' تعارف' ایک دوسرے کیلئے جذبۂ خیر سگالی' خیر خواہی' ہمدردی' اور ایک دوسرے کی خبر گیری کے مبارک جذبات مزید مستحکم ہوں، آپس میں قربتیں اور محبتیں پروان چڑھیں' اور نفرتوں اور دوریوں کا خاتمہ ہو......!

اب اس موقع پر سوال یہ اٹھا کہ ہر نماز با جماعت کے وقت سب کو مطلع کیسے کیا جائے کہ نماز کا وقت ہو چکا ہے لہٰذا سب لوگ مسجد پہنچ جائیں، ظاہر ہے کہ اُس زمانے میں گھڑی تو تھی نہیں، نہ ہی کوئی اور ایسا وسیلہ یا ذریعہ تھا۔

آخر جب اس مقصد کیلئے ''اذان'' کی مشروعیت ہوئی (۱) تو اب یہ سوال درپیش آیا کہ ہر روز پابندی کے ساتھ پانچ بار مسجدِ نبوی میں ''اذان'' دینے کا یہ فریضہ کون انجام دے گا؟

اور تب رسول اللہ ﷺ کی نظرِ انتخاب حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ پر پڑی...... جو ابتدائے اسلام سے ہی ''اَحد، اَحد'' کا وہ نغمۂ جاوداں گنگناتے چلے آ رہے تھے، اور اسی کو انہوں نے شب وروز اپنا ورد بنا رکھا تھا...... لہٰذا اب رسول اللہ ﷺ نے ''اذان'' کیلئے بھی انہی کو منتخب فرمایا، تاکہ شب وروز اور صبح وشام اللہ ذوالجلال والاکرام کی تکبیر وتہلیل کا مقدس ترین فریضہ بھی یہی انجام دیں...... اور یوں سالہا سال تک حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی انتہائی مؤثر ودلنشیں آواز میں یہ اذان مدینہ کی فضاؤں میں گونجتی رہی، اور اہلِ ایمان کے دلوں کو گرماتی رہی، اور یوں خود رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مبارک انتخاب کے نتیجے

(۱) اذان کی مشروعیت کیسے ہوئی...... اذان کے کلمات کا انتخاب کس طرح عمل میں آیا؟ یہ کلمات کس نے کس کو سکھائے......؟ اور اس سے قبل کیا کیا مراحل درپیش آئے...... یہ ایک الگ اور تفصیل طلب موضوع ہے۔

میں حضرت بلالؓ تاریخِ اسلام میں اولین مؤذن مقرر ہوئے، جو کہ یقیناً بہت بڑا اشرف اور اعزاز تھا۔

ہجرتِ مدینہ کے موقع پر مسلمان جب مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، تب ابتداء میں تو مشرکینِ مکہ خوشی مناتے رہے کہ اچھا ہوا یہ مسلمان ہمارے شہر مکہ سے دور چلے گئے، لیکن اس کے بعد جب انہیں اس قسم کی اطلاعات ملنے لگیں کہ مسلمان تو اب وہاں مدینہ میں چین وسکون کی زندگی بسر کر رہے ہیں......تو وہ اس چیز کو برداشت نہ کر سکے، مزید یہ کہ وہ سب تجارت پیشہ لوگ تھے، اور مکہ سے ملکِ شام کے درمیان وہ تجارتی شاہراہ جو اُن کی معیشت کیلئے شہ رگ کی حیثیت رکھتی تھی، راستے میں مدینہ سے گذرتی تھی، لہٰذا اب انہیں یہ اندیشہ ستانے لگا کہ اگر مسلمانوں نے اس شاہراہ پر قبضہ کر لیا تب ان کی تجارت کا کیا بنے گا......؟

یہی وہ اسباب تھے جن کی بناء پر اب مشرکینِ مکہ کی راتوں کی نیند اُڑنے لگی......اور پھر انہوں نے فوری طور پر مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی ٹھانی، جس کے نتیجے میں متعدد غزوات کی نوبت آئی۔

چنانچہ ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد محض اگلے ہی سال حق و باطل کے درمیان اولین معرکہ یعنی ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر کیفیت یہ ہوئی کہ مشرکینِ مکہ جب مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے کچل ڈالنے کی غرض سے نہایت زور وشور اور جوش وخروش کے ساتھ تیاریوں میں مشغول تھے، تب ان سردارانِ قریش میں سے اُمیہ بن خَلَف (حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کا آقا) کافی بددلی اور تذبذب کا شکار تھا، کیونکہ اس جنگ کے تصور سے ہی اس کے شعور و وجدان پر عجیب وحشت سی طاری ہونے لگتی، اور انجانے خوف کی ایک لہر اس کے رگ و پے

میں دوڑ جاتی......حالانکہ اس سے قبل مختلف قبائلی جنگوں میں وہ ہمیشہ پیش پیش رہا تھا اور نامی گرامی شہسوار تھا......لیکن اب غزوۂ بدر کے موقع پر مکہ سے روانگی سے قبل اپنے اسی انجانے خوف کی وجہ سے اس نے اس جنگ میں شرکت نہ کرنے کا حتمی فیصلہ کرلیا۔

بڑے بڑے رؤسائے قریش کو جب اُمیہ کے اس فیصلے کا علم ہوا تو وہ حیرت زدہ رہ گئے، خاص طور پر ان رؤسائے قریش میں سے ایک نامی گرامی سردار جس کا نام عُقبہ بن ابی معیط تھا، یہ اُمیہ کا بہت ہی جگری اور قریبی دوست تھا، یہی اُمیہ کو حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ پر ظلم وستم ڈھانے اور وحشیانہ طریقے سے انہیں زدوکوب کرتے رہنے پر اکسایا اور بھڑ کایا کرتا تھا......اس سردار کو جب یہ علم ہوا کہ اُمیہ نے مسلمانوں کے خلاف اس اولین جنگ میں شرکت نہ کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے......تب اِس سے رہا نہ گیا، اور اُمیہ کے ساتھ اس سلسلے میں گفت وشنید کی غرض سے یہ چل پڑا، اُمیہ اس وقت بڑے بڑے سردارانِ قریش کے جھرمٹ میں بیٹھا ہوا تھا، محفل عروج پر تھی، تب اس کے دوست عقبہ نے وہاں پہنچتے ہی ان تمام معزز سردارانِ قریش کی موجودگی میں اسے ''بزدلی'' اور ''غداری'' کا طعنہ دیا......

تب اُمیہ حیران وپریشان اسے دیکھتا ہی رہ گیا......لیکن ابھی وہ اس کیفیت سے نکلنے بھی نہ پایا تھا کہ ان تمام سردارانِ قریش کی نگاہوں کے سامنے عقبہ نے ایک اور بڑی ہی عجیب وغریب حرکت کرڈالی، ہوا یہ کہ وہ اپنے ہمراہ عورتوں کے بناؤسنگھار کا کچھ سامان لایا تھا، اس نے وہ سامان اُمیہ کی طرف اچھالتے ہوئے کہا ''اے اُمیہ! آج ہمیں پتہ چل گیا ہے کہ تم مرد نہیں' بلکہ عورت ہو، لہٰذا یہ سامان پکڑو، اور ہماری روانگی کے بعد اپنے گھر میں عورتوں کے ساتھ بیٹھ کر خوب بناؤسنگھار کرتے رہنا''۔

بھری محفل میں اپنے ہی دوست کے ہاتھوں اتنی بڑی عزتی......اور اتنا بڑا طعنہ سننے کے بعد

اُمیہ غصے سے آگ بگولہ ہو گیا......اور یوں کہنے لگا: قَبَّحَكَ اللّٰه ...... وَقَبَّحَ مَا جِئتَ بِــــه یعنی ''اللہ تمہارا ستیاناس کرے......اور یہ جو چیز (یعنی بناؤ سنگھار کا سامان) تم اپنے ہمراہ لائے ہو' اللہ اس کا بھی ستیاناس کرے''اور تب اتنی بڑی بے عزتی اور اتنے بڑے طعنے کے بعد اس کیلئے کوئی چارہ ہی نہیں رہا......انکار کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی......اور اسے جنگِ بدر میں شرکت کیلئے نکلنا ہی پڑا۔

اُمیہ بن خلف کا یہی خاص دوست (عقبہ بن ابی معیط) اسے حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ پر وحشیانہ تشدد اور ظلم وستم پر اکسایا کرتا تھا، اور اب پھر اسی دوست نے ہی اُمیہ کو مسلمانوں کے خلاف اس اولین جنگ میں شرکت پر آمادہ کیا تھا......تب اُمیہ کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ وہاں ''بدر'' کے میدان میں اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟ اس نے تو بہت کوشش کی تھی اس جنگ میں شرکت نہ کرنے کی......مگر ''جیسی کرنی ویسی بھرنی ہے ضرور'' یہی قانونِ قدرت ہے، جو کہ اٹل ہے، پتھر پر لکیر کی مانند......کہ جسے نہ کوئی بدل سکتا ہے، اور نہ ہی مٹا سکتا ہے......یہی عقبہ اُمیہ کو بلالؓ کے خلاف خوب ورغلایا کرتا تھا، اور اب یہی عقبہ اُمیہ کو لے چلا بدر کی جانب...... جہاں موت اس کی منتظر تھی، اور وہ بھی کس کے ہاتھوں......؟؟

آخر جب مسلمان اور مشرکینِ مکہ بدر کے میدان میں ایک دوسرے کے بالمقابل صف آرا ہوئے، چند انفرادی جھڑپوں کے بعد باقاعدہ جنگ کا آغاز ہوا، عام یلغار ہوئی......معرکہ اپنے عروج کو پہنچا......تو اس کے ساتھ ہی بلالؓ کا وہی نغمۂ جاوداں ''اَحد، اَحد'' بھی اپنے عروج کو جا پہنچا، آج اس رزمگاہ میں مسلسل یہی ورد کرتے ہوئے بلالؓ بڑی ہی بے مثال بہادری و شجاعت کے ساتھ اللہ کے دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے......

اسی دوران اچانک بلالؓ کا اُمیہ کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا، وہ اُمیہ جو سدا سے ہی بڑا بہادر تھا، نامی گرامی شہسوار تھا......لیکن آج اسے نہ جانے کیا ہوا کہ بلالؓ پر نگاہ پڑتے ہی اس کے سراپا پر لرزہ طاری ہو گیا، خوف کی ایک لہر اس کے تمام وجود میں دوڑ گئی، اور تب اس نے وہاں سے بھاگنے اور بچ نکلنے کی کوشش کی......لیکن اس کے پاؤں اب گویا اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے......اور تب بلالؓ کے وہی ہاتھ جن میں ایک زمانے تک اُمیہ نے ہتھکڑیاں ڈال رکھی تھیں، ہتھکڑیوں اور زنجیروں میں مقید اپنے اس کمزور و بے بس اور لاچار غلام کو وہ بدترین تشدد اور ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کرتا تھا......آج بدر کے میدان میں بلالؓ کے انہی ہاتھوں سے......ایک ہی وار میں فخر و غرور اور رعونت و تکبر سے اکڑا ہوا اُمیہ کا سر زمین پر آ رہا ...... یہ ہے قانونِ قدرت......جو خود اپنی راہ بناتا ہے......حضرت بلالؓ کچھ دیر اسی جگہ خاک و خون میں لت پت تکبر کے اس مجسمے کی جانب بغور دیکھتے رہے......اور پھر دیوانہ وار وہی ''اَحد......اَحد'' کی صدا بلند کرتے ہوئے وہاں سے آگے بڑھ گئے۔

☆ وقت کا سفر جاری رہا...... یہاں تک کہ سن آٹھ ہجری میں ''فتحِ مکہ'' کا یادگار واقعہ پیش آیا، رسول اللہ ﷺ اپنے دس ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ مکہ میں داخل ہوئے، اس موقع پر کوئی فاتحانہ شان و شوکت نہیں تھی، کوئی کبر و غرور نہیں تھا، وہاں تو محض اپنے رب کی کبریائی اور حمد و ثناء تھی......اسی کیفیت میں مسلسل پیش قدمی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ سیدھے کعبۃ اللہ کے قریب پہنچے، اور پھر حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ لئے کعبۃ اللہ کے اندر داخل ہو گئے، شرک اور گمراہی کے جو آثار وہاں نظر آئے اُن کا صفایا کیا، اور پھر کچھ دیر بعد آپؐ نے بلالؓ کو حکم دیا کہ کعبۃ اللہ کی چھت پر جا کر اذان دیں۔

رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے جب حضرت بلالؓ نے کعبۃ اللہ کی چھت

پر چڑھ کر اذان دینا شروع کی ''اللہ اکبر......اللہ اکبر'' کی صدا جب گونجی تو پورے شہر مکہ پر گویا ایک سکوت طاری ہو گیا، ہر چیز اپنی جگہ ساکت و جامد ہو کر رہ گئی، جو اہلِ ایمان تھے' وہ نہایت ہی ادب و خشوع کی کیفیت میں ہمہ تن گوش ہو کر بلالؓ کے ساتھ اذان کے مقدس کلمات دہرا رہے تھے، جبکہ مشرکین پر ایک عجیب سا سکتہ طاری ہو گیا تھا، انہیں نہ تو اپنی آنکھوں پر یقین آ رہا تھا اور نہ ہی اپنے کانوں پر......ان کے زنگ آلود اور شرک زدہ دل اس حقیقت کو قبول کرنے کیلئے کسی صورت آمادہ ہی نہیں تھے کہ یہ کمزور اور بے بس مسلمان......جو محض چند سال قبل یہاں سے نہایت ہی بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں نکلے تھے......آج یہ واپس آ گئے ہیں......اور صرف واپس ہی نہیں آئے ...... بلکہ فاتحانہ واپس آئے ہیں......مزید یہ کہ یہ بلال......یہ حبشی غلام......جسے ہم اسی شہر مکہ میں گلے میں رسی ڈال کر دن بھر تپتی ہوئی گلیوں میں گھسیٹا کرتے تھے......آج یہ ہماری نگاہوں کے سامنے......تمام رؤسائے قریش کی موجودگی میں......کعبے کی چھت پر چڑھ کر کس قدر شانِ بے نیازی کے ساتھ' اور کس طرح بے خوف و خطر ہو کر......اذان دے رہا ہے......اور اللہ کی وحدانیت کا اعلان کر رہا ہے......؟

اور پھر اسی موقع پر ہی جب کچھ دیر بعد رسول اللہ ﷺ ان مشرکینِ مکہ کی طرف متوجہ ہوئے، اِدھر اُدھر نگاہ دوڑائی......تب کیا منظر نظر آیا......؟ ہر طرف وہی پرانے چہرے...... بڑے بڑے مجرم......خونی اور قاتل......وہی پرانے دشمن......آج بے بس......شرمندہ ......سر جھکائے ہوئے اور نگاہیں نیچی کئے ہوئے نظر آئے......یہ وہی لوگ تھے جو آپ ﷺ کے خون کے پیاسے تھے......جانی دشمن تھے......جنہوں نے مکہ میں آپؐ کے قتل کی سازش کی......آپؐ کے ساتھیوں کے ساتھ ہر قسم کا ظلم روا رکھا...... ہر قسم کی بدسلوکی کیلئے

انہیں تختۂ مشق بنائے رکھا......آپؐ کچھ دیر یونہی ان سب کی جانب دیکھتے رہے، کچھ دیر سوچوں میں ڈوبے رہے، اور پھر آپ ﷺ کی آواز گونجی، آپؐ نے اپنے ان بدترین دشمنوں اور بدخواہوں کو مخاطب کرتے ہوئے یہ یادگار الفاظ کہے: لَا تَثْرِیبَ عَلَیکُمُ الیَومَ...... اِذهَبُو...... أنتُمُ الطُّلَقَاء۔ یعنی ''آج تم پر کوئی ملامت نہیں......جاؤ...... آج تم سب آزاد ہو''۔

آپؐ کی زبانی یہ الفاظ سن کر اب وہ مزید حیران و پریشان اور انگشت بدندان رہ گئے...... اور سوچنے لگے کہ ہم سالہا سال تک کس طرح انہیں ستاتے رہے، کیا کیا ظلم وستم کے پہاڑ ہم ان پر توڑتے رہے......اور آج جب ہم مجبور و بے بس، ہاتھ باندھے ہوئے اور گردنیں جھکائے ہوئے ان کے سامنے کھڑے ہیں ......تو انہوں نے ہم سے کوئی انتقام لینے کی بجائے یہ کیسی عجیب بات کہہ دی کہ ''جاؤ......تم سب آزاد ہو'' ہم تو سمجھ رہے تھے کہ آج یہ ہماری گردنیں اڑا دینے کا حکم سنائیں گے......لیکن انہوں نے تو ایسا کوئی حکم صادر کرنے بجائے......ایسی بات کہہ ڈالی......کہ جس سے پتھروں میں بھی دھڑکن پیدا ہو جائے......

☆ اور پھر فتحِ مکہ، غزوۂ حنین، نیز غزوۂ طائف کے بعد رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی جانب واپسی ہوئی، تب آپؐ کے ہمراہ حضرت بلالؓ بھی واپس آئے، یوں وقت کا سفر جاری رہا، مدینہ میں بدستور دن میں پانچ بار حضرت بلالؓ کی اذان گونجتی رہی، دلوں میں ایمان کی حرارت بڑھاتی رہی......یہی وجہ تھی گذرتے ہوئے ہر لمحے کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں بلالؓ کی قدر و منزلت میں اضافہ ہوتا چلا گیا......

رسول اللہ ﷺ اور حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے مابین یہ قلبی تعلق تو بہت پہلے سے ہی تھا، جب ہجرتِ مدینہ سے بھی چند سال قبل وہاں مکی دور میں جب اسراء و معراج کا عظیم

الشان اور یادگار سفر پیش آیا تھا، اس سفر سے واپسی کے بعد آپؐ نے بلالؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا: يَا بِلَال! حَدِّثنِي بِأرجَىٰ عَمَلٍ عَمِلتَهُ عِندَكَ فِي الِاسلَام ، فَاِنِّي سَمِعتُ اللّيلَةَ خَشفَ نَعلَيكَ بَينَ يَدَيَّ فِي الجَنَّةِ یعنی: ''اے بلال! قبولِ اسلام کے بعد آپ نے جو بہترین عمل انجام دیا ہے مجھے اس کے بارے میں کچھ بتایئے؟ کیونکہ آج رات میں نے آپ کی جوتیوں کی آواز جنت میں سنی ہے''۔

اس پر حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے جواب دیا تھا: مَا عَمِلتُ عَمَلاً فِي الِاسلَامِ أرجَىٰ عِندِي مَنفَعَةً ، مِن أنِّي لَا أتَطَهَّرُ طُهُوراً تَامّاً فِي سَاعَةٍ مِن لَيلٍ وَلَا نَهَارٍ ، اِلَّا صَلّيتُ بِذلِكَ الطُّهرِ مَا كَتَبَ اللّهُ لِي أن أُصَلِّي) (۱) یعنی: ''قبولِ اسلام کے بعد میرا وہ عمل جو میری نظر میں سب سے زیادہ مفید اور بہترین ہے' وہ یہ کہ رات یا دن کے کسی بھی حصے میں جب بھی میں خوب اچھی طرح وضوء کرتا ہوں' تو اس وضوء کے بعد اللہ مجھے جس قدر بھی توفیق عطاء فرمادے' میں کچھ نماز ضرور پڑھتا ہوں''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس استفسار کے جواب میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے اپنا یہ معمول بیان فرمایا کہ رات ہو یا دن' جب بھی میں وضوء کرتا ہوں تو حسبِ توفیق کچھ نہ کچھ نوافل ضرور پڑھ لیتا ہوں۔

یہی وہ عمل ہے جس کی وجہ سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی بارگاہ میں اس قدر بلند اور عظیم مقام ورتبہ نصیب ہوا کہ رسول اللہ ﷺ نے معراج کے موقع پر جنت میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے قدموں کی آہٹ محسوس فرمائی۔

(۱) مسلم [۲۴۵۸] باب من فضائل بلال رضی اللہ عنہ۔

یقیناً اس سے نوافل کی فضیلت واہمیت کے ساتھ ساتھ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی فضیلت ومنقبت اور رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا قرب اور قلبی تعلق بھی واضح وثابت ہوتا ہے...... کہ وہاں جنت میں بھی آپؐ نے ان کے قدموں کے آہٹ سنی......

یوں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کا تعلقِ خاطر عرصۂ دراز سے اور ابتدائے اسلام سے ہی چلا آرہا تھا، اور جو کہ ہر گذرتے ہوئے دن کے ساتھ مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جارہا تھا، اور اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ گذر گیا، آپؐ حضرت بلال رضی اللہ عنہ سے تادمِ آخر انتہائی خوش اور مسرور ومطمئن رہے۔

حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا واقعہ یقیناً بہت ہی اندوہناک سانحہ تھا، جس کی وجہ سے تمام مدینہ شہر میں ہر جانب رنج والم کی فضاء چھائی ہوئی تھی ...... ہر کوئی غم کے سمندر میں ڈوبا ہوا تھا...... یہی کیفیت حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کی بھی تھی...... اسی کا یہ اثر تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد اب انہوں نے مسجدِ نبوی میں اذان دینے کا وہ سلسلہ ترک کردیا...... کیونکہ دورانِ اذان جب وہ ''أَشْهَدُ أَنّ مُحَمّداً رَسُولُ اللّه'' پر پہنچتے تو بہت اداس ہوجاتے، آواز گلوگیر ہوجاتی......اور تب ان کیلئے اذان مکمل کرنا بہت دشوار ہوجاتا۔

رسول اللہ ﷺ کے بعد اب مدینہ میں بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کا دل بھی نہیں لگتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آخر انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ ملکِ شام میں جو اسلامی فوج رومیوں کے خلاف برسرِ پیکار ہے، میں بھی وہاں چلا جاؤں، اور اب اپنی باقی زندگی ان سپاہیوں کے شانہ بشانہ بس اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر وقف کردوں......

چنانچہ اس بارے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے اجازت چاہی، جس پر حضرت ابوبکرؓ نے اصرار کیا کہ: ''بلال! آپ ہمیں چھوڑ کر مت جائیے'' لیکن بلالؓ جانے پر مُصر تھے، دونوں طرف سے اصرار کا یہ سلسلہ چلتا رہا...... آخر حضرت بلالؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا ''اگر آپ اس وجہ سے مجھے جانے کی اجازت نہیں دے رہے کہ آپ نے مجھے مکہ میں اُمیہ سے خرید کر آزاد کیا تھا...... اور اپنے اسی احسان کی وجہ سے آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں آپ کی بات مانوں ...... تب ٹھیک ہے، میں حاضر ہوں...... اور اگر آپ نے مجھے محض اللہ کی رضا کی خاطر آزاد کیا تھا...... تو میری آپ سے گذارش ہے کہ آپ مجھے مت روکئے، مجھے جانے کی اجازت دے دیجئے''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب بلالؓ کی زبانی یہ بات سنی...... تو انہیں مدینہ سے ملکِ شام چلے جانے کی اجازت دے دی۔

☆ چنانچہ حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ مدینہ منورہ سے ملکِ شام منتقل ہوگئے، اور وہاں اسلامی لشکر میں شامل ہو کر اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر جدوجہد میں مشغول ومنہمک ہوگئے۔

جس طرح رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں انہیں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا، اسی طرح اب ملکِ شام میں بھی سبھی لوگ دل وجان سے ان کی عزت کیا کرتے تھے، لیکن بلالؓ ہمیشہ یہی کہا کرتے: اِنّمَا أنَا عَبدٌ حَبَشِيٌّ ، اِبنُ أَمَةٍ سَوْدَاء ...... یعنی ''میں تو محض ایک حبشی غلام ہوں، ایک سیاہ فام کنیز کا بیٹا......''

دراصل یہ تو محض حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی طرف سے تواضع اور عجز وانکسار تھا...... ورنہ

حقیقت یہ ہے کہ دینِ اسلام میں چہروں کی سفیدی یا سیاہی کی تو کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ اصل چیز تو دلوں کی سفیدی یا سیاہی ہے...... بالفاظِ دیگر اصل اعتبار اعمال کی سفیدی یا سیاہی کا ہے...... جبکہ چہروں کی سفیدی یا سیاہی دینِ اسلام میں قطعاً کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔

☆ شب و روز کا یہ سفر جاری رہا...... خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد خلیفۂ دوم کی حیثیت سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ذمہ داریاں سنبھالیں، تب اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت زیادہ وسعت اختیار کر گیا، گویا مشرق و مغرب میں فتوحات کا ایسا طاقتور سیلاب تھا جس کے آگے بند باندھنا کسی کے بس کی بات نہیں تھی......

انہی دنوں ۱۷ھ میں سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ(۱) کی زیرِ قیادت فتحِ بیت المقدس کا انتہائی یادگار اور تاریخی واقعہ پیش آیا، اس موقع پر مسلمانوں اور رومیوں کے مابین ایک معاہدے کے مطابق اب بیت المقدس شہر کی چابی مسلمانوں کے حوالے کی جانی تھی، اس موقع پر رومیوں کے بادشاہ نے یہ شرط رکھی کہ ''اس مقصد کیلئے مسلمانوں کے خلیفہ (حضرت عمرؓ) خود بیت المقدس آئیں، ہم چابی فقط انہی کے حوالے کریں گے...... کسی اور کو ہم یہ چابی نہیں دے سکتے''

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ نے بذریعۂ مکتوب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس صورتِ حال سے مطلع کیا، تب ان کا یہ خط موصول ہونے پر مدینہ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابۂ کرام سے اس بارے میں مشاورت کی۔

اس موقع پر بعض حضرات نے مشورہ دیتے ہوئے کہا کہ ''آپ کو وہاں نہیں جانا چاہئے،

(۱) حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا تذکرہ گذشتہ صفحات [۱۲۵-۱۴۱] میں گذر چکا ہے۔

کیونکہ رومیوں نے ہم مسلمانوں کو محض تنگ کرنے کی خاطر نفسیاتی حربے کے طور پر یہ شرط رکھی ہے کہ مسلمانوں کے خلیفہ خود بیت المقدس آئیں......حقیقت تو یہ ہے کہ رومی جب ہم سے شکست کھا چکے ہیں' تو کیا وہ اس بات کو نہیں جانتے کہ شہر کی چابی تو ہم ویسے بھی ان سے چھین سکتے ہیں کہ جب ہم یہ شہر ہی فتح کر چکے ہیں تو اب چابی کی کیا حیثیت ہے......؟''

جبکہ اس موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے یہ مشورہ دیا کہ'' آپ کو وہاں ضرور جانا چاہئے ، کیونکہ اس طرح جذبۂ خیر سگالی بڑھے گا اور رومیوں کے ساتھ ہمارے آئندہ تعلقات پر خوشگوار اثرات مرتب ہوں گے''

تب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت علیؓ کے مشورے کو پسند کرتے ہوئے بیت المقدس جانے کا فیصلہ کر لیا......اور پھر مدینہ میں حضرت علیؓ کو اپنا نائب مقرر کرنے کے بعد وہاں سے بیت المقدس کی جانب محوِ سفر ہو گئے۔

طویل سفر طے کرنے کے بعد حضرت عمرؓ جب بیت المقدس پہنچے تو وہاں اسلامی فوج کے سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت ابو عبیدہ عامر بن الجراح' نیز دیگر کبارِ صحابہ' اہم شخصیات اور مختلف سپہ سالاروں سے ملاقات ہوئی ، مثلاً معاذ بن جبل' خالد بن ولید' یزید بن ابی سفیان' شرحبیل بن حسنہ' وغیرہ' رضی اللہ عنہم اجمعین۔

اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی نگاہیں دائیں بائیں کسی کو تلاش کرتی رہیں ، کسی نے استفسار کیا کہ'' اے امیر المؤمنین! کیا آپ کو کسی کی تلاش ہے؟'' حضرت عمرؓ نے جواب دیا'' ہاں...... بلال کہاں ہیں؟'' اور پھر حضرت بلالؓ بھی وہاں پہنچے ، ملاقات ہوئی۔ اس کے بعد جب نماز کا وقت ہوا تو سب نے اصرار کیا کہ'' آج بلال اذان دیں'' لیکن

حضرت بلالؓ نے معذرت کر دی۔آخر خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''اے بلال! فتحِ مکہ کے یادگار اور عظیم الشان موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دس ہزار افراد پر مشتمل لشکر میں سے صرف آپ کو اذان کیلئے منتخب فرمایا تھا......وہ یادگار ترین موقع تھا......اور آج یہ فتحِ بیت المقدس کا واقعہ بھی یادگار ترین موقع ہے......لہٰذا ہم سب کی یہی خواہش ہے کہ آج بھی آپ ہی اذان دیں......تب حضرت بلال رضی اللہ عنہ آمادہ ہو گئے،اور اذان دی......حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ ودیگر اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو اس موقع پر وہاں موجود تھے،آج سالہا سال کے بعد جب انہوں نے حضرت بلالؓ کی پُرسوز اور دلنشیں آواز میں ''اذان'' سنی' تو انہیں رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ یاد آ گیا......اور تب وہ سبھی آبدیدہ ہو گئے۔

شب وروز اور صبح وشام کا یہ سفر جاری رہا......حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ بدستور ملکِ شام میں ہی مقیم رہے،اللہ کے دین کی سربلندی کے جذبے سے سرشار......مسلسل اسلامی فوج میں خدمات انجام دیتے رہے......آخر ۲۰ھ میں وہیں دمشق میں مختصر علالت کے بعد اس دنیائے فانی سے کوچ کر گئے اور اپنے اللہ سے جا ملے......

یوں وہ آواز ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی کہ جب ابتدائے اسلام میں ''اَحد،اَحد'' کا نعرہ اسی آواز میں بلند ہوا کرتا تھا تو مکہ شہر میں بڑے بڑے ظالم وجابر اور مغرور ومتکبر سردارانِ قریش کے دلوں پر لرزہ طاری ہو جایا کرتا تھا،اور جب رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں مدینہ میں یہی آواز اذان کی صورت میں بلند ہوتی اور مدینہ کی مبارک فضاؤں میں گونجتی تو اہلِ ایمان کے دلوں کو گرما دیا کرتی تھی،فتحِ مکہ کے یادگار موقع پر بھی یہی آواز اذان بن کر فضاء میں بلند ہوئی تھی......اور پھر فتحِ بیت المقدس کے یادگار موقع پر بھی یہی آواز اذان

بن کر فضاء میں گونجی تھی...... یہ مبارک آواز......اب ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگئی تھی۔
اللہ تعالیٰ اپنے حبیب ﷺ کے اس جلیل القدر صحابی حضرت بلال بن رباح رضی اللہ عنہ کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۲۵/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱۸/نومبر ۲۰۱۴ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔
رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عمار رضی اللہ عنہ کے والد حضرت یاسر رضی اللہ عنہ کا تعلق دراصل ملکِ یمن سے تھا، ایک بار وہ کسی کام کے سلسلے میں یمن سے مکہ آئے تھے، اور پھر مستقل وہیں رہائش اختیار کر لی تھی، اور پھر رفتہ رفتہ شہر مکہ میں مقامی باشندوں کے ساتھ ان کے تعلقات مستحکم ہوتے گئے، حتیٰ کہ آخر سردارانِ قریش میں سے کسی نے اپنی کنیز ''سُمیّہ'' کے ساتھ ان کی شادی کرادی، کچھ عرصے بعد اللہ نے ان دونوں میاں بیوی کو بیٹا عطاء فرمایا جس کا نام انہوں نے ''عمار'' رکھا۔

مکہ کے گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے عمار نے اپنا بچپن گذارا، اور پھر جب نوجوانی کے مرحلے میں قدم رکھا تو انہی دنوں شہر مکہ آفتابِ نبوت کی کرنوں سے جگمگانے لگا تھا...... رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے رب کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے پیغامِ حق پہنچانے کا سلسلہ شروع فرمایا تو بالکل ابتدائی دنوں میں ہی ان تینوں افراد پر مشتمل یہ مختصر سا گھرانہ دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہو گیا۔

دینِ اسلام کے ابتدائی دنوں میں مسلمانوں کو جن مصائب و آلام سے گذرنا پڑتا تھا، وہی صورتِ حال ان تینوں کے ساتھ بھی پیش آئی، آزمائشوں اور پریشانیوں کے وہی لامتناہی سلسلے ان کے سامنے بھی آ کھڑے ہوئے...... ہر روز جب سورج بلند ہو جاتا اور دھوپ خوب چمکنے لگتی...... اوپر سے سورج آگ برساتا...... اور نیچے سے دہکتی ہوئی زمین شعلے اگلتی...... ایسے میں مشرکینِ مکہ ان تینوں کو کسی کھلے میدان میں لے جاتے، تب بڑے بڑے سردارانِ قریش، نیز شہر کے آوارہ اور اوباش قسم کے نوجوان بھی...... سب جمع ہو جاتے

اور ہر کوئی خوب جی بھر کر انہیں زدوکوب کرتا، ہر قسم کی اذیت پہنچاتا، تپتے ہوئے سنگریزوں پر انہیں گھسیٹا جاتا، دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹایا جاتا، راہگیر وہاں سے گذرتے، مگر کوئی کچھ نہ بولتا، اکثر رسول اللہ ﷺ کا بھی وہاں سے گذر ہوتا، آپؐ اپنی آنکھوں سے یہ دردناک مناظر دیکھتے، اور بس تڑپ کر رہ جاتے، لیکن آپؐ کچھ کر نہیں سکتے تھے......البتہ اکثر اس موقع پر آپؐ یہ الفاظ کہا کرتے: صَبْراً یَا آلَ یَاسِر، فَإِنَّ مَوعِدَکُمُ الجَنَّة...... یعنی ''اے یاسر کے گھرانے والو! صبر سے کام لو، تمہارے لئے تو یقیناً جنت کا وعدہ ہے......''

یوں وہاں مکہ میں دن گذرتے رہے، مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیوں کے سلسلے بھی بدستور چلتے رہے......حتیٰ کہ ایک روز جب ہر کوئی ان مظلوموں اور بیکسوں پر خوب زور وشور کے ساتھ طاقت آزمائی کر رہا تھا، اور ہر کوئی خوب بڑھ چڑھ کر مار پیٹ میں مشغول تھا......اسی دوران ابوجہل کا وہاں سے گذر ہوا، اس نے جب یہ منظر دیکھا تو وہ بھی ظلم وستم کے اس سلسلے میں شریک ہو گیا، اور تب اس نے پوری قوت کے ساتھ اپنا نیزہ سُمیہ کو دے مارا، جس کے نتیجے میں اسی وقت ......موقع پر ہی سُمیہ کی موت واقع ہو گئی...... اور یوں عمار کی والدہ سُمیہ تاریخِ اسلام میں پہلی شہید تھیں......(رضی اللہ عنہا)۔

اور پھر انہی دنوں ایسے ہی تکلیف دہ حالات میں ایک روز یاسر (رضی اللہ عنہ) بھی اس دنیا سے منہ موڑ گئے......اور تب باقی رہ گئے تنہا عمار......ایسے میں مشرکینِ مکہ کی طرف سے وحشیانہ مظالم کا سلسلہ مزید شدت اختیار کر گیا، اُن دنوں انہیں اس قدر تکلیفیں پہنچائی گئیں کہ آخری عمر اور وفات تک ان تکلیفوں کے آثار اور ان زخموں کے نشان ان کے جسم پر جابجا نمایاں نظر آتے رہے۔

ایک روز جب وحشیانہ مظالم کا یہی سلسلہ جاری تھا، مشرکینِ مکہ پہلے تو عمار بن یاسر رضی اللہ

عنہ کو تپتی ہوئی ریت پر گھسیٹتے رہے، پھر جلا د صفت لوگ ان کے جسم کے مختلف حصوں کو دہکتے ہوئے انگاروں سے داغتے رہے، اور پھر پانی میں ڈبکیاں لگانے کا سلسلہ شروع کیا، بار بار دیر تک عمار کا چہرہ پانی میں ڈبوئے رکھتے، تاکہ سانس بند ہو جائے، اور اصرار کرتے کہ کلمۂ کفر کہو، دینِ اسلام کی حقانیت کا' نیز محمد (ﷺ) کی نبوت کا انکار کرو......

عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ انتہائی تکلیف کے باوجود راہِ حق میں یہ تمام اذیتیں برداشت کرتے رہے، لیکن تکلیف کی شدت کی وجہ سے ان پر کچھ غشی طاری ہونے لگی، اور تب ہوش وحواس بھی ساتھ چھوڑنے لگے......ایسی کیفیت میں غیر ارادی طور پر اور لاعلمی میں نہ جانے کب ان کی زبان سے کوئی نامناسب بات نکل گئی......کوئی کلمۂ کفر انہوں نے کہہ دیا......تب اذیتوں کا وہ سلسلہ موقوف ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ ہوش وحواس بھی بحال ہونے لگے، تب انہیں کچھ یاد آنے لگا کہ ظلم وستم اور زد وکوب کے دوران یہ لوگ مجھے کلمۂ کفر کہنے پر مجبور کر رہے تھے، تب میری زبان سے بے اختیار شاید کوئی نامناسب بات نکل گئی تھی......یہ سوچ کر یہ انتہائی پریشان اور شرمندہ ہونے لگے، اذیتوں کا یہ تمامتر سلسلہ جو عرصۂ دراز سے چلا آ رہا تھا......اس پر یہ کبھی اس قدر پریشان نہیں ہوئے تھے کہ جس قدر آج اس بے خودی اور نیم بیہوشی کی کیفیت میں اپنی زبان سے کلمۂ کفر نکل جانے کی وجہ سے پریشان و پشیمان تھے......کسی صورت انہیں چین نہیں آ رہا تھا۔

آخر بڑی ہمت کر کے اور موقع پا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور تمام ماجرا بیان کیا، اُس وقت ان کی آنکھوں سے مسلسل آنسو بہہ رہے تھے، آپؐ نے اپنے دستِ مبارک سے ان کے بہتے ہوئے آنسو صاف کئے، اور انہیں تسلی بھی دی کہ فکر کی بات نہیں، مجبوری میں اور غیر ارادی طور پر اگر کلمۂ کفر زبان سے نکل بھی گیا ہو......تو اللہ معاف

فرمائیگا......اور پھر دو چار روز ہی گذرے تھے کہ قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی: ﴿مَن كَفَرَ بِاللّهِ مِن بَعْدَ اِيمَانِهِ اِلّا مَن أُكرِهَ وَقَلْبُهُ مُطمَئِنٌّ بَالاِيمَانِ وَلٰكِن مَن شَرَحَ بِالكُفرِ صَدراً فَعَلَيهِمْ غَضَبٌ مِنَ اللّهِ وَلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ﴾ (۱)

ترجمہ ''جو شخص اپنے ایمان کے بعد اللہ سے کفر کرے' سوائے اس کے جس پر جبر کیا گیا ہو جبکہ اس کا دل ایمان پر برقرار ہو، مگر جو لوگ کھلے دل سے کفر کریں، تو ان پر اللہ کا غضب ہے اور انہی کیلئے بہت بڑا عذاب ہے''۔

یعنی اس آیت میں اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے یہ خوشخبری سنا دی گئی کہ جس کسی کو کفر پر مجبور کیا گیا ہو اور اس نے محض اپنی جان بچانے کیلئے کوئی کلمۂ کفر اپنی زبان سے کہہ دیا ہو' جبکہ اس کا دل پوری طرح ایمان پر مطمئن اور برقرار ہو' تو ایسا کرنے کی وجہ سے وہ کافر نہیں ہو جائے گا......

یہ آیت نازل ہونے کے بعد حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ بہت زیادہ مسرور و مطمئن ہو گئے، اور ان کی وہ پریشانی اب جاتی رہی۔

مکی دور میں اسی طرح وقت کا یہ سفر جاری رہا......آخر نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا' تب رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام اہلِ ایمان کی طرح حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے بھی مکہ شہر کو الوداع کہا اور مدینہ منورہ جا پہنچے' جہاں ایک نئی اور بدلی ہوئی زندگی کا آغاز ہوا......

اور پھر جب ہجرت کے بعد محض اگلے سال یعنی سن دو ہجری سے ہی مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف مسلح جارحیت کا سلسلہ شروع ہوا جس کے نتیجے کے طور پر غزوات

(۱) النحل [۱۰۶]

کی نوبت آئی ......تب ہمیشہ ہرغزوے کے موقع پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے اور شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھاتے رہے......

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری، علمی استفادہ، اور کسبِ فیض میں بھی یہ ہمیشہ نہایت جذبۂ اخلاص اور لگن کے ساتھ مشغول و منہمک رہے۔

اسی کیفیت میں مدینہ منورہ میں وقت گذرتا رہا......حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا، آپؐ عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ سے ہمیشہ تا دمِ آخر انتہائی مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں جو قدر و منزلت حاصل تھی، حضرات خلفائے راشدین کے دور میں بھی ان کی وہی حیثیت اور قدر و منزلت اس معاشرے میں برقرار رہی۔

نیز یہ کہ جس طرح یہ رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں ہمیشہ ہرغزوے کے موقع پر پیش پیش رہے، اسی طرح خلفائے راشدین کے دور میں بھی اعلائے کلمۃ اللہ کی خاطر ان کا یہی جذبہ برقرار رہا، بالخصوص خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں مرتدین، مانعینِ زکوٰۃ، اور اسی طرح جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف بہت سی جنگوں کی جو نوبت آئی تھی، ان میں سے بعض جنگیں انتہائی خطرناک اور اعصاب شکن قسم کی تھیں (مثلاً جنگِ یمامہ) ایسی تمام جنگوں کے موقع پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ انتہائی جوش و جذبے کے ساتھ پیش پیش رہے اور بے مثال شجاعت و بسالت کے نمونے دکھاتے رہے......نیز خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں فارس و روم کے خلاف لڑی جانے والی بڑی بڑی تاریخی جنگوں کے موقع پر بھی شریک رہے۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں چہار سو اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت زیادہ وسعت اختیار کر چکا تھا، تب حضرت عمرؓ نے سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو مفتوحہ علاقوں میں نئے شہر آباد کرنے کا حکم دیا، چنانچہ انہی دنوں (۱۷ھ میں) حضرت سعدؓ نے دریائے فرات کے کنارے ایک نیا شہر بسایا جو کہ کوفہ کے نام سے معروف ہوا، اور پھر آئندہ چل کر یہ شہر علمی، ادبی، عسکری، سیاسی، وثقافتی، غرضیکہ ہر لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مزاج میں یہ بات شامل تھی کہ وہ خداداد بصیرت، فراست، اور دور اندیشی کی وجہ سے اہم اور حساس قسم کے مناصب کیلئے ذمہ دار افراد کی تعیین وتقرری کے معاملہ میں ہمیشہ بہت زیادہ احتیاط اور باریک بینی سے کام لیا کرتے تھے، چنانچہ جب یہ نیا شہر (یعنی کوفہ) بسایا گیا تو اس کے والی (گورنر، یا فرمانروا) کے تقرر کیلئے ان کی نظرِ انتخاب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر پڑی، اور تب انہوں نے اس نئے آباد کردہ شہر (کوفہ) کے اولین فرمانروا کی حیثیت سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی تقرری کی۔

نیز اسی موقع پر ہی حضرت عمرؓ نے اہالیانِ کوفہ کی دینی تعلیم وتربیت اور رہنمائی کی غرض سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، ساتھ ہی انہیں یہ تاکید بھی کی کہ وہ تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ بوقتِ ضرورت انتظامی امور میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون بھی کرتے رہیں، مشاورت کے فرائض انجام دیتے رہیں......اور پھر ان دونوں انتہائی جلیل القدر شخصیات کو کوفہ پہنچنے کی تاکید فرمائی۔

اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اہالیانِ کوفہ کے نام ایک خط بھی تحریر فرمایا،

جس کا مضمون یہ تھا: اِنّـِي أبْـعَـثُ اِليكُم عَمّار بن يَاسِر أمِيراً ، و عَبدَاللّٰه بن مَسـعُـود مُعَلِّماً وَ وَزِيراً ، وَاِنّهُمَا مِنَ النُّجَبَاءِ ، مِن أصحَابِ الرّسُولِ ﷺ وَمِـن أصـحَــابِ بَدر ۔ یعنی ''میں تم لوگوں کی طرف عمار بن یاسر کو تمہارے فرمانروا کی حیثیت سے ' جبکہ عبداللہ بن مسعود کو تمہارے لئے معلم ومربی ' نیز عمار بن یاسر کیلئے وزیر ومددگار کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں ، یہ دونوں حضرات انتہائی شریف ونجیب قسم کے انسان ہیں ، رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام میں سے ہیں ' نیز یہ دونوں ''غزوۂ بدر'' میں شرکت کرنے والے خوش نصیبوں میں سے ہیں''۔

☆ حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کوفہ میں طویل عرصہ تک ''فرمانروا'' کی حیثیت سے مقیم رہے ، اس دوران ان کے طرزِ زندگی اور بود وباش میں کوئی فرق نہیں آیا ، وہی انتہائی سادہ طور طریقے ، اور عجز وانکسار سے بھرپور زندگی ...... گھر کیلئے سودا اور سامان وغیرہ لینے کیلئے خود ہی بازار جاتے ، عام لوگوں کی طرح وہاں گھومتے پھرتے ، ضرورت کی اشیاء خریدتے ، اور پھر خود ہی اپنا سامان اٹھائے ہوئے گھر کی طرف چل دیتے ، حتیٰ کہ اناج کی بوری بھی خود ہی اپنی کمر پر لاد کر لاتے ، کوئی شان وشوکت نہیں تھی ، کوئی ''ہوشیار ' خبردار'' کی صدائیں بلند نہیں ہوتی تھیں ، کوئی ''ہٹو...... بچو'' کی آوازیں نہیں آتی تھیں۔

انہی دنوں بازار میں انہوں نے ایک شخص کو کسی بات پر کچھ تنبیہ کی ، جس پر وہ کہنے لگا : يَـــا أجـدَعَ الأذُن ...... یعنی ''اے کن کٹے آدمی ......'' مقصد یہ کہ وہ ان کی بات سننے اور ان کی تنبیہ کو قبول کرنے کی بجائے اُلٹا یوں تمسخر کرنے لگا اور ان الفاظ میں انہیں طعنہ دیا۔

لیکن حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے اس شہر (کوفہ) کا فرمانروا ہونے کے باوجود اپنی رعیت کے اس عام انسان کی طرف سے یہ طعنہ سننے کے بعد کسی غیظ وغضب یا ناگواری کا

کوئی اظہار نہیں کیا...... بلکہ جواب میں اسے مخاطب کرتے ہوئے یوں فرمایا ''یہ تو بہت ہی مبارک کان ہے، کیونکہ یہ تو اللہ کی راہ میں کٹا ہے''۔

دراصل رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد اندرونی و بیرونی دشمنوں کی طرف سے بہت سے فتنے بیک وقت اُٹھ کھڑے ہوئے تھے، رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین کی حیثیت سے ان تمام فتنوں کی سرکوبی کی ذمہ داری خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آپڑی تھی ، جسے انہوں نے مکمل عزیمت واستقامت اور بے مثال بہادری وشجاعت کے ساتھ نبھایا تھا، چنانچہ انہی دنوں مشہور ومعروف ''جنگِ یمامہ'' کی نوبت آئی تھی جو کہ بہت ہی خونریز اور اعصاب شکن قسم کی جنگ تھی، ایک ہزار سے زائد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین اس جنگ کے موقع پر شہید ہو گئے تھے جن میں ستر حُفاظِ قرآن بھی شامل تھے۔(۱)

اسی جنگ کے موقع پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے سر پر کسی کافر نے تلوار کا بھرپور وار کیا تھا، لیکن نشانہ خطا گیا، تلوار ایک زناٹے کے ساتھ ان کے سر کو چھوتی ہوئی گذر گئی تھی...... یوں ان کا سر تو بچ گیا تھا...... لیکن ایک کان کٹ کر دور جا پڑا تھا، اور پھر وہیں کہیں یمامہ کے میدان میں رہ گیا تھا۔

اور اب سالہا سال کے بعد یہاں کوفہ میں جب اس شخص نے انہیں ''کن کٹے'' کا طعنہ دیا' تب انہوں نے فرمانروا ہونے کے باوجود اس کی سرزنش کی بجائے نہایت اعلیٰ اخلاق اور وسعتِ ظرف کا ثبوت دیتے ہوئے اسے بس اس حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ''یہ تو بہت مبارک کان ہے، کیونکہ یہ تو اللہ کی راہ میں کٹا ہے''۔

(۱) یہ جنگ چونکہ ''یمامہ'' کے علاقے میں (حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت) لڑی گئی تھی اس لئے ''یمامہ'' کے نام سے مشہور ہو گئی، یہ وہی علاقہ تھا جہاں آجکل ریاض شہر آباد ہے۔

☆ شب و روز اور آتے جاتے موسموں کا سفر جاری رہا...... حتیٰ کہ اسی کیفیت میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دس سالہ زمانۂ خلافت گذر گیا۔

اس کے بعد خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھالا، جن کا زمانۂ خلافت بارہ سال تک جاری رہا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے کچھ عرصے بعد حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ نے ''والیِ کوفہ'' کی حیثیت سے اپنے اس منصب سے علیحدگی اختیار کر لی اور گمنامی کی زندگی بسر کرنے لگے۔

☆ ...... ۳۵ھ میں مدینہ میں باغیوں اور شر پسندوں کے ہاتھوں خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا انتہائی دردناک واقعہ پیش آیا تھا، اور پھر عرصۂ دراز تک اس افسوسناک واقعے کے بھیانک نتائج واثرات مختلف فتنوں کی شکل میں مسلسل ظاہر ہوتے چلے گئے تھے......

۳۷ھ میں عراق اور شام کے مابین سرحدی علاقے میں واقع ''صِفّین'' نامی مقام پر پیش آنے والے ایسے ہی ایک انتہائی افسوسناک فتنے (جو کہ اسی مقام کی نسبت سے تاریخ میں ''جنگِ صِفّین'' کے نام سے معروف ہوگیا) کے موقع پر حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ جب خلیفۂ وقت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے لشکر میں شامل تھے، تب اس جنگ کے دوران ۹۳ سال کی عمر میں یہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔ تجہیز و تکفین کے موقع پر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ خود پیش پیش رہے اور نمازِ جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھائی۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۲۷/محرم ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۰/نومبر ۲۰۱۴ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ:

حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ شہر میں قبیلۂ قریش کے انتہائی مشہور ومعزز ترین خاندان ''بنو ہاشم'' سے تھا، مکہ میں رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت سے دو سال قبل ان کی ولادت ہوئی تھی۔

حضرت حمزہؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا' نیز رضاعی بھائی تھے، ابولہب کی کنیز ثُویبہ(۱) جس نے آپؐ کی ولادت باسعادت کے فوری بعد آپؐ کو دودھ پلایا تھا' اسی نے انہیں بھی دودھ پلایا تھا۔

مکہ شہر میں اور اس معاشرے میں ابتداء سے ہی حضرت حمزہؓ کی بڑی حیثیت اور بہت زیادہ قدر ومنزلت تھی، خاندان بنو ہاشم کے چشم وچراغ تھے، شجاعت وبہادری میں اپنی مثال آپ تھے، ان کی شخصیت میں ایک خاص قسم کا رعب' جلال' اور وقار پایا جاتا تھا۔

دینِ اسلام کا ابتدائی دور جو کہ مسلمانوں کیلئے انتہائی مشکلات سے بھر پور تھا، اسی دور میں جب نبوت کا چھٹا سال چل رہا تھا' ایک روز رسول اللہ ﷺ جب ''صفا'' کے قریب کسی جگہ سے گذر رہے تھے، تب اتفاقاً وہاں ابوجہل بھی آپہنچا، آپؐ کو اس نے بہت زیادہ برا بھلا کہا، انتہائی نازیبا قسم کی باتیں کیں، اور خوب ہرزہ سرائی کرتا رہا......آپؐ نے اس کی اس بیہودگی کا کوئی جواب نہیں دیا......تب وہ اپنی اس فضول اور بیہودہ گفتگو کے بعد، اور آپؐ کی شان میں اس قدر گستاخی کے بعد وہاں سے کچھ فاصلے پر سردارانِ قریش کی ایک محفل میں

(۱) برصغیر پاک وہند میں بہت سے لوگ اپنی بچیوں کا نام ''ثوبیہ'' رکھتے ہیں، غالباً اسی کنیز کی طرف نسبت کی وجہ سے، حالانکہ یہ لفظ ''ثُویبہ'' ہے، نہ کہ ''ثوبیہ''۔

جا کر بیٹھ گیا، اور ان کے ساتھ اِدھر اُدھر کی ہانکنے میں مشغول ہو گیا۔

اتفاقاً اس وقت وہاں ''صفا'' کے قریب ایک کنیز کھڑی ہوئی تھی، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بدبخت ابوجہل نے جس طرح گستاخی اور بدسلوکی کی تھی' اس نے یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اور اسے اس بات پر بہت ہی رنج اور صدمہ محسوس ہو رہا تھا کہ محمد (ﷺ) جیسے انتہائی شریف' معصوم' اچھے' اور سچے انسان کے ساتھ بلاوجہ اور ناحق اس قدر بدسلوکی، آخر کیوں......؟

اسی دوران حضرت حمزہؓ وہاں سے گذرے، جو کہ شکار کی غرض سے کہیں گئے ہوئے تھے، اور اب وہاں سے واپس آ رہے تھے، لہٰذا ہاتھ میں تیر کمان تھامے ہوئے تھے، کنیز نے جب انہیں دیکھا تو ان کے سامنے تمام ماجرا بیان کرتے ہوئے کہا کہ ''ابھی کچھ ہی دیر قبل ابوجہل نے یہاں آپ کے بھتیجے محمد (ﷺ) کے ساتھ بہت زیادہ بدسلوکی کا برتاؤ کیا ہے اور بغیر کسی سبب کے ان کے سامنے بہت مغلظات بکی ہیں......''

تب حضرت حمزہؓ سیدھے اس محفل میں پہنچے جہاں ابوجہل بڑے سردارانِ قریش کے درمیان بیٹھا ہوا تھا، وہاں پہنچتے ہی انہوں نے کسی سے کوئی بات کئے بغیر فوری طور پر اچانک پوری قوت کے ساتھ اپنی کمان ابوجہل کے سر میں دے ماری......جس کی وجہ سے اس کے سر سے خون بہنے لگا......اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع طور پر یہ منظر دیکھ کر تمام سردرانِ قریش حیرت زدہ رہ گئے، اور حمزہؓ کو روکنے کی غرض سے ان کی طرف لپکے، اور یوں کہنے لگے: ''حمزہ یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟''

تب ابوجہل بولا ''میں سمجھ گیا......دراصل ابھی کچھ ہی دیر قبل میں نے ان کے بھتیجے محمد (ﷺ) کو برا بھلا کہا تھا، شاید انہیں خبر ہو گئی ہے، یہ اسی کا بدلہ انہوں نے لیا ہے مجھ سے''۔

اور تب تمام سردارانِ قریش حمزہؓ کی جانب متوجہ ہو کر کہنے لگے "حمزہ! آپ کو معلوم ہے کہ آپ کا بھتیجا آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ کر کسی نئے دین کی تبلیغ کر رہا ہے، اور یہ چیز ہمارے درمیان بڑے فتنے کا باعث بن رہی ہے"

اس پر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ نے جواب میں یوں فرمایا "خوب اچھی طرح سُن لو تم سب، آج سے میں بھی اسی نئے دین میں شامل ہو رہا ہوں، اسی دین کو قبول کر رہا ہوں، کیونکہ وہی دینِ برحق ہے، تم میں سے کوئی مجھے روک سکتا ہے تو روک لے، میں جا رہا ہوں"

اور پھر حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی تلاش میں وہاں سے روانہ ہو گئے، خدمتِ اقدس میں حاضری دی، آمد کا مقصد بیان کیا، دینِ اسلام قبول کیا، رسول اللہ ﷺ کے سامنے کلمۂ حق پڑھا "أشہد أن لا الٰہ الا اللہ، وأشہد أن محمد ارسول اللہ" اور یوں مسلمان ہو گئے۔ ان کے قبولِ اسلام کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کو' نیز تمام مسلمانوں کو انتہائی مسرت ہوئی، جبکہ مشرکین کیلئے یہ بات بڑے ہی صدمے اور پریشانی کا سبب بنی، کیونکہ اس معاشرے میں ان کا جو بہت بڑا اثر و رسوخ تھا، اس کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ان کا قبولِ اسلام مسلمانوں کیلئے بڑی کامیابی' جبکہ مشرکین کیلئے بڑا خسارہ تھا۔

☆ حُسنِ اتفاق ملاحظہ ہو کہ حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے محض دو دن بعد ہی بالکل اچانک اور غیر متوقع طور پر مکہ کی ایک اور بہت ہی اہم ترین شخصیت یعنی حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی مسلمان ہو گئے...... یکے بعد دیگرے...... ان دو عظیم ترین' انتہائی بااثر اور طاقتور شخصیات کا اچانک قبولِ اسلام...... مشرکینِ مکہ کیلئے یہ ایسا صدمہ تھا کہ جس کی وجہ سے ان میں صفِ ماتم بچھ گئی، ان کے دل مرجھانے لگے، اور ان کے حوصلے پست پڑنے لگے۔

مکہ میں دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں یہی وہ بڑی تبدیلی تھی کہ جس کے نتیجے میں مسلمانوں نے اب پہلی بار علیٰ الاعلان بیت اللہ کا طواف اور وہاں عبادات کا آغاز کیا، ورنہ اس سے قبل یہ سلسلہ نہیں تھا، صورتِ حال یکسر مختلف تھی۔

مکہ میں وقت کا یہ سفر جاری رہا، اور پھر نبوت کے تیرہویں سال ہجرت کا حکم نازل ہونے پر دیگر تمام مسلمانوں کی طرح حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ بھی اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر باد کہتے ہوئے مدینہ جا پہنچے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد اگلے ہی سال یعنی ۲ھ میں حق و باطل کے مابین پیش آنے والے اولین معرکے یعنی ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر حضرت حمزہؓ پیش پیش رہے اور انتہائی بہادری و دلیری کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑی ہی بے جگری سے لڑے، بیک وقت دونوں ہاتھوں میں تلوار لئے ہوئے جب یہ کسی بپھرے ہوئے شیر کی مانند مشرکین کے لشکر پر جھپٹتے تو لوگ انتہائی حیرت کے ساتھ انہیں بس دیکھتے ہی رہ جاتے......

اور پھر اگلے ہی سال یعنی ۳ھ میں جب مشرکینِ مکہ دوبارہ چلے آئے تھے، مسلمانوں سے اپنی شکست کا بدلہ لینے کی خاطر......تب ابتداء میں مسلمان تقریباً یہ جنگ جیت ہی چکے تھے، لیکن پھر اچانک اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے مسلمان اپنی یہ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے تھے، اور اس وقت بہت زیادہ افراتفری پھیل گئی تھی، مسلمان اپنی صفوں میں نظم و ضبط برقرار نہیں رکھ سکے تھے......

ایسے میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بڑی ہی استقامت اور پامردی کے ساتھ مشرکین کے خلاف جنگ میں مشغول و منہمک تھے۔

اس حوالے سے ایک قابلِ ذکر بات یہ کہ غزوۂ اُحد سے قبل غزوۂ بدر کے موقع پر چونکہ متعدد

سردارانِ قریش اور نامی گرامی شہسوار حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارے گئے تھے، لہٰذا ان کے رشتے داروں میں سے بہت سے جنگجواب اُحد کے موقع پر محض حضرت حمزہؓ سے اپنا انتقام لینے کی غرض سے وہاں پہنچے تھے، اورانہوں نے بطورِ خاص بس انہی پر نظر رکھی ہوئی تھی۔

ایسے ہی ایک بڑا سردار طُعیمہ بن عُدی جو ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں مارا گیا تھا، اس کی موت کے بعد مکہ میں اس کا بھتیجا مسلسل انتقام کی آگ میں جل رہا تھا، اوراسے کسی صورت سکون نہیں مل رہا تھا......اس کا ایک حبشی غلام تھا، جس کا نام تھا ''وحشی بن حرب'' جسے دور سے ہی نیزہ پھینک کر شکار کرنے میں بڑی مہارت حاصل تھی اس کا نشانہ کبھی خطا نہیں جاتا تھا(۱)

جنگِ اُحد سے قبل مشرکینِ مکہ جن دنوں مسلمانوں کے خلاف خوب زوروشور کے ساتھ تیاریوں میں مصروف تھے، ان کا جنگی جنون جب عروج پر تھا......ایسے میں ایک روز ''وحشی'' کے آقا نے اسے مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا ''کیا تمہیں آزادی کی تمنا ہے؟'' اپنے آقا کی زبانی یہ بات سن کر وحشی حیرت زدہ رہ گیا، اسے اپنے کانوں پر یقین ہی نہیں آرہا تھا......تب وہ اپنے آقا کی جانب معنیٰ خیز نگاہوں سے دیکھنے لگا، گویا وہ اس بارے میں مزید وضاحت چاہتا ہو......تب اس کے آقا نے اس کی جانب بغور دیکھتے ہوئے یوں کہا ''دیکھو وحشی! مسلمانوں کے خلاف جنگ کی غرض سے ہم لوگ بس چند ہی دنوں میں مدینہ کی جانب کوچ کرنے والے ہیں، اگر تم بھی ہمارے ساتھ چلو، اور وہاں میدانِ جنگ

(۱) اُس دور میں حبشہ کے تمام باشندوں کی یہی کیفیت تھی کہ اپنے شکار کی جانب دور سے نیزہ پھینک کر اسے شکار کرنے میں انہیں بہت زیادہ مہارت حاصل تھی، غالباً اس کی وجہ یہ ہوگی کہ حبشہ میں گھنے جنگل اوران میں پائے جانے والے جنگلی درندوں کی بہتات تھی، انہیں مارنے کیلئے ان کے قریب جانا تو ممکن نہیں تھا، لہٰذا یہ لوگ دور سے ہی نیزہ پھینک کر انہیں مارا کرتے تھے، چونکہ یہ ان کی مجبوری تھی، لہٰذا یہ لوگ اس کام میں بہت ماہر تھے۔

میں حمزہ کو قتل کر ڈالو......تو میں تمہیں بطورِ انعام آزاد کردوں گا''۔

ظاہر ہے کہ وحشی کیلئے اس سے بڑا لالچ اور کیا ہوسکتا تھا......لہٰذا محض حضرت حمزہؓ کو قتل کرنے کی خاطر......اوراس کے عوض اپنی آزادی کے لالچ میں مشرکینِ مکہ کے لشکر کے ہمراہ وہ بھی مدینہ کی جانب روانہ ہوگیا، لشکر مسلسل مدینہ کی جانب پیش قدمی کرتا رہا، اس دوران وحشی روزانہ بڑے ہی اہتمام سے اپنا نیزہ تیز کیا کرتا......اس کا تیز دھار اور چمکدار نیزہ دھوپ میں خوب چمکتا ہوا دور سے ہی نظر آیا کرتا تھا، جسے دیکھ کر بڑے بڑے سردارانِ قریش اس کی خوب حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے......

اسی کیفیت میں وحشی مشرکینِ مکہ کے لشکر کے ہمراہ وہاں پہنچا تھا، اور اُحد کے میدان میں اس نے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کو تلاش کیا اور پھر مسلسل انہی پر نگاہ مرکوز کئے رکھی، اور مسلسل ان کے تعاقب میں رہا......حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس موقع پر جس بے جگری سے لڑ رہے تھے اس پر یہ وحشی بار بار لرز اٹھتا، اس کے سراپا پر عجیب سا خوف طاری ہونے لگتا، اتنی ہمت وہ کہاں سے لاتا کہ ان کے قریب جا کر وار کرے، اور دور سے وار کرنے کا کوئی مناسب موقع نہیں مل رہا تھا......اسی دوران مشرکینِ مکہ کے نامور بہادروں میں سے سِباع بن عبدالعُزیٰ نامی ایک شخص کی نظر حضرت حمزہؓ پر پڑی، اس نے جب انہیں دونوں ہاتھوں میں تلوار لئے ہوئے اس قدر بہادری و بے جگری کے ساتھ لڑتے دیکھا تو انہیں مخاطب کرتے ہوئے چلایا: بَارِزنِي یا حَمزة...... یعنی ''اے حمزہ ذرہ مجھ سے مقابلہ کرو......'' تب حضرت حمزہؓ برق رفتاری کے ساتھ اس کی جانب لپکے، اور اس پر بھرپور وار کیا، اگلے ہی لمحے تکبر و غرور کا وہ پتلا زمین بوس ہوگیا، تاہم ابھی تک حضرت حمزہؓ اسی کی طرف متوجہ تھے، اُس وقت ان کی پشت ایک درخت کی جانب تھی جس کی آڑ میں وحشی چھپا

کھڑا تھا......تب وحشی نے موقع غنیمت جانا، اور پوری قوت کے ساتھ نیزہ ان کی کمر کے نچلے حصے میں ایک پہلو میں دے مارا......جو کہ اسی وقت آر پار ہوگیا......

جیسا کہ بعد میں وحشی نے خود بیان کیا کہ ''نیزہ لگتے ہی حضرت حمزہؓ نے نہایت غصے کے عالم میں گھوم کر میری جانب دیکھا، اور میری طرف بڑھنے کی کوشش کی، تب میں انتہائی خوف ودہشت کی کیفیت میں وہاں سے بھاگنے کیلئے مڑا، حمزہ بھی میرے تعاقب میں آئے مگر دو چار قدم کے بعد وہ لڑکھڑائے، اور پھر رک گئے، اور پھر تھوڑی ہی دیر بعد گر گئے، تب میں اپنی جگہ رک گیا، اور کچھ دیر رکا ہی رہا، اور جب خوب یقین ہوگیا کہ اب ان کی جان نکل چکی ہے، تب میں نے آگے بڑھ کر ان کے جسم میں پیوست اپنا نیزہ نکالا، اور وہاں سے چلتا بنا......کیونکہ مجھے اب اور کوئی غرض نہیں تھی، میرا مقصد پورا ہو چکا تھا''۔(۱)

(۱) واضح ہو کہ ۸ھ میں فتحِ مکہ کے موقع پر وحشی نے مسلمانوں سے بچنے کی خاطر مکہ سے فرار ہو کر طائف میں پناہ لے لی تھی، اور پھر فتحِ طائف کے بعد مسلمانوں سے بچنے کیلئے کافی عرصہ اِدھر اُدھر چھپنے کے بعد آخر کافی بعد میں ایک روز مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کے سامنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا تھا، اس موقع پر اسے مخاطب کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا تھا کہ ''اے وحشی! آئندہ کبھی مجھے اپنی شکل نہ دکھانا''

اور پھر رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد جب جزیرۃ العرب کے طول وعرض میں بہت سے فتنے سر اٹھانے لگے تھے......انتہائی نازک صورتِ حال درپیش تھی، تب خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے نہایت عزیمت واستقامت کے ساتھ ان تمام فتنوں کی سرکوبی کی تھی۔ ایسا ہی ایک فتنہ جو کہ ''جنگِ یمامہ'' کے نام سے مشہور ہے، اس موقع پر مسلمانوں کو دشمن کی طرف سے شدید مشکلات کا اور بڑی مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا، تب اسی وحشی نے ہی اسی طرح دور سے اپنا نیزہ پھینک کر دشمن کے سپہ سالار اور نبوت کے جھوٹے دعویدار ''مسیلمہ کذاب'' کو قتل کر ڈالا تھا......جو کہ اس تمام فتنے کا سرغنہ تھا، اور تب دشمن کے حوصلے پست ہونے لگے تھے اور مسلمانوں کیلئے یہی چیز فتح کا سبب بنی تھی......للہ فی خلقہٖ شؤون......!!اس کے بعد وحشی نے ملکِ شام کے شہر حمص میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی اور بقیہ زندگی وہیں گذاری۔

☆جنگِ اُحد کے موقع پر مشرکینِ مکہ کی عورتیں ان مشرکین کی دلجوئی ٗ نیز حوصلہ افزائی کی غرض سے بڑی تعداد میں ہمراہ آئی تھیں، مشرکینِ مکہ کے سپہ سالار ابوسفیان (جو بعد میں فتحِ مکہ کے موقع پر مسلمان ہوگئے تھے) کی بیوی ہند بھی ان عورتوں میں شامل ٗ بلکہ پیش پیش تھی، ایک تو سپہ سالار کی بیوی ہونے کی وجہ سے لشکر میں اس کی خاص حیثیت اور بڑی شان تھی، مزید یہ کہ غزوۂ بدر کے موقع پر اس کا باپ عتبہ بن ربیعہ ٗ چچا شیبہ بن ربیعہ ٗ اور بھائی ولید بن عتبہ ......جن کا شمار مکہ کے بڑے معززترین افراد میں ہوتا تھا......تینوں ہی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے(۱) اور اسی وجہ سے ہند کے دل و دماغ پر مسلمانوں

(۱) اُس زمانے میں یہ رواج تھا کہ عام یلغار سے قبل باہم مدِ مقابل دونوں لشکروں میں سے چند نامی گرامی بہادر جنگجو میدان میں نکلتے، اور ایک دوسرے کے سامنے ''مبارزہ'' کرتے، یعنی خوب جوش و خروش کے ساتھ ایک دوسرے کو للکارتے، چنانچہ غزوۂ بدر کے موقع پر عام یلغار سے قبل مشرکینِ مکہ کے لشکر میں سے عتبہ ٗ شیبہ ٗ اور ولید نکلے، اور مسلمانوں کو للکارنے لگے، تب ان کے مقابلے کیلئے مسلمانوں میں سے انصارِ مدینہ میں سے تین حضرات وہاں پہنچے، جنہیں دیکھ کر عتبہ نے یہ کہہ کر مقابلے سے انکار کر دیا کہ ''تم ہماری ٹکر کے نہیں ہو......ہمارے مقابلے میں ہماری ٹکر کے لوگ ہی ہونے چاہئیں'' (یعنی جن کا تعلق ہماری ہی طرح مکہ سے ہو) تب رسول اللہ ﷺ نے بآوازِ بلند ارشاد فرمایا: قُم یَا حَمزَۃ ، قُم یَا عَلِي ، قُم یَا عُبَیدَۃ ، یعنی ''اے حمزہ اٹھئے، اے علی اٹھئے، اے عبیدہ اٹھئے'' اس حکم کی تعمیل میں یہ تینوں حضرات میدان میں نکلے، سب سے پہلے حضرت حمزہؓ اور عتبہ نے ایک دوسرے کو للکارا، دونوں طرف سے تلواریں بلند ہوئیں، اور پھر چشم زدن میں حضرت حمزہؓ نے عتبہ کا کام تمام کر ڈالا، اس کے بعد حضرت علیؓ کے ہاتھوں ان کے حریف ولید کا بھی یہی انجام ہوا، جبکہ شیبہ نے اپنے دونوں ساتھیوں (اپنے بھائی اور بھتیجے) کا جب یہ انجام دیکھا تو اس نے قبل از وقت ہی اچانک اپنے مدِ مقابل یعنی حضرت عبیدہؓ پر حملہ کر دیا، جس کی وجہ سے ان کی ٹانگ کٹ گئی، اور وہ گر پڑے، یہ منظر دیکھ کر حضرت حمزہؓ اور حضرت علیؓ نے بیک وقت شیبہ پر حملہ کر کے اسے واصلِ جہنم کر ڈالا، اور دونوں اپنے ساتھی حضرت عبیدہؓ کو اٹھائے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، جہاں آپؐ کی گود مبارک میں حضرت عبیدہؓ نے اپنا سر رکھے ہوئے اپنی جان اللہ کے حوالے کر دی، حضرت عبیدہؓ رسول اللہ ﷺ کے چچا حارث بن عبدالمطلب کے بیٹے تھے۔

سے انتقام کا جنون سوار تھا، لہٰذا اس جنگ کے موقع پر مسلمانوں کے خلاف وہ خوب سرگرمی کا مظاہرہ کر رہی تھی، مشرکینِ مکہ کے بڑے سرداروں کی بیگمات کی قیادت کرتے ہوئے وہ لشکر میں گھوم پھر کر نہایت جوش وخروش کے ساتھ مسلمانوں کے خلاف اشتعال انگیزی میں مصروف تھی۔ اور پھر جنگ کے خاتمے کے بعد مسلمان شہداء کے درمیان گھوم پھر کر وہ دیوانہ وار خوشی منا رہی تھی...... اسی دوران جب اس کی نظر حضرت حمزہؓ کے جسد مبارک پر پڑی تو اس کی خوشی کی انتہاء نہ رہی، اور تب اس پر جنونی کیفیت طاری ہونے لگی، کیونکہ غزوۂ بدر کے موقع پر اس کا مغرور ومتکبر باپ ''عتبہ'' حضرت حمزہؓ کے ہاتھوں ہی مارا گیا تھا...... لہٰذا اب اس نے انتقام کی آگ بجھانے کی خاطر وہاں اُحد کے میدان میں خوب زور وشور کے ساتھ اپنا مکروہ وقبیح ترین کام شروع کر دیا، اور انتہائی درندگی وسفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے حضرت حمزہؓ کے جسم سے مختلف اعضاء نوچ نوچ کر کاٹنے لگی، ناک کان کاٹے، آنکھیں نکالیں، پھر بھی تسلی نہیں ہوئی...... تب سینہ چاک کیا، کلیجہ نکالا، اور اسے چبانے لگی...... نگلنے کی کوشش کرتی رہی، لیکن نگل نہیں سکی، تب غصے میں اگل کر وہاں سے چلتی بنی...... اور جب اسے یہ بات معلوم ہوئی کہ حضرت حمزہؓ کو وحشی نے قتل کیا ہے، تو وہ وحشی کو تلاش کرتی ہوئی اس کے پاس پہنچی اور اپنے گلے سے ہار اتارا، پھر کانوں سے بالیاں بھی اتاریں، اور اپنے یہ قیمتی زیورات بطورِ انعام وحشی کے حوالے کرتے ہوئے اسے یہ تاکید کی ''ان زیورات کو خوب سنبھال کر رکھنا، کیونکہ یہ بہت ہی قیمتی ہیں''۔

رسول اللہ ﷺ جب حضرت حمزہؓ کو تلاش کرتے ہوئے وہاں پہنچے، اور ان کا یہ حال دیکھا، تو آپ ﷺ انتہائی رنجیدہ ہو گئے، آپؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، مزید یہ کہ اس موقع پر آپؐ کی ہچکیاں بھی سنی گئیں...... جبکہ اس کے سوا کسی اور موقع پر کبھی آپؐ کی ہچکیاں

نہیں سنی گئیں۔

وہاں آپؐ کے ہمراہ موجود صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے جب آپؐ کو اس قدر رنجیدہ وافسردہ دیکھا تو وہ قسم کھا کر کہنے لگے'' آئندہ اگر کبھی ہمیں ان مشرکینِ مکہ کے مقابلے میں فتح نصیب ہوئی تو ہم ان کا ایسا مُثلہ کریں گے کہ تاریخ میں مثال نہیں مل سکے گی''(۱)

اور تب خود رسول اللہ ﷺ نے بھی یہ قسم کھائی: لَو ظَهَرنَا عَلَيهِم لَنُمَثِّلَنَّ بَثَلَاثِينَ رَجُلًا مِنهُم ...... یعنی'' اگر ہمیں ان کے مقابلے میں فتح نصیب ہوئی تو ہم ان کے تیس آدمیوں کا ایسا ہی مُثلہ کریں گے''۔(۲)

اور تب آسمانوں سے...... اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیت نازل ہوئی:

﴿وَاِن عَاقَبتُم فَعَاقِبُوا بِمِثلِ مَا عُوقِبتُم بِهٖ وَلَئِن صَبَرتُم لَهُوَ خَيرٌ لِلصَّابِرِينَ وَاصبِر وَمَا صَبرُكَ اِلَّا بِاللّٰهِ وَلَا تَحزَن عَلَيهِم وَلَا تَكُ فِي ضَيقٍ مِمَّا يَمكُرُونَ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الَّذِينَ اتَّقَوا وَالَّذِينَ هُم مُحسِنُونَ﴾ (۳)

ترجمہ: (اور اگر تم بدلہ لو' تو بالکل اتنا ہی جتنا صدمہ تمہیں پہنچایا گیا ہو، اور اگر صبر کر لو' تو بے شک صابرین کیلئے یہی بہتر ہے، آپ صبر کیجئے، اور بغیر توفیق الٰہی کے آپ صبر کر ہی نہیں سکتے، اور ان کے حال پر رنجیدہ نہ ہوں، اور جو مکر وفریب یہ کرتے ہیں ان سے تنگ دل نہ ہوں، یقین مانو کہ اللہ پرہیزگاروں اور اچھے کام کرنے والوں کے ساتھ ہے)۔

(۱) وہ لوگ دشمن کو قتل کر کے اس کے ناک کان وغیرہ کاٹ دیا کرتے تھے، اس عمل کو مُثلہ کہا جاتا تھا، چونکہ جنگِ اُحد کے موقع پر مشرکین نے حضرت حمزہؓ کے جسدِ مبارک کے ساتھ یہ وحشیانہ سلوک کیا تھا' جسے دیکھ کر رسول اللہ ﷺ اس قدر رنجیدہ ہوگئے تھے...... لہٰذا اس موقع پر آپؐ کے ہمراہ موجود صحابۂ کرام نے گویا اس کے جواب میں مشرکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرنے کی قسم کھائی تھی۔

(۲) تفسیر ابن کثیر (سورۃ النحل) ج:۴۔ص:۶۱۴۔ (۳) النحل [۱۲۶۔۱۲۸]

ان آیات میں اولاً تو یہ تنبیہ کی گئی کہ اگر انتقام لینا ہوتو محض اتنا ہی لوکہ جتنا تم پر ظلم کیا گیا ہے، اس سے زیادہ ہر گز نہیں۔اس کے ساتھ ہی یہ تعلیم بھی دے دی گئی کہ اگر بالکل ہی انتقام نہ لو صبر سے کام لو تو یہ بہت بہتر ہے۔اس کے بعد یہ تلقین کی گئی کہ صبر کا دامن تھامے رکھنے کیلئے ضروری ہے کہ اللہ سے صبر کی توفیق طلب کی جائے،اس کی طرف سے توفیق شاملِ حال ہوگی تو صبر نصیب ہوگا،ورنہ نہیں......اور پھر خالقِ ارض وسماء کی طرف سے ہمیشہ کیلئے یہ نسخہ بتادیا گیا کہ اللہ کی معیت ونصرت کی طلب وآرزو ہے تو ''اللہ کا خوف'' نیز''اللہ کے بندوں کے ساتھ حسنِ سلوک'' کا راستہ اختیار کرو......تب جا کر تمہیں اللہ کی معیت ونصرت نصیب ہوسکے گی،اور جب اللہ کی معیت ونصرت جیسی عظیم ترین نعمت نصیب ہوجائے گی ......تو پھر غم کیسا......؟ پھر انتقام کی آگ میں سلگنا کیسا......؟ پھر تو کسی ''انتقام'' یا کسی ''مُثلہ'' کی کوئی ضرورت ہی باقی نہیں رہے گی......

چنانچہ ان آیات میں خالقِ کائنات کی طرف سے ان توجیہات اور پاکیزہ تعلیمات کے نزول کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی اس قسم (یعنی مشرکینِ مکہ کا مُثلہ کرنے کی قسم) کا کفارہ ادا کیا......

اور پھر فتحِ مکہ کے تاریخی موقع پر وہی تمام بڑے بڑے مجرم......جنہوں نے غزوۂ اُحد کے موقع پر یہ اتنا بڑا ظلم کیا تھا......ناک' کان کاٹے' آنکھیں نکالیں' سینہ چاک کیا' کلیجہ نکالا' اور چبانے کی کوشش کی ......اور محض یہی نہیں...... بلکہ اس سے قبل تیرہ سالہ مکی دور میں یہی لوگ مسلمانوں پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑتے رہے......آپ ﷺ نہایت محبت' نرمی' اور شفقت کے ساتھ انہیں دینِ برحق کی طرف دعوت دیتے رہے......آپ ﷺ تیرہ سال مسلسل ان پر وعظ ونصیحت کے پھول برساتے رہے......جبکہ جواب میں یہ لوگ ہمیشہ پتھر

ہی برساتے رہے تھے......آج یہی تمام لوگ مغلوب ومفتوح، ہاتھ باندھے اور سر جھکائے کھڑے تھے...... بے بس اور لاچار......تب اس موقع پر آپ ﷺ نے انہی مذکورہ آیات میں اپنے رب کی طرف سے نازل فرمودہ تعلیمات وتوجیہات کے مصداق کے طور پر ''صبر'' اور ''عفوودرگذر'' کا ایسا مظاہرہ فرمایا تھا کہ ''عفوودرگذر'' کے باب میں یقیناً تمام تاریخِ عالم اس جیسی کوئی اور مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز وقاصر ہی رہے گی......

۳ھ میں مدینہ منورہ کے مضافات میں واقع اُحد پہاڑ کے دامن میں پیش آنے والے اس تاریخی غزوہ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی' آپؐ کے محترم ومکرم چچا' آپؐ کے رضاعی بھائی ......اسداللہ واسدرسولہٖ......سیدالشہداء......حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کو اُحد پہاڑ کے دامن میں ہی' دیگر شہدائے اُحد کے ہمراہ سپردِ خاک کردیا گیا، بوقتِ شہادت ان کی عمر ۵۸ برس تھی۔

اللہ تعالیٰ سیدالشہداء حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ' ودیگر تمام شہدائے اُحد کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۲/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۴/نومبر ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ شہر میں مشہور قبیلۂ قریش کے معزز ترین خاندان ''بنوہاشم'' سے تھا، یہ رسول اللہ ﷺ کے چچا تھے، عمر میں آپؐ سے تقریباً چار سال بڑے تھے۔ اپنے بھائی ابوطالب بن عبدالمطلب کی وفات کے بعد یہی خاندانِ ''بنوہاشم'' کے سردار' نیز ''متولیِ کعبہ'' تھے، یہی وجہ تھی کہ اُس معاشرے میں انہیں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ قبل از اسلام اُس معاشرے میں بھی سخاوت وفیاضی میں اپنی مثال آپ تھے، مہمان نوازی' نیز محتاجوں وضرورتمندوں کی مددواعانت اوران کی خبرگیری کے معاملے میں ہمہ وقت پیش پیش رہا کرتے تھے۔

حضرت عباسؓ ابتداء سے ہی انتہائی شریف النفس قسم کے انسان تھے، ابوطالب کی طرح یہ بھی ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت ہی رحمت وشفقت کا معاملہ کیا کرتے تھے، مشرکینِ مکہ کے مقابلے میں آپؐ کی طرف سے ہمیشہ مدافعت وحمایت کی بھی حتیٰ المقدور کوشش وجستجو کیا کرتے تھے۔

نبوت کے تیرہویں سال بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر آپؐ جب مدینہ سے آئے ہوئے افراد کے ساتھ طے شدہ منصوبے کے مطابق خفیہ ملاقات کی غرض سے رات کی تاریکی میں اپنے گھر سے منیٰ کی جانب روانہ ہونے لگے، تب عین وقت پر حضرت عباسؓ بھی آ پہنچے، اور اصرار کیا کہ ''میں آپ کو ہرگز تنہا نہیں جانے دوں گا، میں بھی ضرور آپ کے ہمراہ وہاں جاؤں گا''۔

حضرت عباسؓ اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے...... اپنے پرانے دین پر ہی قائم تھے...... لیکن اپنے بھتیجے (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے ساتھ محبت وشفقت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اس بات کو گوارا نہیں کیا کہ اس قدر خطرہ مول لیتے ہوئے ان کا بھتیجا اکیلا وہاں جائے...... ایک تو راستے میں قدم قدم پر مشرکینِ مکہ کی طرف سے خطرہ...... اوراس کے علاوہ مزید یہ کہ انہیں کچھ اندازہ ہو چکا تھا کہ اس ملاقات میں آپؐ شاید اب مستقل طور پر مکہ سے مدینہ منتقل ہو جانے کے بارے میں ان لوگوں کے ساتھ کچھ گفت وشنید کریں گے اوراس سلسلے میں کچھ اہم معاملات طے کئے جائیں گے......!

چونکہ یہ انتہائی نازک معاملہ تھا...... لہٰذا حضرت عباسؓ کی یہ خواہش تھی کہ اس اہم اورحساس ترین معاملے پر گفت وشنید کے موقع پر وہ بھی موجود ہوں اورفریقین کے مابین اس بارے میں جو کچھ بھی طے ہو وہ ان کی موجودگی میں ہو...... تاکہ ان کا پیارا بھتیجا کسی مشکل میں نہ پھنس جائے......!

چنانچہ آپ ﷺ اس موقع پر اپنے مشفق ومہربان چچا کے اصرار کو دیکھتے ہوئے انہیں اپنے ہمراہ لے گئے تھے، اوروہاں منیٰ میں اس ملاقات اور پھر بیعت کے موقع پر انصارِ مدینہ نے آپؐ کو مستقل مدینہ چلے آنے والے کی دعوت دی تھی، تب رسول اللہ ﷺ اورانصارِ مدینہ کے مابین اس حوالے سے طے کئے جانے والے معاملات اورضروری گفت وشنید کے موقع پر حضرت عباسؓ بھی موجود تھے...... یقیناً اس سے حضرت عباسؓ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ تعلق، اورآپؐ کی خیریت وسلامتی کے حوالے سے فکر، تشویش، اورخیرخواہی کے جذبات کی خوب عکاسی ہوتی ہے۔

☆ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ دینِ اسلام کے ظہور کے بعد بہت ابتدائی

زمانے سے ہی دینِ برحق قبول کرنا چاہتے تھے......لیکن......ایسا نہیں ہو سکا۔البتہ اس کے باوجود وہ ہمیشہ مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے رہے۔مسلمانوں کی حفاظت وسلامتی سے متعلق جو کچھ بھی ان سے بن پڑا......ہمیشہ ہی اس سلسلے میں حتیٰ المقدور کوشش و جستجو میں مشغول رہے......

نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام مسلمان اپنے آبائی شہر مکہ کو خیر باد کہتے ہوئے مدینہ چلے آئے تھے، اور پھر اس ہجرت کے بعد محض اگلے سال ہی مشرکینِ مکہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی غرض سے مدینہ کی جانب رواں دواں ہو گئے تھے، اور پھر مدینہ شہر سے تقریباً ایک سو ساٹھ کلومیٹر کے فاصلے پر ''بدر'' کے مقام پر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین اولین معرکہ پیش آیا تھا......اس موقع پر حضرت عباس مشرکینِ مکہ کے ہمراہ بادلِ ناخواستہ اور مجبوراً چلے آئے تھے......جبکہ ان کی دلی ہمدردیاں مسلمانوں کے ساتھ تھیں......اور یہ مسلمانوں کے خلاف کسی بھی قسم کی جارحیت اور لشکر کشی کے سخت مخالف تھے......

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو یہ تاکید فرمادی تھی کہ'' دورانِ جنگ اگر کسی کا عباس کے ساتھ آمنا سامنا ہو جائے ......تو وہ انہیں قتل نہ کرے......'' کیونکہ آپ ﷺ کو اس حقیقت کا خوب احساس وادراک تھا کہ عباس خلوصِ دل کے ساتھ مسلمان ہونا چاہتے ہیں، وہ مسلمانوں کے بڑے خیر خواہ ہیں' اور ان کا دل مسلمانوں کے ساتھ ہی دھڑکتا ہے......

اور پھر غزوۂ بدر کے اختتام پر کیفیت کچھ یوں تھی کہ مشرکینِ مکہ میں سے ستر افراد مارے گئے تھے، ستر ہی مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بنے تھے، جبکہ باقی لوگ جان بچا کر واپس لوٹ

گئے تھے۔

حضرت عباسؓ کا نصیب انہیں ان تینوں قسم کے افراد میں سے دوسری قسم کی جانب کھینچ لایا تھا......یعنی جو قیدی بن گئے تھے۔

اور پھر جب وہ دن ڈھل گیا اور رات کے سائے ہر طرف پھیل گئے......قیدیوں کے کراہنے کی آوازیں بلند ہونے لگیں......انہی آوازوں میں حضرت عباسؓ کی آواز بھی شامل تھی، مشفق ومہربان چچا کے کراہنے کی آواز جب آپؐ کی سماعت سے ٹکراتی تو آپ انتہائی رنجیدہ ودل گرفتہ ہو جاتے......صحابۂ کرام نے جب آپؐ کی یہ اداسی اور بے چینی دیکھی تو اس چیز کی وجہ دریافت کی......تب آپؐ نے فرمایا ''میں اپنے چچا عباس کی آواز کی وجہ سے پریشان ہوں......''

اور پھر کچھ دیر بعد عباسؓ کی آواز آنا بند ہوگئی، جس پر آپؐ نے اپنے ان صحابۂ کرام کو مخاطب کرتے ہوئے استفسار فرمایا: مَالِي لَا أَسمَع أَنِينَ العَبّاس......؟ یعنی ''کیا بات ہوگئی......اب مجھے عباس کے کراہنے کی آواز سنائی نہیں دے رہی؟'' تب ان میں سے ایک شخص نے عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! مجھ سے آپ کی بے چینی دیکھی نہیں جا رہی تھی، اس لئے میں آپ کے چچا عباس کی رسی ڈھیلی کر آیا ہوں'' اس پر آپؐ نے فرمایا ''جاؤ، سب ہی قیدیوں کی رسی ڈھیلی کر دو''

اور پھر باہم مشاورت کے بعد ان قیدیوں کے بارے میں جب یہ طے پایا کہ تمام قیدی فدیہ ادا کریں اور آزاد ہو جائیں......تب دیگر قیدیوں کی طرح حضرت عباس بھی جب آزاد ہوئے......تو اب مکہ واپسی کے بعد دینِ اسلام' پیغمبرِ اسلام' نیز تمام مسلمانوں کی بہتری اور خیر وخوبی کیلئے حتیٰ المقدور کوششیں کرتے رہے......وقتاً فوقتاً رسول اللہ ﷺ کے

ساتھ خفیہ خط و کتابت بھی کیا کرتے، جس میں مکہ کی صورتِ حال' مشرکینِ مکہ کی جنگی تیاریاں' ودیگر ضروری اطلاعات ومعلومات بہم پہنچایا کرتے...... جب انہیں مسلمانوں کی کسی کامیابی کے بارے میں علم ہوتا تو بہت خوش ہوتے، اور جب ان کی کسی ناکامی کی اطلاع ملتی تو انتہائی رنجیدہ وافسردہ ہوجایا کرتے...... اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا...... حتیٰ کہ سن آٹھ ہجری میں فتحِ مکہ سے کچھ قبل حضرت عباسؓ ہجرتِ مدینہ کی غرض سے مکہ شہر سے نکلے، اور مدینہ کی جانب روانہ ہوگئے، لیکن راستے میں مکہ شہر سے کچھ فاصلے پر ہی ان کی ملاقات رسول اللہ ﷺ سے ہوگئی' جو اس موقع پر اپنے دس ہزار جاں نثاروں کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب پیش قدمی فرمارہے تھے...... اور تب اس ملاقات کے موقع پر انہوں نے باقاعدہ طور پر اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کیا، اور آپ ﷺ کے لشکر میں شامل ہوکر اب واپس مکہ کی طرف گامزن ہوگئے۔

بعض مؤرخین کے بقول حضرت عباسؓ بہت پہلے ہی دینِ اسلام دل سے قبول کر چکے تھے...... تاہم اس چیز کو وہ چھپاتے تھے، البتہ اب فتحِ مکہ کے موقع پر جب مسلمانوں کو غلبہ نصیب ہوا تو انہوں نے اپنے قبولِ اسلام کا کھل کر اعلان کر دیا۔

فتحِ مکہ کے فوری بعد تاریخی ''غزوۂ حنین'' پیش آیا، مکہ سے تقریباً اسی کلومیٹر کے فاصلے پر واقع طائف شہر میں ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' نامی دو بڑے قبائل آباد تھے، انہیں جب مسلمانوں کے ہاتھوں فتحِ مکہ کی خبر موصول ہوئی تو یہ اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں مسلمان مکہ کے بعد اب ہمارے شہر طائف کی جانب متوجہ نہ ہوجائیں...... لہٰذا انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ قبل اس کے کہ ایسی نوبت آئے' ہمیں خود ہی مکہ پہنچ کر مسلمانوں پر حملہ کر دینا چاہئے، چنانچہ اس مقصد کیلئے چوبیس ہزار جنگجوؤں پر مشتمل ان کا لشکرِ جرار طائف سے مکہ کی جانب

روانہ ہوا۔

دوسری جانب رسول اللہ ﷺ کو مکہ میں جب یہ اطلاع ملی تو آپ ؐ نے بھی وہیں بیٹھ کران کا انتظار کرنے کی بجائے اپنے بارہ ہزار جاں نثاروں کے ہمراہ ان کی جانب کوچ کرنے کا فیصلہ فرمایا، چنانچہ مکہ اور طائف کے درمیان ''حُنین'' نامی مقام پر دونوں لشکروں کا آمنا سامنا ہوا۔ ایک تو دشمن کی تعداد مسلمانوں کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی، مزید یہ کہ انہوں نے ایک تنگ وتاریک پہاڑی درے میں بڑی تعداد میں تیرانداز بٹھا رکھے تھے، عام یلغار سے قبل یہ صورتِ حال پیش آئی کہ مسلمان جب وہاں سے گذرنے لگے تو ان چھپے ہوئے تیراندازوں نے مسلمانوں پر شدید تیراندازی شروع کردی، مسلمان اس اچانک اور بالکل ہی غیر متوقع حملے کی وجہ سے افراتفری کا شکار ہو گئے......اچانک تیروں کی بارش، نامعلوم اور انتہائی تنگ وتاریک پہاڑی راستے......لہٰذا ابتداء میں مسلمانوں کو بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا، ان کی صفوں میں نظم وضبط برقرار نہ رہا، آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ رابطہ بھی برقرار نہ رہ سکا......اور یوں وہ سب ایک دوسرے سے بے خبر ان انجان اور گمنام راستوں میں اِدھر اُدھر بکھر گئے......مزید یہ کہ اتنے بڑے پیمانے پر افراتفری اور بھاگ دوڑ کی وجہ سے گردوغبار کا ایسا طوفان اٹھا کہ دن میں رات کا گمان ہونے لگا، یہ چیز مزید سراسیمگی وبدحواسی کا سبب بنی......

ایسے میں جب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ محض گنتی کے چند افراد ہی رہ گئے تھے......ان میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جنہوں نے اس موقع پر آپ ؐ کی حفاظت وحمایت کی خاطر بے مثال جرأت اور بڑی استقامت کا مظاہرہ کیا، مزید یہ ان کی آواز قدرتی طور پر چونکہ کافی بلند تھی، لہٰذا اس موقع پر وہ بار بار بآوازِ بلند پکارتے رہے کہ ''مسلمانو! دیکھو

رسول اللہ ﷺ یہاں ہیں ......لہٰذا سب یہاں چلے آؤ'' ان کی اس پکار کی وجہ سے مسلمان دوبارہ وہاں یکجا ہوئے ، اپنی صفوں کو منظّم کیا، اور پھر ایسا زوردار حملہ کیا کہ دشمن کے پاؤں اکھڑ گئے......

غرضیکہ اس نازک ترین موقع پر حضرت عباس رضی اللہ عنہ کی یہ استقامت جہاں مسلمانوں کیلئے بڑی خیر وخوبی کا سبب بنی......وہیں اس سے ان کے اخلاص' نیز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی بے مثال محبت اور جذبۂ وفاء کی بھی خوب عکاسی ہوتی ہے......

اور پھر غزوۂ حنین کے فوری بعد پیش آنے والے غزوۂ طائف کے موقع پر' نیز ۹ھ میں تاریخی غزوۂ تبوک کے موقع پر حضرت عباس ؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ موجود تھے۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ ان کی بہت زیادہ عزت کیا کرتے تھے، اور فرمایا کرتے تھے: ھٰذا عَمّي و صِنوُ أبي (۱) یعنی'' یہ میرے چچا ہیں اور میرے لئے والد کی مانند ہیں''۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ بہت ہی سخی اور فیاض قسم کے انسان تھے، قبولِ اسلام کے بعد اس سخاوت وفیاضی میں مزید اضافہ ہوگیا تھا، فقراء ومساکین کی بہت زیادہ مدد واعانت کیا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ ان کے بارے میں فرمایا کرتے تھے: ھٰذا العَبّاس عَمُّ نَبِیِّکُم ، أجوَدُ قُرَیشٍ کَفّاً ، و أوصَلُھا (۲) یعنی'' یہ عباس ہیں، تمہارے نبی کے چچا تمام قبیلۂ قریش میں سب سے زیادہ سخی' اور سب سے بڑھ کر صلہ رحمی کرنے والے انسان''۔

غرضیکہ حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے بعد رسول اللہ ﷺ ہمیشہ ان کے ساتھ بہت ہی عزت واحترام سے پیش آتے رہے، اور یوں آپ ؐ کا مبارک

(۱) مجمع الزوائد ۲۷۳/۹ (۲) صحیح ابن حبان [۷۰۵۲] ج:۵۔ص:۵۲۸۔

دور گذر گیا۔

حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد آپؐ کے خلفائے راشدین کے دور میں بھی حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو اسی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا، خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان کی بہت زیادہ تعظیم وتکریم کیا کرتے، ان کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی بھی یہی کیفیت رہی، حتیٰ کہ اگر راستے میں کہیں آتے جاتے انہیں حضرت عباسؓ نظر آجاتے تو وہ ان کے احترام میں اپنی سواری سے نیچے اتر آتے اور پیدل چلنے لگتے......اور یوں کہا کرتے: ھٰذا عمّ النّبي ﷺ ۔ یعنی''یہ نبی ﷺ کے چچا محترم ہیں''مقصد یہ کہ نبی ﷺ کے چچا محترم اگر پیدل چل رہے ہیں...... ایسے میں' میں سواری پر ان کے قریب سے گذروں...... یہ مناسب نہیں۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے دورِ خلافت میں مشکل مواقع پر خود بکثرت دعاء ومناجات کے علاوہ اکثر وبیشتر حضرت عباس رضی اللہ عنہ سے بھی دعاء کروایا کرتے تھے، چنانچہ ایک بار جب سخت قحط پڑا، تب انہوں نے حضرت عباسؓ سے دعاء کیلئے کہا۔ جس پر حضرت عباسؓ نے خوب گڑگڑا کر اور نہایت دل سوزی کے ساتھ دعاء کی، اور پھر دعاء سے فراغت کے بعد جب مڑ کر حضرت عمرؓ کی جانب دیکھا......تو ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی بارش ہو رہی تھی......اور تب دیکھتے ہی دیکھتے آسمان سے بھی خوب بارش برسنے لگی، جس طرح ایک طرف حضرت عباسؓ کی آنکھوں سے لگاتار آنسوؤں کی برسات ہو رہی تھی...... بعینہٖ اسی طرح اب دوسری طرف آسمان سے بھی خوب پانی برسنے اور بہنے لگا تھا...... حالانکہ اس سے قبل وہاں مطلع بالکل صاف تھا، بارش کے قطعاً کوئی آثار نہیں تھے، بادلوں کا

کوئی نام ونشان تک نہیں تھا۔(۱)

اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا......آتے جاتے موسموں کا سفر جاری رہا......

آخر رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی‘ نیز آپؐ کے مشفق ومہربان چچا حضرت عباس بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ‘ خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران ۳۲ھ بروزِ جمعہ بیاسی سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے‘ اور اپنے اللہ سے جا ملے۔ تجہیز وتکفین کے موقع پر خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے، نمازِ جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھائی، اور پھر انہیں مدینہ منورہ کے قبرستان ’’بقیع‘‘ میں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔

(۱) حضرت عباسؓ سے دعاء کرانے کے اس واقعے کے حوالے سے یہاں یہ تنبیہ ضروری ہے کہ ’’وسیلہ‘‘ سے متعلق عام طور پر جو غلط عقائد پائے جاتے ہیں، ان کی بناء پر اس واقعہ سے کوئی غلط استدلال نہ کرے، کیونکہ جائز اور شرعی وسیلہ محض وہی ہے جو درجِ ذیل امور میں سے کسی پر مشتمل ہو:

(۱) اللہ سبحانہ وتعالیٰ کو خود اس کے اسماء وصفات کا وسیلہ دینا، مثلاً: رحمت کی طلب ہے تو یوں دعاء کرنا ’’یارحمٰن، یارحیم‘‘ مغفرت کی طلب ہے تو ’’ یاغفور، یاغفار‘‘ رزق کی طلب ہے تو ’’یارزاق‘‘ وغیرہ......

(۲) اپنے ایمان اور عملِ صالح کا وسیلہ، جیسا کہ ’’حدیثِ غار‘‘ کے نام سے معروف حدیث میں ان تین افراد میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے عملِ صالح کا تذکرہ کرتے ہوئے اس مصیبت سے نجات کیلئے اللہ سے دعاء وفریاد کی تھی، اور تب وہ چٹان وہاں سے سرک گئی تھی، اور وہ تینوں زندہ سلامت باہر نکل آئے تھے۔

(۳) کسی صالح، متقی وپرہیزگار انسان سے اس کی زندگی میں دعاء کروانا، جیسا کہ اس واقعہ میں یہی صورتِ حال ہے کہ حضرت عمرؓ نے قحط سے نجات کیلئے حضرت عباسؓ سے دعاء کروائی......واللہ الموفق والہادی الی سواء السبیل۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۴/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۶/نومبر ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ:

حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ کا تعلق مکہ شہر میں قبیلۂ قریش کے مشہور و معزز ترین خاندان ''بنوہاشم'' سے تھا، ان کی شکل وصورت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی تھی (۱) یہی وجہ تھی کہ رسول اللہ ﷺ انہیں مخاطب کر کے فرمایا کرتے تھے: أَشْبَهْتَ خَلْقِي وَ خُلُقِي (۲) یعنی ''آپ شکل وصورت میں بھی، نیز اخلاق وعادات میں بھی میرے مشابہ ہیں''

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے مشفق ومہربان چچا، خاندانِ بنوہاشم کے سردار، اور متولیِ کعبہ، یعنی جناب ابوطالب کے بیٹے تھے، آپ ﷺ کی عمر مبارک آٹھ برس تھی جب آپ ﷺ کے دادا محترم عبدالمطلب کا انتقال ہو گیا تھا، تب دادا کی وصیت کے مطابق آپ ﷺ ابوطالب کی کفالت میں آ گئے تھے (۳)

ابوطالب کے چار بیٹے تھے، طالب، عقیل، جعفر، اور علی، حضرت جعفرؓ حضرت علیؓ سے دس سال بڑے تھے، ظہورِ اسلام کے وقت حضرت علیؓ دس سال کے تھے، جبکہ حضرت جعفرؓ کی عمر

(۱) تین افراد ایسے تھے جن کی شکل وصورت میں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی تھی، اول: حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا بنت الرسول ﷺ۔ دوم: حضرت فاطمہ کے بڑے صاحبزادے حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما۔ سوم: حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۲) ترمذی [۳۷۶۵] باب مناقب جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ۔

(۳) رسول اللہ ﷺ کے دادا عبدالمطلب کے دس بیٹے تھے، جن میں سے دو یعنی حارث اور عبداللہ (آپ ﷺ کے والد گرامی) عبدالمطلب کی زندگی میں ہی وفات پا گئے تھے، باقی آٹھ تھے، عبدالمطلب نے اپنے ان آٹھ بیٹوں میں سے ابوطالب کو اپنے بعد اپنے یتیم پوتے (رسول اللہ ﷺ) کا سرپرست مقرر کیا تھا۔

اُس وقت بیس سال تھی۔

حضرت جعفر رضی اللہ عنہ جب بڑے ہوئے تو ان کی شادی مشہور صحابیہ حضرت اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا سے ہوئی (۱)

رسول اللہ ﷺ کے اعلانِ نبوت کے فوری بعد یہ دونوں میاں بیوی مسلمان ہو گئے تھے' لہٰذا یہ دونوں ''السابقین الأولین'' یعنی بھلائی میں سبھی لوگوں پر سبقت لے جانے والے ان عظیم ترین افراد میں سے تھے جنہوں نے بالکل ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا تھا کہ جب مسلمانوں کیلئے بہت ہی مظلومیت اور بے بسی و بے چارگی کا زمانہ چل رہا تھا......یہی وجہ ہے کہ ان حضرات کا بڑا مقام و مرتبہ ہے، ان کیلئے عظیم خوشخبریاں ہیں۔

قبولِ اسلام کے بعد تکالیف' مصائب و آلام' اور آزمائشوں کا دور شروع ہوا......دینِ اسلام کے اسی ابتدائی دور میں جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاء رسانیوں کا سلسلہ عروج پر تھا، تب نبوت کے پانچویں سال رسول اللہ ﷺ کے مشورے پر بہت سے مسلمان مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، انہی مہاجرینِ حبشہ میں یہ دونوں میاں بیوی بھی شامل تھے۔

مشرکینِ مکہ کو جب ان مظلوم و مجبور مسلمانوں کی مکہ سے خفیہ روانگی اور پھر حبشہ پہنچنے کی خبر ملی تو انہیں یہ بات بہت ناگوار گذری اور انہوں نے طیش میں آ کر اپنا ایک وفد حبشہ کی جانب روانہ کیا' تاکہ یہ وفد حبشہ پہنچ کر وہاں کے بادشاہ ''نجاشی'' سے ملاقات کرے، اور اسے ان

(۱) حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد حضرت اسماء بنت عمیس کی شادی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ ہوئی تھی، سن دس ہجری میں رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ حجۃ الوداع کیلئے مکہ کی جانب سفر کے موقع پر مدینہ شہر سے نکلتے ہی میقات ''ذوالحلیفہ'' میں ان دونوں کے بیٹے محمد کی پیدائش ہوئی تھی۔ اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد یہ حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے نکاح میں آ گئی تھیں۔

مسلمانوں کے خلاف ورغلانے کے بعد اس بات پر آمادہ کرے کہ وہ ان مسلمانوں کو دوبارہ ان (مشرکینِ مکہ) کے حوالے کر دے۔

آخر اس منصوبے کے تحت مشرکینِ مکہ کا ایک وفد ملکِ حبشہ جا پہنچا، اور بادشاہ سے ملاقات سے قبل اس کے درباریوں اور مشیروں سے متعدد ملاقاتیں کیں، ان کے ساتھ تعارف اور دوستی کے رشتے استوار کئے، اور پھر بطورِ رشوت قیمتی تحائف اور نذرانے بھی پیش کئے، یوں شاہی دربار میں پیش ہونے اور وہاں اپنی آمد کا مقصد بیان کرنے سے قبل ہی ان مکاروں اور شاطروں نے بادشاہ کے ان وزیروں اور مشیروں کو اپنی مٹھی میں کر لیا......!!

آخر ایک روز شاہی دربار میں پیش ہوئے، وہاں بھی بھاری نذرانے اور قیمتی تحائف پیش کرنے کے بعد اپنا مدعیٰ بیان کرتے ہوئے یوں گویا ہوئے:

''اے بادشاہ! ہمارے شہر کے چند سر پھرے اور فتنہ پرداز قسم کے لوگ اپنے آبائی دین سے برگشتہ ہو کر آپ کے ملک میں آ بسے ہیں، اے بادشاہ! اگر انہوں نے اپنے آباء واجداد کا دین چھوڑ کر آپ کا دین ہی اپنا لیا ہوتا تب بھی غنیمت تھا...... مگر انہوں نے تو ایک ایسا عجیب وغریب نیا دین ایجاد کر لیا ہے جسے سمجھنے سے ہم اور آپ دونوں ہی قاصر ہیں......

اے بادشاہ! جس طرح انہوں نے ہمارے شہر مکہ میں فتنہ پھیلایا ہے' یقیناً اسی طرح اب یہ آپ کے ملک میں بھی فتنہ اور خرابی ہی پھیلائیں گے، لہٰذا ہمارے بزرگوں اور دانشمندوں نے ہمیں آپ کی خدمت میں بھیجا ہے، تاکہ آپ انہیں ہمارے حوالے کر دیں...... اور ہم انہیں اپنے ہمراہ واپس مکہ لے جا سکیں......''

بادشاہ نے ان کی یہ بات سننے کے بعد اپنے درباریوں اور مشیروں کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھا، گویا وہ ان کی رائے جاننا چاہتا ہو...... اور تب...... رشوت بول اٹھی...... سبھی

درباریوں نے پرزورانداز میں مشرکینِ مکہ کی تائیداوران کے مطالبے کی حمایت کی ، اوراپنے بادشاہ کومسلمانوں کی طرف سے مزید بددل کرنے کیلئے تاکیدی انداز میں کہا کہ جواپنے آباؤاجداد کے دین کے ساتھ غداری کرسکتے ہیں......ان سے خیر کی کیا توقع کی جاسکتی ہے......؟

مشرکینِ مکہ اورپھران کے بعداپنے ان درباریوں کی گفتگوسننے کے بعد بادشاہ نے کہا: ''انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ پہلے ان مسلمانوں کی بات بھی سن لی جائے' اوراس کے بعدان کے بارے میں کوئی فیصلہ صادرکیا جائے''۔

چنانچہ مسلمانوں کووہاں دربارمیں طلب کیا گیا، بادشاہ نے ان سے دریافت کیا: ''یہ کون سا دین ہے کہ جس کی خاطر تم نے اپنے آباؤاجداد کے دین کوچھوڑ دیا ہے......اورپھر یہ کہ ہمارا دین بھی نہیں اپنایا......؟''

بادشاہ کی طرف سے اس سوال کے جواب میں ان حضرات صحابۂ کرام (رضوان اللہ علیہم اجمعین) میں سے حضرت جعفر بن ابی طالبؓ کھڑے ہوئے اوریوں سلسلۂ گفتگوکا آغاز کیا:

"أيّهَا المَلِك! كُنّا قوماً أهلَ جَاهِلِيّة ، نَعبُدُ الأصنَام ، وَ نَأتِي الفَوَاحِش ، وَ نَأكُلُ المَيتَة ، وَ نَقطَعُ الأرحَام ، وَ نُسِيءُ الجِوَار ، وَ يَأكُلُ القَوِيُّ مِنّا الضّعِيف ، فَكُنّا عَلىٰ ذٰلِكَ ، حَتّىٰ بَعَثَ اللّٰهُ اِلَينَا رَسُولاً مِنّا ، نَعرِفُ نَسَبَهُ وَ صِدقَهُ وَ أمَانَتَهُ وَ عِفَافَهُ ، فَدَعَانَا اِلىٰ اللّٰهِ لِنُوَحّدَهُ وَ نَعبُدَهُ ، وَنَخلَعَ مَا كُنّا نَعبُدُ نَحنُ وَ آبَاؤنَا مِن دُونِهٖ مِنَ الحِجَارَةِ وَالأوثَان ...... وَأمَرَنَا بِصِدقِ الحَدِيث ، وَأدَاءِ الأمَانَة ، وَصِلَةِ الرّحِم ، وَحُسنِ الجِوَارِ، وَالكَفّ عَنِ المَحَارِمِ وَ الدِّمَاء ، وَنَهَانَا عَنِ الفَوَاحِشِ،وَقَولِ الزّور، وَأكلِ

مَالِ اليَتِيم ، وَ قَذفِ المُحصَنَات ...... فَصَدّقنَاهُ وَ آمَنّا بِهٖ ...... فَعَدَا عَلَينَا قَومُنَا ، فَعَذّبُونَا ، وَ فَتَنُونَا عَن دِينِنَا ، لِيَرُدُّونَا اِلىٰ عِبَادَةِ الأوثَانِ مِن دُونِ اللّٰه...... فَلَمّا قَهَرُونَا ، وَ ظَلَمُونَا ، وَ حَالُوا بَينَنَا وَ بَينَ دِينِنَا ، خَرَجنَا اِلىٰ بِلَادكَ ، وَ اختَرنَاكَ عَلىٰ مَن سِوَاكَ ، وَ رَغِبنَا فِي جِوَارِكَ ، وَ رَجَونَا أن لَا نُظلَمَ عِندَكَ أيُّهَا المَلِك"۔

ترجمہ:''اے بادشاہ ! ہم جاہل تھے،ہم بتوں کی پوجا کیا کرتے تھے،بدکاری کیا کرتے تھے،ہم مردار کھاتے تھے،پڑوسیوں کے ساتھ برا سلوک کیا کرتے تھے،ہم میں سے جو طاقتور تھا وہ کمزور کو کھا جاتا تھا،ہم اسی کیفیت میں زندگی بسر کر رہے تھے کہ اس دوران اللہ نے ہم میں سے ایک ایسی ہستی کو نبی بنا کر ہماری جانب مبعوث فرمایا کہ جس کے حسب نسب' نجابت وشرافت' امانت ودیانت' نیز اس کی پاکیزہ زندگی سے ہم سب خوب واقف تھے،اس نے ہمیں ایک اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دی،اور اللہ کے سوا جن بتوں کی ہم اور ہمارے باپ دادا پوجا کرتے چلے آرہے تھے......ان کی پوجا سے باز رہنے کی تاکید کی، اس نے ہمیں راست بازی' امانت داری' صلہ رحمی' اور پڑوسیوں کے ساتھ حسنِ سلوک کا سبق سکھایا،خونریزی' بے حیائی' دروغ گوئی' یتیموں کا مال ہڑپ کر جانے' اور پاکدامن عورتوں پر بہتان لگانے سے ہمیں منع کیا،پس ہم نے اس کی تصدیق کی اور اس پر ایمان قبول کیا،جس پر ہماری قوم ہمارے درپے آزار ہوگئی،ہمیں ہر طرح ستایا' پریشان کیا' اور ہمیں اپنے دین سے برگشتہ کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، جب ان کا ظلم وستم حد سے تجاوز کر گیا تو اے بادشاہ ہم نے اپنے وطنِ عزیز کو خیر باد کہا،اور پناہ کی تلاش میں ہم آپ کے ملک میں چلے آئے، یہ امید لئے ہوئے کہ یہاں ہمارے ساتھ انصاف کیا جائے گا،اور یہ

کہ یہاں ہمارے ساتھ کوئی ظلم وزیادتی نہیں ہوگی......''۔

یہ تھا اس نبیؐ اُمّی کے مکتب کا فیض...... کہ ایک صحرانشیں......جس نے دنیا کی کسی درسگاہ میں کوئی تعلیم حاصل نہیں کی......جس کے پاس کوئی ڈگری نہیں...... جسے دنیا کے کسی شاہی دربار میں جانے کا کبھی اتفاق ہی نہیں ہوا......شاہی درباروں کے آداب سے یکسر ناواقف، سفارتی آداب سے مکمل بے خبر......مگر بادشاہ کے دریافت کرنے پر جو جواب دیا...... وہ کس قدر جامع، پُرمغز، مدلل، اوراثر انگیز تھا...... یقیناً یہ معلّمِ انسانیت رسول اکرم ﷺ کی پاکیزہ تربیت ہی کا فیضان تھا......!!

اس کے بعد نجاشی نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ سے کہا ''تمہارے نبی کی جانب اللہ کی طرف سے جو کلام نازل کیا گیا ہے، کیا اس میں سے کچھ تم مجھے سنا سکتے ہو؟ اس پر حضرت جعفرؓ نے سورۂ مریم کی ابتدائی چند آیات تلاوت کیں، جنہیں سن کر نجاشی زاروقطار رونے لگا، اس کی آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے جو اس کے رخساروں پر بہنے لگے......تب بے اختیار وہ بول اٹھا: اِنّ ھٰذا وَالّذي جَاءَ بِهٖ عِیسَیٰ لَیَخرُجُ مِن مِشکَاۃٍ وَاحِدَۃٍ یعنی ''بیشک یہ کلام اور وہ کلام جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے ہیں، دونوں ایک ہی چراغ سے نکلے ہوئے نور ہیں''۔

نجاشی حضرت جعفرؓ کی تقریر سے اور پھر ان کی زبانی سورۂ مریم کی تلاوت سے اس قدر متأثر ہوا کہ اس نے ان مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ کے حوالے کرنے سے صاف انکار کردیا اور مشرکینِ مکہ کے وفد کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا ''اللہ نے مجھے یہ سلطنت رشوت لے کر عنایت نہیں کی ...... پھر میں کسی سے رشوت کیوں لوں......؟'' اور پھر اس نے مشرکینِ مکہ کے اس وفد کو واپس لوٹ جانے کا حکم دیا۔

چنانچہ یہ تمام مسلمان اس کے بعد بدستور حبشہ میں ہی رہے، اور پھر نبوت کے تیرہویں سال جب ہجرتِ مدینہ کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمان مستقل طور پر مدینہ منتقل ہو گئے تب یہ مہاجرینِ حبشہ بھی رفتہ رفتہ وہاں سے مدینہ پہنچ گئے۔ البتہ حبشہ میں قیام کے دوران ایک بار کسی نے یہ غلط خبر اڑادی کہ تمام مشرکینِ مکہ اسلام قبول کر چکے ہیں، جس پر متعدد حضرات (جن میں حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نیز ان کی اہلیہ حضرت رقیہؓ بنت رسول ﷺ بھی شامل تھیں) حبشہ سے مکہ واپس آگئے، لیکن یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ یہ اطلاع غلط تھی، چنانچہ یہاں پہنچنے کے بعد انہیں ازسرِ نو مشرکینِ مکہ کی طرف سے اذیتوں اور مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑا...... اور پھر جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تب ان حضرات نے دوبارہ ہجرت کی، یعنی پہلے مکہ سے حبشہ کی جانب، اور پھر مکہ سے مدینہ کی جانب۔

جبکہ دیگر بہت سے مسلمان بدستور وہاں حبشہ میں ہی مقیم رہے، جن میں حضرت جعفر رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، اور پھر جب انہیں ہجرتِ مدینہ کے بارے میں اطلاع ملی تب یہ حضرات آہستہ آہستہ وہاں سے مدینہ کی جانب منتقل ہو گئے۔ حضرت جعفرؓ اپنے اہل وعیال سمیت کچھ عرصہ مزید وہیں حبشہ میں ہی رہے، آخر ۷ھ میں یہ وہاں سے مستقل نقل مکانی کرنے کے بعد مدینہ کی جانب عازمِ سفر ہوئے اور طویل مسافت طے کرتے ہوئے مدینہ آپہنچے۔

اتفاق سے یہ انہی دنوں کی بات ہے کہ جب ''فتحِ خیبر'' کے اہم ترین اور تاریخی واقعے کے فوری بعد رسول اللہ ﷺ کی اپنے جاں نثار ساتھیوں کے ہمراہ خیبر سے مدینہ واپسی ہوئی تھی، نہایت صبر آزما اور اعصاب شکن قسم کی جنگ کے بعد وہاں خیبر میں مسلمانوں کو بڑی

فتح نصیب ہوئی تھی، اس یادگار فتح کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ نیز آپؐ کے جاں نثار ساتھی انتہائی مسرور و شاداں تھے......

عین انہی دنوں رسول اللہ ﷺ کے یہ چچازاد بھائی حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بمع اہل وعیال حبشہ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے......تو آپ ﷺ گویا خوشی سے جھوم جھوم اٹھے......آپ ﷺ نے حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کا نہایت گرمجوشی کے ساتھ اور انتہائی والہانہ انداز میں استقبال کیا، اس موقع پر آپؐ بار بار یہ کلمات دہراتے رہے: مَـا أدرِي بِـأيِّهِمَا أنَا أشَدُّ فَرَحاً......أبِقُدُومِ جَعْفَر......أم بِفَتحِ خَيْبَر؟ یعنی ''مجھے نہیں معلوم کہ جعفر کی آمد کی وجہ سے میں زیادہ خوش ہوں......یا فتحِ خیبر کی وجہ سے؟''

آپؐ اور حضرت جعفرؓ کے دلوں میں باہم ایک دوسرے کیلئے جو محبت وقربت تھی، اور جو تعلقِ خاطر تھا......اسے سمجھنے اور جاننے کیلئے اس موقع پر آپؐ کی زبان مبارک سے ادا شدہ یہ کلمات بہت کافی ہیں۔

نبوت کا پانچواں سال چل رہا تھا جب حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ دیگر مسلمانوں کے ہمراہ مکہ سے ہجرت کر کے حبشہ کی جانب روانہ ہوئے تھے، اور پھر نبوت کے چودہویں سال ہجرتِ مدینہ کا واقعہ پیش آیا تھا، اور اب ۷ھ میں حضرت جعفرؓ کی حبشہ سے مدینہ آمد ہوئی تھی......یعنی رسول اللہ ﷺ نیز مدینہ میں موجود دیگر مسلمانوں کے ساتھ حضرت جعفرؓ کی تقریباً پندرہ یا سولہ سال کی مسلسل اور طویل جدائی کے بعد اب یہ ملاقات ہوئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ جس طرح حضرت جعفرؓ اور ان کے اہل وعیال اس ملاقات پر انتہائی شاداں وفرحان تھے......بعینہٖ اسی طرح خود رسول اللہ ﷺ نیز دیگر تمام مسلمان بھی اس موقع پر بہت زیادہ مسرور تھے۔

بالخصوص مدینہ میں مسلمانوں میں سے جو فقراء و مساکین تھے، وہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی آمد کی وجہ سے بہت زیادہ خوش تھے، کیونکہ ان کی مدینہ آمد کے فوری بعد ہی سبھی نے ان کے اس مزاج کو جان لیا کہ یہ تو بہت ہی سخی ٗ فیاض ٗ مہمان نواز ٗ اور مہربان قسم کے انسان ہیں، محتاجوں اور ضرورتمندوں کی مدد و اعانت کے معاملے میں خوب دریا دلی سے کام لیا کرتے ہیں...... چنانچہ ان کی اسی بے مثال خوبی کی وجہ سے اُن دنوں مدینہ میں وہ ''اَبوالمساکین'' یعنی ''غریب پرور'' کے لقب سے معروف ہو گئے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرمایا کرتے تھے: کَانَ أَخْیَرَ النّاسِ لِلمسکِینِ جَعفَرُبن أَبِي طَالب ، کَانَ یَنقَلِبُ بِنَا فَیُطعِمَنَا مَا کَانَ فِي بَیتِهٖ ، حَتّیٰ اِن کَانَ لَیُخرِجُ اِلَینَا العُکَّة الّتِي لَیسَ فِیهَا شَئ ، فَنَشُقُّهَا ، فَنَلعَقُ مَا فِیهَا......(۱)

یعنی ''ہم مساکین کیلئے تو جعفر بن ابی طالب بہت ہی اچھے انسان ثابت ہوئے تھے، وہ ہمیں اپنے گھر لے جایا کرتے ، جو کچھ کھانا میسر ہوتا وہ ہمیں کھلایا کرتے ، یہاں تک کہ جب کھانا ختم ہو جاتا تو وہ چمڑے کی خالی تھیلی لا کر ہمارے حوالے کر دیا کرتے [جس میں گھی رکھا جاتا تھا] ، ہم اس تھیلی کو پھاڑ دیا کرتے ، اور تب اس کی دیواروں میں لگا ہوا گھی بھی ہم چاٹ لیا کرتے تھے......''

یہ تھے وہ جذبات و احساسات......اور یہ تھا وہ خوشی کا سماں جو حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی مدینہ آمد کی وجہ سے وہاں چہار سو دکھائی دیا کرتا تھا......

(۱) بخاری [۳۷۰۸] باب مناقب جعفر بن ابی طالب الہاشمی ۔ یہ اس حدیث کا آخری حصہ ہے جس کی ابتداء اس طرح ہے: اِنّ النّاسَ کَانُوا یَقُولُونَ أکثَرَ أبُوهُرَیرَة ، وَاِنّي کُنتُ أَلزَمُ رَسُولَ اللّٰهِ ﷺ......

لیکن...... یہ خوشی دیر پا نہ رہ سکی...... خوشی کا سلسلہ بہت ہی مختصر ثابت ہوا...... حضرت جعفرؓ کی حبشہ سے مدینہ آمد ۷ھ میں ہوئی تھی، اس کے فوری بعد محض اگلے ہی سال ۸ھ کے اوائل میں ''غزوۂ مؤتہ'' کا عجیب وغریب واقعہ پیش آ گیا......

اس واقعے کا پس منظر کچھ اس طرح تھا کہ ۵ھ میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''صلحِ حدیبیہ'' کے نام سے جو مشہور تاریخی معاہدہ طے پایا تھا، اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ کی جانب سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تھی، تب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے اس مبارک سلسلے کو مزید وسعت دینے کا فیصلہ فرمایا تھا، اسی سلسلے میں ان دنوں مختلف فرمانرواؤں' حکمرانوں' امراء وسلاطین' اور والیانِ ریاست کو خطوط ارسال کئے گئے تھے' جن میں انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اسی سلسلے میں ''بُصریٰ'' (۱) کے فرمانروا کے نام رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تحریر فرمودہ نامۂ مبارک لئے ہوئے حارث بن عمیر الأزدی رضی اللہ عنہ جب مدینہ سے بُصریٰ کی

(۱)[اُلف] واضح ہو کہ یہ لفظ ''بصرہ'' نہیں' جو کہ عراق کا مشہور شہر ہے، بلکہ یہ ''بُصریٰ'' ہے جو کہ سلطنتِ روم کا ایک مشہور شہر اور بڑا تجارتی مرکز تھا، اب بھی اس کے آثار (ملکِ شام میں) بڑے پیمانے پر موجود ہیں۔
[ب] رسول اللہ ﷺ نے سلطنتِ روم کے بادشاہ ''ہرقل قیصرِ روم'' کے نام بھی اگرچہ دعوتی خط ارسال فرمایا تھا، جو کہ دِحیہ بن خلیفہ الکلبی رضی اللہ عنہ لے کر گئے تھے، تاہم اس کے علاوہ چونکہ سلطنتِ روم کے بہت ہی بڑے وسیع وعریض علاقے میں متعدد چھوٹی بڑی ریاستیں بھی تھیں، جو دراصل سلطنتِ روم ہی کے تابع تھیں، لیکن کسی حد تک انہیں بعض معاملات میں خودمختاری بھی حاصل تھی...... لہٰذا بعض ایسی ریاستوں کے فرمانرواؤں کے نام بھی دعوتی خطوط ارسال کئے گئے تھے، ایسا ہی ایک خط ''بُصریٰ'' کے فرمانروا کے نام تحریر کیا گیا تھا جو کہ اُس تک پہنچانے کی غرض سے حارث بن عمیر الأزدی رضی اللہ عنہ آپ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے مدینہ سے بُصریٰ کی جانب محوِ سفر تھے......۔

جانب محوِ سفر تھے...... تب راستے میں ملکِ شام کی حدود میں ''بلقاء'' نامی ریاست (جو کہ سلطنتِ روم کے تابع تھی) کے فرمانروا شرحبیل الغسانی نے انہیں روکا، تشدد کا نشانہ بنایا، اور پھر انتہائی سنگدلی و سفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑنے کے بعد انہیں قتل کر ڈالا......

رسول اللہ ﷺ کو جب اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ملی تو آپؐ انتہائی رنجیدہ وافسردہ ہو گئے، کیونکہ کسی نہتے اور بے قصور انسان کو...... بالخصوص غیر ملکی قاصد اور سفارتی نمائندے کو یوں ناحق قتل کر ڈالنا یقیناً بہت ہی بڑا جرم تھا، مزید یہ کہ یہ سفارتی آداب کی سنگین خلاف ورزی بھی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ انتہائی افسوسناک بلکہ المناک واقعہ پیش آنے پر یہ فیصلہ فرمایا کہ اب رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی ضروری ہو چکی ہے، چنانچہ تین ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر سلطنتِ روم کی جانب روانہ کیا گیا۔ آپؐ نے اس لشکر کا سپہ سالار اپنے جلیل القدر صحابی، زمانۂ قبل از بعثت میں اپنے منہ بولے بیٹے، اور اپنے آزاد کردہ غلام حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، اور یہ وصیت فرمائی کہ زید کے بعد سپہ سالاری کے فرائض جعفر بن ابی طالب انجام دیں گے، اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ (جو کہ انصارِ مدینہ میں سے تھے) انجام دیں گے، اور ان کے بعد تم باہم مشاورت کے بعد کسی کو اپنا سپہ سالار منتخب کر لینا (گویا رسول اللہ ﷺ کو من جانب اللہ خبر دے دی گئی تھی کہ اس موقع پر یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے شہید ہو جائیں گے......)(۱)

(۱) یہاں یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ زمانۂ قبل از اسلام میں تمام عرب معاشرہ نسلی وطبقاتی تقسیم اور اونچ نیچ کے شکنجے میں بہت بری طرح پھنسا ہوا تھا...... اس کے باقی ماندہ اثرات ظہورِ اسلام کے بعد ابتدائی دنوں میں بھی نمایاں تھے، یہی حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ ہی تھے جن کی حضرت زینب بنت جحش رضی اللہ عنہا کے ساتھ

اور پھر یہ لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مدینہ منورہ سے سوئے منزل رواں دواں ہوگیا......

طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب یہ مبارک لشکر جزیرۃ العرب اور سلطنتِ روم کے مابین سرحدی علاقے میں پہنچا تو وہاں ''مؤتہ'' نامی مقام پر (جو کہ رفتہ رفتہ تقسیم در تقسیم کے سلسلوں کے بعد اب موجودہ ''اُردن'' میں واقع ہے) جو صورتِ حال نظر آئی وہ نہایت خلافِ توقع اور انتہائی پریشان کُن تھی، کیونکہ وہاں منظر کچھ ایسا تھا کہ سامنے رومیوں کی ایک لاکھ فوج مقابلے کیلئے موجود تھی، مزید یہ کہ اس سرحدی علاقے میں آباد بہت سے عرب قبائل (غسان وغیرہ) جو کہ دینی' معاشی' وسیاسی طور پر سلطنتِ روم ہی کے تابع تھے'

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

شادی کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی طبقاتی تقسیم تھی......اسلام نے اس طبقاتی ونسلی تقسیم وتفریق کا خاتمہ کیا، دنیا کو مساوات کا سبق سکھایا......''فضیلت'' کا معیار صرف اور صرف ''تقویٰ'' کو قرار دیا گیا......دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی اسی ''تعلیمِ مساوات'' کی جھلک یہاں غزوۂ مؤتہ کے حوالے سے اس واقعے میں بھی نمایاں نظر آتی ہے......کہ......حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ دراصل مکہ شہر کے باشندے نہیں تھے کسی دوسرے علاقے سے قیدی اور پھر غلام بنا کر لائے گئے تھے، نہ ہی قبیلۂ قریش سے ان کا تعلق تھا، مزید یہ کہ ایک عرصے تک غلام بھی رہ چکے تھے، آخر رسول اللہ ﷺ نے انہیں آزاد کر دیا تھا......جبکہ حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ مکی تھے، قرشی تھے، ہاشمی تھے، رسول اللہ ﷺ کے چچازاد تھے......معاشی طور پر کافی خوشحال بھی تھے......لیکن اس سب کچھ کے باوجود رسول اللہ ﷺ نے اس غزوہ کے موقع پر لشکر میں ان کی موجودگی کے باوجود......ان کی بجائے اپنے آزاد کردہ غلام یعنی حضرت زید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر فرمایا (حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحہ [۳۶۳] پر ملاحظہ ہو)۔

آپؐ کے اس عمل میں اسلام کی تعلیمِ مساوات کی اس جھلک کے ساتھ ساتھ دوسری جانب یہ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے اخلاص' ایمانی کیفیت' اور اللہ ورسول ﷺ کے ہر حکم اور ہر فیصلے کے سامنے بلا چون وچرا سرِ تسلیم خم کر دینے کے مبارک جذبے کا واضح ثبوت بھی ہے۔

ان کے ایک لاکھ جنگجو بھی یہاں رومی فوج کے شانہ بشانہ موجود تھے......یعنی صورتِ حال یہ بنی کہ ایک طرف مسلمان محض تین ہزار......جبکہ دوسری جانب ان کے بالمقابل دولاکھ مسلح اور چاق وچوبند جنگجوؤں پر مشتمل بہت بڑا لشکرِ جرار......

اس خلافِ توقع صورتِ حال کی وجہ سے مسلمان کچھ تردد کا شکار ہوگئے ، دوروز تک باہم مشاورت کا سلسلہ چلتا رہا، کسی نے کہا ''ہمیں اب مزید پیش قدمی کی بجائے یہیں رک کر رسول اللہ ﷺ کو اس صورتِ حال سے مطلع کرنا چاہئے اور آپ ؐ کی طرف سے اس بارے میں کسی فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے'' کسی نے کہا ''ہمیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجنا چاہئے کہ مزید دستے ارسال کئے جائیں'' اسی دوران حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن انداز میں مشورہ دیتے ہوئے کہا ''ہمارے لئے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، ہمارے سامنے تو دونوں ہی صورتوں میں کامیابی ہی کامیابی ہے...... یا شہادت......یا فتح......لہٰذا اس تمام تر تردد کی کیا ضرورت ہے؟''

چنانچہ سبھی نے اس مشورے کو قبول کیا، اور اس پر عمل کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدمی شروع کی......فریقین میں کوئی توازن ہی نہیں تھا......ایک طرف فقط تین ہزار مسلمان ، اور وہ بھی گھر سے بے گھر، وطن سے بہت دور، یہاں دشمن کی سرزمین پر......جبکہ دوسری جانب دولاکھ جنگجو......خود اپنی ہی سرزمین پر اور اپنے ہی علاقے میں......مگر اس کے باوجود دونوں جانب سے نہایت زوردار یلغار ہوئی......زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نہایت بے جگری کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوگئے......تب رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قیادت سنبھالی، بے مثال شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دور اندر تک چلے گئے......آخر ایک

موقع ایسا آیا کہ وہ اپنے گھوڑے سے نیچے اتر آئے، اور پیدل ہی مسلسل مردانہ وار لڑتے رہے، حتیٰ کہ اس دوران ان کا ایک بازو کٹ کر جسم سے الگ ہوگیا...... پھر دوسرا بازو بھی کٹ کر الگ ہوگیا...... لیکن اس کے باوجود آخری سانس تک مسلسل ثابت قدم رہے...... اور پھر...... بالآخر...... اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر لڑتے ہوئے وہاں ''مؤتہ'' کے میدان میں شہید ہوگئے......(۱) بوقتِ شہادت ان کی عمر اکتالیس سال تھی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما جو کہ غزوۂ مؤتہ کے موقع پر اسلامی لشکر میں موجود تھے، فرماتے ہیں کہ شہداء کے درمیان ہم نے جعفر کو تلاش کیا، اور جب وہ ملے تو کیفیت یہ نظر آئی کہ...... وَجَدنَا فِي جَسَدِهِ بِضعاً وتِسعِينَ مِن طَعنَةٍ وَرَميَةٍ یعنی ''ہمیں ان کے جسم پر تلواروں، نیزوں، اور تیروں کے نوے سے زائد زخم نظر آئے'' (۲)

اُدھر مدینہ میں (لشکر کی واپسی سے قبل) جب ان تینوں (حضرت زید بن حارثہ، حضرت

(۱) حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے قیادت سنبھالی تھی، اور بڑی ہی دلیری کے ساتھ لڑتے ہوئے وہ بھی شہید ہوگئے تھے...... اور پھر لشکر میں فوری طور پر باہمی مشاورت کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالاری سونپی گئی تھی، جو کہ محض کچھ عرصہ قبل ہی مسلمان ہوئے تھے، فنونِ سپہ گری، شہسواری، شجاعت و بہادری، فنونِ حرب، اور جنگی تدبیروں میں انہیں بے مثال مہارت حاصل تھی...... قبولِ اسلام سے پہلے وہ ہمیشہ مسلمانوں کے خلاف لڑتے رہے تھے...... اور اب قبولِ اسلام کے بعد اسلامی لشکر میں شامل ہو کر جنگ لڑنے کا ان کا یہ پہلا موقع تھا...... لیکن یہ موقع انہیں اس قدر نازک ترین صورتِ حال میں ملا کہ جب اسلامی لشکر بہت بڑی مشکل میں گرفتار تھا...... ایسی صورتِ حال میں انہوں نے قیادت سنبھالنے کے بعد دشمن پر حملے جاری رکھنے کی بجائے جنگی تدبیروں اور حیلوں پر زیادہ توجہ دی...... اور انہی تدبیروں کی بدولت وہ تمام لشکر کو اس طرح مناسب اور منظّم طریقے سے وہاں سے نکال لانے میں کامیاب ہوگئے کہ دشمن کو اس وقت یہ اندازہ ہی نہ ہو سکا کہ مسلمان اب مستقل طور پر یہاں سے واپس جا رہے ہیں......

(۲) بخاری [۴۲۶۱] کتاب المغازی، باب غزوۃ مؤتہ من أرض الشام۔

جعفر بن ابی طالب، حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہم اجمعین) کی شہادت کی خبر پہنچی تو رسول اللہ ﷺ تعزیت کی غرض سے ان تینوں کے گھر تشریف لے گئے، اس موقع پر جب آپؐ حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے تو جو صورتِ حال پیش آئی اس کے بارے میں حضرت جعفرؓ کی اہلیہ محترمہ حضرت اسماء بنت عمیسؓ فرماتی ہیں:

''مجھے اطلاع ملی تھی کہ لشکر کی کسی بھی وقت مدینہ کی طرف واپسی متوقع ہے، لہٰذا میں جعفر کے استقبال کیلئے تیاریوں میں مشغول تھی، ایک روز میں گھر میں صفائی ستھرائی کر رہی تھی کہ اس دوران غیر متوقع طور پر رسول اللہ ﷺ ہمارے گھر تشریف لائے، اُس وقت آپؐ کے چہرے پر انتہائی غم اور اداسی کے آثار تھے، جس کی وجہ سے میں بہت زیادہ سہم گئی اور بڑی پریشانی کا شکار ہوگئی، لیکن میں نے اس خوف کی وجہ سے آپؐ سے کچھ پوچھا نہیں کہ کہیں ایسا نہو کہ میرے پوچھنے پر آپؐ مجھے جعفر کے بارے میں کوئی ایسی خبر سنا دیں جسے سننے کی مجھ میں ہمت اور سکت ہی نہو...... آپؐ اسی طرح کچھ دیر خاموش بیٹھے رہے...... اور پھر آپؐ نے میری طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ''اسماء...... جعفر کے بچوں کو ذرہ میرے پاس لاؤ'' میں نے بچوں کو آواز دی، تب سبھی بچے نہایت ہنسی خوشی دوڑتے ہوئے چلے آئے، خوب ہنستے مسکراتے ہوئے اور معصوم پرندوں کی طرح چہچہاتے ہوئے آپؐ سے لپٹنے لگے، ہر کوئی آپؐ کی گود میں بیٹھنے کیلئے مچلنے لگا...... رسول اللہ ﷺ نے ان بچوں کو پیار کیا، شفقت سے ان کے سر پر ہاتھ پھیرا، اور پھر آپؐ کی آنکھوں سے زار و قطار آنسو بہنے لگے...... آپؐ جو ابتک صبر کا پہاڑ بنے ہوئے تھے، اب آپؐ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونے لگا، درد اور غم کا وہ طوفان جو آپؐ کے دل میں برپا تھا...... اب وہ آنکھوں کے راستے چھلکنے لگا...... تب میں بہت زیادہ خوفزدہ ہوگئی...... مجھ پر شدید لرزہ طاری ہوگیا...... آخر میں نے

ڈرتے ڈرتے عرض کیا: يَا رَسُولَ اللّه، بِأبِي أنتَ وَأُمِّي، مَا يُبْكِيكَ؟ أبَلَغَكَ عَن جَعْفَر وَصَاحِبَيهِ شَيءٌ؟ یعنی ''اے اللہ کے رسول، آپ پر میرے ماں باپ قربان، آپ کیوں رو رہے ہیں؟ کیا آپ کو جعفر اور ان کے دونوں ساتھیوں (یعنی زید بن حارثہ اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہما) کے بارے میں کوئی خبر موصول ہوئی ہے؟'' آپؐ نے جواب میں فرمایا: نَعَم، لَقَد اُستُشهِدُوا...... یعنی ''ہاں، وہ شہید ہو چکے ہیں......'' بس اتنا کہنے کے بعد آپؐ اپنی جگہ سے اٹھے، اور اپنی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے، چپ چاپ، بوجھل قدموں کے ساتھ واپس روانہ ہو گئے......''

یہ ہے اس عظیم انسان کی پاکیزہ داستان......وہ عظیم انسان جس کے تصور سے ہی دل اس کیلئے عقیدت ومحبت کے جذبات سے لبریز ہونے لگتا ہے......وہ عظیم انسان جس کا نام سرفروشوں کی داستان میں ہمیشہ نمایاں رہے گا......اور وہ نام ہے ''جعفر بن ابی طالب'' رضی اللہ عنہ۔(۱)

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔

---

(۱) حضرت جعفر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے چند روز بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: رَأيتُ جَعفَراً يَطِيرُ فِي الجَنَّةِ مَعَ المَلَائِكَةِ (ترمذی: ۳۷۶۳) یعنی ''میں نے جعفر کو جنت میں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے ہوئے دیکھا ہے'' یعنی چونکہ غزوۂ مؤتہ کے موقع پر یکے بعد دیگرے ان کے دونوں بازو کٹ کر جسم سے جدا ہو گئے تھے، لہٰذا ان کٹے ہوئے بازوؤں کے عوض اللہ نے انہیں جنت میں پر عطاء فرمائے ہیں، جن کے ذریعے وہ وہاں فرشتوں کے ساتھ اُڑتے پھرتے ہیں۔ اور یہ منظر خواب میں رسول اللہ ﷺ کو دکھایا گیا، اسی وجہ سے وہ ''جعفر طیار'' کے لقب سے معروف ہو گئے۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۸/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۳۰/نومبر ۲۰۱۴ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت صُہیب بن سِنان رومی رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے والدین کا تعلق دراصل ملکِ یمن سے تھا، اُس زمانے میں ملکِ یمن روئے زمین کی عظیم قوت ''سلطنتِ فارس'' کے تابع تھا، حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی پیدائش سے قبل (زمانۂ قبل از اسلام میں) ان کا باپ سِنان بن مالک النُمیر ی سلطنتِ فارس کی طرف سے ملکِ یمن میں کسی بڑے سرکاری عہدے پر فائز تھا، سرکاری ملازم کی حیثیت سے وقتاً فوقتاً اس کا تبادلہ مختلف مقامات کی جانب ہوتا رہتا تھا۔ اسی طرح ایک بار سلطنتِ فارس کے بادشاہ کسریٰ نے ''اَلْاُبُلّہ'' نامی ایک مقام کے گورنر کی حیثیت سے اس کی تقرری کی، اور اسے وہاں پہنچنے کی ہدایت کی، یہ مقام موجودہ شہر ''موصل'' (عراق کا مشہور شہر جو کہ ترکی کی سرحد سے متصل ہے، جہاں کُرد باشندوں کی اکثریت ہے) کے قرب وجوار میں کہیں واقع تھا۔

چنانچہ اس حکم کی تعمیل میں سنان بن مالک النُمیر ی اپنی بیوی سلمیٰ سمیت وہاں منتقل ہوگیا، اور اس علاقے کے گورنر کی حیثیت سے نئی زندگی کا آغاز کیا، اور یوں اس نئے مقام پر زندگی کا سفر رواں دواں ہوگیا۔

کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ ان دونوں کے یہاں ایک بیٹے کی پیدائش ہوئی، جس کا نام انہوں نے ''صہیب'' رکھا، گذرتے ہوئے وقت کے ساتھ...... وہاں اس شاہی محل میں بہت ہی نازونِعَم اور شاہی شان وشوکت سے بھرپور اس ماحول میں اس بچے کی پرورش ہوتی رہی، گورنر کا لاڈلا بیٹا اور نورِ نظر ہونے کے علاوہ مزید خاص بات یہ کہ یہ بچہ خوبصورت بھی بہت

تھا، کِھلا ہوا چہرہ، بھورے بال، آنکھوں سے جھانکتی ہوئی ذہانت وفطانت، رفتار وگفتار سے جھلکتی ہوئی خاندانی شرافت ونجابت......کچھ ایسی کیفیت لئے ہوئے یہ بچہ پروان چڑھ رہا تھا......

یہ علاقہ اُس دور میں روئے زمین کی دو عظیم ترین قوتوں یعنی ''سلطنتِ فارس'' اور ''سلطنتِ روم'' کے مابین سرحدی علاقہ تصور کیا جاتا تھا، یعنی اگر چہ یہ سلطنتِ فارس کا حصہ تھا، لیکن سلطنتِ روم کی سرحد سے بالکل متصل تھا، یہی وجہ تھی کہ یہاں اکثر دونوں سلطنتوں کے سرحدی فوجی دستوں کے مابین آئے دن جھڑپوں کا سلسلہ چلتا رہتا تھا۔

ایک روز اس بچے ''صہیب'' کی ماں ''سلمیٰ'' اپنی چند سہیلیوں، اورخدم وحشم، نیز سرکاری محافظوں کے ایک دستے کی معیت میں اپنے اس لختِ جگر کو ہمراہ لئے ہوئے سیر وتفریح کی غرض سے اپنے شاہی محل سے قریب ہی کسی تفریحی مقام پر گئی، اتفاقاً عین اس وقت سرحد کے اُس پار سے رومی فوج کا ایک دستہ گھس آیا، سلمیٰ کے محافظوں اوران رومیوں کے مابین جھڑپ ہوئی، جس کے دوران رومیوں نے ان کا بہت سا مال واسباب اور زیورات لوٹے، سرکاری محافظوں میں سے کچھ کو قتل کیا، اور دیگر کچھ کو قیدی بنا کر اپنے ہمراہ ہنکا لے گئے......انہی قیدیوں میں یہ کم سن بچہ ''صہیب'' بھی شامل تھا، اس بچے کی ماں بس دیکھتے ہی رہ گئی، اوراس کے بعد کبھی زندگی بھر ملاقات نہو سکی......

اس کے بعد اس بچے کو دیگر قیدیوں کی طرح وہاں سلطنتِ روم میں ''غلاموں کی خرید وفروخت'' کے بازار میں فروخت کر دیا گیا، جہاں یہ بچہ مرورِ زمانہ کے ساتھ مسلسل ایک آقا سے دوسرے آقا کے ہاتھ بکتا بکا تا رہا......سالہا سال تک غلامی کی اس زنجیر میں جکڑا ہوا، چپ چاپ......مختلف آقاؤں کی خدمت بجالاتا رہا......

یہ وہ زمانہ تھا جب ''سلطنتِ روم'' کا سورج پوری آب وتاب کے ساتھ چمک رہا تھا، رومیوں کی قسمت انتہائی عروج پر تھی، ہر طرف خوشحالی کا اور مال ودولت کا سیلاب تھا، حدِ نگاہ تک دلفریب نظارے تھے، چہارسو بڑے بڑے محلات تھے، خوبصورت حویلیاں تھیں...... ہر محل میں...... ہر حویلی میں...... غلاموں' خادموں' اور کنیزوں کا فوج درفوج ایک بہت بڑا سلسلہ آباد تھا......

اس بچے نے اس ماحول میں' ان حویلیوں میں' لڑکپن اور پھر نوجوانی کا زمانہ گذارا، اور اس معاشرے کی ظاہری خوبصورتی کے پیچھے پوشیدہ جو اصل بھیانک چہرہ تھا، ظاہری چمک دمک کے پیچھے جن اندھیروں نے بسیرا ڈال رکھا تھا، ظاہری شرافت کے پیچھے عیاری ومکاری اور ظلم وستم کا جو بازار گرم تھا، ظاہری مسکراہٹوں کے پیچھے قلب وجگر کو جھلسا دینے والا آہوں اور سسکیوں کا جو ایک لامتناہی سلسلہ تھا...... یہ سب کچھ اس نوجوان نے وہاں حقیقت کی دنیا میں کھلی آنکھوں کے ساتھ نہایت قریب سے دیکھا......

یہ نوجوان یعنی ''صہیب'' بہت کم سنی سے ہی اس معاشرے میں رہنے کی وجہ سے اپنی اصل زبان یعنی ''عربی'' کافی حد تک بھولتا چلا گیا، اور اس کی جگہ خودبخود ''رومی'' زبان اور اس رومی معاشرے کے طور طریقے اس کی زندگی کا حصہ بنتے چلے گئے، البتہ ان ظاہری تبدیلیوں کے باوجود لمحہ بھر کیلئے بھی یہ بات اس کے ذہن سے نکل نہیں سکی کہ وہ دراصل ایک عرب ہے...... صحرانشین...... اس کے دل میں ہمہ وقت اس غلامی سے نجات کا' اور پھر اپنے وطن اور ہموطنوں سے جا ملنے کا شوق اور جذبہ تازہ رہتا تھا......

ایک روز یہ نوجوان ''صہیب'' اپنے آقا کے ہمراہ کسی تقریب میں شریک تھا، وہاں اس نے کسی ''کاہن'' کی گفتگو سنی جو یوں کہہ رہا تھا ''بیشک اب وہ وقت آ پہنچا ہے کہ کسی بھی روز

جزیرۃ العرب کے شہر مکہ میں آخری نبی کے ظہور کی خبر آ جائے...... جو کہ عیسیٰ بن مریم (علیہ السلام) کی تصدیق کریں گے، لوگوں کو جہالت کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی کی طرف لے جائیں گے''۔

اس کاہن کی زبانی یہ بات سن کر یہ نوجوان انتہائی حیرت زدہ رہ گیا، نیز یہ کہ اس حیرت کے ساتھ ساتھ اب اس کے دل میں اپنے وطن کیلئے شوق' نیز اس رومی معاشرے سے نجات کی تمنا مزید تقویت پکڑنے لگی، اور اب وہ ہمیشہ اس کوشش میں رہنے لگا کہ کسی طرح یہاں سے نکلنے کا کوئی موقع ہاتھ آ جائے......

آخر ایک روز اسے وہاں سے بھاگ نکلنے کا موقع مل ہی گیا، اور تب یہ نوجوان ملکِ شام سے مسلسل سفر کرتا ہوا...... بہت طویل مسافت طے کرنے کے بعد مکہ جا پہنچا...... کیونکہ اُس زمانے میں شہر مکہ ہی عربوں کا اصل گڑھ اور مرکزی علاقہ تصور کیا جاتا تھا...... اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس راہب نے نبیٔ آخر الزمان (ﷺ) کا تذکرہ کرتے ہوئے یہی کہا تھا کہ ان کا ظہور اب کسی بھی وقت ''مکہ'' میں متوقع ہے۔

یہ نوجوان ''صہیب'' جب مکہ پہنچا تو کیفیت یہ تھی کہ اس کی عربی زبان کافی شکستہ اور کمزور تھی، لہٰذا ابتداء میں یہ رومی زبان ہی بولا کرتا تھا، نیز یہ کہ اس کے بال بھی بھورے تھے، رنگت کافی صاف تھی، شکل و شباہت اور وضع قطع میں رومیوں کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت تھی...... لہٰذا مکہ میں سبھی لوگ اسے ''صہیب رومی'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

مکہ میں وقت گذرتا رہا...... مختلف لوگوں کے ساتھ تعارف اور میل جول کے بعد آخر مکہ میں ''عبداللہ بن جُدعان'' نامی ایک معروف شخصیت اور بڑے مشہور تاجر سے تعارف ہوا، جو کہ اس نوجوان کی شخصیت اور صلاحیت و قابلیت سے کافی متأثر ہوا، اور پھر اس نے اپنے

تجارتی معاملات کی دیکھ بھال کی غرض سے اس نوجوان کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا، جس کے بعد وہ اس نوجوان یعنی صہیب رومی کی ذہنی استعداد اور فہم وفراست سے مسلسل متأثر ہوتا چلا گیا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ صہیب کی امانت ودیانت کو دیکھ کر اس کا دل باغ باغ ہو جایا کرتا تھا......تب اس نے صہیب کو طے شدہ تنخواہ کے علاوہ مزید کمیشن کی بھی پیشکش کی، تاکہ یوں یہ نوجوان طے شدہ کام کے علاوہ الگ سے بھی اس کی تجارت کے فروغ کیلئے جدوجہد کرتا رہے......صہیب نے اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے مزید ہمت اور دلجمعی کے ساتھ کام شروع کر دیا......جس کا نتیجہ بہت جلد یہ ظاہر ہوا کہ اس شخص کی تجارت کافی وسیع ہوتی چلی گئی، اور اس کے ساتھ ہی مسلسل کمیشن ملنے کی وجہ سے ''صہیب رومی'' نامی یہ نوجوان بھی کافی خوشحال اور مال دار ہوتا چلا گیا......

لیکن کسبِ معاش کی خاطر ان تمامتر مصروفیات اور بڑے پیمانے پر تجارتی سرگرمیوں کے باوجود اس نوجوان کے دل کی گہرائیوں میں ابتک کاہن کے وہی الفاظ پیوست تھے......اور اس کے کانوں میں وہی الفاظ ہمہ وقت گونجتے رہتے تھے کہ ''آخری نبی کا ظہور مکہ میں کسی بھی وقت متوقع ہے'' اور تب......وہ اس سوچ میں پڑ جاتا کہ نہ جانے کب وہ خوشخبری ملے گی......؟ شب وروز کی تجارتی مصروفیات اور کاروباری معاملات کے باوجود یہی سوال ذہن میں گردش کرتا رہتا تھا......کہ ''نہ جانے کب......؟''

اور آخر جلد ہی اس نوجوان کو اپنے اس سوال کا جواب بھی مل گیا......ایک بار جب تجارتی سفر پر یہ نوجوان مکہ سے باہر کہیں گیا ہوا تھا، اور پھر چندروز بعد جب اس سفر سے واپسی ہوئی تو مکہ شہر میں داخل ہوتے ہی اپنے کسی آشنا سے ملاقات ہوئی، اِدھر اُدھر کی گفتگو کے بعد اس نے یہ خبر سنائی کہ ''محمد بن عبداللہ (ﷺ) نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے، اور یہ کہ لوگوں

کو وہ صرف اللہ کی عبادت کی طرف دعوت دے رہے ہیں......‘‘ تب صہیب نے اس شخص سے دریافت کیا: ’’کیا یہ وہی شخص نہیں جنہیں سبھی لوگ ’’امین‘‘ کے لقب سے پکارا کرتے ہیں؟‘‘ اس نے جواب دیا: ’’ہاں، یہ وہی شخص ہیں‘‘ صہیب نے پوچھا ’’ان سے ملاقات کہاں ہو سکے گی؟‘‘ اس شخص نے جواب دیا ’’صفا کے قریب دارالأرقم میں‘‘۔

اور پھر اس شخص نے جب یہ محسوس کیا کہ یہ نوجوان یعنی صہیب تو گویا رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کا خواہشمند ہے اور یہ ان کی تعلیمات میں شاید دلچسپی رکھتا ہے‘ تب اس نے اسے تنبیہ کرتے ہوئے کہا ’’خبردار! تمہیں کوئی وہاں جاتے ہوئے نہ دیکھ لے، ورنہ تمہارے ساتھ بہت برا ہوگا، کیونکہ تم پردیسی ہو، یہاں اس شہر مکہ میں تم اجنبی ہو، یہاں نہ تمہاری کوئی قوم ہے، نہ قبیلہ ہے، اور نہ برادری......لہٰذا مشکل وقت میں کون تمہارا ساتھ دے گا؟ کون تمہاری حفاظت کرے گا؟‘‘

لیکن صہیب کا گوہرِ مقصود تو یہی تھا......منزل سامنے نظر آنے لگی تھی......البتہ یہ معاملہ انتہائی نازک اور خطرناک تھا......آخر ہمت کر کے صہیب دارالأرقم کی طرف روانہ ہو گئے، تمام راستے اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے......پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے......رؤسائے قریش کی نگاہوں سے بچتے بچاتے......

اسی کیفیت میں صہیب جب دارالأرقم کے قریب پہنچے تو وہاں اپنے ایک دوست عمار بن یاسر (رضی اللہ عنہ) (۱) سے ملاقات ہو گئی، رسمی گفتگو کے بعد کچھ دیر دونوں خاموش رہے، پھر صہیب نے دریافت کیا ’’عمار! تم یہاں کیا کر رہے ہو؟‘‘

عمار نے جواب دیا ’’پہلے تم بتاؤ، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟‘‘

(۱) حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات (۲۵۲-۲۶۰) میں ملاحظہ ہو۔

صہیب نے ہمت کر کے کہا ''میں تو اس لئے یہاں آیا ہوں کہ یہاں اس گھر میں موجود شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) سے ملاقات کر سکوں اور ان کی گفتگو سن سکوں''

تب عمار کے چہرے پر مسکراہٹ دوڑ گئی......اور بیساختہ انہوں نے صہیب سے کہا ''چلو آؤ، ہم ایک ساتھ ہی اندر چلتے ہیں''۔

تب یہ دونوں خوش نصیب دوست ایک ساتھ اندر داخل ہوئے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت اقدس میں حاضری کا اور ملاقات کا شرف نصیب ہوا، آپؐ کی مبارک اور پاکیزہ گفتگو سنی، اور تب فوراً ہی ان دونوں کے دل ایمان کے نور سے منور ہونے لگے، دل کی دنیا میں ایمان کی بہار آنے لگی......اور پھر ان دونوں نے اپنی زبان سے کلمۂ حق ''اشہدأن لا الٰہ الا اللہ، واشہدأن محمداً رسول اللہ'' پڑھتے ہوئے' دینِ اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

اس کے بعد ان دونوں دوستوں نے وہ تمام دن وہاں کوہِ صفا کے قریب دارالأرقم میں رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت میں ہی گذارا، اور پھر غروبِ آفتاب کے بعد جب ہر طرف رات کا اندھیرا چھا گیا......تب اس اندھیرے کا فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ دونوں چھپتے چھپاتے ان تاریک راستوں پر چل پڑے......وہ راستے تاریک تھے......البتہ اب ان کے دلوں میں ایمان کی ایسی شمع روشن ہو چکی تھی، جو اس تمام کائنات کو روشن کر دینے کیلئے بہت کافی تھی۔

اور پھر جب رؤسائے قریش کو اس پردیسی نوجوان ''حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ'' کے قبولِ اسلام کی خبر ہوئی تو انہوں نے انہیں اس قدر اذیتیں پہنچائیں اور ایسے بدترین ظلم و ستم کا نشانہ بنایا کہ جس کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جائیں......دلوں پر لرزہ طاری ہو جائے......

اسی کیفیت میں مکہ میں وقت گذرتا رہا......آخر رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد جب تیرہواں سال چل رہا تھا، تب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا، دیگر تمام اہلِ ایمان کی طرح حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے بھی ہجرت کا ارادہ کیا......لیکن رؤسائے قریش نے انہیں سخت تنبیہ کی، اور ہجرت سے باز رہنے کا حکم دیا، باقاعدہ ان پر سخت پہرے بٹھادیئے گئے اور کڑی نگرانی شروع کردی گئی (کیونکہ ان رؤسائے قریش کی نظر اس مال پر تھی جو حضرت صہیبؓ نے مکہ میں رہتے ہوئے اپنی محنت اور تجارت سے کمایا تھا)۔

اب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے شب و روز اسی اسیری میں بسر ہونے لگے......رفتہ رفتہ تمام مسلمان ......اور پھر خود رسول اللہ ﷺ بھی مکہ سے ہجرت کر گئے......جبکہ حضرت صہیبؓ اس دوران مسلسل کسی مناسب موقع کی آس میں رہے......متعدد بار انہوں نے فرار کا منصوبہ بنایا......لیکن ہر بار انہیں یہی اندازہ ہوا کہ ......ان پہریداروں کی چبھتی ہوئی نگاہوں......اور ان کی چمکتی ہوئی تلواروں سے بچ کر نکلنا ممکن نہیں......

آخر ایک بار سخت سردی کے موسم میں، جب خوب طوفانی جھکڑ چل رہے تھے، رات کی سیاہی ہر طرف چھائی ہوئی تھی، ایسے میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کو ایک تدبیر سوجھی، انہوں نے پیٹ میں سخت درد اور مروڑ کا بہانہ بنایا، اور پیٹ پر ہاتھ رکھے ہوئے خوب تلملانے لگے......اور بار بار قضائے حاجت کیلئے جانے لگے......ان کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ پہریدار آپس میں یوں کہنے لگے کہ ''دیکھو آج تو ہمارے خداؤں لات 'منات' اور عُزّیٰ نے اس مسلمان کو کیا خوب سزا دی ہے......بیچارے کا حال دیکھو......بار بار قضائے حاجت کیلئے جا رہا ہے......''

اور پھر باہم ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے ہوئے خوب ہنسی خوشی یوں کہنے لگے ''مبارک ہو،

آج کی یہ سرد رات......خوب ٹھنڈا موسم......آج تو ہم خوب جی بھر کر اور بے فکر ہو کر میٹھی نیند سے لطف اندوز ہوں گے، کیونکہ آج تو اس قیدی کے بھاگ نکلنے کا کوئی امکان ہی نہیں، یہ تو بار بار حاجت کی تکلیف میں پھنسا ہوا ہے......''

اور پھر وہ سب سو گئے......دنیا و مافیہا سے بے خبر نیند کی وادیوں میں کھو گئے......

وہ رات انتہائی سرد تھی، تند و تیز طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں، تمام ماحول اور موسم بہت ہی بھیانک نظر آ رہا تھا......لیکن اس کے باوجود حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے موقع غنیمت جانا، اور دبے پاؤں وہاں سے بھاگ نکلے......

کچھ ہی دیر بعد اتفاقاً ان پہریداروں میں سے کسی کی آنکھ کھلی تو اس نے ''قیدی'' کو غائب پایا، فوراً ہی اس نے اپنے باقی ساتھیوں کو گہری نیند سے جگایا، ان سب نے جب یہ منظر دیکھا تو بہت ہی پشیمان ہوئے......لیکن پھر فوراً ہی وہ تعاقب میں نکل کھڑے ہوئے اور اپنے گھوڑے سرپٹ دوڑا دیئے......چونکہ حضرت صہیبؓ پیدل تھے، اور یہ سب برق رفتار گھوڑوں پر سوار......لہٰذا جلد ہی یہ اُن تک جا پہنچے......

تب حضرت صہیب رومیؓ سرعت کے ساتھ ایک بلند ٹیلے پر جا چڑھے، اور ان کی جانب اپنی تیر کمان سیدھی کرتے ہوئے بلند آواز میں یوں بولے ''اے جماعتِ قریش! تم بخوبی جانتے ہو کہ میں تیراندازی میں کس قدر ماہر ہوں، اور یہ کہ میرا نشانہ کبھی چوکتا نہیں ہے......لہٰذا جب تک میرے ترکش میں ایک تیر بھی باقی رہے گا میں چن چن کر تم سب کو نشانہ بناؤں گا......اس کے بعد جب تک میرے ہاتھ میں تلوار کا کوئی ٹوٹا پھوٹا ٹکڑا بھی باقی رہے گا......اُس وقت تک میں تمہارا مقابلہ کروں گا......''

تب وہ تعاقب میں آنے والے قدرے پریشان ہو گئے، اور کچھ دیر باہم سرگوشیوں میں

مشغول رہنے کے بعد یوں کہنے لگے ''دیکھو صہیب! تم ہمارے شہر مکہ میں بالکل خالی ہاتھ آئے تھے، اس کے بعد ہمارے شہر میں رہتے ہوئے تم نے خوب دولت کمائی، اس لئے اب ہم تمہیں یہاں سے جانے نہیں دیں گے''

اس پر حضرت صہیب رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''اگر میں اپنا تمام مال و دولت تمہارے حوالے کر دوں...... تب تم مجھے جانے دو گے؟''

وہ سب بیک زبان بولے ''ہاں...... ضرور جانے دیں گے''

تب حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ نے ان لالچی، مال و زر کے پجاری، ہوس اور حرص و طمع کے مارے ہوئے ان لوگوں کو اپنی تمام تر پونجی کے بارے میں آگاہ کیا کہ ''وہ فلاں جگہ رکھی ہوئی ہے...... جاؤ...... وہاں سے لے لو......'' وہ لوگ چونکہ حضرت صہیبؓ کی راست بازی اور امانت و دیانت سے بخوبی واقف تھے، لہٰذا ان کی اس بات پر مکمل بھروسہ کرتے ہوئے وہ لوگ ہنسی خوشی وہاں سے واپس چلتے بنے کہ اصل چیز تو مل گئی...... اب انہیں روکنے کی کوئی ضرورت ہی نہیں رہی۔

اور پھر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ سوئے منزل روانہ ہو گئے...... یکہ و تنہا...... کوئی ساتھی نہیں...... کوئی ہمسفر نہیں...... مکہ سے مدینہ تک اس قدر طویل سفر...... وہ بھی پا پیادہ ...... کوئی سواری نہیں...... منزل دور اور ہمت چُور...... جب کبھی بہت زیادہ تھک جاتے اور ہمت جواب دینے لگتی، تب رسول اللہ ﷺ کی یاد ستانے لگتی، آپؐ سے ملاقات، آپؐ کا دیدار، اور آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضری کا شوق دل میں موجزن ہونے لگتا...... اور یہ فکر ستانے لگتی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں ہمت ہار بیٹھوں، اور پھر ہمیشہ کیلئے آپؐ کی زیارت اور صحبت و معیت سے بس محروم ہی رہ جاؤں...... اور تب نیا ولولہ پیدا ہوتا...... نیا جوش اور نیا

عزم بیدار ہوتا......اور پھر نئی ہمت اور نئے جذبے کے ساتھ سوئے منزل رواں دواں ہوجاتے......

آخر یہ طویل مسافت پیدل طے کرنے کے بعد ایک روز حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مدینہ شہر کی مضافاتی بستی ''قباء'' جاپہنچے، حُسنِ اتفاق سے اُس وقت رسول اللہ ﷺ بھی اسی بستی میں ہی تشریف فرما تھے، جیسے ہی آپؐ کی نگاہ صہیبؓ پر پڑی......آپؐ انتہائی مسرت سے لبریز اور بہت ہی جذباتی انداز میں صہیب کی جانب بڑھے، اُس وقت آپؐ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے: لَقَد رَبِحَ البَیع......لَقَد رَبِحَ البَیع یعنی ''یہ شخص تو اس سودے بازی میں بہت ہی کامیاب رہا......''

رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری' اور ملاقات کے اس شرف کی وجہ سے حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ اُس وقت کچھ دیر کیلئے سبھی کچھ بھول گئے......اپنی اس تمامتر تھکاوٹ کا بھی احساس نہیں رہا......اور پھر جب کچھ وقت گذر چکا تو عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! میں نے ابتک اپنی اس سودے بازی کا کسی کے سامنے تذکرہ ہی نہیں کیا، پھر آپؐ کے اس ارشاد کا کیا مطلب......؟''

آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا ''ابھی کچھ دیر قبل ہی آسمان سے جبریل امین یہ وحی لائے ہیں: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَن یَشرِي نَفسَهُ ابتِغَاءَ مَرضَاتِ اللّٰهِ وَاللّٰهُ رَؤُفٌ بِالعِبَادِ﴾ (۱) ترجمہ (لوگوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں کہ اللہ کی رضامندی کی طلب میں اپنی جان تک بیچ ڈالتے ہیں، اور اللہ تو اپنے بندوں پر بڑی مہربانی کرنے والا ہے) (۲)

(۱) البقرہ [۲۰۷] (۲) کس قدر غور طلب ہے یہ بات کہ رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ یہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، ان کا مزاج اور ان کا انداز تو یہ تھا کہ ''جو کچھ لُٹتا ہے لُٹ جائے......مگر بس ایمان سلامت رہ جائے'' ایمان کی دولت کو بچانے کی خاطر سبھی کچھ لُٹا دیا، دشمنوں کے حوالے کر دیا، اور خود خالی ہاتھ چلے آئے،

مدینہ پہنچنے کے بعد ایک نئی اور خوشگوار زندگی کا آغاز ہوا، جہاں مشرکینِ مکہ نہیں تھے، ان کی طرف سے وہ ایذاء رسانیوں اور بدسلوکیوں کے سلسلے نہیں تھے، اس نئی اور بدلی ہوئی زندگی میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت' صحبت ومعیت' اور کسبِ فیض کے سلسلے میں پیش پیش رہے، نیز آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران جتنے بھی غزوات پیش آئے ...... اولین غزوہ یعنی ''بدر'' سے آخری غزوہ یعنی ''تبوک'' تک ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ شریک رہے اور دینِ برحق کی سربلندی کی خاطر بے مثال شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے رہے، اسی کیفیت میں مدینہ منورہ میں وقت گذرتا رہا...... حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا، آپؐ صہیب رومی رضی اللہ عنہ سے ہمیشہ تادمِ آخر انتہائی مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں جو قدر و منزلت حاصل تھی' حضرات خلفائے راشدین کے دور میں بھی ان کی وہی حیثیت اور قدر و منزلت اس معاشرے میں برقرار رہی۔

خلیفۂ دوم امیر المؤمنین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں فطری طور پر ہی کافی رعب اور وقار تھا، لیکن اس کے باوجود وہ اکثر حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کے

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

اور اس پر بھی انتہائی مسرور و مطمئن ...... کہ کامیاب رہے اس سودے بازی میں ...... یہ سوچ تھی ان مقدس و پاکیزہ ترین شخصیات کی جن کے ہم نام لیوا ہیں ...... نہ یہ کہ دنیا کے عارضی وفانی اور حقیر فائدے کی خاطر اپنے دین وایمان کا اور اپنے ضمیر کا سودا کرلیا جائے، اللہ ہم سب کے حال پر رحم فرمائے۔

ساتھ ہلکی پھلکی خوش مزاجی' خوش طبعی' ہنسی مذاق' اورظرافتِ طبع کا مظاہرہ کیا کرتے تھے، جس سے ان دونوں جلیل القدر شخصیات کی باہم محبتوں اور قربتوں کی عکاسی ہوا کرتی تھی۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شخصیت میں مخصوص رعب اور وقار کے علاوہ یہ خوبی نمایاں تھی کہ وہ نظم وضبط کے انتہائی پابند تھے،فطری طور پر انہیں بڑی قائدانہ صلاحیتوں سے نوازا گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ ان کے زمانۂ خلافت میں اسلامی فتوحات کا سلسلہ مشرق ومغرب میں چہارسو بہت زیادہ وسعت اختیار کر گیا تھا......ایسا بے مثال سلسلہ جو کہ بجا طور پر:

''تھمتا نہ تھا کسی سے سَیلِ رواں ہمارا''

کا جیتا جاگتا مصداق تھا......یہی وجہ تھی کہ ان وسیع وعریض مفتوحہ علاقوں میں نظم وضبط برقرار رکھنے اور انتظامی امور کو مناسب طریقے سے چلانے کیلئے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو ہمیشہ ہی محنتی' قابل' باصلاحیت' اور ذی استعداد قسم کے افراد کی تلاش رہتی تھی......

حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ بہت ہی محنتی' اور قابل انسان تھے،سلطنتِ روم سے بالکل ہی خالی ہاتھ مکہ پہنچے تھے، جہاں وہ بڑی محنت وجان فشانی کے ساتھ تجارت میں مشغول ومنہمک ہوگئے تھے،اور بہت جلد آسودہ حال ہوگئے تھے،اس کے بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے موقع پر مکہ میں اپنی محنت اور خون پسینے کی وہ تمام تر کمائی وہیں مشرکینِ مکہ کے حوالے کر دی تھی، اور یوں مدینہ چلے آئے تھے......دوبارہ بالکل خالی ہاتھ اور مفلوک الحال......یہاں مدینہ میں اب انہوں نے ازسرِنو محنت کی' تجارت ہی کو اپنا مشغلہ اور وسیلۂ روزگار بنایا......اور اس بار بھی دیکھتے ہی دیکھتے کافی خوشحال اور مالدار ہوگئے......ظاہر ہے کہ یہ چیز اللہ کی طرف سے توفیق اور فضل وکرم کے بعد' ان کی لیاقت وقابلیت کی بڑی دلیل تھی......چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی ان کی اس خوبی'

محنت وجان فشانی' امانت ودیانت' اورلیاقت وقابلیت سے خوب واقف بھی تھے اور متأثر بھی تھے۔

حضرت صہیب بن سنان رومی رضی اللہ عنہ کے مزاج میں ایک خاص بات یہ تھی کہ جس طرح خوب محنت اورقابلیت کے ذریعے مال ودولت خوب کماتے تھے' اسی طرح ضرورتمندوں اورمحتاجوں پرخوب سخاوت وفیاضی اوردریادلی کے ساتھ خرچ بھی بہت زیادہ کیا کرتے تھے،مہمان نواز بھی بہت تھے،یعنی جس قدر تیز رفتاری کے ساتھ ان کے پاس دولت آتی تھی' اسی قدر تیز رفتاری کے ساتھ چلی بھی جاتی تھی، پیسہ ان کے ہاتھ میں ٹکتانہیں تھا، آنے جانے کا یہ سلسلہ لگا ہی رہتا تھا......اورحضرت عمرؓ ان کی اس کیفیت اوراس مزاج سے بھی خوب واقف تھے......

لہٰذا حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اکثر انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کرتے تھے: ''صہیب! میں اچھی طرح جانتا ہوں کہ تم بہت ہی قابل انسان ہو......اس لئے میرا بہت جی چاہتا ہے کہ تمہاری اس قابلیت اورسمجھداری سے فائدہ اٹھایا جائے، میں کوئی اہم سرکاری عہدہ تمہیں سونپنا چاہتا ہوں ......مگر یہ جوتمہاری عادت ہے ناں ......کہ تم پیسہ بہت اُڑاتے ہو......بس اسی سے میں ڈرتا ہوں......''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی یہ بات سن کرحضرت صہیب رضی اللہ عنہ بس مسکرادیتے......اور یوں جواب دیا کرتے: ''آپ کی اس محبت کا اوراس پیشکش کا بہت شکریہ......لیکن مجھے کسی عہدے کی کوئی طلب ہی نہیں ہے......''

اوراس کے ساتھ ہی وہ یہ وضاحت بھی کردیا کرتے کہ ''میں جوکچھ بھی مال ودولت خرچ کرتا ہوں وہ واقعی ضرورتمندوں پرہی خرچ کرتا ہوں،کوئی فضول خرچی نہیں کرتا......مال

ودولت ضائع نہیں کرتا......''

لیکن حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا اپنا ایک نظریہ تھا،اور مخصوص زاویۂ نگاہ تھا...... دراصل جس کسی کی ذمہ داری جس قدر بڑی ہوتی ہے ......اسی قدر وہ محتاط بھی زیادہ ہوا کرتا ہے......ظاہر ہے کہ امیر المؤمنین اور خلیفۂ وقت ہونے کی حیثیت سے حضرت عمرؓ کی ذمہ داری بہت بڑی تھی......اس لئے ان کے اندازِ فکر کا مخصوص معیار تھا، بالخصوص بیت المال کے حوالے سے ......شاید انہیں یہ اندیشہ تھا کہ اگر صہیب کو کوئی ذمہ داری سونپی گئی اور بڑا منصب ان کے حوالے کر دیا گیا......تو شاید یہ (خلوصِ نیت سے ہی سہی) اپنے مزاج کے مطابق دیکھتے ہی دیکھتے سبھی کچھ لٹا دیں گے......اس لئے حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت صہیب رضی اللہ عنہ کی خداداد صلاحیتوں سے اس قدر متأثر ہونے کے باوجود' اور دونوں میں اتنی قربتوں اور محبتوں کے باوجود......کوئی سرکاری عہدہ ان کے حوالے کرنے سے کتراتے تھے۔

البتہ اس کے باوجود حضرت عمرؓ ان کی قدر و منزلت سے خوب آگاہ تھے،اور ان دونوں جلیل القدر شخصیات میں باہمی محبتوں اور عزت واحترام کا رشتہ بہت ہی مضبوط تھا۔

یہی وجہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جب ایک روز مسجدِ نبوی میں نمازِ فجر کی امامت کے دوران ابولولو فیروز نامی مجوسی غلام کی طرف سے قاتلانہ حملے کے نتیجے میں شدید زخمی ہو گئے تھے......اور چار دن موت وزیست کی کشمکش میں مبتلا رہنے کے بعد آخر بتاریخ یکم محرم ۲۴ھ شہید ہو گئے تھے......اس موقع پر زخمی ہونے کے بعد اور شہادت کے درمیان کے عرصہ میں خود حضرت عمرؓ نے یہ خاص تاکید فرمائی تھی کہ میرے بعد کوئی نیا خلیفۃ المسلمین منتخب ہونے تک صہیب نماز پڑھائیں......چنانچہ اس تاکید کے مطابق اُن دنوں حضرت

صہیب رومی رضی اللہ عنہ مسجدِ نبوی میں امامت کے فرائض انجام دیتے رہے......
اور پھر حضرت عمرؓ کی وصیت کے مطابق ان کی نمازِ جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھائی۔

مدینہ میں وقت گذرتا رہا......آتے جاتے موسموں کا سفر جاری رہا......حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ مرورِ زمانہ کے ساتھ کافی ضعیف اور عمر رسیدہ ہوگئے......اور تب انہوں نے تمام کام کاج چھوڑ کر بس گوشہ نشینی اختیار کر لی، اور صرف عبادت میں ہی تمام وقت گذارنے لگے......

آخر خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں ۳۸ھ میں ۷۲ سال کی عمر میں مدینہ میں ان کا انتقال ہوگیا......اور یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت صہیب بن سِنان رومی رضی اللہ عنہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔ مدینہ منورہ کے قبرستان ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔
اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، اور ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۱/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۳/دسمبر ۲۰۱۴ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ:

مکہ شہر میں جب نورِ نبوت چمکا اور خاتم الأنبیاء والمرسلین ﷺ کی بعثت ہوئی تب عبداللہ بن مسعود بالکل نوجوان تھے، دن بھر شہر سے باہر سردارانِ قریش میں سے ایک معروف شخص عُقبہ بن مُعیط کی بکریاں چرایا کرتے تھے۔

انہی دنوں لوگوں کی زبانی انہیں بھی رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بارے میں علم ہوا، مختلف لوگوں سے انہوں نے یہ خبر سنی، لیکن اس طرف کوئی خاص توجہ نہیں دی، کیونکہ بالکل نوعمری اور لااُبالی کا دور تھا، نیز یہ کہ دن بھر تو یہ مکہ شہر سے باہر آبادی سے دور بکریاں چراتے تھے، اور پھر رات کے وقت تھکے ہارے جب واپس مکہ پہنچتے تو نیند کا غلبہ ہوتا تھا، لہٰذا آتے ہی سو جاتے۔

ایک روز جب یہ حسبِ معمول مکہ شہر سے باہر بکریاں چرا رہے تھے، تب انہوں نے وہاں ویرانے میں خلافِ معمول دو ادھیڑ عمر افراد کو اپنی جانب آتے دیکھا جن کی شخصیت میں بہت زیادہ وقار جھلک رہا تھا، جب وہ کچھ قریب آئے تو عبداللہ بن مسعود نے محسوس کیا کہ یہ دونوں بہت زیادہ تھکے ہوئے ہیں، پیاس کی شدت کی وجہ سے ان کے ہونٹ خشک ہوئے جا رہے تھے......

ان میں سے ایک شخص نے عبداللہ بن مسعود کو مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''اے نوجوان! ہمیں کچھ دودھ تو پلاؤ......تاکہ ہم اپنی پیاس بجھا سکیں''

نوجوان عبداللہ بن مسعود نے معذرت کرتے ہوئے جواب دیا ''میں ایسا نہیں کرسکتا، کیونکہ یہ بکریاں میرے پاس کسی کی امانت ہیں''

نوجوان کی طرف سے یہ انکار سن کر ان دونوں نو وارد افراد نے کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا، البتہ ان میں سے ایک نے کہا ''کیا تمہاری ان بکریوں میں کوئی ایسی بکری بھی ہے جو ابھی چھوٹی ہو، دودھ نہ دیتی ہو؟ تب عبداللہ بن مسعود بکریوں کے درمیان گھوم پھر کر ایک چھوٹی بکری لے آئے، تب اس نو وارد شخص نے ''بسم اللہ'' کہتے ہوئے اس بکری کے تھن کو چھوا، جس پر دیکھتے ہی دیکھتے بکری کا تھن دودھ سے بھر گیا......پھر وہاں موجود ایک برتن میں نو وارد نے دودھ دوہنا شروع کیا......نوجوان عبداللہ بن مسعود یہ منظر دیکھ کر انتہائی حیرت زدہ رہ گئے، انہیں اپنی آنکھوں پر یقین ہی نہیں آ رہا تھا......اور تب ان دونوں نو وارد اجنبی افراد نے خوب سیر ہو کر دودھ پیا، اور عبداللہ بن مسعود کو بھی پیش کیا......اور پھر وہ دونوں وہاں سے روانہ ہو گئے......اور نوجوان عبداللہ بن مسعود بس سوچتے ہی رہ گئے کہ ''یہ کیا ماجرا تھا، جو میری آنکھوں نے دیکھا......اور یہ دونوں اجنبی کون تھے......؟''

اس کے بعد کئی روز تک نوجوان عبداللہ بن مسعود اسی حیرت میں ڈوبے رہے اور آخر اِدھر اُدھر مختلف لوگوں کے سامنے اس چیز کا تذکرہ کیا......اور تب جا کر معلوم ہوا کہ ان دونوں باوقار اجنبی افراد میں سے ایک رسول اللہ ﷺ تھے، اور دوسرے ان کے خاص ساتھی حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے۔

دراصل ان دنوں مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاءرسانیوں کا سلسلہ بہت عروج پر تھا، اور اُس روز بھی مشرکین نے ان دونوں کو بہت ستایا تھا، اور تب یہ دونوں حضرات (یعنی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ) ان مشرکین سے جان چھڑانے کیلئے بچتے بچاتے مکہ شہر سے باہر بہت دور نکل آئے تھے، مسلسل پیدل چلنے کی وجہ سے اُس وقت انہیں بہت زیادہ تھکاوٹ اور پیاس محسوس ہو رہی تھی......اور تب انہوں نے اپنی پیاس

بجھانے کی خاطر اس نوجوان سے بکری کا دودھ مانگا تھا......

نوجوان عبداللہ بن مسعود کو جب ان دونوں برگزیدہ ترین شخصیات کے بارے میں علم ہوا تو ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا شوق پیدا ہونے لگا، رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک سے ''معجزہ'' تو وہ پہلے ہی خود اپنی جیتی جاگتی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے، لہٰذا اب کسی طرح جلد از جلد دینِ برحق قبول کرنے کیلئے وہ ہمہ وقت بیتاب رہنے لگے۔

آخر ایک روز موقع پا کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، کلمۂ حق ''اشہدأن لا الٰہ الا اللہ، واشہدأن محمداً رسول اللہ'' پڑھتے ہوئے' دینِ اسلام قبول کیا، اور رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی اس نوجوان (عبداللہ بن مسعود) کو فوراً ہی پہچان لیا، اور اُس روز اس نوجوان نے جس امانت و دیانت کا مظاہرہ کیا تھا (یعنی بکریوں کا دودھ پیش کرنے سے معذرت کر لی تھی' یوں کہتے ہوئے کہ یہ بکریاں تو میرے پاس کسی کی امانت ہیں) اس پر آپؐ نے مسرت کا اظہار بھی فرمایا۔

قبولِ اسلام کے فوری بعد حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے گذارش کرتے ہوئے کہا کہ ''اے اللہ کے رسول! میں اب اپنی تمام زندگی آپ کی خدمت میں بسر کرنا چاہتا ہوں، لہٰذا آپ مجھے اجازت مرحمت فرمائیے'' اس پر آپؐ نے رضامندی کا اظہار فرماتے ہوئے انہیں اس بات کی اجازت دے دی، اور تب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ ہمیشہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کے خادم بن کر رہ گئے، زندگی بھر سائے کی طرح آپ ﷺ کی صحبت و معیت میں ہی رہے، اور خدمت کے فرائض انجام دیتے رہے، خواہ آپ ﷺ مقیم ہوں،

یا حالتِ سفر میں ہوں، نیز ہمیشہ آپؐ کی مسواک کی حفاظت، آپؐ کے جوتوں کی حفاظت، آپؐ کے عصا کی حفاظت، آپؐ کیلئے وضوء کے پانی کا انتظام، لوٹے کا انتظام، غرضیکہ سفر ہو یا حضر، ہمیشہ ہر وقت اور ہر وقت موقع پر آپؐ کی خدمت کیلئے حاضر و مستعد رہا کرتے تھے۔

اس نوعمری سے ہی مسلسل رسول اللہ ﷺ کی صحبت و معیت اور کسبِ فیض کا ہی یہ اثر تھا کہ تمام دینی علوم میں انہیں غیر معمولی مہارت اور دسترس حاصل تھی، بالخصوص قرآن کریم کی تلاوت، نیز قرآن کریم سے متعلق جتنے بھی علوم ہیں، ان میں انہیں خاص مقام و مرتبہ حاصل تھا۔

قرآن کریم کے ساتھ شغف اور محبت اور اس کی تلاوت کے شوق کا یہ عالم تھا کہ اکثر اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے، تلاوت میں ہی مشغول رہا کرتے تھے، قرآن کریم کے ساتھ یہ والہانہ تعلق قبولِ اسلام کے فوری بعد روزِ اول سے ہی ان کے دل میں اسی طرح پوری آب و تاب کے ساتھ موجزن تھا......

یہی وجہ تھی کہ اُس ابتدائی دور میں کہ جب وہاں مکہ شہر میں مسلمان چھپ چھپ کر تلاوتِ قرآن کیا کرتے تھے، کسی میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ وہ کھلم کھلا علی الاعلان ان طواغیت کے سامنے قرآن کریم کی تلاوت کر سکے......ایسی صورتِ حال میں ایک بار ایسا ہوا کہ کسی جگہ بڑے سردارانِ قریش کی محفل جمی ہوئی تھی، لہوولعب اور فضولیات کے سلسلے عروج پر تھے، تب اتفاقاً دور سے کچھ مسلمانوں نے یہ منظر دیکھا، اور پھر وہ آپس میں یوں کہنے لگے "ہے کسی میں اتنی ہمت کہ ان کی اس محفل میں جا کر ان کے سامنے قرآن پڑھے......؟"

اس پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کہا "میں یہ کام کروں گا"

تب ان کے ساتھی کچھ تشویش کا شکار ہو گئے، اور انہیں مخاطب کر کے یوں کہنے لگے "اس

کام کیلئے کوئی ایسا شخص ہونا چاہئے جس کا تعلق اسی شہرمکہ سے ہو، یہاں اس کا طاقتور خاندان ہو،اس کی کوئی حیثیت ہو،جبکہ تم تو مکہ کے باشندے نہیں ہو، یہاں تمہارا خاندان نہیں ہے،کوئی تمہیں بچانے والا اور تمہاری حفاظت کرنے والا نہیں ہے،اس لئے تم مت جاؤ......''

تب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''اللہ میرا حامی وناصر ہے......''

اور پھر یہ اُن سردارانِ قریش کی اس محفل میں جا پہنچے،اُس وقت وہاں لہوولعب کے ساتھ شعروسخن کا سلسلہ بھی زوروں پر تھا، ہرکوئی اپنا کلام سنا رہا تھا......ایسے میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ وہاں پہنچے اور کلام پیش کرنے کی اجازت چاہی......جس پر ان سب نے کہا کہ ''ضرور سناؤ'' تب انہوں نے بآوازِ بلند قرآن کریم کی تلاوت شروع کردی ﴿اَلرَّحمٰن عَلَّمَ القُرآنَ خَلَقَ الاِنسَانَ عَلَّمَهُ البَیَانَ الشَّمسُ وَالقَمَرُ بِحُسبَانٍ وَالنَّجمُ وَ الشَّجَرُ یَسجُدَان......﴾ (۱) ترجمہ: (رحمٰن نے قرآن سکھایا،اسی نے انسان کو پیدا کیا،اور اسے بولنا سکھایا،آفتاب اور ماہتاب مقررہ حساب سے ہیں،اور ستارے اور درخت [اسی کو] سجدہ کرتے ہیں......)

ابتداء میں تو وہ سردارانِ قریش خاموشی کے ساتھ یہ کلام سنتے رہے......اور اس کلام کی بے مثال حلاوت سے اور شیرینی سے بہت ہی متأثر ہوتے رہے......لیکن پھر جلد ہی ان میں سے کسی کو یہ اندازہ ہونے لگا کہ یہ تو وہی کلام پڑھ رہا ہے جو کہ محمد (ﷺ) پڑھا کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ کلام من جانب اللہ ان کی طرف نازل شدہ ہے......تب اس شخص نے دوسرے لوگوں کو بھی اس طرف متوجہ کیا اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے خلاف ورغلایا،

(۱) سورہ ''رحمٰن'' کی ابتدائی آیات۔

تب وہ سبھی بگڑ گئے ......اپنی اصلیت پر آ گئے ......اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو خوب جی بھر کر زدوکوب کرتے رہے، اور ناحق ظلم وتشدد کا نشانہ بناتے رہے......

آخر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنی یہ حالت لئے ہوئے وہاں سے واپس روانہ ہوئے اور اپنے انہی مسلمان ساتھیوں کے پاس پہنچے ......انہوں نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی کہ جگہ جگہ سے خون بہہ رہا ہے......تب وہ برجستہ بولے کہ ''ہمیں اسی چیز کا اندیشہ تھا، اور اسی لئے ہم نے تمہیں منع بھی کیا تھا......''

اس پر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''میری یہ جو بھی حالت ہے......اس کے باوجود میں اس بات پر بہت خوش ہوں کہ آج میں ان لوگوں کے سامنے اللہ کا کلام پڑھ کر آیا ہوں''

اسی کیفیت میں مکہ میں وقت گذرتا رہا......اور پھر نبوت کے تیرہویں سال ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے پر دیگر تمام مسلمانوں کی طرح حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بھی ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے۔

دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور سے ہی قرآن کریم کے ساتھ ان کا جو بہت گہرا اور والہانہ تعلق تھا......اب یہاں مدینہ میں بھی ...... بلکہ اس کے بعد بھی ہمیشہ ہی ان کی یہی کیفیت' اور قرآن کریم کے ساتھ یہی جذباتی لگاؤ اسی طرح برقرار رہا......

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ ایک بار ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساتھ کسی اہم اور نازک معاملے میں گفت وشنید اور مشاورت میں مشغول تھے، اتفاق سے قریب ہی میں بھی موجود تھا، پھر آپؐ وہاں سے اٹھ کر مسجد کی طرف روانہ ہو گئے، ہم دونوں بھی ساتھ ہی چل دیئے، مسجد میں پہنچنے کے بعد ہم نے وہاں ایک شخص کو دیکھا، جو

نماز میں مشغول تھا، اس کی تلاوتِ قرآن کی آواز ہماری سماعت سے ٹکرا رہی تھی، لیکن ہم ٹھیک طرح اسے پہچان نہیں سکے(۱) رسول اللہ ﷺ اس شخص کے قریب جا کر کھڑے ہوگئے، اور بڑے ہی انہماک کے ساتھ کچھ دیر وہیں کھڑے ہوئے اس شخص کی تلاوت سنتے رہے، پھر ہماری طرف متوجہ ہوتے ہوئے آپؐ نے ارشاد فرمایا: (مَن سَرَّہٗ أن یَقرَأَ القُرآنَ رَطْباً کَمَا نَزَلَ ، فَلیَقرَأہُ عَلَیٰ قِرَاءَ ۃِ ابنِ أُمّ عَبْد) (۲) یعنی "جس کسی کی یہ خواہش ہوکہ وہ قرآن کو اس طرح پڑھے جس طرح وہ تازہ تازہ نازل ہوا......(۳) اسے چاہئے کہ وہ ابن اُم عبد [یعنی عبداللہ بن مسعودؓ] کی طرح پڑھے"۔
مقصد یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس شخص (حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) کیلئے یہ بہت بڑی گواہی اور تصدیق تھی کہ ان کی تلاوتِ قرآن بہت ہی درست ترین ہے۔
اس کے بعد حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "نماز سے فراغت کے بعد عبداللہ بن مسعود اسی جگہ بیٹھے ہوئے دیر تک دعاء میں مشغول رہے، جبکہ اس دوران رسول اللہ ﷺ انتہائی شفقت بھرے انداز میں مسلسل ان کی جانب دیکھتے رہے، اور اپنی زبانِ مبارک سے یوں کہتے رہے: سَلْ تُعْطَہ...... سَلْ تُعطَہ یعنی "مانگتے جاؤ، تمہیں عطاء کیا جائے گا...... مانگتے جاؤ، تمہیں عطاء کیا جائے گا"۔
حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "میں نے دل میں سوچا کہ جب صبح ہوگی تو میں عبداللہ بن مسعود کے پاس جاؤں گا، اور انہیں یہ سب تفصیل بتاؤں گا کہ گذشتہ رات جب آپ مسجد میں نماز میں مشغول تھے، تب رسول اللہ ﷺ نے آپ کی تلاوت سنی، اور پھر

(۱) شاید رات کا وقت ہوگا، اس لئے ابتداء میں نہیں پہچان سکے، البتہ بعد میں پہچان لیا۔
(۲) صحیح ابن حبان [۷۰۶۶]
(۳) یعنی قرآن کو یوں بالکل درست طریقے سے پڑھے کہ جس طرح اللہ کی طرف سے نازل ہوا ہے۔

کس طرح آپ کی تلاوت کی تعریف کی ......اور پھر جب آپ دعاء میں مشغول تھے، تب آپؐ نے کیا بات ارشاد فرمائی تھی......''

چنانچہ جب صبح ہوئی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ' حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے گھر پہنچے' یہی سب کچھ بتانے کیلئے، تاکہ وہ خوش ہوجائیں......،لیکن جب یہ وہاں پہنچے تو دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سے پہلے وہاں موجود تھے، اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے سامنے گذشتہ رات کا تمام ماجرا بیان کر چکے تھے......تب حضرت عمرؓ سوچنے لگے کہ ''ابوبکر تو ہمیشہ ہی ہر خیر میں سبھی پر سبقت لے جاتے ہیں''

اس کے بعد ان دونوں حضرات (یعنی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' نیز حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ) نے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مخاطب ہوتے ہوئے فرمایا ''ہمیں یہ تو بتا دیجئے کہ اُس وقت آپ کیا دعاء مانگ رہے تھے؟'' جواب میں انہوں نے کہا: ''میں اُس وقت اس دعاء میں مشغول تھا:

اَللّٰهُمّ اِنِّي أسألُكَ اِيمَاناً لَا يَرتَدّ، وَنَعِيماً لَا يَنفَد، وَمُرَافَقَةَ نَبِيِّكَ مُحَمَّدٍ ﷺ فِي أعلَىٰ جَنَّةِ الخُلد (۱) یعنی ''اے اللہ میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا ایمان جو واپس [کفر کی طرف] نہ پھرے، اور ایسی نعمتیں کہ جو ختم نہ ہوں، اور رفاقت تیرے نبی محمد ﷺ کی جنت کے اعلیٰ ترین مقام' یعنی جنت الخُلد میں''۔

اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا......ابتدائے اسلام سے ہی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ پہلے مکی زندگی میں اور پھر مدنی زندگی میں چونکہ ہمیشہ سائے کی طرح رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے، لہٰذا ہمہ وقت کی اس مسلسل حاضری'

(۱) مسند امام احمد [۶/۱۲۸]

خدمت، صحبت، علمی استفادہ، اور کسبِ فیض کا یہ نتیجہ تھا کہ تمام دینی علوم بالخصوص قرآنی علوم میں انہیں غیرمعمولی دسترس حاصل تھی، نیز قرآن کریم کی تلاوت بھی نہایت ہی مؤثر اور دل نشیں انداز میں کیا کرتے تھے۔

یہی وجہ تھی کہ بعض اوقات رسول اللہ ﷺ خود ان سے فرمائش کرکے ان کی تلاوت سنا کرتے تھے۔

چنانچہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: قَالَ لِي رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ: اِقرَأ عَلَيَّ القُرآن ، قُلتُ: يَا رَسُولَ اللّٰه! أقرَأ عَلَيكَ وَعَلَيكَ أُنزِلَ؟ قَالَ: اِنِّي أشتَهِي أن أسمَعَهُ مِن غَيرِي ، فَقَرأتُ عَلَيهِ سُورَةَ النِّسَاء ، حَتّىٰ بَلَغتُ ((فَكَيفَ اِذَا جِئنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئنَا بِكَ عَلَىٰ هٰؤلَآءِ شَهِيداً)) فَقَالَ: حَسبُكَ ، فَالتَفَتُّ اِلَيهِ ، فَاِذَا عَينَاهُ تَذرِفَانِ .(۱)

یعنی: (ایک بار رسول اللہ ﷺ نے مجھ سے فرمایا ''مجھے قرآن پڑھ کر سناؤ'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! میں آپ کے سامنے قرآن پڑھوں؟ حالانکہ یہ قرآن تو آپ ہی پرنازل کیا گیا ہے؟ (یعنی میری اتنی مجال کہاں؟) آپؐ نے فرمایا ''مجھے قرآن کسی دوسرے سے سننا اچھا لگتا ہے'' تب میں نے آپؐ کے سامنے سورۃ نساء کی تلاوت شروع کی، یہانتک کہ جب میں اس آیت پر پہنچا: (فَكَيفَ اِذَا جِئنَا مِن كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيدٍ وَجِئنَا بِكَ عَلَىٰ هٰؤلَآءِ شَهِيداً) (۲) یعنی (اس وقت [ان کا] کیا حال ہوگا جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لے کر آئیں گے، اور [اے نبیؐ] ہم آپ کو ان لوگوں کے خلاف گواہ کے طور پر پیش کریں گے) تب آپؐ فرمانے لگے ''بس کرو'' تب میں نے آپؐ کی

(۱) صحیح بخاری[۵۰۵۰][۵۰۵۵][۵۰۵۶] کتاب التفسیر۔ باب قول اللہ تعالیٰ: فکیف اذا جئنا من کل اُمّۃ بشھید......، نیز: مسلم[۸۰۰] ودیگر کتبِ حدیث وتفسیر۔ (۲) النساء[۴۱]

جانب مڑ کر دیکھا......تو اس وقت آپ ؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں)(۱)

☆حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جسمانی طور پر کافی نحیف اور دبلے پتلے تھے، ایک روز جب خوب ہوا چل رہی تھی، جس کی وجہ سے کپڑے اُڑے جارہے تھے، تب ان کی پنڈلی سے کپڑا کچھ ہٹ گیا......اتفاقاً کچھ لوگوں کی نظر ان کی دبلی پتلی پنڈلی پر پڑی تو بے اختیار ان کی ہنسی نکل گئی......تب رسول اللہ ﷺ نے ان سے دریافت فرمایا ''تم لوگ کیوں ہنس رہے ہو؟'' انہوں نے جواب دیا ''اے اللہ کے رسول! بس ان کی دبلی پتلی پنڈلی پر نظر پڑی تو بے اختیار ہماری ہنسی نکل گئی'' اس پر آپ ؐ نے فرمایا: وَالَّذِي نَفسِي بِيَدِهٖ ، لَهُمَا أثقَلُ فِي المِيزَانِ مِن جَبَلِ أُحُد ۔ (۲) یعنی ''قسم اس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، ان کی یہ پنڈلیاں ''میزان'' میں اُحُد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہیں''

مقصد یہ کہ عبداللہ بن مسعود (رضی اللہ عنہ) کی یہ دبلی پتلی پنڈلیاں دیکھ کر یہاں دنیا میں تم لوگوں کی ہنسی نہیں رُک رہی......لیکن یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک ان کا اس قدر بلند ترین مقام و مرتبہ ہے کہ قیامت کے روز میزان (یعنی انسانوں کے اعمال کا وزن کرنے والے ترازو) میں ان پنڈلیوں کا وزن اُحد پہاڑ سے بھی زیادہ ہوگا'' (یعنی اپنے اسی دبلے پتلے جسم سے یہ جو اس قدر اللہ کی عبادت کیا کرتے ہیں، خوب اعمالِ صالحہ انجام دیا کرتے ہیں، ان کا وزن اُحد پہاڑ سے زیادہ ہے)۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ بالکل نوعمری میں ہی قبولِ اسلام کے بعد سے ہمیشہ

(۱) یعنی روزِ قیامت معاملے کی نزاکت' اس دن کی ہولناکیاں ......نیز آپ ؐ کا ان مشرکین کے خلاف اللہ کے سامنے گواہی دینے کا معاملہ......ان چیزوں کو یاد کر کے آپ ؐ اُس وقت آبدیدہ ہوگئے (۲) مسند احمد [۳۸۵۹]

زندگی بھر تا دمِ آخر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے، نہایت ذوق وشوق اور خوب اہتمام کے ساتھ تحصیلِ علمِ دین، استفادہ، اور کسبِ فیض میں ہر دم اور ہر لحہ مشغول ومنہمک رہے......صحبت ومعیت کا مبارک سلسلہ بدستور جاری رہا......اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا......حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا، آپؐ ہمیشہ تادمِ آخر ان سے انتہائی خوش اور مسرور ومطمئن رہے۔

رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلافتِ راشدہ کے زمانے میں بھی عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہی حیثیت اور قدر ومنزلت برقرار رہی۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران مشرق ومغرب میں چہارسو اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت وسعت اختیار کر چکا تھا، ایسے میں حضرت عمرؓ نے مفتوحہ علاقوں میں نئے شہر بسانے کا حکم جاری کیا، چنانچہ اسی سلسلے میں انہی دنوں سن سترہ ہجری میں دریائے فرات کے کنارے ایک نیا شہر ''کوفہ'' بسایا گیا، جو کہ رفتہ رفتہ علمی، ادبی، ثقافتی، سیاسی، وعسکری، غرضیکہ ہر لحاظ سے بہت زیادہ اہمیت اختیار کر گیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے مزاج میں یہ بات شامل تھی کہ وہ خداداد بصیرت، فراست، اور دور اندیشی کی وجہ سے اہم اور حساس قسم کے مناصب کیلئے ذمہ دار افراد کی تعیین وتقرری کے معاملہ میں ہمیشہ بہت زیادہ احتیاط اور باریک بینی سے کام لیا کرتے تھے۔

چنانچہ جب یہ نیا شہر (یعنی کوفہ) بسایا گیا تو اس کے والی (گورنر، یا فرمانروا) کے تقرر کیلئے ان کی نظرِ انتخاب حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ پر پڑی، اور تب انہوں نے اس نئے آباد کردہ شہر (کوفہ) کے اولین فرمانروا کی حیثیت سے حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کی تقرری کی۔

جبکہ اسی موقع پر ہی حضرت عمرؓ نے اہالیانِ کوفہ کی دینی تعلیم وتربیت اور رہنمائی کی غرض سے حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا، ساتھ ہی انہیں یہ تاکید بھی کہ وہ تعلیم وتربیت کے ساتھ ساتھ بوقتِ ضرورت انتظامی امور میں حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کے ساتھ تعاون بھی کرتے رہیں، مشاورت کے فرائض انجام دیتے رہیں......اور پھر ان دونوں انتہائی جلیل القدر شخصیات کو کوفہ پہنچنے کی تاکید فرمائی۔

اس موقع پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اہالیانِ کوفہ کے نام ایک خط بھی تحریر فرمایا، جس کا مضمون یہ تھا: اِنّي أبْعَثُ اِلیکم عَمّار بن یَاسِر أمِیراً ، و عَبدَاللّٰه بن مَسْعُود مُعَلّماً وَ وَزِیراً ، وَاِنّهُمَا مِنَ النُّجَبَاءِ ، مِن أصْحَابِ الرّسُولِ ﷺ ، وَمِن أصْحَابِ بَدر ۔ یعنی ’’میں تم لوگوں کی طرف عمار بن یاسر کو تمہارے فرمانروا کی حیثیت سے‘ جبکہ عبداللہ بن مسعود کو تمہارے لئے معلم ومربی‘ نیز عمار بن یاسر کیلئے وزیر ومددگار کی حیثیت سے بھیج رہا ہوں، یہ دونوں حضرات انتہائی شریف ونجیب قسم کے انسان ہیں، رسول اللہ ﷺ کے صحابۂ کرام میں سے ہیں‘ نیز یہ دونوں ’’غزوۂ بدر‘‘ میں شرکت کرنے والے خوش نصیبوں میں سے ہیں‘‘۔

تب یہ دونوں حضرات یعنی عمار بن یاسر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما مدینہ سے کوفہ منتقل ہوگئے، جہاں عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ فرمانروا کی حیثیت سے‘ جبکہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ معلم ومدرس کی حیثیت اپنے اپنے فرائض کی انجام دہی میں مشغول ومنہمک ہوگئے۔

☆......عجز وانکسار:

کوفہ میں قیام کے دوران حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے دینی مقام ومرتبے‘ نیز سرکاری حیثیت کے باوجود انتہائی سادہ زندگی بسر کیا کرتے تھے، تواضع اور سادگی کا یہ

عالم تھا کہ راہ چلتے ہوئے ہمیشہ تنہا ہی چلنا پسند کرتے، تاکہ سادگی وعاجزی برقرار رہے، اور کسی شان وشوکت کا اظہار نہو۔

چنانچہ ایک بار جب کسی راستے میں چلے جارہے تھے، تب کچھ لوگ احتراماً ان کے ہمراہ ہولئے، جس پر انہوں نے ان کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے ان سے استفسار کیا ''کیا آپ حضرات کو مجھ سے کوئی کام ہے؟''

ان لوگوں نے عرض کیا کہ ''نہیں! کام تو کچھ نہیں ہے...... البتہ بس ہمارا جی چاہا کہ ہم آپ کے ہمراہ چلیں''

اس پر حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے فرمایا'' آپ لوگ واپس لوٹ جائیے، کیونکہ اس میں (یعنی بلاضرورت کسی کے ہمراہ' یا پیچھے پیچھے چلنے میں) ''تابع''یعنی پیچھے آنے والے کیلئے ذلت ہے، جبکہ ''متبوع''یعنی جس کے پیچھے چلے آرہے ہیں' کیلئے ''فتنہ'' ہے۔(۱)

یعنی جو پیچھے چلا آرہا ہے، گویا وہ بلاوجہ خود کو کمتر بنارہا ہے...... جبکہ جس کے پیچھے چلا آرہا ہے' ہوسکتا ہے اس کے دل میں خود پسندی' غرور اور تکبر کے جذبات پیدا ہونے لگیں...... یا وہ خود کو بزرگ اور پارسا سمجھنے لگے...... لہٰذا چونکہ یہ چیز تابع ومتبوع دونوں ہی کیلئے مضر ہے' اس لئے اس سے گریز ضروری ہے۔

اسی طرح عام زندگی میں اور روزمرہ کے معاملات میں چھوٹوں بڑوں سبھی کے ساتھ میل جول کے موقع پر انتہائی تواضع اور عجز وانکسار سے پیش آیا کرتے تھے، کبھی کوئی ایسی بات نہیں کہتے تھے جس سے کسی کی دل شکنی ہو، یا جس میں کسی کی بے عزتی ورسوائی کا اندیشہ ہو،

(۱) منہاج القاصدین۔ لابن الجوزی۔ باب فی ذم الجاہ والریاء۔

اکثر یوں کہا کرتے تھے: لَو سَخِرتُ مِن کَلبٍ لَخَشِیتُ أن أُحَوَّلَ کَلباً...... یعنی ''میں تو اس خوف سے کبھی کسی کتے کا مذاق بھی نہیں اُڑاتا' کہ کہیں اس کی پاداش میں خود مجھے بھی کتا ہی نہ بنادیا جائے......''(۱)

مقصد یہ کہ کتا خود اپنی مرضی سے تو کتا نہیں بنا......لہٰذا اگر میں اس کا مذاق اڑاؤں، اور اسے طعنہ دوں......تو کہیں اللہ کی طرف سے ایسا نہ ہو کہ بطورِ سزا مجھے بھی کتا بنادیا جائے۔

☆......وفات:

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے ''کوفہ'' کے باشندوں کی دینی تعلیم وتربیت کی غرض سے کافی عرصہ وہاں گذارا، اور پھر خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں وہاں سے واپس مدینہ چلے آئے، جہاں رفتہ رفتہ عمر میں اضافے کے ساتھ ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی۔

انہی دنوں جب طبیعت کافی زیادہ ناساز ہوچکی تھی اور بچنے کی امید بظاہر کم تھی......تب ایک روز خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ان کی عیادت کیلئے آئے، اس موقع پر ان دونوں جلیل القدر حضرات کے مابین درجِ ذیل گفتگو ہوئی:

☆......حضرت عثمانؓ: مَا تَشْکِي؟ یعنی ''اس وقت آپ کیا تکلیف محسوس کررہے ہیں؟

☆......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: ذُنُوبِي یعنی ''بس اپنے گناہوں کی وجہ سے میں پریشان ہوں''

☆......حضرت عثمانؓ: فَمَا تَشتَهِي؟ یعنی ''تو پھر آپ کیا چاہتے ہیں؟

☆......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: رَحمَةَ رَبِّي یعنی ''اپنے رب کی رحمت''

(۱) قرطبی، تفسیر سورۃ الحجرات، آیت:۱۱۔ یا أیہا الذین آمنوا لا یسخر قوم من قوم......

☆......حضرت عثمانؓ: أَلَا آمُرُ لَكَ بِعَطَائِكَ الّذِي امتَنَعتَ عَن أَخْذِهِ مُنذُ سِنِيْن؟ یعنی''کیا میں آپ کی وہ رقم آپ کی طرف بھجوادوں جو کہ سالوں سے آپ نے وصول نہیں کی ہے؟''(یعنی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کوفہ میں بطورِ مدرس جو فرائض انجام دیا کرتے تھے' ان دنوں آخر میں کافی عرصہ اس کیفیت میں گذرا کہ انہوں نے سرکاری بیت المال سے اپنا جائز وظیفہ وصول نہیں کیا تھا، مفت میں خدمات انجام دیتے رہے تھے، اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت عثمانؓ نے یہ پیشکش کی تھی)

☆......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: لَا حَاجَةَ لِي بِهِ یعنی''مجھے اس کی کوئی ضرورت نہیں''

☆......حضرت عثمانؓ: يَكُونُ لِبَنَاتِكَ مِن بَعْدِكَ یعنی''وہ رقم آپ کے بعد آپ کی بیٹیوں کے کام آئے گی (اس لئے آپ وہ رقم قبول کر لیجئے)

☆......حضرت عبداللہ بن مسعودؓ: لَا أَخَافُ عَلَيهِنَّ الفَقْرَ ، لِأَنِّي أَمَرتُهُنَّ أَن يَقرأنَ كُلَّ لَيلَةٍ سُورَةَ الوَاقِعَة ، وَإِنِّي سَمِعْتُ رَسُولَ اللّهِ ﷺ يَقُول: ((مَن قَرَأَ الوَاقِعَةَ كُلَّ لَيلَةٍ لَم تُصِبْهُ فَاقَةٌ أَبَداً)) (۱) یعنی''مجھے اپنی بیٹیوں کے بارے میں فقر و فاقے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے، کیونکہ میں نے انہیں یہ تاکید کر رکھی ہے کہ ہر رات سورۃ الواقعہ ضرور پڑھ لیا کریں، میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا ہے (جو کوئی ہر رات سورۃ الواقعہ پڑھے' وہ کبھی فقر و فاقے کا شکار نہیں ہوگا)۔

☆......اس واقعے سے یقیناً حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بے مثال زہد و استغناء ظاہر ہوتا ہے کہ خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ خود چل کر ان کے پاس تشریف لائے اور بار بار خود انہیں اس رقم کی پیشکش کی......لیکن جواب میں انہوں نے

(۱) مشکاۃ المصابیح[۲۱۸۱] کتاب فضائل القرآن۔

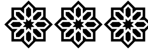
مسلسل معذرت کا اظہار کیا۔

نیز اس سے ان کے دل میں موجود رسول اللہ ﷺ کے اس مذکورہ بالا ارشاد (بلکہ آپؐ کے تمام ارشادات وفرمودات) پر مکمل اور غیر متزلزل یقین وایمان کا اظہار ہوتا ہے..... کیونکہ اسی یقین وایمان کی وجہ سے انہوں نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت بالکل آخری دنوں میں اپنی صاحبزادیوں کو اس چیز (یعنی ہررات سورۃ الواقعہ کی تلاوت) کی تاکید وتلقین فرمائی۔

مزید یہ کہ اس طرح ہمیشہ کیلئے تمام مسلمانوں کو بھی فقروفاقہ اور تنگدستی سے حفاظت ونجات کیلئے یہ نافع ومفید نسخۂ اکسیر بتا گئے۔

اور پھر رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس چند روزہ علالت کے بعد مدینہ منورہ میں ۳۲ھ میں تقریباً ساٹھ سال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے، تجہیز وتکفین کے موقع پر خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ پیش پیش رہے، نمازِ جنازہ بھی انہوں نے ہی پڑھائی، اور پھر مدینہ کے قبرستان ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کر دیا گیا۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، اور ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۴/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۶/دسمبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ تاریخِ اسلام کا ایسا روشن ستارہ ہیں کہ اس دنیا میں شاید ہی کوئی مسلمان ہوگا جو ان کے نام سے واقف نہو، خصوصاً جب بھی رسول اللہ ﷺ کی کسی حدیث کا تذکرہ ہوگا تو خود بخود ذہن میں ان کا نام ابھرنے لگے گا کہ شاید یہ حدیث انہی سے مروی ہوگی......

رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد جب ابھی مکی دور ہی چل رہا تھا، ہجرتِ مدینہ کی نوبت نہیں آئی تھی، نبوت کا گیارہواں سال چل رہا تھا، تب وہاں مکہ میں طفیل بن عمرو الدوسی (رضی اللہ عنہ) کی آمد ہوئی تھی، جو کہ اُس وقت اپنے پرانے دین (یعنی) شرک پر ہی قائم تھے، نیز جو کہ ایک مشہور اور بہت ہی طاقتور قبیلے ''دَوس'' کے سردار تھے، یہ قبیلہ مکہ سے جنوب کی جانب ''تہامہ'' نامی علاقے میں آباد تھا، جس کا کچھ حصہ آجکل حجاز (سعودی عرب) میں' جبکہ دیگر کچھ حصہ ملکِ یمن میں ہے۔

طفیل بن عمرو الدوسی (رضی اللہ عنہ) اُس وقت رسول اللہ ﷺ سے بہت متأثر ہوئے تھے، اور پھر مشرف باسلام ہوگئے تھے، اور تب مکہ مکرمہ سے اپنے علاقے ''تہامہ'' کی جانب واپسی کے بعد انہوں نے وہاں اپنے قبیلے والوں کو دینِ برحق کی طرف دعوت کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

دعوتِ دین کے سلسلہ میں ان کی اس محنت و کوشش کے نتیجے میں ایک شخص ''ابو ہریرہ'' تو فوراً ہی اس دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے تھے، البتہ باقی افراد میں سے اکثریت کی طرف سے ابتداء میں انہیں (یعنی طفیل کو) کافی مخالفت اور مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا تھا،

البتہ بعد میں رفتہ رفتہ وہ لوگ بڑی تعداد میں دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے تھے۔
اس کام میں کافی عرصہ لگ گیا تھا، حتیٰ کہ ہجرتِ مدینہ کے بھی مزید چھ سال بعد سن سات ہجری میں (یعنی طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے تقریباً سات یا آٹھ سال بعد) جن دنوں غزوۂ خیبر پیش آیا تھا انہی دنوں طفیل بن عمرو الدوسی (رضی اللہ عنہ) اپنے قبیلے میں سے دینِ اسلام قبول کر لینے والے افراد کی قیادت کرتے ہوئے (جو کہ ۸۰ گھرانوں پر مشتمل تھے) طویل مسافت طے کرتے ہوئے ''تہامہ'' سے مدینہ آپہنچے تھے، تب ان کی آمد پر رسول اللہ ﷺ نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا تھا......اور انہی افراد میں اسی قبیلے سے تعلق رکھنے والے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔
الغرض رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے گیارہویں سال ''تہامہ'' میں آباد مشہور قبیلۂ دوس کے سردار حضرت طفیل بن عمرو الدوسی رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام' اور پھر ان کی طرف سے اپنے قبیلے والوں کو دعوتِ اسلام کے سلسلہ میں محنت و کوشش کے نتیجے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تھے، اور پھر اپنے اسی سردار (حضرت طفیلؓ) کی زیرِ قیادت ہی تہامہ سے سفر کرتے ہوئے ۷ھ میں مدینہ پہنچے تھے۔
حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا اصل نام ''عبدِ شمس'' تھا، یعنی سورج کا بندہ۔ دراصل اُس معاشرے میں قبل از اسلام جو جہالت کی تاریکیاں' نیز عقیدہ و ایمان کے معاملے میں جو خرابیاں اور گمراہیاں چہار سو پھیلی ہوئی تھیں' انہی میں سے ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سورج کی تعظیم کیا کرتے تھے، اور اسی وجہ سے ان میں ''عبدِ شمس'' نام عام تھا۔
لیکن رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں جب حاضری ہوئی تو آپؐ نے ان کا نام ''عبدِ شمس'' سے بدل کر ''عبدالرحمٰن'' رکھ دیا تھا۔

البتہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اپنے نام ''عبدالرحمٰن'' کی بجائے اپنی کنیت ''ابو ہریرہ'' سے ہمیشہ کیلئے مشہور ہوگئے، ''ہریرہ'' کے معنیٰ ہیں ''بلی'' دراصل ان کی ایک بلی تھی، جوانہیں بہت ہی پیاری تھی، اکثر اسے اپنے ساتھ ہی رکھتے تھے، لہٰذا اسی نسبت سے ''ابو ہریرہ'' یعنی ''بلی والے'' مشہور ہوگئے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں جب پہلی بار اپنے علاقے تہامہ سے مدینہ آئے' تب یہ اٹھائیس سال کے جوان تھے۔ اس کے بعد سے انہوں نے خود کو رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت' علمی استفادہ' کسبِ فیض' اور اللہ کا دین سیکھنے کیلئے مکمل طور پر وقف کر دیا۔

چونکہ اُس وقت تک ان کی شادی بھی نہیں ہوئی تھی' لہٰذا کوئی گھریلو ذمہ داری بھی نہیں تھی، اس لئے ''مسجدِ نبوی'' کو اپنا مستقل ٹھکانہ بنایا، مسجد سے بالکل متصل ہی ایک ''صفہ'' یعنی چبوترا تھا، جہاں غریب اور مسکین قسم کے مسلمان مقیم رہتے تھے، جنہوں نے اپنی زندگیاں کسبِ فیض اور تحصیلِ علمِ دین کی خاطر وقف کر رکھی تھیں، ان کی رہائش گاہ بھی وہی تھی' عبادت گاہ بھی وہی تھی' اور درس گاہ بھی وہی تھی، اوران کے استاد اور معلم ومربی خود رسول اللہ ﷺ تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے بھی مسجدِ نبوی سے متصل اس ''صفہ'' کو اپنا مسکن بنایا، اور شب وروز اللہ کی عبادت میں' نیز تحصیلِ علمِ دین میں مشغول ومنہمک رہنے لگے، چونکہ اہل وعیال تو تھے نہیں' لہٰذا فرصت بھی خوب میسر تھی۔

البتہ ان کی صرف ایک عمر رسیدہ ماں تھیں' جن کا نام ''اُمیمہ'' تھا، اور وہ دینِ نصرانیت کی پیروکار تھیں،، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بہت کوشش کیا کرتے تھے کہ ان کی والدہ بھی دینِ اسلام قبول کرلیں، لیکن ان کی والدہ اپنا دین ترک کرنے پر کسی صورت آمادہ نہیں

تھیں، جس پر ابو ہریرہؓ بہت ہی دکھی اور پریشان رہا کرتے تھے، اور ہمیشہ بڑی ہی محبت اور احترام کے ساتھ انہیں دینِ اسلام قبول کر لینے کی دعوت دیا کرتے تھے۔

انہی دنوں ایک روز جب حضرت ابو ہریرہؓ نے حسبِ معمول اپنی والدہ کو دینِ اسلام قبول کرنے کی دعوت دی، تو یہ دعوتِ حق قبول کرنے کی بجائے وہ کافی ناراض ہو گئیں، مزید یہ کہ اس موقع پر انہوں نے کوئی نامناسب بات بھی کہی......جس پر ابو ہریرہؓ کو بہت ہی صدمہ ہوا، فوراً وہاں سے روانہ ہوئے ، اور زاروقطار روتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے، رسول اللہ ﷺ نے جب ان کی یہ کیفیت دیکھی تو دریافت فرمایا کہ ''اے ابو ہریرہ! آپ کیوں رو رہے ہیں؟'' تب جواب میں انہوں نے آپؐ کے سامنے تمام ماجرا سنا ڈالا......اور پھر گلوگیر آواز کے ساتھ عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ میری والدہ کیلئے دعاء کیجئے کہ اللہ ان کے دل کو دینِ اسلام کی طرف راغب کر دے''۔ تب آپؐ نے ان کی والدہ کیلئے ہدایت کی دعاء فرمائی۔

اس کے بعد حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ واپس گھر کی طرف چل دیئے، وہاں پہنچ کر دیکھا کہ گھر کا دروازہ بند ہے، اور کچھ پانی بہنے کی آواز بھی سنائی دے رہی تھی، جیسے نہاتے دھوتے وقت پانی کی آواز آیا کرتی ہے......اور جب یہ اندر داخل ہونے لگے تو اندر سے والدہ کی آواز آئی جو کہہ رہی تھیں ''ابو ہریرہ! اسی جگہ رکے رہو، ابھی اندر مت آنا'' تب یہ وہیں رک گئے، پھر کچھ دیر بعد آواز آئی ''ابو ہریرہ! اب اندر چلے آؤ'' تب یہ اندر چلے گئے۔ جونہی اندر داخل ہوئے تو دیکھا کہ ان کی والدہ نے نہا دھو کر صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے ہیں، اور انہیں دیکھتے ہی انہوں نے بآوازِ بلند یہ الفاظ کہے: أشهد أن لا إله إلا الله، وأشهد أن محمداً رسول الله''۔

والدہ کی زبان سے یہ الفاظ سنتے ہی ابوہریرہؓ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہ رہا...... بے اختیار آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......اب دوبارہ فوراً اسی وقت پلٹے اور رسول اللہ ﷺ کو اس چیز کی اطلاع دینے کی غرض سے روانہ ہوگئے......

ابوہریرہؓ ابھی کچھ ہی دیر قبل بھی اسی راستے پر چلتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچے تھے، تب بھی ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے......اور اب دوبارہ اسی راستے پر رواں دواں تھے، اور اب بھی آنکھوں سے آنسو رواں تھے، البتہ پہلی بار وہ غم کے آنسو تھے......اور اس بار یہ خوشی کے آنسو تھے......اور پھر اسی کیفیت میں رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں پہنچے...... بہتے ہوئے آنسوؤں اور بھیگی پلکوں کے ساتھ یہ خوشخبری سنائی، اور بڑے ہی جذباتی انداز میں یوں کہنے لگے ''اے اللہ کے رسول! اللہ نے آپ کی دعاء قبول فرمالی......میری والدہ مسلمان ہوچکی ہیں'' جس پر آپؐ نے نہایت ہی مسرت کا اظہار فرمایا۔(۱)

☆......طلبِ علم میں خاص رغبت واہتمام:

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں جب اپنے علاقے ''تہامہ'' سے طویل مسافت طے کرنے کے بعد مدینہ پہنچے تھے......اس کے بعد سے مسلسل رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا اس قدر گہرا اور قلبی تعلق تھا کہ گویا آپؐ کی محبت وعقیدت ان کے رگ وپے میں سما گئی تھی......لہٰذا اٹھتے بیٹھتے، گھومتے پھرتے، ہمہ وقت بس سائے کی طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہی رہتے تھے۔

(۱) صحیح مسلم [۲۴۹۱] باب فضائل أبی ہریرۃ الدوسی رضی اللہ عنہ۔
نیز: کتاب: الادب المفرد۔ از: امام بخاری رحمہ اللہ۔ باب (نمبر: ۱۸) عرض الاسلام علی الأم النصرانیۃ [۳۴]۔

نیز جس طرح رسول اللہ ﷺ کی محبت وعقیدت ان کے سراپا میں سرایت کرچکی تھی......اسی طرح آپؐ سے استفادہ، کسبِ فیض، اور دینی علم حاصل کرنے کا جذبہ بھی اس قدر شدید تھا کہ بس اسی چیز کوانہوں نے اپنا اوڑھنا بچھونا، اپنا شیوہ وشعار، اپنا نصب العین، اور اپنا مقصدِ زندگی بنالیا تھا۔

انصارِ مدینہ میں سے مشہور صحابی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (۱) فرماتے ہیں کہ:

(بَينَا أنَا وَ أبُوهُرَيرَة وَصَاحِبٌ لِي فِي المَسجِدِ ، نَدعُو اللّهَ تَعالىٰ وَنَذْكُرُه ، اِذ طَلَعَ عَلَينَا رَسُولُ اللّهِ ﷺ ، وَ أقبَلَ نَحوَنَا ، حَتّىٰ جَلَسَ بَينَنَا ، فَسَكَتْنَا ، فَقَالَ : عُودُوا اِلَىٰ مَا كُنْتُم فِيه ، فَدَعَوتُ اللّهَ تَعَالَىٰ أنَا وَصَاحِبِي قَبلَ أبِي هُرَيرَة ، وَجَعَلَ الرّسُولُ ﷺ يُؤَمِّنُ عَلَىٰ دُعَائِنَا ، ثُمّ دَعَا أبوهُرَيرَة فَقَالَ : اللّهُمّ اِنِّي أسأَلُكَ مَا سَأَلَكَ صَاحِبَايَ ، وَأسأَلُكَ عِلماً لَا يُنسَىٰ ، فَقَالَ : آمِين ، فَقُلنَا : وَنَحنُ نَسأَلُ اللّهَ عِلماً لَا يُنسَىٰ ، فَقَالَ : سَبَقَكُم بِهَا الغُلَامُ الدَّوسِي) (۲)

یعنی ''ایک بار جب میں، اور ابوہریرہ، نیز میرا ایک اور ساتھی، ہم مسجد میں بیٹھے ہوئے اللہ سے دعاء اور اس کے ذکر میں مشغول تھے، کہ اس دوران رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لائے اور ہماری ہی طرف چلے آئے، حتیٰ کہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئے، تب ہم خاموش ہوگئے، آپؐ نے فرمایا ''تم لوگ جس کام میں مشغول تھے اپنا وہی کام جاری رکھو'' تب میں نے اور پھر میرے ساتھی نے ابوہریرہ سے پہلے اللہ سے دعاء مانگی، رسول اللہ ﷺ ہماری دعاء پر آمین کہتے رہے، اس کے بعد ابوہریرہ یوں دعاء مانگنے لگے ''اے اللہ میں تجھ سے مانگتا

(۱) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحہ [۵۰۹] پر ملاحظہ ہو۔

(۲) ابن حجر فی ''الاصابۃ'' [۴/۲۰۸] نیز: الہیثمی فی مجمع الزوائد [۹/۳۶۴] وغیرہ۔

ہوں وہ چیز جو مجھ سے قبل میرے یہ دونوں ساتھی تجھ سے مانگ چکے ہیں، اور (مزید یہ کہ) میں تجھ سے مانگتا ہوں ایسا علم جسے میں کبھی نہ بھولوں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''آمین'' تب ہم دونوں نے بھی یہی الفاظ کہے کہ ''ہم بھی اللہ سے مانگتے ہیں ایسا ہی علم جسے ہم کبھی نہ بھولیں'' تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اس بارے میں بس یہ دَوسی نوجوان تم پر سبقت لے جا چکا''۔

مقصد یہ کہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے اللہ سے وہ چیزیں بھی مانگ لیں جوان سے قبل ان کے دونوں ساتھیوں نے مانگی تھیں ......اور پھر مزید یہ کہ بطورِ خاص اللہ سے ایسا علم مانگا جو کبھی ذہن سے اور یادداشت سے محو نہ ہو سکے، یعنی جسے وہ کبھی نہ بھولیں، ہمیشہ ہی یاد رہے اور محفوظ رہے......مقصد یہ کہ انہوں نے بطورِ خاص ''علم'' میں ترقی واضافہ کی دعاء مانگی، جس سے ان کی تحصیلِ علم میں خاص دلچسپی اور بہت زیادہ رغبت ظاہر ہوتی ہے......

مزید یہ کہ ان کی اس دعاء پر رسول اللہ ﷺ نے ''آمین'' کہا۔ اور وہی قبولیت کی کوئی خاص گھڑی تھی، لہٰذا جب دوسرے دونوں حضرات نے یہی دعاء مانگی، تو رسول اللہ ﷺ نے ''آمین'' کہنے کی بجائے یہ ارشاد فرمایا ''یہ دَوسی نوجوان تم پر سبقت لے گیا'' (دَوسی نوجوان، یعنی حضرت ابو ہریرہؓ، کیونکہ ان کا تعلق قبیلۂ ''دَوس'' سے تھا، جو کہ ''تہامہ'' میں آباد تھا)۔

تحصیلِ علم کے بارے میں، نیز اللہ کا دین سیکھنے اور سکھانے، اور پھر اس کے مطابق اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کی تعمیل اور اطاعت وفرمانبرداری کے معاملے میں، حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا یہ بے مثال جذبہ، یہ شوق، یہ رغبت، اور اس قدر اہتمام والتزام، یہ سب کچھ محض ان کی اپنی ذات تک ہی محدود نہیں تھا......بلکہ ان کے دل میں یہی

جذبہ دوسروں کے بارے میں بھی ہمیشہ موجزن رہتا تھا، دوسروں کے بارے میں بھی انہیں یہی فکر دامن گیر رہتی تھی...... کہ کاش سبھی لوگ اسی طرح اس معاملے میں رغبت' ذوق وشوق اور بلند ہمتی کا مظاہرہ کیا کریں......

چنانچہ ایک بار حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ (رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر نے جانے کے بعد) جب مدینہ کے کسی بازار سے گذر رہے تھے، اُس وقت وہاں خوب رونق تھی ، خرید وفروخت کا سلسلہ بڑے عروج پر تھا...... یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ اسی جگہ رُک گئے، کچھ پریشانی کا شکار ہوگئے، اور سوچنے لگے کہ ''یہ سب لوگ کس طرح زور وشور کے ساتھ بس دنیا کمانے میں مشغول ومنہمک ہیں......''

کچھ دیر اسی طرح خاموش کھڑے ہوئے ان کی جانب دیکھتے رہے......اور پھر قدرے توقف کے بعد انہیں مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یوں کہنے لگے ''اے مدینہ والو! کس قدر پست ہمت ہو تم لوگ''

وہاں موجود سبھی لوگ تعجب سے ایک دوسرے کی جانب دیکھنے لگے، اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے ''اے ابو ہریرہ! آپ کو ہماری طرف سے کیا پست ہمتی نظر آئی ہے؟''

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ''رسول اللہ ﷺ کی میراث تقسیم ہو رہی ہے، اور تم لوگوں کو کوئی احساس ہی نہیں کہ جا کر اپنا حصہ وصول کر لو؟''

وہ کہنے لگے ''اے ابو ہریرہ! ہمیں بتائیے، رسول اللہ ﷺ کی میراث کہاں تقسیم ہو رہی ہے؟''

حضرت ابو ہریرہؓ نے فرمایا ''مسجد میں تقسیم ہو رہی ہے''

تب بہت سے تاجر اپنی تجارت چھوڑ کر مسجدِ نبوی کی طرف چل دیئے، جبکہ حضرت ابو ہریرہؓ وہیں کھڑے ہوئے ان کی واپسی کا انتظار کرنے لگے۔ اور پھر کچھ ہی دیر بعد جب وہ لوگ مسجد سے واپس آئے اور ابو ہریرہؓ کو دیکھا تو کہنے لگے ''اے ابو ہریرہ! ہمیں تو مسجد میں کہیں کوئی میراث تقسیم ہوتی ہوئی نظر نہیں آئی''

حضرت ابو ہریرہ نے فرمایا ''تو پھر بتاؤ وہاں تمہیں کیا نظر آیا؟''

وہ کہنے لگے ''ہم نے تو وہاں بس یہ منظر دیکھا کہ کوئی نماز پڑھ رہا ہے، کوئی تلاوتِ قرآن میں مشغول ہے، اور کچھ لوگ حلال وحرام کے بارے میں دینی مسائل اور شرعی احکام سیکھنے سکھانے میں مشغول ہیں''

اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے فرمایا ''یہی تو رسول اللہ ﷺ کی میراث ہے''

☆......فقر وفاقہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے چونکہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت اور طلبِ علم کیلئے خود کو وقف کر ڈالا تھا اور سارا وقت تو اسی کام میں گذر جاتا تھا...... کسبِ معاش کا کوئی سلسلہ نہیں تھا...... لہٰذا اکثر فقر وفاقہ' بھوک' اور تنگدستی کا شکار رہا کرتے تھے...... اکثر وبیشتر جب بھوک بہت زیادہ ستاتی تو کسی راستے میں کھڑے ہو جاتے، صحابۂ کرام میں سے کسی کا جب وہاں سے گذر ہوتا تو اس سے کوئی دینی مسئلہ یا کسی آیت کا مطلب ومفہوم سمجھنے کے بہانے بات چیت شروع کر دیتے ...... کہ شاید باتوں ہی باتوں میں اس کے ہمراہ چلتے چلتے ...... اس کے گھر تک جا پہنچیں ...... اور پھر وہ گھر لے جا کر شاید کچھ کھانا بھی کھلا دے گا...... حالانکہ اِنہیں اُس آیت کا مطلب خوب معلوم ہوتا تھا، اور کسی سے کچھ دریافت کرنے کی تو دراصل کوئی ضرورت ہی نہیں تھی۔

چنانچہ اسی بارے میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

''ایک بار مجھے بھوک نے بہت زیادہ ستایا، حتیٰ کہ اُس روز مجھے اپنے پیٹ پر پتھر باندھنا پڑا، پھر میں ایک راستے میں جا بیٹھا جہاں سے اکثر صحابۂ کرام کا گذر ہوا کرتا تھا، اچانک مجھے ابوبکر (رضی اللہ عنہ) آتے ہوئے دکھائی دیئے، جب وہ قریب آئے تو میں نے ان سے ایک آیت کا مطلب دریافت کیا' حالانکہ مجھے اس کا مطلب خوب معلوم تھا، انہوں نے میرے سوال کا جواب دیا، اور پھر چلتے بنے، میں اسی طرح کھڑا رہ گیا، پھر کچھ دیر بعد عمر (رضی اللہ عنہ) وہاں سے گذرے، میں نے انہیں روکا، اور ایک آیت کا مطلب دریافت کیا، انہوں نے بھی مجھے اس آیت کا مطلب بتایا اور آگے بڑھ گئے...... کچھ ہی دیر گذری تھی کہ رسول اللہ ﷺ کا وہاں سے گذر ہوا، تب میں نے آپ ﷺ سے اس آیت کا مطلب دریافت کیا، اس پر آپ ﷺ مسکرا دیئے، اور اصل بات کو سمجھ گئے، یعنی بھوک کی وجہ سے میری جو کیفیت تھی' اسے آپؐ نے بھانپ لیا...... تب آپؐ مجھے اپنے ہمراہ لئے ہوئے اپنے گھر کی طرف چل دیئے...... گھر پہنچنے کے بعد وہاں دودھ سے بھرا ہوا پیالہ نظر آیا، آپؐ نے اپنے اہلِ خانہ سے اس دودھ کے بارے میں دریافت فرمایا کہ ''یہ کہاں سے آیا ہے؟'' عرض کیا گیا کہ ''یہ فلاں شخص نے آپؐ کی خدمت میں بھیجا ہے''۔ تب آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا ''اے ابو ہریرہ! ذرہ صفہ والوں کے پاس جاؤ، اور انہیں بلا لاؤ'' تب میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ ''اتنا ذرہ سا دودھ ہے، اور اتنے سارے وہ اصحابِ صفہ جب یہاں آ کر یہ دودھ پئیں گے، تو اس میں سے کیا بچے گا؟'' (یعنی دل میں یہ حسرت پیدا ہوئی کہ کاش اس میں سے خود مجھے تو پہلے ایک گھونٹ نصیب ہو جاتا...... تا کہ مجھ میں ہلنے جلنے اور اصحابِ صفہ تک جانے کی کچھ طاقت تو آ جاتی)

تب حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہاں پہنچے اور سبھی اصحابِ صفہ کو بلا لائے......

اس کے بعد یہ فرماتے ہیں کہ ''جب وہ سبھی اصحابِ صفہ وہاں بیٹھ گئے تو رسول اللہ ﷺ نے وہ پیالہ مجھے تھماتے ہوئے ارشاد فرمایا ''یہ لو ابو ہریرہ! ان سب کو پلاؤ'' تب میں ایک ایک کو وہ دودھ کا پیالہ پیش کرتا رہا، اور ہر کوئی خوب سیر ہو کر پیتا رہا...... حتیٰ کہ سبھی دودھ پی چکے، تب میں نے وہ پیالہ واپس آپؐ کی خدمت میں پیش کر دیا، اس پر آپؐ نے مسکراتے ہوئے میری جانب نگاہ اٹھا کر دیکھا، اور پھر فرمایا: ''اب تو بس صرف ہم دونوں ہی باقی رہ گئے'' میں نے عرض کیا ''آپؐ درست فرما رہے ہیں اے اللہ کے رسول'' تب آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''پیو'' تب میں نے پینا شروع کیا، آپؐ بار بار یہی ارشاد دہراتے رہے کہ ''پیو'' اور میں پیتا رہا، یہاںتک کہ آخر میں نے عرض کیا ''قسم اس اللہ کی جس نے آپ کو نبیِ برحق بنا کر مبعوث فرمایا ہے...... اب مزید پینے کی کوئی گنجائش نہیں بچی ہے'' تب آپؐ نے وہ پیالہ مجھ سے لے لیا، اور اس میں سے خود نوش فرمایا'' (۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے دل میں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کی حقانیت وصداقت پر مکمل اور غیر متزلزل ایمان تو پہلے ہی موجزن تھا، البتہ اب اپنی آنکھوں سے اتنے بڑے معجزے کا مشاہدہ کر لینے کے بعد یقین وایمان میں مزید پختگی آ گئی۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں ۲۸ سال کی عمر میں جب اپنے علاقے ''تہامہ'' سے

(۱) صحیح بخاری [۶۴۵۲] کتاب (نمبر ۸۱) الرقاق، باب (نمبر ۱۷) کیف کان عیش النبی ﷺ وأصحابہ...... حضرت ابو ہریرہؓ سے مروی اس طویل حدیث کی ابتداء اس طرح ہے: اَللّٰهُ الّذِي لَا اِلٰهَ اِلّا هُو......

''مدینہ''منتقل ہوئے تھے' تب سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خاص تعلقِ خاطر' ہمہ وقت صحبت ومعیت' علمی استفادہ' اورکسبِ فیض کا سلسلہ جاری وساری رہا......حتیٰ کہ آپ ﷺ کا مبارک دورگذر گیا،آپؐ تادمِ آخران سے انتہائی مسرور ومطمئن رہے اوران کے ساتھ بہت زیادہ شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے رہے۔

رسول اللہ ﷺ کا مبارک زمانہ گذر جانے کے بعد بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے شب وروز کے معمولات وہی رہے' یعنی ہمہ وقت صرف علمِ دین کی خدمت،اللہ کا دین سیکھنا اور سکھانا......اسی کیفیت میں شب وروز کا اور ماہ وسال کا یہ سفر جاری رہا۔

☆......فقر وفاقہ کی جگہ خوشحالی:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ' رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں ہمہ وقت مکمل توجہ اوردلجمعی کے ساتھ حاضری اور تحصیلِ علمِ دین کی خاطر جس طرح بھوک کی شدت اورفقر وفاقے کی زحمت برداشت کرتے چلے آئے تھے،اب ان کے اس صبر کے نتیجے میں اللہ سبحانہ' وتعالیٰ کی طرف سے یہ فضل وکرم بھی ہوا کہ وہ فقر وفاقہ اب جاتا رہا......مرورِ زمانہ کے ساتھ اسلامی فتوحات کا سلسلہ بڑھتا چلا گیا،جس کے نتیجے میں دور دراز کے مفتوحہ علاقوں سے بہت بڑی مقدار میں مالِ غنیمت لگاتار مدینہ پہنچتا رہا......یوں حالات نے پلٹا کھایا،سبھی کے حالات بدلے......ساتھ ہی حضرت ابو ہریرہؓ کے حالات میں بھی تبدیلی آئی ،ایک وقت وہ تھا کہ جب ابو ہریرہؓ مدینہ کے گلی کوچوں میں چلتے چلتے بھوک کی شدت کی وجہ سے گر جایا کرتے تھے......لیکن رفتہ رفتہ اب اس فقر وفاقے کی جگہ خوشحالی وآسودگی آگئی۔

☆......اللہ کے شکر کا جذبہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی زندگی میں فقر وفاقے کے طویل سلسلے کے بعد جب حالات

نے کروٹ بدلی، اورانہیں بھی خوشحالی وفروانی نصیب ہوئی' تو ایسے میں کسی فخر وغرور کی بجائے' کیفیت یہ رہی کہ جس قدر نعمتیں بڑھتی چلی گئیں' اسی قدر ان کا سر اپنے منعم ومحسن کے سامنے مزید جھکتا چلا گیا......اپنے خالق و مالک کیلئے دل تشکر وامتنان اوراحسان مندی کے جذبات سے لبریز ہوتا چلا گیا......

اللہ کی طرف سے عطاء فرمودہ اس خوشحالی وفراوانی پر اظہارِ تشکر کے طور پر اکثر یوں کہا کرتے: نَشَأتُ يَتِيماً ، وَ هَاجَرتُ مِسكِيناً ، وَكُنتُ أجِيراً لِبُسرَة بِنتِ غَزوَان بِطَعَامِ بَطنِي ، فَكُنتُ أخدِمُهَا ، فَزَوَّجَنِيهَا اللّٰهُ ...... یعنی''میں نے ایک یتیم کی حیثیت سے پرورش پائی، اس کے بعد جب میں نے ہجرت کی تب بھی میں بالکل ہی مسکین تھا، بُسرہ بنت غزوان نامی عورت کا میں خادم تھا، محض دووقت کی روٹی کے عوض دن بھر میں اس کی خدمت بجالایا کرتا تھا......اور پھر اللہ نے فضل فرمایا کہ اسی کے ساتھ میری شادی ہوگئی......''

یوں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کے حالات بدلے، آسودگی بھی آگئی، شادی بھی ہوگئی، اور پھر اللہ نے گھربار اور آل واولاد سے بھی نوازا۔

☆......خوشحالی کے بعد بھی تقویٰ:

تنگدستی اور فقر وفاقے کی بجائے اب خوشحالی وفراوانی کے دور میں بھی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا تقویٰ' پرہیزگاری' خشیتِ الٰہیہ' اور فکرِ آخرت کا وہی جذبہ اور وہی معیار مسلسل برقرار رہا، خوشحالی اور خیر وخوبی کا یہ سفر مسلسل جاری رہا، حتیٰ کہ ایک وقت ایسا بھی آیا (کافی بعد میں' مروان کے زمانے میں) جب یہ والیِ مدینہ (یعنی مدینہ اور اس سے ملحقہ علاقوں کے علاقوں کے گورنر) مقرر ہوئے۔

اس کے باوجود ان کا معمول یہ تھا کہ ہمیشہ نصف شب کے فوری بعد یہ خود نمازِ تہجد ٗ عبادت ٗ اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا اہتمام کرتے ، پھر اپنی اہلیہ کو بیدار کرتے ، وہ بھی اسی طرح تہجد وغیرہ پڑھا کرتیں ، اور پھر ان کی اہلیہ رات کے بالکل آخری حصے میں بیٹی کو جگایا کرتیں ، تب وہ اسی طرح تہجد وغیرہ کا اہتمام کیا کرتی تھی تھیں۔

الغرض نصف شب کے بعد سے اذانِ فجر تک ان کے گھر میں کوئی وقت ایسا نہیں گذرتا تھا کہ جب وہاں اللہ عز وجل کی عبادت نہ ہو رہی ہو ، ہمہ وقت عبادت کا یہ مبارک سلسلہ جاری رہتا تھا ، اور بلاناغہ ہر رات جاری رہتا تھا...... حالانکہ یہ اُس وقت مدینہ کے فرمانروا تھے۔

نیز فقر وفاقہ کے بعد اب یہ خوشحالی کا دور آیا تو ان کی کیفیت یہ ہوئی کہ نہایت سخاوت وفیاضی کے ساتھ ضرورتمندوں اور محتاجوں کی مدد واعانت کیا کرتے تھے ، ہمہ وقت ان کی خبر گیری کیا کرتے ، اور ان کیلئے ضروریاتِ زندگی کی فراہمی سے متعلق انتظام وانصرام میں مشغول ومنہمک رہا کرتے تھے۔

☆......والدہ کی خدمت واطاعت کا جذبہ: (۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ اپنی والدہ کے انتہائی مطیع وفرمانبردار تھے ، ہمہ وقت ان کی

(۱) حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ جن دنوں مدینہ کے فرمانروا تھے ، تب بھی اپنی بہت زیادہ مصروفیات کے باوجود نہایت پابندی کے ساتھ روزانہ گھر سے روانگی ٗ نیز واپسی کے موقع پر اپنی والدہ کو یوں سلام کیا کرتے تھے : السّلام عليكِ ورحمة اللّه وبركاته يا أُمّتاه ، تب ان کی والدہ سلام کا جواب دیتیں : وعليكَ السّلام ورحمة اللّه وبركاته ، اس کے بعد ابوہریرہؓ کہتے : رَحِمَكِ اللّهُ كَما رَبَّيتِنِي صَغيراً یعنی "اللہ آپ پر رحم فرمائے ، جیسا کہ آپ نے میری پرورش کی جب میں چھوٹا تھا" جواب میں ان کی والدہ یوں کہتیں : يا بُنيّ ، وأنتَ ، فجزاك اللّه خيرا ، ورَضِيَ عنك كما بَرَرتَني كَبيرا ، یعنی "اے میرے بیٹے ، اللہ تمہیں جزائے خیر عطاء فرمائے جیسا کہ تم بڑے ہونے کے بعد میرے ساتھ حسنِ سلوک کرتے چلے آرہے ہو" ملاحظہ ہو : کتاب "الأدب المفرد" از : امام بخاری رحمہ اللہ۔ باب (نمبر ۶) جزاء الوالدین۔

خدمت اور دلجوئی کی خاطر کوشاں وسرگرداں رہا کرتے تھے،خود اپنی والدہ کی خدمت واطاعت گذاری کے ساتھ ساتھ دوسروں کو بھی ہمیشہ بطورِ خاص والدین کی عزت' بڑوں کا ہمیشہ احترام اور حسنِ سلوک کی خوب تاکید وتلقین کیا کرتے تھے۔

چنانچہ ایک بار انہوں نے دوافراد کوساتھ ساتھ چلتے دیکھا،ان میں سے ایک کی عمر زیادہ تھی،جبکہ دوسرا نسبتاً کم عمر دکھائی دے رہا تھا،تب انہوں نے ان دونوں سے دریافت فرمایا ''تم دونوں کا آپس میں کیا رشتہ ہے؟'' انہوں نے جواب دیا کہ ''ہم باپ بیٹا ہیں'' اس پر حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے پہلے تو اس منظر پر بڑی مسرت کا اظہار فرمایا کہ ''ماشاء اللہ، باپ بیٹا دونوں ایک ساتھ چلے جارہے ہیں، کتنا اچھا منظر ہے'' اور انہیں دعائیں بھی دیں،اس کے بعد بیٹے کو مخاطب کرتے ہوئے یہ نصیحت فرمائی: لَا تُسَمِّہٖ بِاسْمِہٖ ، وَلَا تَمْشِ أَمَامَه ، وَلَاتَجلِس قَبْلَه ۔ یعنی ''تم کبھی اپنے والد کو نام لے کر نہ پکارنا، کبھی ان سے آگے نہ چلنا، اور کبھی ان سے پہلے نہ بیٹھنا'' (یعنی اگر دونوں کھڑے ہوں، تو جب تک والد نہ بیٹھ جائیں اُس وقت تک تم بھی نہ بیٹھنا، کھڑے رہنا)(۱)

☆......اخلاصِ نیت کا نتیجہ:

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ۷ھ میں تہامہ سے مدینہ آئے تھے،اس کے بعد ماہِ ربیع الأول ۱۱ھ میں رسول اللہ ﷺ اپنے رب سے جا ملے تھے،تقریباً تین سال کے اس مختصر عرصہ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ جس بے مثال جذبہ وشوق اور اہتمام والتزام کے ساتھ آپؐ سے استفادہ اور کسبِ فیض مین مشغول ومنہمک رہے......اور پھر آپؐ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے بعد بھی بہت طویل عرصہ (تقریباً چھیالیس سال) تک دینی علوم

(۱) الأدب المفرد۔ از امام بخاری رحمہ اللہ۔ باب (نمبر۲۳): لایسمی الرجل أباہ......[۴۴]۔

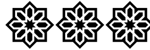
اور بالخصوص آپ ﷺ کی احادیث مبارکہ کی نشر واشاعت اور درس وتدریس کی خاطر انہوں نے جس طرح اپنی تمام زندگی کو وقف کئے رکھا......خلقِ خدا بہت بڑی تعداد میں ان سے مستفید اور فیضیاب ہوتی رہی......نیز یہ کہ اللہ سبحانہ‘ وتعالیٰ کی طرف سے جس طرح انہیں بہت بڑے پیمانے پر ’’قبولِ عام‘‘ نصیب ہوا......یقیناً اس سے اس بے مثال ’’اخلاص‘‘ کی عکاسی ہوتی ہے جو ان کے دل کی گہرائیوں میں راسخ و پیوست تھا۔

☆......وفات:

مدینہ میں وقت گذرتا رہا......مرورِ زمانہ کے ساتھ رفتہ رفتہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ ضعیف ہوتے چلے گئے، آخر ۵۸ھ میں ۷۸ سال کی عمر میں اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے۔

انتقال سے کچھ قبل ان پر رقت اور گریہ کی کیفیت طاری ہونے لگی......تب کسی نے اس گریہ کی وجہ دریافت کی، تو جواب میں یوں فرمایا: أبْـكي لبُعْدِ السّفر...... وقِلّة الزّاد...... یعنی ’’میرے رونے کی وجہ یہ ہے کہ آگے راستہ بہت طویل ہے......جبکہ میرے پاس زادِ راہ بہت مختصر ہے......‘‘۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، اور ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ نیز تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت سے نوازیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۷/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۹/دسمبر ۲۰۱۴ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت طفیل بن عمرو الدَوسی رضی اللہ عنہ:

جزیرۃ العرب میں ''تہامہ'' نامی ایک مشہور علاقہ تھا' جس کا کچھ حصہ آجکل حجاز (سعودی عرب) میں' جبکہ دیگر کچھ حصہ ملکِ یمن میں ہے(۱) وہاں ''دَوس'' نامی ایک قبیلہ آباد تھا، جس کی طاقت اور شان وشوکت کے بڑے چرچے تھے، طفیل بن عمرو نامی شخص اس طاقتور ترین قبیلے کا سردار تھا، نیز یہ کہ زمانۂ جاہلیت میں عرب معاشرے میں جو بڑے بڑے نامی گرامی ''شرفاء'' تھے' جن کی سخاوت وفیاضی' مہمان نوازی' اورشجاعت وبہادری کے بڑے چرچے تھے' اوراسی بناء پرانہیں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا' انہی میں طفیل کا شمار ہوتا تھا۔

طفیل کی سخاوت وفیاضی اورمہمان نوازی کا یہ عالم تھا کہ اس کے گھر میں چولہا کبھی نہیں بجھتا تھا، دروازہ کبھی بندنہیں کیا جاتا تھا، رات ہو یا دن...... ہرایک کیلئے ہروقت اس کے گھر کا دروازہ کھلا رہتا......اوردسترخوان سجا رہتا تھا۔

مزید یہ کہ وہ بہت ہی فصیح وبلیغ قسم کا ادیب' خوش بیان شاعر' شعلہ انگیز خطیب' نیز بہت ہی باذوق' سمجھدار' اوردانشور قسم کا سلجھا ہوا انسان تھا۔

ایک بار طفیل بیت اللہ کی زیارت کی غرض سے اپنے علاقے ''تہامہ'' سے مکہ کی جانب روانہ ہوا۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب مکہ میں رسول اللہ ﷺ اورمشرکین کے مابین کشمکش خوب

(۱) بعض ماہرینِ جغرافیہ کے بقول ''تہامہ'' دراصل اس پہاڑی سلسلے کا نام ہے جوملکِ یمن سے ''مکہ'' تک پھیلا ہوا ہے، بلکہ خود مکہ شہر بھی ''تہامہ'' میں ہی شامل ہے......واللہ اعلم۔

عروج پر تھی، آپؐ شب وروز اور صبح وشام بستی بستی، نگری نگری، گھوم پھر کر اللہ کے دین کی طرف دعوت دینے میں مشغول ومنہمک تھے، اور اس مبارک فریضے کی انجام دہی میں آپؐ کا ہتھیار تھا ''اللہ پر توکل وایمان''......جبکہ مشرکینِ مکہ اپنی تمامتر قوت وتوانائی کے ساتھ آپؐ کا راستہ روکنے پر تُلے ہوئے تھے، اور اس مذموم وناپاک مقصد کی خاطر ان کا ہتھیار تھا ''طاقت وقوت، زور اور زبردستی، دھونس اور دھمکی......''۔

ایسی صورتِ حال میں جب سردارانِ قریش کو طاقتور قبیلے ''دَوس'' کے سردار کی تہامہ سے مکہ آمد کی اطلاع ملی تو انہوں نے اس کا دل جیتنے......نیز اسے رسول اللہ ﷺ سے دور رکھنے کی خاطر......نہایت گرمجوشی کے ساتھ اور خوب پُرتپاک طریقے سے اس کا استقبال کیا، خوب مہمان نوازی اور آؤ بھگت کی، اور پھر رفتہ رفتہ اس کے سامنے رسول اللہ ﷺ کی برائیاں شروع کیں، اور اسے آپؐ سے متنفر کرنے کی کوششوں میں لگ گئے۔

طفیل کو رسول اللہ ﷺ سے متنفر کرتے ہوئے ان مشرکینِ مکہ نے یہ بات بھی کہی کہ (نعوذ باللہ) یہ شخص بہت بڑا پہنچا ہوا جادوگر ہے......اس کے پاس ایسا عجیب وغریب کلام ہے کہ اگر کوئی ایک بار سُن لے......پھر وہ کسی کام کاج کے قابل نہیں رہتا......بس اسی کا دیوانہ ہو کر رہ جاتا ہے......اس نے اپنے اسی جادو کے ذریعے ہمارے معاشرے میں پھوٹ ڈال دی ہے، ہمیں تقسیم کر کے رکھ دیا ہے، جس کی وجہ سے اب ہماری سرداری اور تمام شان وشوکت بھی بڑے خطرے سے دوچار ہو چکی ہے......لہٰذا ایسا نہ ہو کہ ہماری طرح تمہاری قوم بھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو جائے......اور تمہاری سرداری اور شان وشوکت بھی جاتی رہے......

اس تمام صورتِ حال کی وجہ سے یہ سردار ''طفیل'' پریشان ہو گیا، کیونکہ یہ سب کچھ اس کیلئے

بالکل اچانک اور غیر متوقع تھا، نیز یہ کہ وہ اس کشمکش میں فریق نہیں بننا چاہتا تھا......جبکہ مشرکینِ مکہ اسے مسلسل خوفزدہ کرتے ہی رہے......

آخر طفیل نے یہ فیصلہ کرلیا کہ وہ کسی صورت اس شخص (یعنی رسول اللہ ﷺ) سے ملاقات نہیں کرے گا، نہ ان کی کوئی گفتگو سنے گا، نہ ہی ان سے کوئی بات چیت کرے گا، ہر قیمت پر اور بہرصورت ان سے دور ہی رہے گا۔

اسی سلسلے میں سردارانِ قریش کی طرف سے طفیل کو رسول اللہ ﷺ سے خوفزدہ کرنے کی غرض سے خبردار کیا گیا تھا کہ آپؐ اکثر وبیشتر بیت اللہ کے قریب ہی نظر آیا کرتے ہیں......لہٰذا وہاں خاص احتیاط برتنا ضروری ہے۔

چنانچہ طفیل جب بیت اللہ کی زیارت کیلئے روانہ ہونے لگا(۱) تو احتیاطی تدبیر کے طور پر اپنے کانوں میں روئی ٹھونس لی، تا کہ وہاں محمد (ﷺ) اگر موجود ہوئے تو ان کی آواز یا ان کی کوئی بات اس کی سماعت سے نہ ٹکرانے پائے، اور اس طرح یہ اُس ''جادو'' سے محفوظ رہ سکے جس سے اسے خوب خوفزدہ کیا گیا تھا......بیت اللہ کے قریب پہنچنے کے بعد جو صورتِ حال پیش آئی وہ خود طفیل نے بعد میں اپنی زبانی یوں بیان کی ہے:

''میں نے بیت اللہ کے قریب ایک شخص کو کھڑے دیکھا جو کہ ہماری عبادت سے مختلف کسی اور ہی طریقے سے عبادت (نماز) میں مشغول تھا، میں سمجھ گیا کہ یہی محمد (ﷺ) ہیں، مجھے ان کا یہ انداز' اور عبادت کا یہ طریقہ اچھا لگا، اور میں بے اختیار ان کے قریب ہوتا گیا، ان کی شخصیت میں اور سراپا میں مجھے عجیب سی کشش محسوس ہورہی تھی، لہٰذا میں مزید قریب ہو گیا، حتیٰ کہ میرے کانوں میں ان کی تلاوتِ قرآن کی آواز آنے لگی، تب اس موقع پر پہلے

(۱) عرب زمانۂ جاہلیت میں بھی بیت اللہ کی خوب تعظیم وتکریم اور طواف وغیرہ کیا کرتے تھے۔

تو مجھے رؤسائے قریش کی باتیں اوران کی نصیحتیں یاد آنے لگیں، لہٰذا میں نے وہ روئی اپنے کانوں میں مزید اچھی طرح مضبوطی کے ساتھ ٹھونس لی، لیکن پھر جلد ہی ان کا وہ شیریں کلام دوبارہ سننے کیلئے میرا دل بیتاب ہونے لگا، کچھ دیر یہی کشمکش جاری رہی...... آخر میرے دل سے آواز آئی ''اے طفیل! تم کوئی معمولی انسان نہیں ہو، تم اپنی قوم کے رہنما ہو، اتنے بڑے طاقتور قبیلے کے سردار ہو، اور پھر یہ کہ تم اس قدر پہنچے ہوئے ادیب' فصیح و بلیغ خطیب' اور نامی گرامی شاعر بھی ہو، تمہیں اچھے اور برے کلام کی خوب پہچان ہے...... تو پھر...... یہ عجیب حرکت کیوں کررہے ہو کہ اپنے کانوں میں روئی ٹھونس رکھی ہے؟ تمہیں کس بات کا ڈر ہے؟ تمہیں یہ کلام سن لینا چاہئے...... اگر یہ کلام اچھا ہوا تو اپنا لینا، برا ہوا تو چھوڑ دینا......''

دل کی یہ آواز اور ضمیر کی یہ پکار سننے کے بعد طفیل نے اپنے کانوں سے وہ روئی نکال پھینکی، اور تب خوب جی بھر کر رسول اللہ ﷺ کی زبانی اللہ عزوجل کا مبارک و مقدس کلام سنا، دل کی دنیا بدلنے لگی، کفر و شرک اور معصیت و ضلالت کی تاریکیاں چھٹنے لگیں...... اور تب دل میں فوری اور پختہ عزم کرلیا کہ ضرور بضرور رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کرنی ہے...... لیکن اُس وقت سرداران قریش کی موجودگی میں یہ مناسب نہیں سمجھا، البتہ بعد میں بہت جلد ہی رسول اللہ ﷺ کے گھر میں حاضر ہوکر وہاں شرفِ ملاقات حاصل کیا، آمد کا مقصد بیان کیا، تمام ماجرا کہہ سنایا...... تب رسول اللہ ﷺ نے بھی انہیں کچھ سنایا...... ایسا کلام سنایا جس کی تأثیر...... اور جس کی حلاوت طفیل کے دل میں بہت دور گہرائیوں میں پیوست ہوتی چلی گئی...... اور وہ کلام تھا: قُل هُوَاللّٰهُ أحَد ، اللّٰهُ الصَّمَد ، لَم يَلِد وَلَم يُولَد ، وَلَم يَكُن لَهٗ كُفُواً أحَد ۔ یعنی ''کہہ دو کہ اللہ ایک ہے، اللہ بے نیاز ہے، نہ اس کی کوئی اولاد ہے' نہ وہ خود کسی کی اولاد ہے، اور نہ ہی کوئی اس کا ہمسر ہے''۔

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ کلامِ الٰہی سننے کے بعد طفیل زاروقطار رونے لگے، اور پھر کلمۂ حق ''أشهدأن لا الٰہ الا اللہ، وأشهدأن محمداًرسول اللہ'' پڑھتے ہوئے دینِ برحق قبول کیا، نیز نبیٔ برحق (ﷺ) کے دستِ مبارک پر بیعت کی......اور یوں ''تہامہ'' میں آباد مشہورومعروف اور طاقتورترین قبیلے ''دَوس'' کا یہ سردار ''طفیل'' اب رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی ''حضرت طفیل بن عمرو الدَوسی رضی اللہ عنہ'' بن گئے۔

قبولِ اسلام کے بعد حضرت طفیل بن عمرو الدَوسی رضی اللہ عنہ کچھ عرصہ مکہ میں ہی مقیم رہے، اس دوران رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر اللہ کا دین سیکھتے رہے، نیز کچھ قرآن کریم بھی حفظ کیا۔

اور جب مکہ سے واپس اپنے علاقے ''تہامہ'' کی جانب روانہ ہونے لگے تو عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! میں اپنے قبیلے کا سردار ہوں، وہاں میری اطاعت کی جاتی ہے، اس لئے میں وہاں پہنچنے کے بعد اُن لوگوں کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دوں گا، لہٰذا آپ سے میری گذارش ہے کہ آپ اللہ سے میرے لئے دعاء فرمائیے کہ اللہ مجھے کوئی ''نشانی'' عطاء فرمائے، تاکہ جب میں اپنی قوم کو دینِ اسلام کی طرف دعوت دوں، تو اُس موقع پر میں انہیں اس دین کی حقانیت وصداقت کی کوئی نشانی بھی دکھا سکوں''

تب رسول اللہ ﷺ نے دعاء فرمائی: اَللّٰھُمّ اجْعَلْ لَہٗ آیَۃ یعنی ''اے اللہ تو اسے کوئی نشانی عطاء فرما''۔

اور پھر رسول اللہ ﷺ سے الوداعی ملاقات کے بعد حضرت طفیل بن عمرو الدَوسی رضی اللہ عنہ مکہ سے اپنے علاقے کی جانب روانہ ہوگئے، مسلسل سفر کرتے ہوئے جب وہاں پہنچے تو ابھی اپنی بستی سے کچھ فاصلے پر ہی تھے کہ اچانک ان کی دونوں آنکھوں کے درمیان کی جگہ

سے یوں روشنی پھوٹنے لگی جیسے کوئی چراغ جل رہا ہو......تب یہ پریشان ہوگئے، اورسوچنے لگے کہ میری قوم جب یہ منظر دیکھے گی تو اس چیز کو دینِ اسلام کی حقانیت کی نشانی سمجھنے اور متأثر ہونے کی بجائے وہ لوگ یوں کہیں گے کہ ''اس نے چونکہ اپنا دین بدل لیا، اپنے دین سے غداری کی' لہٰذا اس کی سزا کے طور پر اس کی تو شکل ہی بدل گئی......''اورتب انہوں نے اللہ سے دعاء کی کہ یا اللہ تو اس نشانی کو میرے چہرے کی بجائے کہیں اور منتقل فرمادے'' تب وہ روشنی وہاں سے ہٹ گئی، اور انہوں نے اپنے ہاتھ میں جو کوڑا تھام رکھا تھا' اس کے سرے پر آکر خوب چمکنے لگی...... چونکہ وہ پہاڑی علاقہ تھا، ان پہاڑیوں کے درمیان وہ بستی کچھ نشیب میں تھی، یعنی باہر سے بستی کی طرف آنے والا راستہ بلندی سے ڈھلان کی طرف آتا تھا، چنانچہ طفیل بن عمروالدَوسیؓ اپنی بستی کی طرف آتے ہوئے جب اسی بلندی سے ڈھلان کی طرف اتر رہے تھے......تو ان کے قبیلے والوں نے عجیب وغریب منظر دیکھا، کہ ان کے سردار نے ہاتھ میں کوڑا تھام رکھا ہے، اور اس کے سرے پر گویا ایک چمکتی ہوئی قندیل لٹکی ہوئی ہے...... یہ بڑا ہی عجیب وغریب منظر تھا......گویا اوپر پہاڑ کی بلندیوں سے ایک روشنی ان کی جانب چلی آرہی ہے...... جسے دیکھ کر وہ لوگ حیران وپریشان اور انگشت بدندان رہ گئے......

حضرت طفیل بن عمروالدَوسی رضی اللہ عنہ چونکہ اپنے اس قدر طاقتور اور شان وشوکت والے قبیلے کے سردار تھے، اور اسی وجہ سے خود ان کی بھی خوب شان وشوکت اور بڑی حیثیت تھی، لہٰذا اس چیز کے لازمی نتیجے کے طور پر ان کے مزاج میں کچھ تندی وتیزی تھی، جبکہ دعوتِ دین کے کام میں تندی یا درشتی کی بجائے حکمت' محبت' اور نرمی ضروری ہوا کرتی ہے، چنانچہ جب انہوں نے اپنے علاقے میں دعوتِ اسلام کا آغاز کیا تو صورتِ حال کچھ ایسی بنی کہ

سب سے پہلے تو ان کے والد جو کافی عمر رسیدہ تھے' ان کے قریب آئے، تب انہوں نے اپنے والد سے کہا'' آپ ذرہ مجھ سے دور ہی رہیے، کیونکہ اب وہ پہلے والا معاملہ نہیں رہا'' والد نے بڑی حیرت سے دریافت کیا'' کیوں بیٹا؟'' طفیلؓ نے جواب دیا'' میں مسلمان ہو چکا ہوں، محمد ﷺ کا دین اختیار کر چکا ہوں'' والد نے کہا'' ارے میرے بچے! کیا میرا دین کبھی تمہارے دین سے جدا ہو سکتا ہے؟ جو تمہارا دین' وہی میرا بھی دین'' تب طفیلؓ نے کہا'' ٹھیک ہے، آپ جائیے، نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہن کر آئیے'' اس پر ان کے والد گئے اور نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہن کر آئے، اور تب طفیلؓ نے انہیں کلمۂ حق پڑھایا، دینِ اسلام کے بارے میں کچھ بنیادی اور ضروری باتیں بتائیں ......اور یوں طفیلؓ کے عمر رسیدہ والد مسلمان ہو گئے۔

اس کے بعد طفیلؓ کی بیوی ملاقات اور استقبال کی غرض سے آئیں، انہوں نے اسے مخاطب کرتے ہوئے کہا'' تم اب مجھ سے دور ہی رہو'' وہ انتہائی تعجب وحیرت کے ساتھ ان کی جانب دیکھتے ہوئے بولی'' کیوں؟'' انہوں نے جواب دیا'' میں مسلمان ہو چکا ہوں، ہمارے راستے جدا ہو چکے ہیں، اب ہمارا تمہارا کوئی تعلق نہیں'' وہ کہنے لگی'' جو آپ کا دین' وہی میرا بھی دین'' تب انہوں نے اسے تاکید کرتے ہوئے کہا'' ٹھیک ہے، جاؤ، نہا دھو کر صاف ستھرا لباس پہن کر آؤ'' تب اس نے ایسا ہی کیا، جس کے بعد انہوں نے اسے کلمۂ حق پڑھایا، اور وہ بھی مسلمان ہو گئی۔

اس کے بعد حضرت طفیلؓ نے اپنے قبیلۂ دَوس والوں کو دینِ اسلام کی طرف دعوت کا سلسلہ شروع کیا...... چونکہ یہ ان سبھی کے سردار اور فرمانروا تھے...... جبکہ وہ سب ان کے ماتحت' بلکہ ان کی رعیت تھے...... لہٰذا حاکم ومحکوم کے کے مابین تخاطب اور گفتگو کا جو انداز پہلے سے

ہی چلا آرہا تھا، یعنی لہجے میں کچھ سختی اور درشتی تھی، فطری اور غیر اختیاری طور پر وہی انداز اب دعوتِ دین کے موقع پر بھی کافی حد تک برقرار اور اثر انداز رہا، جس کا لازمی نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ ان کے اتنے بڑے قبیلے میں سوائے ایک شخص (حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ) کے باقی کسی نے ان کی بات نہیں مانی' اور صاف انکار کر دیا...... جس پر یہ کافی دلبر داشتہ ہو گئے...... آخر کچھ عرصے بعد انہوں نے دوبارہ مکہ جانے اور وہاں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بارے میں مشاورت کا فیصلہ کیا......

چند ہی دنوں بعد حضرت طفیل رضی اللہ عنہ دوبارہ تہامہ سے مکہ کی جانب عازمِ سفر ہوئے تو اس بار تمام قبیلہ دَوس میں سے ان کے واحد ہم مذہب اور دینی بھائی حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی ہمراہ تھے، دونوں حضرات مکہ پہنچے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابو ہریرہؓ کی یہ پہلی اور مختصر ملاقات تھی......(۱)

اس ملاقات کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: مَا وَرَاءَ كَ يَا طُفيل؟ یعنی "اے طفیل! وہاں آپ کے علاقے میں کیا صورتِ حال ہے؟" (یعنی دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں......؟)

طفیلؓ نے عرض کیا: قُلُوبٌ عَلَيهَا أكِنَّة ، وَكُفرٌ شَدِيد ، لَقَد غَلَبَ عَلَىٰ دَوسٍ الفُسُوقُ وَالعِصيَان ...... یعنی "اے اللہ کے رسول! وہاں تو دلوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں، شدید قسم کا کفر چھایا ہوا ہے، قبیلۂ دَوس والوں پر تو بس فسق و فجور اور نافرمانیوں کا غلبہ ہے......"۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہمارے سردار طفیل کی زبانی یہ بات سن کر......

(۱) حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ گذشتہ صفحات [۳۳۰-۳۴۵] میں گذر چکا ہے۔

رسول اللہ ﷺ اپنی جگہ سے اٹھے، وضوء کیا، دو رکعت نماز ادا کی، اور اس کے بعد دعاء کیلئے اپنے دونوں ہاتھ بلند کر دیئے...... میں نے جب یہ منظر دیکھا تو میں بہت زیادہ خوفزدہ ہوا اور انتہائی پریشان ہو گیا، اور میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: وَا قَـومَـاہ...... (یعنی: ہائے میری قوم) لیکن رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر یوں دعاء شروع کی: اَللّٰھُمَّ اھْدِ دَوْساً وَائتِ بِھِم یعنی''اے اللہ تو قبیلۂ دوس والوں کو ہدایت نصیب فرما، اور انہیں میرے پاس لے آ''۔

مقصد یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے جب حضرت طفیلؓ کی زبانی ان کے قبیلے والوں کے بارے میں یہ بات سنی کہ وہاں تو بس کفر ہی کفر ہے...... اس کے فوری بعد آپؐ نے اٹھ کر وضوء کیا، دو رکعت نماز پڑھی اور پھر دعاء کیلئے اپنے ہاتھ اٹھا دیئے...... تو یہ منظر دیکھ کر حضرت ابو ہریرہؓ یہ سمجھے کہ اب آپؐ دَوس والوں کیلئے بددعاء کریں گے، اور ظاہر ہے کہ نبی کی بددعاء تو رائیگاں نہیں جائے گی، وہ تو ضرور اثر دکھائے گی...... جس کے نتیجے میں اب قومِ دَوس برباد ہو کر رہ جائے گی، وہ سبھی مارے جائیں گے، اور وہ سب اگرچہ کافر و مشرک ہی سہی، لیکن بہرحال وہ ابو ہریرہؓ ہی کی قوم کے لوگ تھے، ان کے ساتھ خاندانی تعلقات تھے، قربتیں تھیں، رشتے داریوں کے سلسلے تھے...... لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے جب دعاء کیلئے ہاتھ بلند کئے تو یہی سب کچھ سوچ کر ابو ہریرہؓ نہایت پریشان ہو گئے اور زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے''ہائے میری قوم''۔

لیکن''رحمۃ للعالمین'' ﷺ نے اس موقع پر جب دعاء شروع کی تو اس میں کسی کیلئے تباہی کا کوئی تذکرہ نہیں تھا...... اس میں تو بس قومِ دَوس کیلئے ہدایت کی دعاء مانگی گئی تھی، اور یہ کہ وہ سبھی لوگ ہدایت پانے کے بعد وہاں سے چلے آئیں اور رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ دیگر تمام

مسلمانوں میں شامل ہو جائیں۔

اس دعاء سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ حضرت طفیلؓ کی طرف متوجہ ہوئے اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِرجِع اِلَیٰ قَومِكَ ، وَارفِق بِهِم ، وَادعُهُم اِلَیٰ الاِسلَام یعنی ''اے طفیل! آپ اپنی قوم کی طرف واپس جایئے، ان کے ساتھ نرمی سے پیش آیئے، اور انہیں دینِ اسلام کی طرف دعوت دیجئے'' (غالباً آپؐ کو اس بات کا اندازہ ہو چکا تھا کہ طفیلؓ کے مزاج میں اپنی قوم کی سرداری کی وجہ سے کچھ سختی ہے، اس لئے آپؐ نے انہیں اپنی قوم کے ساتھ نرمی برتنے اور پیار و محبت کے ساتھ دینِ اسلام کی طرف دعوت کی تاکید فرمائی)۔

چنانچہ یہ دونوں حضرات مکہ سے واپس اپنے علاقے کی طرف لوٹے، اور وہاں پہنچنے کے بعد حضرت طفیل بن عمرو الدَوسی رضی اللہ عنہ اپنی قوم میں مسلسل دعوت و تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے، اور یوں کئی سال بیت گئے، رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمان نبوت کے چودہویں سال کے اوائل میں مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے، اور پھر ۲ھ میں غزوۂ بدر، پھر ۳ھ میں غزوۂ اُحد، اور پھر ۵ھ میں غزوۂ خندق کے اہم ترین واقعات بھی گذر گئے، حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ۷ھ میں جا کر جب ان کے قبیلۂ دَوس کے لوگ کافی تعداد میں دینِ اسلام قبول کر چکے، تب حضرت طفیلؓ اَسّی گھرانوں پر مشتمل اپنی قوم کے افراد کی قیادت کرتے ہوئے تہامہ سے مدینہ آپہنچے......انہی دنوں رسول اللہ ﷺ فتحِ خیبر کے بعد مدینہ واپس تشریف لائے تھے، آپؐ حضرت طفیلؓ اور ان کے ساتھیوں کی مدینہ آمد پر بہت زیادہ مسرور ہوئے، نیز چونکہ یہ سب لوگ محض اپنے دین و ایمان کی حفاظت کی خاطر اپنے گھربار اور اپنا آبائی علاقہ چھوڑ کر مدینہ چلے آئے تھے، لہٰذا ان کی مدد کے طور پر، نیز ان کی دلجوئی کی خاطر آپؐ نے

خیبر سے حاصل شدہ مالِ غنیمت میں سے انہیں بہت کچھ عطاء فرمایا، تاکہ اب یہ لوگ ازسرِ نو یہاں مدینہ میں اپنے گھر بسا سکیں۔

اس کے بعد حضرت طفیل بن عمرو الدَّوسی رضی اللہ عنہ مسلسل رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں رہے......اور اگلے ہی سال یعنی ۸ھ میں ماہِ رمضان میں فتحِ مکہ کا یادگار اور تاریخی واقعہ جب پیش آیا، تو اس موقع پر یہ بھی رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ تھے۔

فتحِ مکہ کے فوری بعد جب یہ تمام حضرات ابھی مکہ میں ہی مقیم تھے، حضرت طفیلؓ نے آپؐ کی خدمت میں عرض کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! ہمارے علاقے [یعنی ''تہامہ'' جہاں اصل میں طفیلؓ اور ان کا قبیلۂ دَوس آباد تھا] میں ایک بہت بڑا بت ہے، اے اللہ کے رسول! میرا جی چاہتا ہے کہ میں ایک بار پھر وہاں جاؤں اور اسے جلادوں(۱) آپؐ نے اجازت مرحمت فرمائی، جس پر حضرت طفیلؓ مکہ سے اپنے اصل علاقے ''تہامہ'' کی جانب مسلسل سفر کرتے ہوئے جب وہاں پہنچے تو ان کے قبیلے کے باقی ماندہ افراد جو ابتک اپنے پرانے دین (یعنی کفروشرک) پر ہی قائم تھے، ان کے سامنے حضرت طفیلؓ اس بڑے بت کو جلانے کی تیاریاں کرنے لگے......تب وہاں لوگوں کا ایک جمِ غفیر اکٹھا ہو گیا، مرد، عورتیں، بچے، چھوٹے، بڑے، سبھی نہایت بے چینی کے ساتھ انتظار کرنے لگے، اور آپس میں یوں چہ میگوئیاں کرنے لگے کہ بس ابھی ہمارے اس بڑے بت کا غضب طفیل پر نازل ہونے ہی والا ہے......بس اب تھوڑی ہی دیر میں یہ شخص ہماری آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہو جائے گا......برباد ہو جائے گا......

اور پھر حضرت طفیلؓ نے ان سب کی نگاہوں کے سامنے......کہ جو سالہا سال سے نسل درنسل

(۱) غالباً وہ بت لکڑی کا ہوگا، اُس زمانے میں پتھر کے بت بھی ہوا کرتے تھے اور لکڑی کے بھی۔

اس بڑے بت کی پوجا کرتے چلے آرہے تھے، اور اسے اپنی قسمت کا اور اپنے نفع ونقصان کا مالک سمجھتے ہوئے ہمہ وقت اس کے سامنے سجدہ ریز رہا کرتے تھے......ان سب کی نگاہوں کے سامنے اس بڑے بت کوجلا کر ریزہ ریزہ کرڈالا......اورتب وہ بس دیکھتے ہی رہ گئے، اپنی کھلی آنکھوں سے جب انہوں نے اپنے اس سب سے بڑے بت کی یہ بے بسی دیکھی کہ ''یہ تو خود اپنی حفاظت بھی نہیں کرسکا'' تب وہ سب فوج درفوج مسلمان ہو گئے......اور یوں حضرت طفیل بن عمر والدَ وسی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں جب وہ بڑا بت جلا......تو اس کے ساتھ ہی اس علاقے میں کفر وشرک کے باقی ماندہ اثرات بھی ہمیشہ کیلئے جل کرنیست ونابود ہو گئے اوران کا نام ونشان مٹ گیا۔

اس کے بعد حضرت طفیلؓ واپس مدینہ لوٹ آئے، زندگی کا سفر پھر رواں دواں ہو گیا، نہایت ذوق وشوق اوراہتمام والتزام کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت سے مستفید و مستفیض ہوتے رہے، حتیٰ کہ آپ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا۔ آپؓ ہمیشہ تا دمِ آخر ان سے بہت ہی مسروراورانتہائی مطمئن رہے۔

حضرت طفیل بن عمر والدَ وسی رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کا دورِ خلافت آیا تو حضرت طفیل بن عمر والدَ وسی رضی اللہ عنہ نے خود اپنے آپ کو' اپنی تلوار کو' نیز اپنے جواں سال بیٹے عمرو کو رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین کی خدمت میں پیش کرتے ہوئے اپنا یہ سبھی کچھ اللہ کے دین کی خدمت اور سر بلندی کیلئے وقف کر دیا۔

رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد بیک وقت بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا، مانعینِ زکوٰۃ کا فتنہ، مرتدین کا فتنہ، جھوٹے مدعیانِ نبوت کا فتنہ......وغیرہ وغیرہ،

الغرض اندرونی سازشوں اور بیرونی یلغاروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا......رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور مسلمانوں کے خلیفۂ اول کی حیثیت سے ان تمامتر فتنوں کی سرکوبی اور بیخ کنی کی ذمہ داری حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آپڑی تھی، جسے انہوں نے بڑی ہی عزیمت واستقامت اور بے مثال شجاعت وبہادری کے ساتھ بحسن وخوبی نبھایا، اور تمام فتنوں کا قلع قمع کیا، اوراس مقصد کیلئے متعدد بڑی جنگوں کی نوبت آئی۔ ان تمام جنگوں کے موقع پر حضرت طفیلؓ اپنے جواں سال بیٹے ''عمرو بن طفیل'' سمیت خوب جوش وجذبے کے ساتھ شریک رہے اور ہمیشہ پیش پیش رہے۔

انہی دنوں (یعنی ۱۱ھ میں) ان جھوٹے مدعیانِ نبوت میں سے بالخصوص مسیلمہ نے اپنے علاقے ''یمامہ'' (۱) میں اس سلسلہ میں بڑا فتنہ پھیلا رکھا تھا، اور بہت سے مرتد قبائل اپنی تمامتر توانائیوں سمیت بہت بڑی تعداد میں اس کے ساتھ جا ملے تھے۔

اس بڑے فتنے کی سرکوبی کی غرض سے حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ، اور پھر شرحبیل بن حسنہ رضی اللہ عنہ کی قیادت میں لشکر ''یمامہ'' کی جانب روانہ کیا تھا (۲) لیکن دونوں بار یہ لشکر اس فتنے کی سرکوبی میں ناکام رہا، اوراسی کیفیت میں واپس مدینہ لوٹنا پڑا، تب حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ نے اس لشکر کی قیادت کیلئے ایک ایسے شخص کا انتخاب فرمایا جسے فنونِ حرب میں مہارت کے حوالے سے ''طلسماتی'' شخصیت تصور کیا جاتا تھا......اور جو اس ''جنگِ یمامہ'' کے بعد بھی عرصۂ دراز تک دشمنانِ اسلام کے سروں پر قہر بن کر ٹوٹتا رہا، جسے خود رسول اللہ ﷺ نے ''سیف اللہ'' یعنی ''اللہ کی تلوار'' کے لقب سے نوازا تھا، یعنی حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ......

(۱) ''یمامہ'' بعینہ وہی علاقہ تھا جہاں آج مشہور شہر ''ریاض'' آباد ہے۔

(۲) البدایہ والنہایہ، مقتل مسیلمۃ الکذاب، جلد:۹، صفحہ:۴۶۵، طبعہ ''دارہجر''، بتحقیق عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی۔

اور جب یہ لشکر حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مدینہ سے اپنی منزلِ مقصود یعنی ''یمامہ'' کی جانب روانہ ہوا تو اس لشکر میں حضرت طفیلؓ اپنے جواں سال بیٹے عمرو سمیت شریک تھے۔

مدینہ سے روانگی کے بعد جب یہ لشکر منزلِ مقصود کی جانب رواں دواں تھا' تب راستے میں ایک روز حضرت طفیلؓ جب نیند سے بیدار ہوئے تو اپنے ساتھیوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگے ''میں نے ایک خواب دیکھا ہے، ہے کوئی جو مجھے اس خواب کی تعبیر بتا سکے؟'' ان کے ساتھیوں نے کہا ''سنائیے اپنا خواب'' تب یہ اپنا خواب بیان کرتے ہوئے کہنے لگے:

''میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ میرا سر منڈا ہوا ہے، اور یہ کہ ایک پرندہ میرے منہ سے نکلا اور فضاء میں اُڑ گیا، اس کے بعد کوئی چیز مجھے نگل گئی اور میں اس کے پیٹ میں پہنچ گیا، نیز یہ کہ میرا بیٹا بڑی بے چینی کے ساتھ مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے، لیکن وہ مجھ تک پہنچ نہیں سک رہا......''

حضرت طفیلؓ کی زبانی یہ خواب سن کر ان کے ساتھی محوِ حیرت ہو گئے، اور پھر ان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے یوں کہنے لگے ''اللہ خیر کرے گا''

تب قدرے توقف کے بعد حضرت طفیلؓ نے کہا ''میں نے اپنے اس خواب کی تعبیر جان لی ہے......میرے منڈے ہوئے سر کا مطلب یہ ہے کہ عنقریب اس جنگ میں میرا سر کٹ جائے گا، جو پرندہ میرے منہ سے نکلا اور فضاء میں اُڑ گیا' اس کا مطلب یہ ہے کہ میری روح میرے جسم سے نکل کر پرواز کر جائے گی، کسی چیز نے مجھے نگل لیا اور میں اس کے پیٹ میں جا پہنچا' اس کا مطلب یہ ہے کہ میں قبر میں جا پہنچوں گا، لہٰذا مجھے امید ہے کہ میں اس جنگ کے موقع پر شہید ہو جاؤں گا......اور میں نے یہ جو دیکھا کہ میرا بیٹا مجھے تلاش کرتا پھر رہا ہے

لیکن وہ مجھ تک پہنچ نہیں سک رہا' اس کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح مجھے اس جنگ کے موقع پر شہادت نصیب ہوگی' اسی طرح وہ بھی شہادت کی آرزو کرے گا، لیکن اس کی یہ خواہش فی الحال پوری نہیں ہوگی، البتہ بعد میں کسی اور موقع پر اس کی یہ خواہش پوری ہو جائے گی اور تب اللہ اسے مجھ سے ملا دے گا''۔

اس کے بعد یہ لشکر مسلسل سفر کرتا ہوا جب ''یمامہ'' پہنچا تو وہاں بڑی ہولناک قسم کی جنگ کی نوبت آئی......یہی وہ جنگ تھی جس میں ایک ہزار سے زائد جو صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے تھے' ان میں ستر حُفاظِ قرآن بھی تھے، جس کے نتیجے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفۂ وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے مسلسل ''جمعِ قرآن'' کے بارے میں اصرار کرتے رہے تھے......اور تب پہلی بار ''جمعِ قرآن'' کا اہم ترین کام سرانجام دیا گیا تھا(۱)

یہ بہت ہی مشکل ترین گھڑی تھی، ایسے میں حضرت طفیل بن عمر والدَوسی رضی اللہ عنہ بڑی بے جگری کے ساتھ لڑتے رہے تھے، تمام جسم زخموں سے چور تھا، لیکن پائے استقامت میں کوئی لغزش نہیں آئی تھی، آخری سانس تک میدانِ کارزار میں بڑی بہادری کے ساتھ ڈٹے رہے تھے، آخر مسلسل لڑتے لڑتے شہید ہو گئے تھے۔

جبکہ ان کا جواں سال بیٹا عمرو بن طفیل بھی اس موقع پر اپنے بہادر باپ کی طرح بڑی بہادری اور انتہائی ثابت قدمی کے ساتھ لڑتا رہا، تمام جسم بری طرح چھلنی اور چور چور ہو گیا، دایاں ہاتھ کٹ کر جسم سے الگ ہو گیا......''یمامہ'' کے میدانِ کارزار میں کہیں گر گیا......اور پھر ہمیشہ کیلئے بس وہیں رہ گیا......

(۱) اس جنگِ ''یمامہ'' کے موقع پر شہید ہونے والے ستر حُفاظِ قرآن صحابۂ کرام میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے بڑے بھائی حضرت زید بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

یوں زخموں سے چور اور نڈھال...... طفیلؓ کا جواں سال بیٹا عمرو اس جنگ کے خاتمے پر جب وہاں سے واپس لوٹنے لگا تو کیفیت یہی تھی کہ اپنے مشفق ومہربان باپ کو' نیز اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کو' ہمیشہ ہمیشہ کیلئے وہیں ''یمامہ'' کے میدان میں چھوڑ کر بوجھل قدموں کے ساتھ مدینہ کی جانب روانہ ہو گیا......

اور پھر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت گذر گیا، اور خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت آیا، تب ایک بار حضرت عمرؓ نے اپنے کچھ ساتھیوں کو کھانے پر مدعو کیا، جو کہ انہی کی طرح اکابر صحابہ میں سے تھے، اتفاقاً اسی وقت یہ جواں سال عمرو بن طفیل بھی وہاں آ پہنچا، تب حضرت عمرؓ نے اسے روک لیا، اور اصرار کیا کہ کھانا ہمارے ساتھ کھا کر جانا...... پھر جب کھانے کا سلسلہ شروع ہوا تو یہ عمرو ایک طرف کہیں چھپ کر بیٹھ گیا، حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اسے مخاطب کرتے ہوئے استفسار فرمایا ''اے نوجوان! تم کھانا کیوں نہیں کھا رہے ہمارے ساتھ؟'' لیکن اس نوجوان نے کوئی خاص جواب نہیں دیا، تب حضرت عمر سمجھ گئے کہ اسے اپنے کٹے ہوئے ہاتھ کی وجہ سے ہمارے ساتھ کھانے کھاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے...... چنانچہ انہوں نے اس سے دریافت کیا کہ ''تمہیں اپنے ہاتھ کی وجہ سے ہمارے ساتھ کھانا کھاتے ہوئے شرم محسوس ہو رہی ہے؟'' اس پر وہ خاموش رہا، اور کچھ نہ بولا...... تب حضرت عمرؓ کھانا چھوڑ کر اپنی جگہ سے اٹھے، اور اس کے قریب جا کر یوں فرمانے لگے ''اللہ کی قسم! ہم میں سے کوئی اس وقت تک کھانا نہیں کھائے گا جب تک تم اپنا یہ کٹا ہوا ہاتھ ہمارے اس کھانے میں نہ لگا لو...... کیونکہ یہ ہاتھ تو اللہ کی راہ میں کٹا ہے'' لیکن اس کے باوجود وہ نوجوان پس وپیش کا اور تردد کا شکار رہا، جبکہ حضرت عمرؓ اصرار کرتے رہے...... آخر اس نوجوان نے اپنا وہ ہاتھ

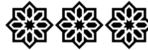
اس کھانے میں لگایا (اُس دور میں ایک ہی بڑا برتن ہوا کرتا تھا جس میں سبھی ایک ساتھ کھانا کھایا کرتے تھے) تب اس نوجوان نے' اور ساتھ ہی خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ و دیگر تمام افراد نے کھانا کھایا......

وقت کا سفر جاری رہا...... یہ نوجوان عمرو بن طفیل اپنے عظیم باپ طفیل بن عمروؓ کی طرح ہمیشہ اللہ کی راہ میں شہادت کا متمنی اور موقع کا منتظر رہا......

آخر ۱۵ھ میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مسلمانوں اور رومیوں کے مابین ''یرموک'' کے مقام پر بہت ہی یادگار اور تاریخی جنگ لڑی گئی......جس کے نتیجے میں سلطنتِ روم کا زمانۂ عروج ہمیشہ کیلئے زوال پذیر ہو گیا......اس جنگ کے موقع پر یہ نوجوان عمرو بن طفیل بن عمرو الدَوسی انتہائی بہادری اور بے جگری کے ساتھ لڑتا ہوا شہید ہو گیا......

اور یوں عظیم باپ کا یہ عظیم بیٹا اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اُس سے جا ملا......

اللہ اپنی رحمتیں نازل فرمائے اپنے اس بندے طفیل پر بھی، اور اس کے بیٹے عمرو پر بھی (رضی اللہ عنہم اجمعین)، نیز اللہ ہمیں جنت الفردس میں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے نوازے۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۲۲/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱۴/دسمبر ۲۰۱۴ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنَّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ:

بہت پہلے کی یہ بات ہے، ملکِ عرب میں ''بنی مَعن'' نامی ایک مشہور قبیلہ تھا، اس قبیلے سے تعلق رکھنے والی ایک عورت تھی جس کا نام ''سُعدیٰ بنت ثعلبہ'' تھا۔

ایک روز وہ حسبِ معمول اپنے گھر میں کام کاج میں مشغول تھی، اور پھر دن بھر کے اس کام کاج اور محنت و مشقت کے بعد جب اسے کچھ فرصت میسر آئی اور گھڑی بھر کیلئے ستانے کی غرض سے وہ اپنے گھر کے آنگن میں بیٹھی ......تو اسے اپنے میکے کی یاد ستانے لگی، ماں باپ اور بھائی بہنوں سے ملاقات کیلئے دل مچلنے لگا......اور پھر اس کا شوہر ''حارثہؓ'' جو کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر گیا ہوا تھا، شام کے وقت جب وہ واپس گھر لوٹا تو سُعدیٰ نے اس کے سامنے اس خواہش کا اظہار کیا......جس پر شوہر نے اسے چند دنوں کیلئے میکے چلے جانے کی اجازت دے دی۔

تب ایک روز سُعدیٰ اپنے محلے کی دیگر چند مسافر عورتوں کے ہمراہ اس علاقے کی جانب روانہ ہوئی جہاں اس کا میکہ آباد تھا، اس سفر میں اس کا کمسن لختِ جگر ''زید'' بھی ہمراہ تھا، جس کی عمر اُس وقت آٹھ سال تھی۔

دورانِ سفر راستے میں کچھ لٹیروں نے حملہ کر دیا، مال و اسباب بھی لوٹا، اور کچھ لوگوں کو قیدی بنا کر اپنے ہمراہ لے گئے، جن میں سُعدیٰ کا کمسن لختِ جگر ''زید'' بھی شامل تھا......سُعدیٰ بیچاری ممتا کی ماری اس ناگہانی آفت پر بس روتی اور سر پیٹتی رہ گئی...... پہلے آنسو بہاتی ہوئی اپنے میکے پہنچی، انہیں بھی خوب رُلایا، اور پھر اپنے گھر چلی آئی......حارثہ نے جب اپنی بیوی کو تنہا آتے دیکھا تو وہ پریشان ہو گیا، سُعدیٰ نے اسے تمام ماجرا کہہ سنایا......تب وہ ہوش و

حواس گنوا بیٹھا، سارا دن بیٹے کے غم میں دردناک اشعار گنگناتا......اس کی تلاش میں نگری نگری......بستی بستی......مارا مارا پھرتا......

اُس دور کے دستور کے مطابق اس بچے کو غلام بنالیا گیا، اور پھر کچھ ہی عرصے بعد جب ''عُکاظ'' کا مشہور سالانہ میلہ لگا تو ان لٹیروں نے اس کمسن نوجوان کو وہاں اس میلے میں فروخت کی غرض سے پیش کیا، اُس وقت اس میلے میں قریشِ مکہ کے نامور اور خوشحال تاجروں میں سے چند افراد خریداری کی غرض سے وہاں موجود تھے، انہی میں سے ''حکیم بن حزام بن خویلد'' (ام المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کے بھتیجے) نامی تاجر نے عکاظ کے اس میلے میں چند کمسن غلام خریدے، جن میں حارثہ اور اس کی بیوی سُعدیٰ کا یہ گمشدہ نورِ نظر ''زید'' بھی شامل تھا۔

حکیم بن حزام (بعد میں مسلمان ہو گئے تھے' لہٰذا ''رضی اللہ عنہ'') ان غلاموں کو ہمراہ لئے ہوئے واپس مکہ پہنچے، ان کی پھوپھی خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا کو جب اپنے بھتیجے کی آمد کی اطلاع ملی، تو وہ ملاقات' نیز خیریت دریافت کرنے کی غرض سے آئیں، تب حکیم نے انہیں بتایا کہ ''پھوپھی جان! میں نے عکاظ کے میلے سے چند غلام خریدے ہیں، جو کہ کم سن ہیں، کیونکہ کم سن غلام کی خود تربیت کی جائے تو آئندہ چل کر اس کے ساتھ مفاہمت اور تعامل میں سہولت رہتی ہے......'' اور پھر حکیم نے مزید کہا ''پھوپھی جان ان میں سے کوئی ایک غلام میری طرف سے آپ کیلئے ہدیہ ہے، آپ کی خدمت انجام دے گا، گھریلو کام کاج کر دیا کرے گا......لہٰذا آپ خود پسند کر لیجئے''

تب خدیجہ نے ان سب غلاموں پر سرسری نظر ڈالی تو انہیں ''زید'' کی شخصیت اور سراپا میں خاندانی شرافت و نجابت کے آثار نمایاں دکھائی دیئے، لہٰذا انہوں نے زید کو پسند کر لیا، اور

اسے اپنے بھتیجے کی طرف سے بطورِ ہدیہ قبول کرتے ہوئے اپنے گھر لے آئیں۔

اس کے بعد کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ خدیجہ (رضی اللہ عنہا) کی شادی تمام بنی نوعِ انسان میں اشرف ترین' اور صادق وامین' یعنی محمد (ﷺ) کے ساتھ ہوگئی (جن کی ابھی تک من جانب اللہ بعثت نہیں ہوئی تھی) اس شادی کے بعد خدیجہ نے اپنے شوہرِ نامدار کی دلجوئی کی غرض سے کچھ ہدایا وتحائف انہیں پیش کئے، جن میں یہ کم سن غلام (زید) بھی شامل تھا۔

یوں اب زید کے شب وروز محمد بن عبداللہ (ﷺ) کی صحبت ومعیت میں گذرنے لگے، کہ جنہیں اُس وقت قبیلۂ قریش میں' اور تمام شہر مکہ میں انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا...... بلکہ عنقریب جنہیں اللہ کی طرف سے نبوت ورسالت سے سرفراز کیا جانے والا تھا، اور صرف قریش ہی کیا......؟ تمام بنی آدم' بلکہ تمام مخلوق میں سب سے افضل وبہتر قرار دیا جانا اللہ کو مقصود تھا۔

دوسری طرف بیٹے کی جدائی اور گم شدگی کے باعث اس کی ماں صدمے سے نڈھال تھی، مسلسل روتے روتے اس کا برا حال ہوگیا تھا، آنسو تھے کہ تھمتے ہی نہیں تھے، دل میں ایسی آگ لگی تھی جو کسی صورت بجھتی نہیں تھی، جو بات اسے مزید اداس اور پریشان کئے رکھتی تھی وہ یہ کہ کاش کسی طرح اسے کم از کم اتنا ہی معلوم ہوجائے کہ اس کا نورِ نظر اور لختِ جگر زندہ ہے...... یا مر چکا ہے؟ اگر زندہ ہے تو اس سے دوبارہ ملنے کی امید باندھ لے، اور اگر مر چکا ہے تو بس رو دھو کر خاموش ہوجائے۔

جبکہ اس بچے کا غمزدہ باپ ''حارثہ'' تو بیٹے کی جدائی میں ہوش وحواس ہی تقریباً کھو بیٹھا، کسی کام کاج کے قابل نہیں رہا، کام کاج کی بجائے دن بھر بیٹے کی تلاش میں چہار سو مارا مارا پھرتا، ہر آنے جانے والے کو روک روک کر اس سے اپنے بیٹے کے بارے میں پوچھتا، دن

پھر بے خودی ولاچاری کی کیفیت میں اشعار گنگنا تا پھرتا، جن کا مفہوم کچھ اس طرح ہے:

''اے میرے بیٹے زید! تیری یاد میں میں کتنا رویا ہوں، میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا کہ میں آخر کیا کروں؟ مجھے کیسے پتہ چل سکے گی یہ بات کہ تو اب تک زندہ ہے' لہٰذا میں تجھ سے دوبارہ ملنے کی امید قائم کرلوں...... یا یہ کہ تو اب اس دنیا میں نہیں رہا' لہذا میں دل پر پتھر رکھ لوں...... تجھے زمین نگل گئی ہے؟ یا آسمان کھا گیا ہے؟ کیا تجھے موت نے اُچک لیا ہے؟ یا ان ظالم پہاڑی راستوں میں تو ہمیشہ کیلئے کہیں کھو گیا ہے؟ ہر صبح طلوع ہوتا ہوا یہ سورج مجھے تیری یاد دلاتا ہے، اور پھر ہر شام غروب ہوتا ہوا یہ سورج مجھے پھر تیری ہی یاد دلاتا ہے، اور تب ڈوبتے ہوئے سورج کے ساتھ میرا دل بھی ڈوبنے لگتا ہے، اور مجھے موت اپنی طرف بڑھتی ہوئی محسوس ہونے لگتی ہے''(۱)

☆......اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا، آتے جاتے موسموں کا سفر جاری رہا......آخر ایک بار موسمِ حج کے موقع پر دور دراز کے علاقوں سے جب بڑی تعداد میں لوگ مکہ آئے ہوئے تھے، زید کے قبیلے کے کچھ لوگ بھی آئے تھے، انہی دنوں ایک روز بیت اللہ کے طواف کے دوران ان میں سے کچھ لوگوں کا اچانک زید کے ساتھ آمنا سامنا ہو گیا، ملاقات ہوئی، صورتِ حال کے بارے میں آگاہی ہوئی، اور پھر ان لوگوں نے حج سے فراغت کے بعد واپس اپنے علاقے میں جا کر زید کے والدین کو اس بارے میں مطلع کیا، تب زید کے باپ حارثہ نے نہایت عجلت میں مکہ روانگی کیلئے سواری کا انتظام کیا اپنے بھائی کعب کو بھی ہمراہ لیا، کچھ مال بھی ساتھ لیا، تاکہ مکہ پہنچنے کے بعد زید کے آقا کو یہ مال بطورِ فدیہ پیش کر کے اپنے نورِ نظر کو آزاد کرایا جا سکے......

(۱) عربی میں اصل اشعار کیلئے ملاحظہ ہو: الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب۔از: ابن عبدالبر۔الرقم المسلسل [۸۰۰]

دونوں نہایت بے چینی کے ساتھ سفر کرتے ہوئے مکہ پہنچے، وہاں لوگوں سے زید کے آقا یعنی رسول اللہ ﷺ کے بارے میں معلومات حاصل کیں، اور پھر آپ ؐ سے ملاقات کی، آمد کا مقصد بیان کرتے ہوئے کہا: یا ابن عبدالمطّلب ، أنتم جيران اللّه ، أنتم تفُكّون العاني ، وتُطعِمون الجائع ، وتُغِيثون الملهوف ......
یعنی ''اے عبدالمطلب کے گھرانے والو! تم اللہ کے پڑوسی ہو، تم لوگ تو قیدیوں کو رہائی دلایا کرتے ہو، بھوکے کو کھانا کھلایا کرتے ہو، پریشان حال کی دستگیری کیا کرتے ہو......

اور لمحہ بھر کے توقف کے بعد نہایت درد بھرے لہجے میں کہا: وقد جئناكَ في ابننا الّذي عندكَ ، وحَمَلنا الَيكَ مِنَ المَالِ ما يفي بهٖ ، فامنُن علينا ، وفادِهٖ لَنا بما تشاء...... ہم آپ کے پاس آئے ہیں اپنے بیٹے کے سلسلے میں جو کہ آپ کے پاس ہے، ہم اپنے ہمراہ کچھ مال بھی لائے ہیں جو اس کی قیمت کے طور پر کافی ہو جائے گا، پس آپ ہم پر یہ احسان کر دیجئے، اور اس کے فدیہ کے طور پر آپ جو چاہیں ہم سے تقاضا کر لیجئے......

اس پر رسول اللہ ﷺ نے قدرے حیرت کے ساتھ دریافت فرمایا ''میرے پاس تمہارا بیٹا، کون ہے وہ؟''

وہ بولے ''آپ کا نوعمر خادم، زید بن حارثہؓ''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''کیا میں تمہیں ایک ایسی تجویز دوں جو تمہارے لئے اس فدیہ سے زیادہ مناسب رہے گی؟''

وہ بولے ''ضرور فرمایئے......کیا ہے وہ تجویز؟''

آپ ؐ نے فرمایا ''میں ابھی اسے یہاں بلاتا ہوں، تم اسے اختیار دینا کہ یا وہ تمہارے ساتھ

جانا پسند کرلے ،اورتب میں تم سے اس کا کوئی فدیہ وصول نہیں کروں گا (یعنی مفت میں تمہارے حوالے کردوں گا) اوریا وہ میرے ساتھ رہنا پسند کرلے،اورتب میں بھی اس سے بے رُخی نہیں برتوں گا (یعنی اگر وہ میرے ساتھ رہنا پسند کرلیتا ہے تو میں اسے زبردستی خود سے دور نہیں کروں گا)

وہ کہنے لگے ''بے شک آپ نے بہت ہی انصاف کی بات کی ہے''

اورتب رسول اللہ ﷺ نے زید کو بلوایا،زید کی آمد کے بعد آپ نے ان دونوں افراد کی جانب اشارہ کرتے ہوئے زید سے دریافت فرمایا ''یہ دونوں کون ہیں ،تم انہیں جانتے ہو؟''

زید نے کہا ''جی ہاں......یہ میرے والد ہیں حارثہ بن شُراحیل ،اوردوسرے میرے چچا ہیں کعب بن شُراحیل''

تب آپؐ نے زید کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''میری طرف سے تمہیں اختیار ہے کہ اگر چاہو تو میرے پاس ہی رہو،اوراگر چاہو تو ان کے ہمراہ چلے جاؤ''

زید نے کسی تردد یا تأمل کے بغیر فوری طور پر جواب دیا ''میں تو آپ کے پاس ہی رہوں گا''

تب وہ دونوں (زید کے والداور چچا) انتہائی حیرت زدہ رہ گئے،اورزید کو یوں کہنے لگے ''زید تمہیں کیا ہوگیا؟ یہ تم کیا کہہ رہے ہو؟ کیا تم اپنے ماں باپ کے ساتھ رہنے کی بجائے یہاں غلامی کی زندگی کو پسند کررہے ہو؟''

زید نے جواب دیا ''میں نے ان کا (یعنی رسول اللہ ﷺ کا) جوحسنِ اخلاق دیکھا ہے' اس کی وجہ سے میں انہیں چھوڑ کر کہیں نہیں جاسکتا''

تب زید کے والداور چچا خوب اصرار کرتے رہے کہ ''زید ہمارے ساتھ چلو' جبکہ زید کی

طرف سے مسلسل انکار کا سلسلہ جاری رہا......

رسول اللہ ﷺ نے جب یہ عجیب وغریب صورتِ حال دیکھی تو آپؐ اپنی جگہ سے اٹھے، اور زید کو ہمراہ لئے ہوئے سیدھے بیت اللہ کے قریب پہنچے جہاں اُس وقت حسبِ معمول قریش کے معزز افراد بڑی تعداد میں موجود تھے، آپؐ نے وہاں پہنچنے کے بعد ان تمام سردارانِ قریش کو مخاطب کرتے ہوئے بآوازِ بلند یوں کہا ''اے جماعتِ قریش گواہ رہنا، آج سے یہ زید میرا بیٹا ہے''

زید کے باپ اور چچا نے جب یہ منظر دیکھا تو یہ سوچ کر کافی مطمئن ہو گئے کہ ''ہمارا بیٹا زید یہاں مکہ میں معزز ترین خاندانِ بنوہاشم میں پرورش پائے گا......مزید یہ کہ جب وہ خود یہاں خوش ہے، تو پھر ہمیں اور کیا چاہئے؟''

اور یوں وہ دونوں مسرور ومطمئن اور ہنسی خوشی مکہ سے واپس اپنے علاقے کی جانب روانہ ہو گئے، اور پھر اپنے علاقے میں پہنچنے کے بعد زید کی ماں کو بھی یہ کہہ کر خوب مطمئن کر دیا کہ ہمارا بیٹا وہاں مکہ میں بہت خوش ہے، وہاں ایک بہت ہی معزز ترین اور انتہائی شریف النفس انسان نے اسے اپنا منہ بولا بیٹا بنالیا ہے، مزید یہ کہ اب وہ گم شدہ تو نہیں ہے، بلکہ ہمیں اب اس کا ٹھکانہ معلوم ہے، لہٰذا جب ہمارا جی چاہے گا ہم وہاں جا کر اس سے مل لیا کریں گے۔

اِدھر مکہ شہر میں بیت اللہ کے قریب تمام سردارانِ قریش کی موجودگی میں رسول اللہ ﷺ نے جب اپنے اس نوعمر غلام (زید) کو اپنا منہ بولا بیٹا بنانے کا اعلان کیا تھا، تبھی سے تمام شہر مکہ میں لوگ اسے ''زید بن محمدؐ'' کے نام سے پکارنے لگے تھے۔

اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا......حتیٰ کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو

تمام دنیائے انسانیت کی رہبری ورہنمائی کی غرض سے مبعوث فرمایا گیا۔

☆ ...... ’’مُتبنّیٰ‘‘ یعنی منہ بولا بیٹا بنانے کی ممانعت:

رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل مکہ شہر میں زید کو آپؐ کے بیٹے کے طور پر پہچانا جاتا تھا، لیکن آپؐ کی بعثت کے بعد قرآن کریم میں ’’تَبَنّی‘‘ کی حرمت کا حکم نازل ہوا، تب آپؐ نے بھی اس حکمِ ربانی کی تعمیل میں زید کے بارے میں یہی معاملہ اپنایا کہ یہ میرا بیٹا نہیں ہے، ہاں البتہ آپؐ کی طرف سے زید کیلئے وہی پرانی عنایتیں اور شفقتیں بدستور جاری رہیں۔

اس سلسلے میں قرآنی تعلیم یہ ہے کہ: وَمَا جَعَلَ أدعِيَاءَكُم أبنَاءَكُم ، ذلِكُم قَولُكُم بِأفوَاهِكُم ، وَاللّٰهُ يَقُولُ الحَقَّ وَهُوَ يَهدِي السَّبِيلَ (۱) یعنی ’’اللہ نے تمہارے منہ بولے بیٹوں کو تمہارا بیٹا نہیں بنایا، یہ تو تمہارے اپنے منہ کی باتیں ہیں، جبکہ اللہ تو حق بات بتاتا ہے اور سیدھی راہ سجھاتا ہے)

اس کے بعد مزید ارشادِ ربانی ہوا: أُدعُوهُم لِآبَائِهِم هُوَ أَقسَطُ عِندَاللّٰه...... (۲) یعنی ’’تم ان [اپنے منہ بولے بیٹوں] کو پکارو ان کے حقیقی باپوں کی طرف نسبت کرکے‘‘۔

یعنی ان آیات میں منہ بولا بیٹا (یا بیٹی) بنانے کی حرمت کا حکم نازل ہوا، اور یہ تاکید کی گئی کہ ہر انسان کو اس کے حقیقی باپ کا بیٹا کہہ کر ہی بلایا جائے اور اسی کی طرف نسبت کی جائے، نہ کہ کسی اور کی طرف۔

دینِ اسلام کی ایک بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہ دینِ فطرت ہے، لہٰذا اسلام کا ہر حکم اللہ کی بنائی ہوئی فطرت کے عین کے مطابق ہے۔

’’تبنّی‘‘ یعنی کسی کو متبنّیٰ یا منہ بولا بیٹا (یا بیٹی) بنانے میں قدم قدم پر ایسی قباحتیں ہیں جو اللہ کی

(۱) الأحزاب [۴] (۲) الأحزاب [۵]

بنائی ہوئی انسانی فطرت سے مکمل طور پر متصادم ہیں۔

چنانچہ جب کوئی میاں بیوی کسی پرائے بچے کو گود لیتے ہیں، اور پھر دنیا کے سامنے' نیز اس بچے کے سامنے بھی ہمیشہ یہی ظاہر کرتے ہیں کہ وہ ان کا حقیقی بچہ ہے، اور وہ اس کے حقیقی ماں باپ ہیں......اسی کیفیت میں وہ بچہ پروان چڑھتا ہے، حتیٰ کہ بڑا ہو جاتا ہے۔

لیکن قانونِ قدرت یہی ہے کہ حقیقت ہرگز ہرگز چھپ نہیں سکتی...... چنانچہ اس بارے میں جب حقیقت منکشف ہوتی ہے تو یہ چیز اس شخص (یعنی منہ بولی اولاد) کیلئے بہت زیادہ ذہنی کرب اور نفسیاتی صدمے کا باعث بنتی ہے، اس کی شخصیت بری طرح ٹوٹ پھوٹ جاتی ہے، جنہوں نے اسے پال پوس کر بڑا کیا' کسی قابل بنایا' اب اس کے دل میں ان کیلئے وہ عزت باقی نہیں رہتی، وہ جذباتی تعلقِ خاطر چکنا چور ہو جاتا ہے......کیونکہ اب وہ اس حقیقتِ حال کو جان چکا ہوتا ہے کہ میرا تو ان کے ساتھ دراصل کوئی رشتہ نہیں ہے، ابتک جو کچھ تھا وہ محض ایک فریب تھا......

مزید یہ کہ......دوسری طرف......جو اس کے اصل والدین ہیں، اب وہ ان کی تلاش میں سرگرداں رہنے لگتا ہے، یہی فکر ہمہ وقت اس کے دل و دماغ پر چھائی رہتی ہے کہ کاش کسی طرح میں ان کا کوئی کھوج لگا سکوں، کسی طرح ان کے بارے میں کچھ جان سکوں کہ وہ کون ہیں اور کہاں ہیں؟ ان کی محبت اسے پریشان کیئے رکھتی ہے، اور اس کے ساتھ ہی اس کے دل میں ان کے خلاف نفرت کے جذبات بھی پروان چڑھنے لگتے ہیں کہ انہوں نے مجھے کیوں چھوڑا؟ کیا ماں باپ ایسے ہوا کرتے ہیں کہ اپنی ہی اولاد کو کسی دوسرے کی جھولی میں ڈال دیں......یا زمانے کے رحم و کرم پر چھوڑ دیں......؟

لہٰذا بیک وقت اس کے دل میں اپنے حقیقی والدین کیلئے محبت اور تڑپ' نیز ان کے خلاف

نفرت وعداوت کے جذبات کی یہ جنگ اس کے دل ودماغ میں جاری رہتی ہے......ظاہر ہے کہ اس جنگ اور اس کشمکش سے کسی اور پر تو کوئی اثر نہیں پڑتا، البتہ خود وہی بے چارہ بس سلگتا رہتا ہے، نفسیاتی صدموں کے شکنجے میں پھنستا چلا جاتا ہے، اور یوں اس کی تمام زندگی اس کیلئے ایک بہت بڑی الجھن بن کر رہ جاتی ہے۔

یہی وہ اسباب ہیں جن کی بناء پر دینِ اسلام میں کسی کو "مُتبنّیٰ" یعنی منہ بولا بیٹا (یا بیٹی) بنانے کی ممانعت ہے۔

☆......رسول اللہ ﷺ کی عظیم شخصیت' بلند اخلاق' اور پاکیزہ سیرت وکردار سے انتہائی متأثر ہونے کی وجہ سے اس نوعمر (زید بن حارثہ) نے اپنے والدین کے ساتھ جانے کی بجائے آپؐ کے ساتھ رہنا پسند کیا، اُسوقت زید کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ جس شخصیت کو انہوں نے اپنے "آقا" کے طور پر پسند کیا ہے' اور اپنے ماں باپ' اپنا خاندان' اپنے بھائی بہن' سبھی پر جس شخصیت کی صحبت ومعیت کو ترجیح دی ہے' وہ تو دراصل صرف زید کے آقا ہی نہیں...... بلکہ انہیں تو اللہ نے تمام جہان والوں کا آقا بنایا تھا، اور اللہ کی طرف سے تمام دنیائے انسانیت کی رہبری ورہنمائی کیلئے انہیں منتخب کیا گیا تھا۔

زید کے تصور میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ عنقریب آسمان سے ایک نیا اور آخری دین نازل ہوگا، اور پھر اس دین کی بنیاد پر اس زمین میں ایک نئی دنیا وجود میں آئیگی، ایک نیا معاشرہ تشکیل پائیگا، ایک نیا نظام قائم ہوگا، اور تب اس نئی دنیا میں' نئے معاشرے میں' وہ گنے چنے چند افراد جنہیں بڑی اہمیت اور بنیادی حیثیت حاصل ہوگی......ان میں زید بھی ہوں گے، بلکہ سرِ فہرست ہوں گے، اور انہیں اس نئی عمارت میں سنگِ بنیاد کی حیثیت حاصل ہوگی، کیونکہ اس واقعے کے بعد جب محض چند سال ہی گذرے تھے کہ اللہ عزوجل کی طرف سے

تمام دنیائے انسانیت کی رہبری ورہنمائی کی خاطر رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی بنا کر بھیجا گیا، اور تب آپؐ کے گھرانے کے ایک فرد کی حیثیت سے زید نے سب سے پہلے دینِ اسلام قبول کیا۔(۱)

☆......جس طرح زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں رہنے کی خاطر اپنا گھر بار چھوڑا، اپنے ماں باپ کو چھوڑا، نیز جس طرح ان کے دل کی گہرائیوں میں رسول اللہ ﷺ کیلئے محبت وعقیدت اورعزت واحترام کے جذبات خوب راسخ ہو چکے تھے......بعینہٖ اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی ہمیشہ زید پر بہت زیادہ شفقت وعنایت فرماتے رہے، آپؐ نے زید کو ہمیشہ اپنے گھر کا فرد سمجھا، گھر کے دیگر افراد کے ساتھ آپؐ کا جو رویہ وسلوک تھا' وہی رویہ زید کے ساتھ بھی تھا' نیز گھر کے کسی بھی فرد کو جو حیثیت اور اہمیت حاصل تھی' وہی زید کو بھی حاصل تھی۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ اگر کبھی کسی سفر کے موقع پر گھر سے دور جاتے تو رسول اللہ ﷺ اداس ہو جاتے، زیدؓ واپس آتے تو آپؐ بھی مسرور ومطمئن ہو جاتے، خوب والہانہ انداز میں مسرت کا اظہار فرماتے، اوراس طرح گرمجوشی کے ساتھ زید کا استقبال فرماتے کہ یہ سعادت کسی اور کو نصیب نہیں ہو سکی۔اسی کیفیت میں مکہ میں وقت گذرتا رہا......

☆......نبوت کے تیرہویں سال کے آخر میں جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا تب اس حکم کی تعمیل کے طور پر رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے، اور پھر چند ہی روز بعد جب زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ مدینہ پہنچے، تب فرطِ مسرت

(۱) یہاں یہ وضاحت ہو جائے کہ عورتوں میں سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ، بچوں میں سب سے پہلے حضرت علیؓ، غلاموں میں سب سے پہلے حضرت زید بن حارثہؓ، جبکہ آزاد مردوں میں سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیقؓ مشرف باسلام ہوئے۔جبکہ مجموعی طور پر سب سے پہلے حضرت خدیجہؓ مسلمان ہوئی تھیں۔

کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کی جو کیفیت تھی اس کی منظر کشی کرتے ہوئے ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

''زید بن حارثہ جب مدینہ پہنچے اُس وقت رسول اللہ ﷺ میرے گھر میں تشریف فرما تھے، اوراس وقت آپؐ نے محض ایک تہبند باندھ رکھی تھی، زید نے جب گھر کا دروازہ کھٹکھٹایا تو آپؐ اسی کیفیت میں اپنی تہبند تھامے ہوئے دروازے کی طرف لپکے، زید کو گلے سے لگایا اور بوسہ بھی دیا، میں نے آپؐ کو اس کیفیت میں دروازے پر جاتے ہوئے نہ کبھی اس سے قبل دیکھا تھا اور نہ کبھی اس کے بعد دیکھا''۔(۱)

☆......ہجرت کے بعد اب یہاں مدینہ میں وقت کا سفر جاری رہا......رسول اللہ ﷺ کیلئے زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ گھر کے فرد کی مانند تو پہلے ہی تھے......اب مزید ہر دم اور ہر لمحہ یہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا......

مدنی زندگی میں مخالفین ومشرکین کی طرف سے مسلمانوں کو مسلسل جارحیت کا سامنا کرنا پڑا' جس کے نتیجے میں متعدد غزوات کی نوبت آئی، ایسے میں ہر غزوے کے موقع پر زیدؓ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت شریک رہے' بلکہ پیش پیش رہے، اور بے مثال شجاعت وجرأت کا خوب مظاہرہ کرتے رہے۔

☆......''غزوۂ موتہ:

آخر ۸ ھ میں ایک بہت بڑی آزمائش سامنے آ کھڑی ہوئی، ہوا یہ کہ ۶ ھ میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''صلحِ حدیبیہ'' کے نام سے جو مشہور تاریخی معاہدہ طے پایا تھا، اس

(۱) ترمذی[۲۷۳۲] باب ماجاء فی المعانقۃ والقبلۃ۔ اس حدیث کی ابتداء اس طرح ہے: قَـدِمَ زَيْـدُ بْـنُ حَارِثَةَ المَدِينَةَ وَرَسُولُ اللّٰهِ ﷺ فِي بَيْتِي......

کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ کی جانب سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تھی، تب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے اس مبارک سلسلے کو مزید وسعت دینے کا فیصلہ فرمایا تھا، اسی سلسلے میں ان دنوں مختلف فرمانرواؤں، حکمرانوں، امراء وسلاطین، اور والیانِ ریاست کو خطوط ارسال کئے گئے تھے، جن میں انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت دی گئی تھی۔

اسی سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے حارث بن عمیر الأزدی رضی اللہ عنہ ''بُصریٰ'' کے فرمانروا کے نام تحریر فرمودہ آپؐ کا نامۂ مبارک لئے ہوئے جب مدینہ سے بُصریٰ کی جانب محوِ سفر تھے...... تب راستے میں ملکِ شام کی حدود میں ''بلقاء'' نامی ریاست (جو کہ سلطنتِ روم کے تابع تھی) کے فرمانروا شرحبیل الغسانی نے انہیں روکا، تشدد کا نشانہ بنایا، اور پھر انتہائی سنگدلی وسفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑنے کے بعد انہیں قتل کر ڈالا......

رسول اللہ ﷺ کو جب اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ملی تو آپؐ انتہائی رنجیدہ ہوگئے، کیونکہ کسی نہتے اور بے قصور انسان کو...... بالخصوص غیر ملکی قاصد اور سفارتی نمائندے کو ناحق یوں قتل کر ڈالنا یقیناً بہت ہی بڑا جرم تھا، مزید یہ کہ یہ سفارتی آداب کی سنگین خلاف ورزی بھی تھی۔

رسول اللہ ﷺ نے یہ انتہائی افسوسناک بلکہ المناک واقعہ پیش آنے پر یہ فیصلہ فرمایا کہ اب رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی ضروری ہوچکی ہے، چنانچہ تین ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر سلطنتِ روم کی جانب روانہ کیا گیا، اس موقع پر آپؐ نے اس لشکر کا سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، اور یہ وصیت فرمائی کہ زید کے بعد سپہ سالاری کے

فرائض جعفر بن ابی طالب انجام دیں گے، اوران کے بعد عبداللہ بن رواحہ (جو کہ انصارِ مدینہ میں سے تھے) انجام دیں گے، اوران کے بعد تم باہم مشاورت کے بعد کسی کو اپنا سپہ سالار منتخب کر لینا (گویا رسول اللہ ﷺ کو اس موقع پر من جانب اللہ خبر دے دی گئی تھی کہ اس موقع پر یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے شہید ہو جائیں گے)

اور پھر یہ لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مدینہ منورہ سے سوئے منزل رواں دواں ہو گیا......

طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب یہ مبارک لشکر جزیرۃ العرب اورسلطنتِ روم کے مابین سرحدی علاقے میں پہنچا تو وہاں ''مُوْتہ'' نامی مقام پر (جو کہ رفتہ رفتہ تقسیم در تقسیم کے سلسلوں کے بعد موجودہ ''اُردن'' میں واقع ہے) جو صورتِ حال جو نظر آئی وہ نہایت خلافِ توقع اور انتہائی پریشان کُن تھی، کیونکہ وہاں منظر کچھ ایسا تھا کہ سامنے رومیوں کی ایک لاکھ فوج مقابلے کیلئے تیار تھی، مزید یہ کہ اس سرحدی علاقے میں آباد بہت سے عرب قبائل (غسان وغیرہ) جو دینی' معاشی' وسیاسی طور پر سلطنتِ روم ہی کے تابع تھے' انکے ایک لاکھ جنگجو بھی یہاں رومی فوج کے شانہ بشانہ موجود تھے......یعنی صورتِ حال یہ بنی کہ ایک طرف مسلمان محض تین ہزار......جبکہ دوسری جانب ان کے بالمقابل دولاکھ مسلح اور چاق وچوبند جنگجوؤں پر مشتمل بہت بڑا لشکرِ جرار......مسلمان اپنے وطن سے دور پردیس میں......جبکہ دشمن اپنی سرزمین پر......مسلمانوں کو اشیائے خوردونوش ودیگر ضروری اسباب کی شدید قلت کا سامنا......جبکہ دشمن کے پاس ہر قسم کے اسباب کی خوب فراوانی۔

اس خلافِ توقع صورتِ حال کی وجہ سے مسلمان کچھ تردد کا شکار ہو گئے، دوروز تک باہم مشاورت کا سلسلہ چلتا رہا، آخر باہمی مشاورت کے اس سلسلے کے بعد یہ طے پایا کہ ہمارا

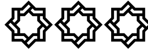
مقصد تو محض...... یا فتح ہے...... یا شہادت......لہٰذا پیش قدمی کی جائے۔

چنانچہ پیش قدمی شروع ہوئی......فریقین میں کوئی توازن ہی نہیں تھا......ایک طرف فقط تین ہزار مسلمان، اور وہ بھی گھر سے بے گھر، وطن سے بہت دور، یہاں دشمن کی سرزمین پر...... جبکہ دوسری جانب دولاکھ جنگجو......خود اپنی ہی سرزمین پر اور اپنے ہی علاقے میں...... مگر اس کے باوجود......دونوں جانب سے نہایت زوردار یلغار ہوئی......زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ سپہ سالار کی حیثیت سے پیش پیش تھے، رسول اللہ ﷺ نے خود اپنے دستِ مبارک سے زید کو نامِ خدا کا جو جھنڈا اتھمایا تھا......اس مبارک جھنڈے کو بلند رکھنے کیلئے' اور اس کی حرمت وعظمت کو ہر قیمت پر قائم ودائم رکھنے کیلئے اُس روز زیدؓ نے شجاعت وبہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ شاید چشمِ فلک نے اس سے قبل کبھی ایسے مناظر نہیں دیکھے ہوں گے......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عنایت فرمودہ اس مبارک جھنڈے کو بلند رکھنے کی خاطر وہ آخری دم تک نہایت ثابت قدمی کے ساتھ میدان میں ڈٹے رہے، بیشمار تلواروں' تیروں' اور نیزوں نے ان کے تمام جسم کو چھلنی کرڈالا، اور پھر آخر ان بیشمار زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے''مُؤتہ'' کے میدان میں' وطن سے بہت دور......اپنے گھر سے بہت دور...... اپنے شہر مدینہ سے بہت دور......اپنے پیاروں سے بہت دور......اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے عنایت فرمودہ اس مبارک جھنڈے کی حرمت وعظمت کو برقرار رکھنے کی خاطر......زیدؓ نے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا......اپنی جان قربان کردی......مگر اس مبارک جھنڈے کو کسی صورت سرنگوں نہیں ہونے دیا......

یوں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ' جنہیں رسول اللہ ﷺ نے اپنے بچوں کی طرح پالا تھا، اپنے گھر کا ایک فرد بنایا تھا......جن کے ساتھ آپ ؐ کا بہت ہی گہرا اور قریبی تعلق تھا......

اور بہت ہی جذباتی قسم کا لگاؤ تھا...... ۸ھ میں ''مؤتہ'' کے میدان میں اپنے اللہ سے جا ملے، جب ان کی عمر تینتالیس سال تھی۔

اُدھر مدینہ میں رسول اللہ ﷺ جب تعزیت کی غرض سے زیدؓ کے گھر پہنچے، ان کے اہلِ خانہ کو تسلی دی، اور صبر کی تلقین کی، اور پھر جب اُٹھ کر وہاں سے واپس روانہ ہونے لگے تو کیفیت یہ ہوئی کہ زیدؓ کی کمسن بیٹی بار بار آپؐ کی ٹانگوں کے ساتھ لپٹ جاتی......اور خوب بلک بلک کر روتی......تب آپؐ کی آنکھوں سے بھی زاروقطار آنسو بہنے لگے......اور یوں زیدؓ کے گھر والوں کو صبر کی تلقین کرتے کرتے......خود آپؐ پر بھی گریہ طاری ہو گیا...... (۱)



(۱) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی ایک بہت بڑی فضیلت و منقبت یہ ہے کہ تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی برگزیدہ ترین جماعت میں سے یہ واحد شخصیت ہیں جن کا تذکرہ قرآن کریم میں نام لے کر کیا گیا ہے:
﴿فَلَمَّا قَضَیٰ زیدٌ مِنهَا وَطراً زوَّجنَاکَهَا لِکَي لَایَکُونَ عَلَیٰ المُؤمِنِینَ حَرَجٌ﴾ (الاحزاب:۳۷)

الحمد للہ آج بتاریخ ۳۰/صفر ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۲/دسمبر ۲۰۱۴ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ:

مکہ شہر میں جب رسول اللہ ﷺ کی بعثت ہوئی اور شہر مکہ نورِ نبوت سے جگمگانے لگا' خالقِ ارض وسماء کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کو تمام دنیائے انسانیت کیلئے رہبر ورہنما بنا کر بھیجا گیا......

اُن دنوں شہر مکہ میں ایک نوجوان تھا، انتہائی حسین وجمیل، بہت ہی پُرکشش شخصیت کا مالک، بہت زیادہ ناز ونعم میں جس کی پرورش ہوئی تھی، اپنے ماں باپ کا وہ انتہائی لاڈلا اور پیارا تھا، تمام شہر مکہ میں سب سے زیادہ خوش لباس' خوش منظر' سلیقہ مند' اور لائق وفائق تھا، ہمیشہ قیمتی' جاذبِ نظر' اور دیدہ زیب قسم کی پوشاک پہنتا، فرحت آمیز قسم کے عطر بکثرت استعمال کرتا، اور ہمہ وقت خوشبوؤں میں رچا بسا رہتا، جس گلی محلے سے گذر جاتا لوگوں کو پتہ چل جاتا کہ وہ نوجوان یہاں سے گذرا ہے......غرضیکہ ناز ونعم' نفاست' اور حسن وجمال میں تمام شہر مکہ میں وہ اپنی مثال آپ تھا......

مزید یہ کہ اس ظاہری خوبصورتی اور خوش پوشی کے ساتھ ساتھ سلیقہ وشعار' عقلمندی' معاشرتی آداب واخلاق اور رکھ رکھاؤ میں بھی وہ یکہ وتنہا تھا، تمام شہر مکہ کے نوجوانوں میں کوئی اس کا ہم پلہ نہیں تھا، یہی وجہ تھی کہ نوجوانوں کی جتنی محفلیں سجتیں' ان سب میں اس کی موجودگی کو ضروری سمجھا جاتا......اس نوجوان کا نام تھا مُصعب بن عمیر۔

اُس معاشرے میں چونکہ فصاحت وبلاغت اور شعر وشاعری کی بہت بڑی اہمیت تھی، لہٰذا نوجوانوں کی مختلف ادبی تنظیمیں بھی بکثرت وہاں موجود تھیں، چونکہ شعر وشاعری کے لحاظ سے بھی مصعب کا دلکش اور منفرد انداز تھا اس وجہ سے ادبی دنیا اور شعر وسخن کی محفلوں

میں بھی اسے خاص مقام حاصل تھا، اوراسے ہرمحفل کی جان اور ہرمجلس کی رونق تصور کیا جاتا تھا، اور یوں یہ نوجوان مصعب سبھی کی آنکھوں کا تارا بنا ہوا تھا......

☆ ......اُن دنوں چونکہ ہرمحفل میں رسول اللہ ﷺ کی شخصیت موضوعِ گفتگو بنی رہتی تھی، بالخصوص اس حوالے سے کہ آپؐ پراللہ کی طرف سے جو پاکیزہ کلام نازل کیا جاتا تھا، آپؐ وہ کلامِ حق مکہ والوں کوسناتے، اورانہیں دینِ برحق کی طرف دعوت دیتے، قریش کے بڑے بڑے شعراء واُدباء اپنی تمامترفصاحت وبلاغت کے باوجود......نیز رسول اللہ ﷺ کے خلاف اپنی تمامترنفرت اورعداوت کے باوجود......اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز وقاصر تھے، چنانچہ وہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ کلامِ الٰہی سنتے اوربس منہ تکتے رہ جاتے......حیران وپریشان......اورانگشت بدندان......

☆ ......چونکہ ان دنوں ہرمحفل میں یہی بات موضوعِ گفتگو بنی رہتی تھی......جبکہ ایسی کوئی محفل تھی نہیں جہاں مصعب کی آمدورفت نہو......لہٰذا یہ باتیں مصعب کے کانوں تک بھی پہنچیں......اورپھراسے دینِ برحق اورنبیٔ برحق کے بارے میں علم ہواتو اسے اپنے قلب وجگر میں رسول اللہ ﷺ کی مبارک شخصیت کیلئے بہت زیادہ کشش محسوس ہونے لگی، اوراب اس کے شب وروزاسی بےچینی میں گذرنے لگے کہ کاش کسی طرح نبیٔ برحق' پیغمبرِ اسلام' محسنِ انسانیت' رسول اکرم' صلیٰ اللہ علیہ وسلم' کی خدمت میں حاضری کاشرف نصیب ہوسکے، اوروہ اللہ عزوجل کی جانب سے ان کے قلبِ مبارک پرنازل شدہ وہ کلام براہِ راست خودانہی کی زبانی سن سکے۔

☆ ......اُن دنوں رسول اللہ ﷺ بیت اللہ سے متصل ''صفا'' پہاڑی کے دامن میں واقع ''دارالأرقم'' نامی ایک مکان میں مقیم تھے، گنے چنے محض چندافراد جوکہ دعوتِ حق پرلبیک

کہتے ہوئے مسلمان ہو چکے تھے، آپؐ انہیں وہاں خفیہ طور پر دین کی تعلیم دیا کرتے تھے۔ نوجوان مصعب بہت بے چین رہتا کہ کاش کسی طرح اسے بھی وہاں تک رسائی نصیب ہو سکے...... آخر ایک روز خوب ہمت مجتمع کر کے سردارانِ قریش کی عقابی نگاہوں سے بچتا بچاتا یہ نوجوان وہاں جا پہنچا...... رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضری ہوئی، ملاقات کا شرف نصیب ہوا، بصد شوق اور نہایت ہی توجہ اور دلچسپی کے ساتھ آپؐ کی مبارک گفتگو سنی، جب بھی آپؐ کے ہونٹوں پر جنبش ہوتی اور آپؐ کے ان مبارک ہونٹوں سے کوئی لفظ ادا ہوتا...... تب مصعب کو یوں محسوس ہوتا کہ گویا کسی توقف کے بغیر وہ لفظ فوری طور پر مصعب کے کانوں سے ہوتا ہوا دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جاتا ہے...... اور یوں دیکھتے ہی دیکھتے نوجوان مصعب کا دل ایمان کے نور سے منور ہونے لگا...... تب فوراً ہی کسی تردد کے بغیر مصعب نے اپنی زبان سے کلمۂ حق ''أشھدأن لا الٰہ الا اللہ، وأشھدأن محمداًرسول اللہ'' پڑھا، اور دینِ برحق قبول کر لیا...... عین اسی لمحے رسول اللہ ﷺ نے اپنا دایاں ہاتھ بڑھایا اور مصعب کے سینے پر رکھ دیا، اور جب آپؐ کے دستِ مبارک کا یہ لمس مصعب نے اپنے سینے میں اور پھر دل کی گہرائیوں میں محسوس کیا تو اسے اپنے شعور و وجدان میں ایک عجیب سا سکون محسوس ہوا، ایسا سکون جو کہ اس سے قبل اپنی تمام تر ظاہری شان و شوکت، عیش و عشرت، راحت و آرام، اور ہر قسم کی لذتوں سے بھرپور زندگی کے باوجود اسے کبھی نصیب نہیں ہو سکا تھا...... آج سے قبل اس بے مثال اور انمول سکون کی لذت سے وہ ہمیشہ محروم اور ناآشنا ہی رہا تھا...... اور یوں یہ نوجوان مصعب اب رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بن گئے...... اور یہی وہ تاریخی لمحہ تھا جب مصعبؓ کے دل کی دنیا ہمیشہ کیلئے بدل گئی، مصعب کے شب و روز بدل گئے، طور طریقے

بدل گئے......اور سبھی انداز بدل گئے......

☆......یہ دینِ اسلام کے اُس ابتدائی دور کی بات ہے جب مکہ شہر میں مسلمانوں پر ظلم وستم ڈھانے والے بڑے بڑے ظالم وجابر بڑی تعداد میں موجود تھے، ایک سے ایک بڑھ کر جفاگر اور ستمگر اُس معاشرے میں پایا جاتا تھا......اُن سب کا خوف اپنی جگہ......لیکن مصعبؓ کے ساتھ عجیب معاملہ تھا کہ انہیں اپنے قبولِ اسلام کی وجہ سے ان تمام پہنچے ہوئے سرکشوں اور ستمگروں سے بڑھ کر جس شخصیت کی طرف سے سب سے زیادہ خوف دامنگیر تھا اور جس کی وجہ سے انہیں سب سے زیادہ پریشانی لاحق تھی، وہ کوئی غیر نہیں، بلکہ وہ خود ان کی اپنی ماں تھی......جو کہ بہت زیادہ غصیلی اور انتہائی جھگڑالو قسم کی عورت تھی، مزید یہ کہ وہ چونکہ بہت زیادہ مالدار اور خوشحال بھی تھی، لہٰذا اس چیز نے اسے اور زیادہ مغرور، خودسر، اور ضدی بنادیا تھا۔

چنانچہ مصعبؓ نے غور وفکر کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ فی الحال کچھ عرصہ تک اپنے قبولِ اسلام کے واقعہ کو صیغۂ راز میں ہی رکھا جائے......لیکن یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مکہ شہر میں کسی راز کا زیادہ عرصے تک چھپا رہنا ممکن نہیں تھا، ہر گلی کوچے میں، ہر محلے میں، ہر راستے پر، اور ہر قدم پر رؤسائے قریش کے چھوڑے ہوئے کارندے دندناتے پھرتے تھے، اپنی عقابی نگاہوں کے ساتھ ہر ایک کے تعاقب میں رہتے تھے، اور ہر ایک پر گہری نظر رکھتے تھے کہ کہیں کوئی مسلمان تو نہیں ہو گیا......

چنانچہ مصعبؓ کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا......ان کے قبولِ اسلام کا معاملہ زیادہ عرصے تک راز نہ رہ سکا......ایک روز کسی نے انہیں خفیہ طور پر ''دارالأرقم'' میں داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا، اور پھر چند روز ہی گذرے تھے کہ اسی شخص نے انہیں کسی جگہ رسول اللہ ﷺ کی طرح

نماز پڑھتے دیکھا......تب اس سے صبر نہ ہو سکا، اور اس نے یہ راز کی بات مصعبؓ کی ماں کے گوش گذار کر دی۔

اور تب مصعبؓ کی دنیا بدل گئی......وہ تمام تر نعمتیں، راحت و آرام کا وہ تمام تر انتظام، ناز و نعم سے بھر پور وہ زندگی...... یہ سب کچھ اب خواب و خیال ہو کر رہ گیا......سبھی کچھ چھن گیا...... ماں نے بہت کوشش کی، کبھی نرمی سے، اور کبھی سختی سے......کہ اس کا لاڈلا بیٹا اس نئے دین سے برگشتہ ہو جائے......وہ بہت گرجتی اور برستی رہی......شعلے اگلتی رہی......لیکن مصعبؓ کی عزیمت و استقامت کے سامنے اس کا وہ جاہ و جلال' وہ غصہ اور وہ اشتعال......اور وہ ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ......سب بیکار ثابت ہوا......آخر تنگ آ کر اس نے اپنے چند رشتے داروں کی مدد سے مصعبؓ کو پکڑ کر زبردستی گھر میں نسبتاً ایک الگ تھلگ کمرے میں قید کر دیا، یوں گھر کے اس حصے کو اب گویا مصعبؓ کیلئے ''قید خانے'' کے طور پر مخصوص کر دیا گیا۔

اب مصعبؓ کے شب و روز اسی ''قیدِ تنہائی'' میں بسر ہونے لگے، آمد و رفت' گھومنا پھرنا' یہ تمام سلسلے اب بند ہوئے، تمام تر راحتیں اور نعمتیں خواب و خیال ہو گئیں......اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری کا اور استفادے کا وہ مبارک سلسلہ بھی منقطع ہو گیا، یہ ان دنوں کی بات ہے جب نبوت کا پانچواں سال چل رہا تھا......

گھر کے ایک کونے میں واقع الگ تھلگ اس چھوٹی سی کوٹھڑی میں وقت کا سفر اسی طرح جاری تھا کہ......ایک روز کسی طرح مصعبؓ کو یہ خبر ملی کہ مشرکینِ مکہ کے مظالم سے بچنے کیلئے مسلمانوں کی ایک جماعت خفیہ طور پر ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کرنے والی ہے......تب مصعبؓ نے اس قید خانے کے اندر رہتے ہوئے بڑی مشکل سے کسی طرح اُن مسلمانوں

تک یہ پیغام پہنچایا کہ ''میں بھی تمہارے ہمراہ ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کرنا چاہتا ہوں'' تب یہ خفیہ پیغام رسانی کا 'نیز اس خفیہ سفر کیلئے منصوبہ بندی کا سلسلہ آگے بڑھتا رہا، اور مصعبؓ کی ماں کو اس بارے میں کچھ خبر نہ ہو سکی...... بالآخر ایک روز مصعبؓ اپنے گھر سے بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے، اور ان مسلمانوں سے جا ملے، اور پھر انہی کے ہمراہ...... اللہ کا نام لے کر...... مکہ سے بہت دور...... ملکِ حبشہ کی جانب روانہ ہو گئے......

☆......ملکِ حبشہ میں قیام کے دوران کسی نے ان مسلمانوں کو یہ خبر دی کہ تمام مشرکینِ مکہ دینِ اسلام قبول کر چکے ہیں......جس پر ان مسلمانوں میں سے کچھ نے اب ملکِ حبشہ سے واپس اپنے وطن مکہ لوٹ جانے کا فیصلہ کیا، جبکہ باقی کچھ نے کہا کہ جب تک باوثوق ذرائع سے اس خبر کی مکمل اور حتمی تصدیق نہ ہو جائے' اُس وقت تک محض سنی سنائی اس بات پر بھروسہ کرتے ہوئے اتنا بڑا اقدام (یعنی واپس مکہ لوٹ جانا) مناسب نہیں۔

چنانچہ جو لوگ واپس مکہ چلے آئے......انہیں یہاں آمد کے بعد معلوم ہوا کہ یہ خبر سراسر غلط تھی......اور یوں یہ مسلمان اب از سرِ نو انہی مشرکینِ مکہ کے شکنجے میں آ پھنسے کہ جن سے نجات کی خاطر انہوں نے یہاں سے ہجرت کی تھی......انہی مسلمانوں میں نوجوان مصعبؓ بھی شامل تھے۔

☆......حبشہ سے واپسی پر مصعبؓ کی ماں نے انہیں دوبارہ اُسی طرح اس قید خانے میں بند کرنے کی کوشش کی، اور اس مقصد کیلئے حسبِ سابق اپنے کچھ رشتے داروں سے مدد چاہی......لیکن اس بار مصعبؓ کو جب اس بات کا علم ہوا تو اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ ''جو کوئی اس ظلم میں میری ماں کا ساتھ دے گا......مجھ سے جس طرح بھی بن پڑا......میں ضرور اسے قتل کر ڈالوں گا''

مُصعَبؓ کی ماں کو اس بات کا بخوبی احساس تھا کہ مصعب اپنے قول کا کتنا پکا ہے، جو کہتا ہے کر گذرتا ہے...... جب ٹھان لیتا ہے...... تو پھر کسی صورت پیچھے نہیں ہٹتا...... تب یہ سوچ کر آخر اس نے اپنے بیٹے مصعب کو دوبارہ قید کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☆...... البتہ اب مصعب کی طرف سے مایوس اور ناامید ہو کر ماں نے ہمیشہ کیلئے جدائی کا فیصلہ کر لیا...... اور تب اس نے خوب روتے ہوئے مصعب کو یوں کہا ''جاؤ...... آج کے بعد ہمارا ایک دوسرے کے ساتھ کوئی تعلق نہیں...... کوئی رشتہ نہیں...... ہم دونوں ایک دوسرے کیلئے مر گئے...... اب نہ میں تمہاری ماں ہوں...... اور نہ ہی تم میرے بیٹے ہو......''
ماں کی یہ کیفیت دیکھ کر...... اور اس کی یہ باتیں سن کر...... مصعب بھی رونے لگے...... اور ماں کے قریب جا کر انتہائی ادب کے ساتھ اور بہت ہی پیار بھرے لہجے میں یوں کہا ''ماں......! مجھے تم سے بہت ہمدردی ہے، اس لئے دونوں جہانوں میں تمہاری بھلائی کیلئے میں چاہتا ہوں کہ تم کلمۂ حق پڑھ لو...... تم بھی میری طرح مسلمان ہو جاؤ...... ماں...... بس ایک بار اپنی زبان سے کہہ دو: ''أشھد أن لا الٰہ الا اللہ...... وأشھد أن محمداً رسول اللہ''۔
اُس دن مُصعَبؓ اپنی ماں کے سامنے بہت گڑگڑائے، بہت زیادہ منت سماجت اور آہ وزاری کرتے رہے...... اس کا اتنا اثر تو ہوا کہ آج ماں نے جواب میں کوئی غصہ نہیں دکھایا، البتہ اپنا منہ دوسری طرف پھیرتے ہوئے کہا ''مجھے یہ بات گوارا نہیں کہ لوگ تمہاری طرح مجھے بھی کم عقلی کا طعنہ دیا کریں......''
اور تب نوجوان مصعب آنسو بہاتے ہوئے...... بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے چل دیئے...... اور پھر اس کے بعد کبھی زندگی بھر دوبارہ ماں سے ملاقات نہیں ہو سکی۔

☆...... اس کے بعد مکہ میں اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا...... وہی شہر مکہ اور وہی گلی کوچے

جہاں کسی زمانے میں مصعبؓ جیسا خوش لباس، شوخ اور چنچل نوجوان اور کوئی نہیں تھا، اب اسی شہر مکہ میں مصعبؓ جیسا سیدھا سادھا، معصوم، روکھی سوکھی کھا کر گذارا کرنے والا، اور پھر بھی ہر حال میں صبر و شکر بجالانے والا......اور کوئی نہیں تھا......

☆......انہی دنوں ایک بار مکہ شہر میں کسی جگہ رسول اللہ ﷺ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ تشریف فرما تھے کہ اس دوران اتفاقاً وہاں سے مصعبؓ کا گذر ہوا......ان سبھی نے مصعبؓ کا یہ حال دیکھا......بوسیدہ اور پھٹا پرانا لباس، بے رونق حلیہ، مسلسل فقر و فاقہ کی وجہ سے گرتی ہوئی صحت......یہ منظر دیکھ کر یہ حضرات اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکے اور آبدیدہ ہوگئے......تب آپؐ کی آنکھیں بھی آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں......(۱)

مصعبؓ میں قبولِ اسلام کے بعد رونما ہونے والی اس بڑی تبدیلی کی وجہ سے اگرچہ بظاہر تو ان کا یہ بڑا نقصان ہوا کہ راحت و آرام، عیش و عشرت، اور ناز و نعم سے بھرپور ان کی وہ حسین اور رنگین زندگی اب جاری نہیں رہ سکی تھی......لیکن اب یہ جو اِن کی نئی اور بدلی ہوئی

(۱) یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان عظیم شخصیات نے اللہ کے دین کی خاطر کس قدر تکلیفیں اٹھائیں......کبھی گھر سے باہر مشرکین و مخالفین کی طرف سے ظلم و ستم کے وہ سلسلے......کبھی میدانِ جنگ میں تیروں اور تلواروں کے سامنے سربکف ڈٹے رہنا......اور کبھی خود اپنے گھر کے اندر یہ اتنی بڑی آزمائشیں ......یہ تمام تر ذہنی اور نفسیاتی صدمات......دین پر استقامت کی خاطر تمام رشتوں اور محبتوں سے یوں دستبرداری......مصعبؓ کا اپنی ماں سے جدائی کا یہ واقعہ......کیا یہ معمولی بات ہے؟ کیا وہ لوگ بھی ہماری ہی طرح گوشت پوست کے انسان نہیں تھے؟ کیا ان کے سینوں میں دل نہیں تھے؟ یا ان کے دلوں میں انسانی جذبات نہیں تھے؟ پھر یہ سب تکلیفیں ......یہ تمام تر قربانیاں......یہ غیر معمولی صدمات ......یہ اتنے بڑے بڑے دکھ......کیوں؟ محض کلمۂ ''اشہد اَن لا الٰہ الا اللہ، واَشہد اَن محمداً رسول اللہ'' کی خاطر......جبکہ آج ہمیں یہ کلمہ کس قدر آرام و راحت کے ساتھ اپنے گھر میں بیٹھے بٹھائے نصیب ہے......لہٰذا ہمیں اس بارے میں اپنا محاسبہ کرنا چاہئے کہ ''کیا ہمیں اس اتنی بڑی نعمت کی کوئی قدر ہے؟ کوئی احساس ہے؟''۔

زندگی تھی، اس کی وجہ سے اب ان کی شخصیت میں ایک عجیب سا وقار، طبیعت میں ٹھہراؤ اور سنجیدہ پن، چہرے پر ہمہ وقت عجیب سی معصومیت اور بھولا پن......ان سب چیزوں نے مل کراب ان کی شخصیت کو پہلے سے کہیں زیادہ دلکش اور پُرکشش بنا دیا تھا......

نیز یہ کہ نعمتوں کی جگہ اب یہ جو مشکلات تھیں، یہ کوئی ان کی مجبوری نہیں تھی، بلکہ دینِ برحق کی خاطر انہوں نے از خود تمامتر نعمتوں اور راحتوں کو ترک کرتے ہوئے برضا و رغبت اس بدلی ہوئی زندگی کو گلے لگایا تھا......اور اس راستے میں پیش آنے والی تمامتر مشکلات کو وہ خندہ پیشانی اور صبر و شکر کے ساتھ برداشت کرتے چلے آرہے تھے۔

مُصعبؓ کی یہی وہ خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک میں ان کیلئے بہت زیادہ قدر و منزلت کے جذبات تھے، اور آپؐ ہمیشہ ان کے ساتھ انتہائی شفقت و محبت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔

☆......حتیٰ کہ آخر وہ وقت بھی آیا کہ جب رسول اللہ ﷺ نے ایک انتہائی اہم ترین کام کیلئے مُصعبؓ کو منتخب فرماتے ہوئے انہیں ایک بہت بڑی ذمہ داری سونپی، حالانکہ اُس وقت آپؐ کے جاں نثار ساتھیوں میں بڑی تعداد میں ایسے افراد موجود تھے جو مُصعبؓ سے عمر اور تجربے میں بڑے تھے، اپنی اپنی قوم اور برادری میں مقام و مرتبے کے لحاظ سے بھی ان کی حیثیت مُصعَبؓ سے زیادہ تھی، نیز ایسے افراد بھی موجود تھے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ قرابت داری کی وجہ سے جن کی خاص حیثیت تھی، لیکن اس سب کچھ کے باوجود آپؐ نے اس اہم ترین ذمہ داری کیلئے ان سبھی حضرات میں سے محض اس نوجوان (یعنی مُصعَبؓ) کو منتخب فرمایا......

وہ عظیم ترین ذمہ داری یہ تھی کہ نبوت کے بارہویں سال جب حجِ بیت اللہ کے موقع پر مدینہ

سے آئے ہوئے بارہ افراد نے آپؐ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ برحق قبول کیا تھا، اور آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی، جو کہ تاریخ میں بیعتِ عقبہ اُولیٰ کے نام سے معروف ہے......تب ان افراد نے حج سے فراغت کے بعد مدینہ کی طرف واپسی سے قبل رسول اللہ ﷺ سے گذارش کی تھی کہ ان کی دینی تعلیم وتربیت کی خاطر مسلمانوں میں سے کسی کو ان کے ہمراہ روانہ کیا جائے......لہذا ان کی اس گذارش کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے مدینہ میں ان کی تعلیم وتربیت' نیز دینِ اسلام کی دعوت وتبلیغ' اور پیغامِ حق پہنچانے کی خاطر اپنے اولین ''سفیر'' اور ''نمائندہ'' کی حیثیت سے نوجوان مُصعَب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ فرمایا۔

یقیناً یہ بہت ہی بڑا شرف اور اعزاز تھا کہ تاریخِ اسلام میں رسول اللہ ﷺ کے اولین ''سفیر'' اور ''نمائندۂ خاص'' کی حیثیت سے مصعبؓ کا انتخاب ......آپؐ کے اس انتخاب سے یقیناً اس قدر ومنزلت اور اس اہمیت کی عکاسی ہوتی تھی جو آپؐ کے قلبِ مبارک میں اپنے اس نوجوان صحابی' یعنی مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کیلئے تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے جب مصعبؓ کو یہ عظیم ذمہ داری سونپی گئی تو انہوں نے اللہ پر بھروسہ کرتے ہوئے اور اس سے توفیق طلب کرتے ہوئے اس ذمہ داری کو قبول کیا۔

مدینہ پہنچنے کے بعد اللہ پر حقیقی ایمان' اخلاصِ نیت' جذبۂ صادق' سچی لگن' فہم وفراست' اور اپنی خوش اخلاقی کی بدولت مصعبؓ نے دیکھتے ہی دیکھتے بہت جلد وہاں اُس نئے شہر میں' اور نئے معاشرے میں اپنا مقام ومرتبہ بنالیا......مدینہ کے باشندوں کے دلوں میں اپنے لئے جگہ بنائی......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اِن کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے بڑی تعداد میں لوگ فوج درفوج دینِ اسلام قبول کرنے لگے۔

☆......رسول اللہ ﷺ نے اپنے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو محض ان بارہ افراد کے ہمراہ مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ فرمایا تھا جو نبوت کے بارہویں سال بیعتِ عقبہ اُولیٰ کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، یعنی اُس وقت شہر مدینہ کی تمام آبادی میں کل یہی مسلمان تھے، یعنی صرف بارہ افراد۔

لیکن مدینہ پہنچنے کے بعد رسول اللہ ﷺ کے اولین سفیر اور نمائندے کی حیثیت سے مصعبؓ دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کے سلسلے میں جو خدمات انجام دے رہے تھے' ان کی اتنی بڑی افادیت سامنے آئی کہ محض اگلے ہی سال یعنی تیرہ نبوی میں حج کے دوران مدینہ سے آئے ہوئے حجاج میں سے خفیہ طور پر رسول اللہ ﷺ سے ملاقات اور پھر بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر شریک حضرات کی تعداد بہتّر تھی۔ اور پھر اس کے بعد بھی مدینہ میں دینِ اسلام کی نشر و اشاعت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا، مسلمانوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا......

☆ اگرچہ یقیناً رسول اللہ ﷺ کے اولین سفیر کی حیثیت سے مدینہ میں نئے ماحول اور نئے اجنبی معاشرے میں پیغامِ حق پہنچانا کوئی آسان کام نہیں تھا، اس کیلئے بہت زیادہ حکمت و دانش اور فہم و فراست درکار تھی، نیز بڑے صبر' حوصلے اور برداشت کی ضرورت تھی، کیونکہ معمولی سی بے احتیاطی کے نتیجے میں معاملہ بگڑ سکتا تھا اور صورتِ حال دگرگوں ہوسکتی تھی، بالخصوص یہ کہ اس مقدس فریضے کی انجام دہی کے دوران متعدد مواقع پر بڑے نازک حالات بھی پیش آئے......مگر مصعبؓ نے ہمیشہ نہایت خوش اسلوبی کا مظاہرہ کرتے ہوئے صورتِ حال کو سنبھال لیا، یقیناً اللہ کی طرف سے توفیق کے نتیجے میں مصعبؓ کیلئے رسول اللہ ﷺ کے نمائندے، نیز بے مثال مبلغِ اسلام کی حیثیت سے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔

☆......نبوت کے تیرہویں سال کے بالکل آخر میں ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہونے کے

بعد رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام مسلمان مختلف گروہوں کی شکل میں رفتہ رفتہ مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ پہنچنے لگے۔

مشرکینِ مکہ ابتداء میں تو خوشیاں مناتے رہے کہ چلو اچھا ہوا، مسلمان ہمارا شہر چھوڑ کر چلے گئے......لیکن ان کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی، کیونکہ جب انہیں یہ اندازہ ہونے لگا کہ مسلمان ان کے شکنجے سے نکلنے کے بعد اب وہاں مدینہ میں سکون واطمینان کی زندگی بسر کر رہے ہیں......تو ان سے یہ برداشت نہو سکا......راتوں کی نیندیں اُڑنے لگیں......اس سے بھی بڑھ کر جو چیز ان کیلئے بڑی تشویش کا باعث بنی؛ وہ یہ کہ اُس زمانے کی وہ مشہور و معروف تجارتی شاہراہ جس پر ان کے تجارتی قافلوں کی مکہ سے ملکِ شام کے مابین آمد و رفت ہوا کرتی تھی......وہ شاہراہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی......لہٰذا مدینہ میں مسلمانوں کی ابھرتی ہوئی قوت اس شاہراہ کیلئے باعثِ خطرہ تھی۔

یہی وجہ تھی کہ مشرکینِ مکہ نے فیصلہ کیا کہ ایسی نوبت آنے سے قبل ہی مدینہ میں قوت پکڑتے ہوئے ان مسلمانوں کو کچل دیا جائے......چنانچہ اس جنونی کیفیت میں ہجرت کے اگلے ہی سال (یعنی ۲ھ میں) وہ بڑے لشکر کے ساتھ مدینہ آپہنچے......''بدر'' کے مقام پر حق و باطل کے درمیان اولین معرکے کی نوبت آئی......جس کے نتیجے میں مشرکین اپنی تمامتر عددی برتری اور ہر قسم کے سامانِ حرب و ضرب کی فراوانی کے باوجود بدترین شکست و ہزیمت سے دوچار ہوئے، پسپائی' ذلت و رسوائی' اور جگ ہنسائی ان کا مقدر بنی، اور یوں شکست کا غم اور رسوائی کا داغ دلوں پر لئے ہوئے وہ وہاں سے واپس مکہ کی جانب لوٹ گئے۔

☆......البتہ اس رسوا کن شکست کے بعد اپنے شہر مکہ واپس پہنچتے ہی اپنی اس شکست و رسوائی کا بدلہ لینے کی غرض سے انہوں نے مسلمانوں پر بہت بڑے پیمانے پر حملے کا منصوبہ

تیار کیا، تاکہ اب مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے صفحۂ ہستی سے مٹادیا جائے، اور اس مقصد کیلئے نہایت زور وشور کے ساتھ تیاریاں بھی شروع کردیں، نتیجہ یہ ہوا کہ محض اگلے ہی سال یعنی ۳ھ میں مشرکینِ مکہ اپنے بڑے لشکرِ جرار کے ہمراہ......اور اپنے ناپاک ارادوں کے ساتھ مدینہ آدھمکے......اور اُحُد پہاڑ کے دامن میں پڑاؤ ڈالنے کے بعد مسلمانوں کے خلاف بڑی جنگ کیلئے وہاں صف آراء ہوگئے۔

دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے جاں نثار ساتھی بھی اپنی تیاری کے ساتھ اُحُد پہاڑ کے دامن میں پہنچے، اپنی صفیں منظّم کیں، رسول اللہ ﷺ اس موقع پر صفوں کے درمیان گھوم پھر کر خود ضروری ہدایات دیتے رہے، اور پھر اس کام سے فراغت کے بعد آپؐ مخصوص نگاہوں سے اپنے تمام جاں نثاروں کی جانب بغور دیکھنے لگے، گویا کسی بہت اہم اور خاص کام کیلئے ان میں سے کسی کا انتخاب مقصود ہو......اور پھر آپؐ کی نگاہیں اپنے ان تمام جاں نثاروں کی اس برگزیدہ ترین جماعت میں سے مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ پر مرکوز ہوگئیں، آپؐ نے انہیں اپنے قریب بلایا، اور پھر اپنے دستِ مبارک سے انہیں علَم عطاء فرمایا، جو کہ یقیناً بہت بڑا شرف اور اعزاز تھا، چنانچہ اس اہم ترین اور تاریخی غزوۂ اُحُد کے موقع پر نوجوان مصعبؓ اسلامی لشکر کے علمبردار تھے، اور اس عظیم ترین شرف کیلئے انہیں خود رسول اللہ ﷺ نے منتخب فرمایا تھا۔

جنگ کا آغاز ہوا، اِکا دُکا انفرادی جھڑپوں کے بعد دونوں جانب سے عام یلغار ہوئی، خوب گھمسان کا رَن پڑا، مسلمان ہر لمحہ فتح سے قریب تر ہوتے چلے جارہے تھے، جبکہ مشرکینِ مکہ کی شکست وپسپائی کے آثار واضح طور پر نمایاں ہوچلے تھے، اور وہ اب میدان چھوڑ کر راہِ فرار اختیار کررہے تھے۔

لیکن عین اس موقع پر ایک بہت بڑی غلطی ہوئی، جس کی وجہ سے میدانِ کارزار کی تمام صورتِ حال یکسر بدل کر رہ گئی اور مسلمان اپنی یہ جیتی ہوئی جنگ ہار گئے، ہوا یہ کہ وہ ''تیر انداز''، جنہیں رسول اللہ ﷺ نے ایک پہاڑی راستے پر متعین فرمایا تھا اور تاکید کی تھی کہ ''جنگ جو بھی رُخ اختیار کرے، لیکن جب تک میں نہ کہوں اُس وقت تک تم لوگ یہاں سے نہیں ہٹو گے''۔

لیکن ان تیر اندازوں سے اجتہادی غلطی ہوگئی، یہ سمجھے کہ جنگ تو اب ختم ہی ہو چکی، دشمن فرار ہو رہا ہے......لہٰذا یہ لوگ وہ راستہ خالی چھوڑ کر وہاں سے اتر آئے......جبکہ اُدھر بھاگتے ہوئے دشمن کی نگاہ جب اس خالی راستے پر پڑی تو اس نے موقع غنیمت جانا، اور عجلت میں اپنی صفوں کو دوبارہ منظّم کرتے ہوئے اس راستے سے (جو کہ مسلمانوں کے عقب میں تھا) اچانک بھرپور حملہ کر دیا......

مسلمان اس اچانک اور بالکل غیر متوقع حملے کیلئے بالکل تیار نہیں تھے، لہٰذا نتیجہ یہ ہوا کہ اس حملے کی وجہ سے مسلمان فوری طور پر سنبھل نہ سکے، انہیں بہت زیادہ نقصان اٹھانا پڑا، ہر طرف بہت زیادہ افراتفری پھیل گئی، اور تب وہ اپنی صفیں دوبارہ منظّم و مرتب نہ کر سکے، یوں محض چند افراد کی غلطی کی وجہ سے سبھی کو اتنی بڑی شکست اور اتنی بڑی پریشانی سے دوچار ہونا پڑا۔

جب یہ افراتفری اپنے عروج پر تھی، تب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت کم اِکا دُکا چند مسلمان رہ گئے تھے، اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے مشرکینِ مکہ نے اپنی تمام توجہ اور اپنی پوری قوت اُسی جانب مرکوز کر دی تھی کہ جہاں آپؐ موجود تھے، وہ بہرصورت اور ہر قیمت پر اس نادر ترین موقع سے مکمل فائدہ اٹھاتے ہوئے (نعوذ باللہ) آپؐ کو قتل کر دینے کی غرض

سے سرتوڑ کوششوں میں مصروف تھے۔

اسلامی لشکر کے علمبردار حضرت مُصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے جب یہ منظر دیکھا تو فوراً ہی خطرے کو بھانپ لیا اور مشرکینِ مکہ کے اس مذموم ارادے کو بخوبی سمجھ لیا کہ وہ اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کو قتل کر ڈالنا چاہتے ہیں......اور تب مصعبؓ نے پوری قوت کے ساتھ جھنڈے کو بلند کر کے زور وشور کے ساتھ مسلسل لہرانا شروع کیا، تاکہ دشمن یہ سمجھے کہ یہاں کچھ خاص معاملہ ہے، اور اس طرح دشمن کی توجہ اِس طرف مبذول ہو جائے، کافی دیر تک وہ اسی طرح جھنڈے کو بلند کر کے خوب ہلاتے اور لہراتے رہے......جس کی وجہ سے اب واقعی دشمنوں کی توجہ ان پر مرکوز ہونے لگی......اور دشمن کا رش اب اِن کے اردگرد بڑھتا گیا، مصعبؓ مسلسل ایک ہاتھ سے جھنڈا لہراتے رہے، اور دوسرے ہاتھ سے تلوار چلاتے رہے......لیکن اب دشمنوں کی تعداد بہت زیادہ بڑھ چکی تھی، اور اب دشمن اس حقیقت کو بھی سمجھ چکے تھے کہ یہاں رسول اللہ ﷺ موجود نہیں ہیں، نہ ہی کوئی اور خاص معاملہ ہے، بلکہ مصعبؓ ایسا فقط اس لئے کر رہے ہیں کہ اس طرح دشمن کی توجہ رسول اللہ ﷺ کی بجائے بس اسی جانب مرکوز رہے۔

تاہم دشمنوں کو اس موقع پر یہ اندازہ بھی ہو گیا کہ اگرچہ رسول اللہ ﷺ یہاں نہیں ہیں...... البتہ یہ کہ آپؐ تک پہنچنے کیلئے اور اپنے ناپاک منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کیلئے پہلے راستے کی اس رکاوٹ کو ہٹانا ہوگا......اس دیوار کو گرانا ہوگا......یعنی پہلے اس نوجوان علمبردار مصعبؓ کا خاتمہ کرنا ہوگا......

چنانچہ اس نازک ترین صورتِ حال میں جب مصعبؓ اس مقام پر تنہا تھے، دشمن ہر طرف سے ان پر ٹوٹے پڑ رہے تھے......اسی دوران ایک گھڑسوار آیا اور برق رفتاری کے ساتھ ان

کے قریب سے گذرتے ہوئے ان کے دائیں بازو پر اپنی تلوار سے بھرپور وار کیا، جس کے نتیجے میں ان کا بازو تن سے جدا ہو کر دور جا گرا...... بازو تو کٹ کر دور جا گرا...... مگر وہ مبارک جھنڈا جو رسول اللہ ﷺ نے اپنے دستِ مبارک سے انہیں عنایت فرمایا تھا...... اُس جھنڈے کی حرمت و عظمت پر کوئی آنچ نہ آنے دی، اسے سرنگوں نہونے دیا، فوراً ہی بائیں ہاتھ میں وہ جھنڈا تھام لیا، تھوڑی ہی دیر بعد وہی گھڑسوار دوبارہ اپنا گھوڑا سرپٹ دوڑاتا ہوا آیا اور مصعبؓ کے بائیں بازو پر اسی طرح بھرپور وار کیا...... تب بایاں بازو بھی کٹ کر دور جا گرا...... تب مصعبؓ نے فوراً ہی دونوں کٹے ہوئے بازوؤں میں جھنڈے کو جکڑ کر اپنے سینے سے لگا لیا...... دونوں بازو کٹ چکے تھے، خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا، جس کی وجہ سے اب مصعبؓ لڑکھڑانے لگے تھے...... لیکن جب تک جسم میں خون کا آخری قطرہ باقی تھا...... مصعبؓ نے اس جھنڈے کو گرنے نہیں دیا...... ایسے میں دشمنوں میں سے کوئی اور بدبخت آیا، اور اس نے پوری قوت سے اپنے نیزے کے ذریعے مصعبؓ پر بھرپور وار کیا، یہ نیزہ مصعبؓ کے جسم کے آر پار ہو گیا...... تب وہ ان زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر گئے...... مصعبؓ گر گئے...... اور تب وہ جھنڈا بھی گر گیا......

تمام شہر مکہ میں سب سے زیادہ نفیس سمجھا جانے والا یہ نوجوان...... مکہ کے جس گلی کوچے سے گذر جاتا' وہ تمام گلی خوشبو سے مہک اٹھتی، لوگ سمجھ جاتے کہ ابھی یہاں سے مصعب کا گذر ہوا ہے...... آج وہی نوجوان یہاں ''اُحُد'' کے میدان میں خاک اور خون میں لت پت پڑا ہوا تھا، اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت میں ...... نیز اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر اس نوجوان نے اُس مصنوعی' اور عارضی وفانی نفاست' اور راحت و آرام کو خیر باد کہتے ہوئے...... حقیقی کامیابی اور لازوال سعادتمندی کو اپنا لیا تھا...... اب وہ شہداء کے مبارک

کاروان میں شامل ہو چکا تھا اور اس کی روح میدانِ اُحد سے روانہ ہو کر اب جنت الفردوس کی بلندیوں کی جانب محوِ پرواز تھی......

جنگ کے اختتام پر رسول اللہ ﷺ ہر ایک ایک شہید کے پاس تشریف لائے......الوداع کہنے اور رخصت کرنے کی غرض سے......چنانچہ جب آپؐ مصعبؓ کے قریب پہنچے......تو کیفیت یہ دیکھی کہ ان کے کفن کیلئے تو کچھ بھی میسر نہیں ہے......کہیں سے ایک پھٹی پرانی اور خستہ حال چادر کا انتظام کیا گیا، لیکن وہ بھی اتنی چھوٹی تھی کہ سر ڈھانکا جاتا تو پاؤں ننگے ہو جاتے، پاؤں ڈھانپے جاتے تو سر ننگا ہو جاتا......

رسول اللہ ﷺ یہ منظر دیکھ کر مزید رنجیدہ وافسردہ ہو گئے، اور پھر فرمایا: ''سر ڈھانپ دیا جائے، اور پیروں پر نبات الاِذخر (وہاں اُگنے والی گھاس) ڈال دی جائے''۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ کچھ دیر اسی طرح وہاں ساکت و جامد کھڑے ہوئے مصعبؓ کی جانب بہت غور سے دیکھتے رہے......گویا کہیں بہت دور خیالوں کی دنیا میں کھو گئے ہوں۔ اور پھر آپؐ اپنے ساتھیوں کی جانب متوجہ ہوئے، اور انہیں مخاطب کرتے ہوئے شہدائے اُحد کے بارے میں یہ کلمات ارشاد فرمائے: أشهَدُ أنّ هٰؤلَاءِ شُهَدَاءُ عِندَ اللّٰهِ يَومَ القِيَامَة ، فَأتُوهُم ، وَ زُورُوهُم ، وَالّذِي نَفسِي بِيَدِهٖ لَايُسلِّمُ عَلَيهِم أحَدٌ اِلىٰ يَومِ القِيَامَةِ ، اِلّا رَدُّوا عَلَيهِ السَّلَام ......(۱)

یعنی ''میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ یہ (تمام شہدائے اُحد) قیامت کے دن اللہ کے سامنے شہداء کی حیثیت سے ہی پیش ہوں گے، لہٰذا تم ان کی زیارت کیا کرو، ان کے پاس

(۱) تاریخ الاسلام للذہبی [۲/۲۰۷] نیز: البدایہ والنہایہ لابن کثیر [۴/۴۶]

آتے جاتے رہا کرو، انہیں سلام کیا کرو، قسم ہے اُس اللہ کی جس کے قبضے میں میری جان ہے، قیامت تک جب بھی کوئی انہیں سلام کرے گا تو یہ اس کے سلام کا جواب دیں گے''۔

اس کے بعد آپ ﷺ خود بھی اکثر و بیشتر اُحد تشریف لے جایا کرتے، شہدائے اُحد کو سلام کرتے، اور ان کیلئے دعائے خیر فرمایا کرتے تھے......

اسی کے ساتھ رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا ذکرِ خیر مکمل ہوا۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۵/ ربیع الأول ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۷/ دسمبر ۲۰۱۴ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ:

اُم اَنمار الخزاعیہ نامی عورت کو اپنے گھریلو کام کاج کیلئے کسی کمسن غلام کی ضرورت محسوس ہوئی، لہٰذا وہ کسی غلام کی تلاش میں ایک روز مکہ میں اُس بازار کی جانب روانہ ہوئی جہاں غلاموں کی خرید و فروخت ہوا کرتی تھی، اور جسے اُس زمانے میں ''سوق النخّاسین'' کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔

وہاں پہنچنے کے بعد اسے متعدد کمسن غلام نظر آئے جو برائے فروخت اُس بازار میں موجود تھے، سب پر سرسری نگاہ ڈالی، آخر ایک کمسن غلام پر اس کی نگاہ ٹک گئی، جس کے سراپا میں اسے خاندانی شرافت و نجابت کے آثار نمایاں نظر آرہے تھے۔

چنانچہ اس نے قیمت ادا کی اور اسے خرید لیا، اور پھر اسے ہمراہ لئے ہوئے اپنے گھر کی جانب چلتی بنی۔

راستے میں اس نے پلٹ کر اس کمسن غلام کی جانب دیکھا، اور پھر اس سے پوچھا: مَا اسمُكَ یَا غُلَام؟ یعنی ''اے لڑکے! تمہارا نام کیا ہے؟'' لڑکے نے جواب دیا ''خبّاب'' ام انمار نے پھر پوچھا: وَمَا اسمُ أبِيكَ؟ یعنی ''تمہارے باپ کا کیا نام ہے؟'' لڑکے نے کہا ''الأرت'' پھر وہ بولی: وَمِن أينَ أنتَ؟ ''تم کہاں کے رہنے والے ہو؟'' لڑکا بولا: ''نجد کا رہنے والا ہوں'' تب وہ بولی ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم خالص عربی ہو'' لڑکے نے کہا ''جی...... بلکہ مزید یہ کہ میں تو قبیلۂ بنوتمیم سے ہوں'' تب عورت نے حیرت سے اس کی جانب پلٹ کر دیکھا، اور بولی ''قبیلۂ بنوتمیم سے؟ تو پھر تم غلاموں کی خرید و فروخت کے اس بازار میں کیسے پہنچ گئے؟'' لڑکے نے جواب دیا ''ایک رات دشمن قبیلے

نے ہم پر اچانک حملہ کر دیا، ہمیں شکست ہوگئی، تب وہ دشمن بڑی تعداد میں ہمارے جانور اور مویشی وغیرہ ہنکالے گئے...... بہت سی عورتوں اور بچوں کو قیدی بنالیا، اسی مالِ غنیمت میں دیگر بچوں کے ہمراہ میں بھی شامل تھا، اس کے بعد مجھے فروخت کر دیا گیا، اور پھر یکے بعد دیگرے مسلسل مختلف لوگوں کے ہاتھوں بکتا بکاتا آخر یہاں مکہ پہنچ گیا......اور آج مکہ کے اس بازار سے آپ نے مجھے خرید لیا ہے۔

یہ نوعمر غلام اپنی مالکہ ام انمار کے گھر میں خدمت انجام دیتا رہا، چندروز جب اسی طرح گذر گئے تو اس عورت نے اپنے اس غلام کے بارے میں محسوس کیا کہ یہ تو کافی سمجھدار معلوم ہوتا ہے، فہم وفراست، عقلمندی اور ذہانت کے آثار اس میں نمایاں ہیں......تب ام انمار نے فیصلہ کیا کہ اس قابل اور سمجھدار غلام سے محض گھریلو کام کاج لینے کی بجائے اسے کسی ایسے اچھے کام میں لگانا چاہئے جو میرے لئے مالی فائدے کا ذریعہ بن سکے۔

چنانچہ ام انمار نے اپنے اس نوعمر غلام خبّاب کو مکہ شہر کے ایک مشہور لوہار کے حوالے کیا جو اپنی بھٹی پر لوہے سے تلواریں تیار کیا کرتا تھا، اُس معاشرے میں ''تلوار'' کی بہت بڑی اہمیت اور بہت زیادہ مانگ تھی، لہٰذا اس شخص کا یہ کاروبار خوب عروج پر تھا، یہی وجہ تھی کہ ام انمار نے اپنے اس نوعمر غلام کو اس لوہار کے حوالے کیا، تاکہ یہ اس کا ہاتھ بھی بٹائے اور وہاں رہتے ہوئے یہ کام بھی سیکھ لے......اور پھر اس لوہار کی طرح ام انمار بھی ایسا ہی منافع بخش کاروبار کر سکے......

چنانچہ اس لوہار کے پاس رہتے ہوئے خبّاب نے بہت جلد ''تلوار سازی کے اس کام میں خوب مہارت حاصل کر لی، تب ام انمار نے کرائے پر ایک دکان حاصل کی، تلوار سازی' نیز تلواروں کی خرید وفروخت سے متعلق ضروری ساز وسامان کا انتظام کیا، اور یہ دکان اپنے

اس نوعمر غلام ''خبّاب'' کے حوالے کر دی۔

خباب نے جب اس دکان میں کام کا آغاز کیا تو دیکھتے ہی دیکھتے تمام شہر مکہ میں اس کی شہرت ہوگئی، اوراس کا کاروبار خوب ترقی کرنے لگا، جس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ خبّاب میں وہ تمام خوبیاں موجود تھیں جو ترقی کیلئے ضروری ہوتی ہیں، یعنی خوب محنت اور دل لگا کر کام کرنا، اپنے کام میں خوب مہارت پیدا کرنا وغیرہ......مزید یہ کہ امانت ودیانت اور ہمیشہ راست بازی......اور پھر یہ کہ اس نوعمری کے باوجود اس کے مزاج میں پختگی اور متانت تھی، وہ ہمیشہ سنجیدہ اور باوقار نظر آیا کرتا تھا......نوعمری کے باوجود اس میں عمر رسیدہ اور تجربہ کار دانشوروں کی خوبیاں تھیں، یعنی ہمت نوجوانوں جیسی، جبکہ فہم وفراست اور حکمت ودانش عمر رسیدہ اور جہاں دیدہ لوگوں جیسی......

خبّاب کو دن بھر کی محنت ومشقت کے بعد جب فرصت کے چند لمحات میسر آتے اور لمحہ بھر کیلئے خلوت نصیب ہوتی تو وہ اس سوچ میں کھوجاتا کہ آخر اس معاشرے کا انجام کیا ہوگا کہ جس میں ہر کوئی سر سے پاؤں تک ہر قسم کی برائیوں میں غرق ہے، یہ معاشرہ جس طرح جہالت اور گمراہی کے اندھیروں میں ڈوبا ہوا ہے......کیا یہاں کبھی کوئی امید کی کرن بھی طلوع ہوگی یا نہیں......؟ انہی سوچوں میں غرق نوجوان خباب کے دل میں بے اختیار یہ حسرت پیدا ہوتی کہ کاش مجھے اتنی زندگی نصیب ہوجائے کہ میں اپنی آنکھوں سے ان اندھیروں کی جگہ روشنی کو طلوع ہوتا دیکھ سکوں......

نوعمر خباب کی یہ بڑی خوش نصیبی تھی کہ اسے اس مقصد کیلئے زیادہ عرصہ انتظار نہیں کرنا پڑا، ایک روز اسے خبر ملی کہ خاندانِ بنوہاشم کا وہ چشم وچراغ جس کی شرافت اور امانت ودیانت کے چہار سو چرچے ہیں اور جس کا نام محمد بن عبداللہ (ﷺ) ہے، اس کی مبارک زبان سے

آجکل ایسے کلمات نکل رہے ہیں کہ گویا ظلمتوں کے درمیان روشنی کی کرنیں پھوٹ رہی ہوں......

اورتب اس نوعمر خباب کو محمد بن عبداللہ (ﷺ) سے ملاقات کی تمنا بے چین کرنے لگی...... آخرایک روز اسی تمنا کے ہاتھوں مجبور ہوکر ملاقات کیلئے نکل کھڑا ہوا......نہایت بیتابی کے ساتھ خدمتِ اقدس میں حاضری دی، پہلی ملاقات میں ہی دل نے گواہی دی کہ محمد بن عبداللہ تو واقعی اب اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں...... چنانچہ نہایت توجہ سے آپ ؐ کی مبارک گفتگو سنی، تب خباب کو یوں محسوس ہونے لگا گویا دل کی دنیا میں کوئی گلشن کھل اٹھا ہو...... اور پھر نہایت بے صبری کے ساتھ عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! آپ اپنا ہاتھ بڑھایئے، تاکہ میں آپ کے دستِ مبارک پر بیعت کرسکوں''

تب آپ ﷺ نے دستِ مبارک بڑھایا، جس پر فوراً ہی خبّاب نے کلمۂ حق ''أشهد أن لا اله الا الله، وأشهد أنّ محمداً رسول الله'' پڑھتے ہوئے آپ ؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی......اور یوں یہ نوجوان خبّاب اب رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی ''حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ'' بن گئے......

جن دنوں خبّاب ؓ نے دینِ اسلام قبول کیا تب دینِ اسلام کا بالکل ابتدائی دور چل رہا تھا، اُس وقت تک صرف پانچ افراد مشرف باسلام ہوئے تھے، اوران کے بعد اب چھٹے خوش نصیب خبّاب ؓ تھے۔

خبّاب ؓ کی ایک خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہونے کے باوجود اپنے قبولِ اسلام کو کسی سے چھپایا نہیں، لہٰذا انہیں جب بھی موقع ملتا' رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوجاتے اور قرآن سیکھتے......اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ دوسروں کو بھی

دینِ اسلام قبول کرنے کا مشورہ دیا کرتے، جوکوئی نیا نیا مسلمان ہوتا یہ خود چل کر اس کے گھر جاتے اور اسے قرآن کی تعلیم دیا کرتے...... یوں ان کے قبولِ اسلام کی خوب شہرت ہوگئی (۱) اور یہ خبر جلد ہی اُمِ انمار الخُز اعیہ تک بھی پہنچ گئی، جس پر وہ انتہائی غضبناک ہوگئی، اور کہنے لگی کہ ''میرے غلام کی یہ جرأت' کہ میرا دین چھوڑ کر اس نے کوئی اور دین اختیار کرلیا؟''

تب وہ سیدھی اپنے بھائی سِباع بن عبدالعزیٰ کے پاس پہنچی، صورتِ حال سے اسے مطلع کیا، اور پھر دونوں نے اپنے قبیلے ''خُزاعہ'' کے کچھ اوباش اور آوارہ قسم کے نوجوانوں کو ہمراہ لیا اور خبّابؓ کی دکان کی طرف چل دیئے۔

وہاں پہنچنے کے بعد انہوں نے حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کو لوہے کی بھٹی پر اپنے کام (تلوار سازی) میں مشغول پایا، اور تب سباع نے نہایت غصے کے عالم میں اور انتہائی حقارت آمیز انداز میں انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''اے غلام! تمہارے بارے میں ہم نے ایسی خبر سنی ہے جس کے بارے میں ہمیں ابھی تک یقین نہیں آرہا'' اس پر خبّابؓ نے کہا: ''کیا ہے وہ خبر؟'' تب سباع بولا: ''ہم نے سنا ہے کہ تم بے دین ہوگئے ہو اور بنو ہاشم کے اُس آدمی کے دین پر چل پڑے ہو؟''

(۱) چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کا جو مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز وہ انتہائی غصے کی حالت میں اپنی بہن فاطمہ بنت خطاب کے گھر پہنچے، اُس وقت فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کے شوہر سعید بن زید رضی اللہ عنہ دونوں قرآن پڑھ رہے تھے، تب حضرت عمرؓ نے انہیں خوب زدوکوب کیا تھا......لیکن پھر قرآن کی چند آیات جب پڑھیں تو انتہائی متأثر ہوئے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوکر دینِ اسلام قبول کیا......الغرض جب حضرت عمرؓ اپنی بہن کے گھر پہنچے تھے، اُس وقت یہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ ہی تھے جو ان دونوں میاں بیوی کو قرآن پڑھا رہے تھے، اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آتا دیکھ کر گھر میں کہیں چھپ گئے تھے......!

تب خبّابؓ نے کسی گھبراہٹ کے بغیر مکمل سکون واطمینان کے ساتھ جواب دیتے ہوئے کہا ''میں بے دین نہیں ہوا، بلکہ میں نے اللہ وحدہٗ لاشریک لہٗ پر سچے دل سے ایمان قبول کرلیا ہے، تمہارے بتوں سے لاتعلقی اختیار کرلی ہے، اور سچے دل سے یہ گواہی دی ہے کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''

خبّابؓ کی زبان سے نکلے ہوئے یہ الفاظ سِباع اور اس کے آوارہ ساتھیوں کے دلوں پر بجلی بن کر گرے، اور انتہائی غضبناک حالت میں وہ سب ایک ساتھ خبّابؓ پر ٹوٹ پڑے، پہلے لاتوں اور مکوں سے خوب زدوکوب کیا، پھر اس لوہے کی بھٹی میں لوہا' سریا' ہتھوڑا' جو چیز بھی ان کے ہاتھ لگی ......اس سے نہایت بے رحمی کے ساتھ اور انتہائی وحشیانہ طریقے سے دیر تک خبّابؓ پر خوب تشدد اور مار پیٹ کرتے رہے...... یہاںتک کہ خبّابؓ بیہوش ہوکر زمین پر گر پڑے۔

اس واقعے کے بعد جلد ہی تمام شہر مکہ میں جنگل کی آگ کی طرح یہ خبر پھیل گئی...... ہر کوئی یہی کہنے لگا کہ ''ذرہ خبّاب کی جرأت دیکھو، غلام، بے بس اور لاچار......مکہ شہر میں نہ اس کا قبیلہ ہے نہ خاندان، نہ کوئی نصرت وحمایت کرنے والا، نہ مدافعت کرنے والا......مگر اس کے باوجود اتنی بڑی جرأت ......کہ اپنے مالکوں اور آقاؤں کے استفسار پر کچھ بھی چھپایا نہیں، سب صاف صاف بتادیا......علیٰ الاعلان اپنے قبولِ اسلام کا اقرار واعتراف کیا، مزید یہ کہ اپنے آقاؤں اور ان کے آباواجداد کے دین کو غلط اور باطل بھی قرار دیا......''

تب سردارانِ قریش باہم یوں کہنے لگے کہ ''اس نئے دین کے بارے میں جب ایک بے بس' کمزور اور لاچار غلام کی جرأت کا یہ حال ہے......تو آگے نہ جانے کیا بنے گا؟ لہٰذا یہ تو ہمارے لئے بڑے خطرے کی گھنٹی ہے''۔

سردارانِ قریش کا یہ خوف اور یہ اندیشہ غلط اور بے جا نہیں تھا، کیونکہ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کی اس بیباکی اور جرأت وہمت کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ انہی دنوں دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے متعدد افراد نے دینِ اسلام قبول کرلیا اور پھر اس کا اظہار واقرار بھی کرتے رہے۔

اس نئی صورتِ حال کی وجہ سے سردارانِ قریش کی راتوں کی نیند اُڑنے لگی، لہذا اس بارے میں غور وفکر اور اس خطرے کے سدِ باب کی غرض سے انہوں نے ہنگامی اجلاس طلب کیا، جس میں ابوجہل سمیت بڑے بڑے سردارانِ قریش شریک ہوئے، اور باہم مشاورت کے بعد طے کیا کہ اس بڑھتے ہوئے طوفان کو بہرصورت ابھی سے لگام دینے کیلئے ٹھوس اور فوری اقدامات کئے جائیں۔

چنانچہ ایک فوری فیصلہ یہ کیا گیا کہ آئندہ اگر کوئی شخص آباؤاجداد کے دین کو چھوڑ کر دینِ اسلام قبول کرے گا تو اس کے خاندان کے سربراہ پر یہ ذمہ داری عائد ہوگی کہ کسی بھی طرح وہ اس شخص کا کوئی بندوبست کرے......

چنانچہ اس نئے قانون کے تحت اب اُمِ انمار کے قبیلے ''بنوخزاعہ'' کے سربراہ کی حیثیت سے اس کے بھائی سباع بن عبدالعزیٰ کی یہ ذمہ داری قرار پائی کہ کسی بھی طرح خبّاب ؓ سے نپٹنا ہے......یا تو خبّاب ؓ دینِ اسلام سے دستبرداری اختیار کرلیں......یا جان سے ہاتھ دھوبیٹھیں......تیسرا کوئی راستہ نہیں۔

چنانچہ سخت گرمی کے موسم میں تپتی ہوئی دوپہر میں جب سورج خوب آگ برسا رہا ہوتا، اور زمین شعلے اُگل رہی ہوتی ......ایسے میں سباع اپنے آوارہ ساتھیوں کے ہمراہ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کو ہمراہ لئے ہوئے کھلی جگہ کی طرف کہیں نکل جاتا، اور پھر یہ لوگ اس دہکتی ہوئی پتھریلی زمین پر خبّاب کو لٹا دیتے، ان کے جسم سے کپڑے بھی اتار دیئے جاتے،

مزید یہ کہ ان کے برہنہ جسم پر لوہے کی زنجیریں اور زرہیں وغیرہ لپیٹ دیا کرتے تاکہ سلگتا اور تپتا ہوا لوہا ان کیلئے مزید تکلیف کا باعث بن سکے، اسی کیفیت میں جب خبّابؓ کی حالت زیادہ بگڑنے لگتی تو یہ لوگ یوں کہتے ''بولو خباب! محمد کے بارے میں اب تم کیا کہتے ہو؟'' تب خبّابؓ جواب دیتے: ''وہ تو اللہ کے رسول ہیں (ﷺ)، اللہ کی طرف سے دینِ برحق لائے ہیں تاکہ اس کے ذریعے ہمیں گمراہی کے اندھیروں سے نکال کر ہدایت کی روشنی تک لے جائیں''۔

تب وہ مزید زدوکوب کرتے، اور جب تھک جاتے تو کہتے کہ ''اچھا خبّاب! ہمارے ان بتوں لات اور عزیٰ کے بارے میں تم کیا کہتے ہو؟'' تب خبّابؓ جواب دیتے: اِنّھما صَنَمَان ، أصَمّان ، أبكَمان ، لَايَضُرّان ولَا ينفَعَان...... یعنی ''یہ دونوں تو بس پتھر کے بت ہیں، گونگے بہرے......نہ تو کسی کو کوئی فائدہ پہنچا سکتے ہیں، اور نہ ہی کسی کا کچھ بگاڑ سکتے ہیں......''۔

خبّاب کی طرف سے اپنے بتوں کے بارے میں یہ جواب سن کر ان کے غصے کی آگ مزید بھڑک اٹھتی ......اور تب وہ خبّابؓ کے خلاف اپنے ان مظالم کی آگ کو بھی مزید بھڑکانے میں لگ جاتے، اور اکثر ان دنوں وہ پہاڑی سنگریزوں کو آگ میں خوب تپا کر انہیں خبّابؓ کی کمر کے نیچے رکھ دیا کرتے، تاکہ اس طرح ان دہکتے ہوئے سنگریزوں کی وجہ سے خبّاب رضی اللہ عنہ مستقل تکلیف میں مبتلا رہیں۔

انہی دنوں حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کو ستانے اور پریشان کرنے کی غرض سے مشرکینِ مکہ کو ایک نئی شرارت یہ سوجھی کہ وہ لوگ حسبِ سابق ان کی دکان سے مال تو خرید لیا کرتے، لیکن اب ادائیگی نہیں کیا کرتے تھے، خبّابؓ سارا سارا دن ان کے پیچھے گھومتے، ان سے رقم

کا تقاضا کرتے ،مگران کے کانوں پر جوں تک نہ رینگتی ،خبّاب کی مالکہ ام انمار انہیں برا بھلا کہتی اور جلد از جلد پیسے وصول کر کے اس کے حوالے کرنے کا حکم دیتی ،اور یوں یہ سارا دن ایک طرف اپنی مالکہ اور دوسری طرف ان گاہکوں کے ہاتھوں پریشان رہا کرتے تھے۔

انہی دنوں ایک بار سردارانِ قریش میں سے ایک نامی گرامی شخص جس کا نام عاص بن وائل تھا،خبّابؓ کو تنگ کرنے کی غرض سے اس نے بھی یہی حرکت کی......چنانچہ خبّاب کئی روز مسلسل اس سے رقم کا تقاضا کرتے رہے،آخر ایک روز وہ کہنے لگا''اے خبّاب!جب تک تم محمد (ﷺ) کے ساتھ کفر نہیں کروگے اُس وقت تک میں تمہیں یہ رقم ادا نہیں کروں گا۔

اس پرخبّابؓ نے جواب دیا کہ''اے عاص!تم مر کر دوبارہ زندہ ہوجاؤ تب بھی میں یہ کام کرنے والا نہیں ہوں''اس پر عاص بولا''اچھا تو پھر ایسا ہی سہی،جب مجھے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور یہاں کی زندگی کی طرح وہاں کی زندگی میں بھی مجھے خوب مال واولاد سے نوازا جائے گا' تب میں یہ رقم تمہیں وہاں ادا کردوں گا''

عاص بن وائل کی زبانی یہ جواب سن کر مجبور و بے بس خبّابؓ خاموش رہ گئے......تب اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی طرف سے یہ آیات نازل ہوئیں:﴿أَفَرَأَيتَ الَّذِي كَفَرَ بِـآيَاتِنَا وَقَالَ لَأُوتَيَنَّ مَالاً وَّوَلَداً أَطَّلَعَ الغَيبَ أَمِ اتَّخَذَ عِندَ الرَّحمٰنِ عَهداً كَلَّا سَنَكتُبُ مَا يَقُولُ وَنَمُدُّ لَهُ مِنَ العَذَابِ مَدّاً وَنَرِثُهُ مَا يَقُولُ وَيَأتِينَا فَرداً﴾(۱)

یعنی''بھلا تم نے اس شخص کو بھی دیکھا جس نے ہماری آیتوں کو ماننے سے انکار کیا ہے،اور یہ کہا ہے کہ مجھے آل واولاد[آخرت میں]بھی ضرور ملیں گے،کیا اُس نے عالَمِ غیب میں

(۱)سورۃ مریم[۷۷-۸۰]

جھانک کر دیکھ لیا ہے؟ یا اس نے خدائے رحمٰن سے کوئی عہد لے رکھا ہے؟ ہر گز نہیں! جو کچھ یہ کہہ رہا ہے ہم اسے بھی لکھ رکھیں گے، اور اس کے عذاب میں اضافہ کر دیں گے، اور جس [مال واولاد] کا یہ حوالہ دے رہا ہے، اس کے وارث ہم ہوں گے، اور یہ ہمارے پاس تنِ تنہا آئے گا"۔

اسی کیفیت میں مکہ میں وقت گذرتا رہا......شب وروز بس یہی داستان تھی ظلم وستم کی...... سباع بن عبدالعزیٰ اور اس کے سر پھرے ساتھیوں کی طرف سے وحشیانہ مظالم اور زدوکوب کے جو سلسلے تھے' ان کے علاوہ مزید یہ کہ خود اُم انمار بھی اس مار پیٹ میں کسی سے پیچھے رہنے والی نہیں تھی، چنانچہ وہ اکثر لوہے کی اس بھٹی پر جایا کرتی اور خبّاب ؓ کے قبولِ اسلام پر انہیں خوب برا بھلا کہتی، اور تب بھی اس کی تسلی نہ ہوتی تو اس بھٹی میں جہاں ہر طرف لوہے کی سلاخیں بکھری رہتی تھیں اور ہر وقت آگ روشن رہتی تھی......وہاں سے وہ کوئی لوہے کی سلاخ اٹھاتی، اور اسے آگ میں خوب تپا کر اس سے خبّاب ؓ کے جسم کو داغتی، اکثر وہ دہکتی ہوئی سلاخ ان کے سر پر رکھ دیا کرتی، جس کی گرمی' بدبو اور دھوئیں کی تکلیف کی وجہ سے خبّاب بیہوش ہو کر گر جایا کرتے......ایسے میں اکثر بے خودی' غنودگی' اور نیم بیہوشی کی کیفیت میں خبّاب ؓ کے منہ سے بے اختیار اُم انمار اور اس کے بھائی سباع بن عبدالعزیٰ کیلئے بددعائیں نکلتیں......تب ان لوگوں کا غصہ مزید بڑھ جاتا۔

☆......اسی کیفیت میں وقت کا سفر جاری رہا، حتیٰ کہ نبوت کے تیرہویں سال کے بالکل آخر میں جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو دیگر مسلمانوں کی طرح حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ بھی سفرِ ہجرت کیلئے تیاریوں میں مشغول ہو گئے، تب انہوں نے دیکھا کہ یہ دونوں ظالم وجابر بھائی بہن یعنی اُم انمار اور اس کا بھائی سباع جو کہ سالہا سال سے ان کے

ساتھ بغیر کسی قصور کے انتہائی وحشیانہ سلوک کرتے چلے آرہے تھے......اب زمین وآسمان کے مالک کی طرف سے ان کی گرفت کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا......خبّابؓ نے دیکھا کہ اب اللہ کا انصاف حرکت میں آچکا ہے......ان کی زبان سے ان دونوں ظالموں کیلئے جو بددعائیں نکلا کرتی تھیں، اب ان کا اثر نظر آنے لگا تھا......

چنانچہ خبّابؓ نے مکہ سے روانگی سے قبل ہی اپنی آنکھوں سے یہ منظر دیکھ لیا کہ اُن دنوں اُم انمار کو شدید سر درد کی تکلیف رہنے لگی، درد بھی ایسا عجیب وغریب کہ جب اس پر اس درد کا دورہ پڑتا تو وہ کتوں کی طرح بھونکنے لگتی......اس کے بھائی اس کے علاج کیلئے مارے مارے پھرتے رہے......آخر کسی پہنچے ہوئے ماہر طبیب نے اس بیماری کا علاج یہ تجویز کیا کہ جب بھی اس پر اس قسم کا دورہ پڑے تو اس کے سر کو لوہے کی گرم سلاخ سے داغا جائے، چنانچہ سالہا سال تک جس طرح یہ اُم انمار مجبور ولاچار خبّابؓ کے سر کو گرم سلاخ سے داغا کرتی تھی، اب اسی طرح خود اس کے سر کو داغا جانے لگا......مزید یہ کہ غلام کی حیثیت سے یہ خدمت اکثر وبیشتر خبّابؓ ہی کو انجام دینا پڑتی تھی......چنانچہ جب اس کے سر کو گرم سلاخ سے داغا جاتا تو اگرچہ اسے تکلیف تو بہت محسوس ہوتی تھی، لیکن اس شدید اور جان لیوا دردِ سر سے نجات کا کوئی اور طریقہ بھی نہیں تھا۔

☆......انہی دنوں دیگر مسلمانوں کی طرح آخر خبّاب رضی اللہ عنہ بھی مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ جا پہنچے......جہاں اب ایک نئی زندگی تھی، نیا ماحول تھا، نئی جگہ تھی، یہاں اس نئی زندگی میں، اور اس نئی جگہ پر "انصارِ مدینہ" جیسے عظیم انسانوں اور بے مثال میزبانوں کی رفاقت اور صحبت میں پرسکون اور خوشگوار زندگی کا آغاز ہوا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ یہاں اب رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت، کسبِ فیض اور علمی استفادے کے وہ مبارک سلسلے تھے......کوئی

روک ٹوک نہیں تھی، کوئی خوف ودہشت نہیں تھی...... یہاں تو بس رسول اللہ ﷺ کی طرف سے نیز انصارِ مدینہ کی طرف سے ملنے والی محبتیں اور عنایتیں تھیں، غرضیکہ مشرکینِ مکہ سے دور اب یہاں مدینہ میں خوف ودہشت کی بجائے امن وامان اور سکون واطمینان سے بھرپور ایک بدلی ہوئی اور خوشگوار زندگی تھی۔

مسلمانوں کی یہی نئی خوشگوار زندگی مشرکینِ مکہ کو پسند نہ آئی، تب محض اگلے ہی سال یعنی ۲ھ میں وہ اپنا لشکر جرار...... نیز اپنے مذموم عزائم لئے ہوئے آدھمکے...... ''بدر'' کے میدان میں حق وباطل کے درمیان اولین معرکہ پیش آیا، اہلِ حق کو غلبہ نصیب ہوا، جبکہ شکست ورسوائی اہلِ باطل کا مقدر بنی، تب محض اگلے ہی سال یعنی ۳ھ میں اہلِ باطل دوبارہ چلے آئے، جس کے نتیجے میں ''غزوۂ اُحد'' کی نوبت آئی، غزوۂ بدر اور پھر غزوۂ اُحد دونوں ہی تاریخی اور یادگار مواقع پر حضرت خباب بن الأرت رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے حاضر رہے، بلکہ پیش پیش رہے اور شجاعت وبہادری کے بے مثال جوہر دکھاتے رہے۔

اُمِ انمار کا وہ ظالم وجابر اور سنگدل بھائی جس کی مکہ میں بڑی دہشت تھی، بڑا ہی رعب اور دبدبہ تھا، مکہ کے بڑے بڑے نامور بہادروں اور شہسواروں میں اس کا شمار ہوتا تھا، نیز وہاں مکہ میں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بے بس ولاچار انسان یعنی خبّابؓ پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑنے میں یہی سباع ہمیشہ پیش پیش رہا کرتا تھا، بلکہ دوسرے آوارہ صفت لوگوں کو بھی خوب ورغلایا کرتا تھا...... آج یہاں اُحد کے میدان میں جب معرکہ اپنے عروج پر تھا...... ایسے میں اچانک اس کی نگاہ اللہ کے شیر حضرت حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ عنہ پر پڑی...... اور جب اس نے انہیں انتہائی بہادری وشجاعت کے ساتھ اللہ کے دشمنوں پر قہر بن

کرٹوٹتے ہوئے......اور انہیں جہنم رسید کرتے ہوئے دیکھا......تو وہ بس ان کی شجاعت کے یہ مناظر دیکھتا ہی رہ گیا......اور پھر اس سے صبر نہیں ہوسکا، برق رفتاری کے ساتھ اپنا گھوڑا دوڑاتے ہوئے حضرت حمزہؓ کے قریب پہنچا اور بآوازِ بلند انہیں للکارتے ہوئے چلایا: بَارِزنِي یا حَمزۃ...... یعنی ''اے حمزہ ذرہ مجھ سے مقابلہ کرو......'' وہ گھوڑے پرسوار تھا، جبکہ حضرت حمزہؓ پیدل تھے، اس کے باوجود حضرت حمزہؓ بجلی کی مانند اُس پر لپکے، اور شیر کی طرح اُس پر جھپٹے......اور پھر ایک ہی بھرپور وار میں اُس کا کام تمام کرڈالا، اور پلک جھپکتے میں وہ غرور وتکبر کا پتلا زمیں بوس ہوگیا......(۱)

مشرکینِ مکہ میں سے جن لوگوں نے حضرت حمزہؓ کی یہ بے مثال شجاعت وبہادری' نیز ان کے ہاتھوں سباع بن عبدالعزیٰ جیسے نامی گرامی شہسوار اور بہادر انسان کا یہ عبرتناک انجام دیکھا' ان پر گویا لرزہ طاری ہوگیا......اتفاق سے اُس وقت میدانِ کارزار میں اسی جگہ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے، انہوں نے یہ تمام منظر اپنی آنکھوں سے دیکھا، اور تب ان کے تصور میں وہ مناظر تازہ ہوگئے جب وہ مکہ میں لوہے کی بھٹی پر کام کاج اور محنت ومزدوری کررہے ہوتے تھے، ایسے میں یہی دونوں ظالم وسرکش بھائی بہن' یعنی سباع بن عبدالعزیٰ اور ام انمار بنت عبدالعزیٰ آیا کرتے، لوہے کی اس بھٹی سے کوئی سریا لے کر اسے آگ میں گرم کرکے ان کے سر پر لگایا کرتے تھے......تب یہ ان دونوں کو خوب بددعائیں دیا کرتے تھے......اُم انمار کا انجامِ بد تو انہوں نے مکہ میں ہی دیکھ لیا تھا کہ کس طرح اسے شدید سر درد کے دورے پڑنے لگے تھے......اور تب اس کے منہ سے

(۱) یہی وہ نازک ترین لمحہ تھا جب حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ پوری طرح سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف متوجہ تھے، اور تب پہلے سے گھات لگائے ہوئے ''وحشی'' نے یہ موقع غنیمت جانتے ہوئے حضرت حمزہؓ پر پشت کی جانب سے بھرپور وار کیا تھا، جس کے نتیجے میں یہ شہید ہوگئے تھے (حضرت حمزہؓ کا مفصل تذکرہ صفحہ [۲۶۱] پر ملاحظہ ہو)

بے اختیار کتے کے بھونکنے جیسی آوازیں نکلنے لگتی تھیں، اوراس دورے کا واحد علاج یہ تھا کہ اس کے سر پر تپتا ہوا گرم سریا لگایا جائے......

جبکہ آج یہاں اُحد کے میدان میں خبّابؓ نے اپنے دوسرے مجرم یعنی سباع کا یہ انجامِ بد بھی دیکھا......اپنی آنکھوں کے سامنے اسے تڑپتے اور پھر دم توڑتے اور واصلِ جہنم ہوتے ہوئے دیکھ لیا، یوں خبّابؓ کے ان دونوں مجرموں (بہن بھائی) کو اللہ نے دنیا میں ہی' اور خبّابؓ کی نگاہوں کے سامنے عبرتناک سزادی۔

غزوۂ اُحد کے بعد دیگر تمام غزوات کے موقع پر بھی حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ رسول اللہﷺ کی زیرِ قیادت ہمیشہ شریک رہے اور شجاعت وجرأت کے بے مثال جوہر دکھاتے رہے، نیز آپؐ سے علمی استفادہ' کسبِ فیض' اور آپؐ کی علمی وتربیتی مجالس میں شرکت وحاضری کا مبارک سلسلہ بھی مکمل ذوق وشوق اور پابندی کے ساتھ چلتا رہا، حتیٰ کہ اسی کیفیت میں رسول اللہﷺ کا مبارک دور گذر گیا، آپؐ تادمِ آخر خبّابؓ سے انتہائی مسرور ومطمئن رہے۔

حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہﷺ کا مبارک زمانہ گذر جانے کے بعد حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ نے چاروں خلفائے راشدین کا مبارک دور دیکھا، اور اس دور میں بھی اس معاشرے میں ہمیشہ انہیں خاص عزت واحترام اور قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا۔

ایک بار جب خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا زمانۂ خلافت چل رہا تھا' تب حضرت خبّابؓ رضی اللہ عنہ ان سے ملاقات کیلئے آئے، حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے نہایت گرمجوشی کے ساتھ ان کا استقبال کیا، اور بہت زیادہ احترام سے پیش آئے، اور پھر وہاں

موجود دیگر معززین اور شرکائے محفل کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا ''حقیقت یہ ہے کہ یہ جو ہماری طرف سے اس قدر عزت واحترام کا اظہار ہے اور اس قدر پُر جوش استقبال ہے......اس کے مستحق بس دو ہی افراد ہیں، ایک تو یہی خبّاب، اور دوسرے بلال'' (۱)

اس کے بعد جب پرانے وقتوں کی باتیں ہونے لگیں، اور بہت سی پرانی یادیں تازہ ہونے لگیں، تب حضرت عمرؓ نے حضرت خبّابؓ سے دریافت فرمایا کہ ''مشکلات سے بھرپور اُس ابتدائی دور میں آپ کے ساتھ پیش آنے والا سب سے زیادہ اذیت ناک اور تکلیف دہ واقعہ کیا تھا؟''

اس پر حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے کچھ تردد کا اظہار کیا، کچھ جھجھک محسوس کرنے لگے، لیکن جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اصرار کیا تو حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے زبان سے کچھ کہنے کی بجائے خاموشی کے ساتھ اپنی کمر سے کپڑا ہٹا دیا......اور تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ ودیگر حاضرینِ محفل نے جو منظر دیکھا تو وہ سب لرز کر رہ گئے۔

تب حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دریافت فرمایا کہ ''یہ کس طرح ہوا؟'' اس پر حضرت خباب رضی اللہ عنہ نے واقعہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''دینِ اسلام کے ابتدائی زمانے میں وہاں مکہ میں ایک بار اُن لوگوں نے مجھے اذیت پہنچانے کی خاطر آگ روشن کی، لکڑیاں جلائیں، جب وہ لکڑیاں خوب انگاروں کی طرح دہکنے لگیں......تو ان ظالموں نے میرے کپڑے اتارے، اور مجھے ان دہکتے ہوئے انگاروں پر لٹا دیا، یہاںتک کہ میری کمر سے

(۱) حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا اشارہ اس طرف تھا کہ ابتدائے اسلام میں مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں چونکہ انہی دونوں حضرات نے بہت زیادہ تکلیفیں اٹھائی تھیں (کیونکہ یہ دونوں غلامی کی زنجیروں میں جکڑے ہوئے بالکل ہی بے بس اور مجبور تھے) لہٰذا یہی دونوں حضرات اپنی اس بے مثال استقامت کی وجہ سے سب سے زیادہ قابلِ احترام ہیں۔

گوشت پگھل پگھل کر ہڈیوں سے الگ ہونے لگا......انگارے اسی طرح دہکتے رہے، آخر یہ ہوا کہ میرے جسم سے پگھل کر پانی اور چربی کے جو قطرات مسلسل ان انگاروں پر ٹپک رہے تھے......ان کی وجہ سے یہ آگ بجھ گئی......

حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کے اخلاص کی یہ کیفیت تھی کہ یہ اس قدر دردناک واقعہ بھی انہوں نے محض ان حضرات کی طرف سے اصرار کے نتیجے میں سنایا......ورنہ وہ تو کبھی راہِ حق میں اپنے ساتھ پیش آنے والے اس قسم کے واقعات کا کوئی تذکرہ بھی پسند نہیں کیا کرتے تھے، تاکہ نام ونمود اور ریاکاری سے دور رہ سکیں۔

☆......دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ نے بہت مشکل ترین وقت گذارا تھا، مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں' اور بالخصوص اِن کی جو مالکہ تھی اُم اَنمار' نیز اس کا جو ظالم وجابر اور انتہائی سنگدل قسم کا بھائی تھا خاندانِ بنوخزاعہ کا سردار سِباع بن عبدالعزیٰ، اس کے ہاتھوں حضرت خبابؓ نے یہ جو تمام تر تکلیفیں اور اذیتیں برداشت کی تھیں......حقیقت یہ ہے کہ یہ تو جسمانی تکلیفیں تھیں......جبکہ اس سے قبل زمانۂ طفولیت سے ہی وہ تو بہت زیادہ ذہنی ونفسیاتی صدمات بھی اٹھاتے چلے آئے تھے......بچپن کے دور میں یہ وہاں ''نجد'' میں قبیلۂ بنوتمیم میں اپنے والدین کے زیرِ سایہ ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے تھے کہ اچانک دشمن قبیلے نے حملہ کر دیا تھا، اور پھر لوٹ مار اور قتل وغارتگری کا وہی بھیانک سلسلہ چلا تھا کہ جو اُس معاشرے کی خاصیت تھی......اور پھر اُس دور کے رسم ورواج کے مطابق انہیں قیدی بنا کر فروخت کر دیا گیا تھا، تب یہ مختلف آقاؤں کے ہاتھوں سے ہوتے ہوئے آخر مکہ میں اُم انمار کی غلامی کے شکنجے میں جا پھنسے تھے، یوں اس قبائلی جنگ اور فتنہ وفساد کے نتیجے میں بہت بچپن میں ہی یہ غلامی کی زنجیروں میں ناحق جکڑے

گئے تھے، ورنہ اصل میں تو یہ ایک آزاد انسان تھے، اور معزز خاندان سے ان کا تعلق تھا۔
مقصد یہ کہ بچپن سے ہی غلامی کا یہ اذیت ناک سلسلہ شروع ہو چکا تھا......اور پھر بالکل نوعمر ہی تھے جب مکہ میں دینِ اسلام کا سورج طلوع ہوا اور تب انہوں نے بلاتردد دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے جب دینِ برحق قبول کیا تو اب غلامی کی تکلیفوں کے علاوہ مزید یہ کہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے بھی ایذاء رسانیوں اور بدسلوکیوں کے انتہائی جان لیوا اور المناک سلسلے چلتے رہے......آخران جسمانی وروحانی صدمات اور پریشانیوں سے حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ کو ہجرتِ مدینہ کے بعد ہی نجات نصیب ہوسکی تھی۔

الغرض مکی زندگی میں سلگتی ہوئی لُو کے جو گرم تھپیڑے چل رہے تھے......اس کی بجائے اب یہاں مدنی زندگی میں تو ٹھنڈی ہواؤں کے خوشگوار جھونکے تھے......یوں ہجرتِ مدینہ کے بعد سبھی مسلمانوں کے حالات بدلے، حضرت خبّابؓ کے حالات بھی بدلے، نہ صرف یہ کہ مشرکینِ مکہ کی ایذاء رسانیوں کے وہ سلسلے اب ختم ہوئے، بلکہ مزید یہ کہ رفتہ رفتہ فقر وفاقے اور محتاجی کی بجائے خوشحالی آتی چلی گئی......آخر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ خوب مالدار اور خوشحال ہو گئے۔

البتہ اب اس مالداری وخوشحالی کے باوجود ان کے طور طریقوں' تقویٰ و پرہیز گاری میں کوئی فرق نہیں آیا، وہی خشیتِ الٰہیہ اور پرہیز گاری کا جذبہ، وہی تواضع وانکسار......اور پھر خاص بات یہ کہ اللہ کے دیئے ہوئے اس مال ودولت کو خفیہ تجوریوں میں بند کرنے' یا کسی خفیہ مقام پر چھپا کر رکھنے کی بجائے خوب سخاوت وفیاضی کے ساتھ فقراء ومساکین میں تقسیم کیا کرتے تھے، دل کھول کر ضرورتمندوں اور ناداروں کی مدد واعانت کیا کرتے تھے۔
بلکہ اس سلسلے میں ان کی ایک خاص بات یہ تھی کہ روزانہ بڑی مقدار میں نقدی اپنے گھر میں

ایک کھلی جگہ پر رکھ دیا کرتے تھے،ضرورتمندوں کواس جگہ کے بارے میں علم تھا،اورانہیں کھلی آزادی تھی کہ ہرضرورتمند بلاکسی روک ٹوک کےاپنی ضرورت کےمطابق خود وہاں سے نقدی لے لے......چنانچہ فقراء ومساکین وہاں آتے اور ہرکوئی اپنی ضرورت کے مطابق اس جگہ سے اپنے لئے کچھ رقم اٹھالیتا......قابلِ غور ہے یہ بات کہ ان فقراء ومساکین میں بھی کس قدر امانت ودیانت کا جذبہ تھا کہ کھلی چھوٹ ہونے کے باوجود ہرکوئی محض اپنی ضرورت کے مطابق ہی وہاں سے رقم اٹھاتا تھا......جس طرح رقم دینے والے کا دل جذبۂ ایمانی سے معمور......بعینہٖ اسی طرح رقم وصول کرنے والوں کے دل بھی جذبۂ ایمانی سے معمور تھے۔

☆......اس قدر دریادلی کے ساتھ انفاق فی سبیل اللہ' صدقہ وخیرات' اور بڑے پیمانے پر خدمتِ خلق کے باوجود حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ ہمیشہ اللہ کے سامنے احساسِ جوابدہی کی وجہ سے لرزاں وترساں رہا کرتے تھے، ہروقت یہی خوف دامنگیر رہتا کہ اللہ کی طرف سے کوئی گرفت نہ ہوجائے......

ایک بار حضرت خبّابؓ کے کچھ دوست ملاقات کیلئے جب ان کے گھر آئے ہوئے تھے تب اتفاقاً وہاں کچھ فقراء ومساکین بھی موجود تھے، اُس موقع پر ان دوستوں نے یہ منظر دیکھا کہ حضرت خبّابؓ ان فقراء کو یوں کہہ رہے ہیں کہ ''یہ دیکھ لو تم سب، آج یہاں اس تھیلی میں نقد اسّی ہزار درہم رکھے ہوئے ہیں، دیکھو اس تھیلی کا منہ کھلا ہوا ہے، تم میں سے جو کوئی ضرورتمند ہے وہ اس میں سے اپنی ضرورت کے مطابق رقم لے لے......''

حضرت خبّاب رضی اللہ عنہ فقر وفاقے اور رنج وغم سے بھرپور اپنی زندگی کے اُس دور کے بعد اب اِس مالداری وخوشحالی کے دنوں میں اکثر بےاختیار رونے لگتے تھے......ایک بار کسی

نے اس کی وجہ دریافت کی تو جواب یہ دیا ''میرے سبھی ساتھی اس دنیا سے فقر وفاقے کی کیفیت میں ہی چلے گئے......شاید اللہ نے ان کیلئے تمام اجر وثواب آخرت کیلئے محفوظ کر رکھا تھا، جبکہ مجھے اب یہ اس قدر خوشحالی نصیب ہوگئی ہے......لہٰذا میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اللہ نے مجھے میرا حصہ دنیا میں ہی دے کر فارغ نہ کر دیا ہو......اور وہاں آخرت میں اب میرے لئے کوئی اجر وثواب نہو......''

☆......خلیفۂ چہارم امیرالمؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ بعض ناگزیر وجوہات کی بناء پر مدینہ سے کوفہ منتقل ہوگئے تھے، تب انہی دنوں حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ بھی مدینہ سے کوفہ منتقل ہوگئے تھے، وہیں مستقل رہائش اختیار کر لی تھی، یوں انہوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام کوفہ میں گذارے۔

رفتہ رفتہ وہاں کوفہ میں وقت گذرتا رہا، آخر حضرت خبّابؓ بیمار پڑ گئے، اُن دنوں اتفاقاً خلیفۂ وقت حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کوفہ میں موجود نہیں تھے، بلکہ ''صفین'' کے مقام پر پیش آنے والی مشہور اور نہایت افسوسناک اندرونی جنگ کے موقع پر وہاں گئے ہوئے تھے، اسی دوران کوفہ میں حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوگیا، اور یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی ۳۷ھ میں کوفہ میں دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے، اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائیں۔ چند روز بعد حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ جب ''صفین'' سے واپس کوفہ پہنچے تو فوری طور پر پہلے حضرت خبّاب بن الأرت رضی اللہ عنہ کی قبر پر گئے اور تادیر وہاں ان کیلئے دعائے خیر کرتے رہے۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۰/ ربیع الأول ۱۴۳۶ھ، مطابق یکم جنوری ۲۰۱۵ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔

حضرت ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ:

مکہ میں قبیلۂ قریش کے جو ذیلی قبائل اور مختلف خاندان تھے' ان میں سے ایک اہم اور معزز خاندان ''بنوعبدالشّمس'' تھا، اُس دور میں اس خاندان سے تعلق رکھنے والوں کو ''عبدالشمسی'' کی بجائے' اختصار کی غرض سے ''عبشمی'' کہا جاتا تھا۔

اُن دنوں مکہ میں ابولعاص بن الربیع نامی ایک ''عبشمی'' نوجوان تھا، جسے اس کے حسن و جمال اور ظاہری شان وشوکت کی وجہ سے مثالی شخصیت تصور کیا جاتا تھا، اپنے دلکش حلئے اور پُرکشش ناک نقشے کے علاوہ مزید یہ کہ وہ انتہائی سلیقہ مند' باادب' اور خوش اخلاق بھی تھا، اس کے علاوہ یہ کہ مالی طور پر بھی کافی خوشحال تھا...... الغرض اُس دور میں اور اُس معاشرے میں حسن و جمال' شان وشوکت' بہادری وشجاعت' خوش اخلاقی' سخاوت وفیاضی' یہی وہ صفات تھیں جن کی بناء پر کسی کو ''مثالی شخصیت'' قرار دیا جاتا تھا، اور یہی تمام تر صفات اس نوجوان ''ابوالعاص بن الربیع العبشمی'' میں بڑی حد تک موجود تھیں۔

قریش نسل در نسل تجارت کرتے چلے آرہے تھے، یہی ان کا خاندانی ذریعۂ معاش اور وسیلۂ روزگار تھا (۱) ان کے تجارتی قافلوں کا ملکِ شام' نیز ملکِ یمن کی جانب آمد ورفت کا سلسلہ جاری رہتا تھا...... (۲)

(۱) جیسا کہ اسی بات کا تذکرہ قرآن کریم میں بھی کیا گیا ہے: ﴿لِاِیلَافِ قُرَیش اِیلَافِهِم رِحلَةَ الشِّتَاءِ وَ الصَّیف ......﴾

(۲) چنانچہ ملکِ شام اور ملکِ یمن کی طرف ان کے تجارتی قافلوں کی بکثرت آمد ورفت کی وجہ سے ہی ملکِ شام کی سمت میں واقع بیت اللہ کے کونے کو ہمیشہ کیلئے ''رُکنِ شامی'' جبکہ ملکِ یمن کی سمت میں واقع کونے کو ''رُکنِ یمانی'' کہا جانے لگا۔

ابوالعاص بن الربیع نے بھی اپنے بزرگوں سے یہی پیشہ (تجارت) سیکھا، اسی کو اپنایا، اس میں خوب مہارت حاصل کی، اور پھر خوب ترقی کی منزلیں بھی طے کرتا چلا گیا۔

چنانچہ جب بھی مکہ سے ملکِ شام یا ملکِ یمن کی جانب کوئی تجارتی قافلہ روانہ ہوتا، اور پھر وہاں سے واپسی میں یہ قافلہ بڑی مقدار میں تجارتی سامان لئے ہوئے واپس مکہ پہنچتا...... تو ایسے ہر قافلے میں ہمیشہ ابوالعاص بن الربیع کے سو اونٹ' نیز ان اونٹوں کی دیکھ بھال اور سامان کی نقل وحمل کی غرض سے ہر اونٹ کے ساتھ دو ملازم' یعنی ہر قافلے میں ابوالعاص کے سو اونٹ اور دو سو ملازم شامل ہوا کرتے تھے۔

خاص بات یہ کہ صداقت اور امانت و دیانت کے حوالے سے بھی اس نوجوان ابوالعاص کی بڑی شہرت تھی، لہٰذا اس کی تجارت کی کامیابی اور اس قدر عروج کی یہ بھی ایک بڑی وجہ تھی۔

☆...... مکہ میں اُس دور میں ایک بہت ہی شریف النفس اور معزز خاتون ہوا کرتی تھیں' جو کہ انتہائی شرافت ونجابت اور اعلیٰ اخلاق وکردار کے ساتھ ساتھ مالدار اور خوشحال بھی بہت زیادہ تھیں، اور ان کا ذریعۂ معاش بھی ''تجارت'' ہی تھا، اِن خاتون کا نام ''خدیجہ بنت خویلد'' تھا، جو کہ مکہ کے ایک انتہائی شریف النفس اور معزز ترین انسان ''محمد بن عبداللہ'' کی زوجہ محترمہ تھیں (یہ تمام تر گفتگو رسول اللہ ﷺ کی بعثت سے قبل کے زمانے کی ہے)۔

خدیجہ بنت خویلد کی ایک چھوٹی بہن تھی جس کا نام ''ہالہ'' تھا(۱) اور یہ نوجوان تاجر ابوالعاص بن الربیع اسی ''ہالہ'' کا بیٹا تھا، اور یوں خدیجہ اس کی خالہ تھیں۔

خدیجہ بنت خویلد اپنی چھوٹی بہن ہالہ بنت خویلد سے بہت پیار کیا کرتی تھیں، اور پھر اسی

(۱) خوب چمکتے ہوئے چاند کے چاروں جانب روشنی کا جو ایک دائرہ نظر آیا کرتا ہے، اسے عربی میں ''ہالہ'' کہا جاتا ہے۔

رشتے کی وجہ سے وہ نوجوان ابوالعاص کے ساتھ بھی ہمیشہ بڑی محبت وشفقت سے پیش آیا کرتی تھیں ،انہوں نے کبھی اس نوجوان کو اپنا بھانجا نہیں سمجھا، بلکہ وہ اسے اپنا بیٹا ہی تصور کیا کرتی تھیں......یہی کیفیت اس خاتون کے شوہرِ نامدار محمد بن عبداللہ (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی بھی تھی۔

☆......صبح وشام کا یہ سفر جاری رہا......اس دوران ان دونوں میاں بیوی (محمد بن عبداللہ اور خدیجہ بنت خویلد) کی بڑی بیٹی ''زینب'' کھیلتے کودتے بڑی ہوگئی......

''زینب'' تمام مکہ شہر میں اعلیٰ ترین خاندان کی چشم و چراغ تھی ،مزید یہ کہ شرافت ونجابت' ادب وسلیقہ' اخلاق وحیاء' عفت وعصمت' یہ وہ تمام خوبیاں تھیں جن کی وجہ سے ''زینب'' اپنی مثال آپ تھی ، یہی وجہ تھی کہ اُن دنوں مکہ کے بڑے نامی گرامی شرفاء اور انتہائی معزز اور اعلیٰ حسب نسب رکھنے والے بہت سے نوجوان اس بات کی تمنا کرنے لگے تھے کہ کاش ''زینب'' ان کے گھر کی زینت بن سکے......

لیکن ان سبھی کو اس بات کا بخوبی اندازہ تھا کہ ان کی یہ حسرت تو بس ''حسرتِ ناتمام'' ہی رہ جائیگی......کیونکہ زینب کی والدہ خدیجہ کا وہ جولا ڈلا اور نورِ نظر بھانجا ہے......یعنی وہ نوجوان ''ابوالعاص بن الربیع'' اس کے ہوتے ہوئے یہ خوش نصیبی کسی اور کے حصے میں آنے والی نہیں......

اور پھر ایسا ہی ہوا......خدیجہ نے اپنے شوہر نامدار محمد بن عبداللہ (رسول اللہ ﷺ) کے مشورے اور اجازت سے اپنی پیاری بیٹی کا نکاح اپنے بھانجے کے ساتھ کر دیا، اپنی لختِ جگر ''زینب'' کا ہاتھ اپنے لاڈلے بھانجے ''ابوالعاص بن الربیع'' کے ہاتھ میں تھما دیا......اور یوں یہ دونوں ہمیشہ کیلئے شریکِ حیات اور دکھ سکھ کے ساتھی بن گئے۔

☆......ابھی ان دونوں (زینب اور ابوالعاص بن الربیع) کی شادی کو کچھ وقت ہی گذرا تھا کہ مکہ کی وادی ''نورِ نبوت'' سے جگمگانے لگی، خالقِ ارض وسماء کی جانب سے محمد بن عبداللہ (رسول اللہ ﷺ) کو تمام دنیائے انسانیت کیلئے رہبر ورہنما بنا کر مبعوث فرمایا گیا۔

رسول اللہ ﷺ کی اس بعثتِ مبارکہ کے فوری بعد آپؐ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے سب سے پہلے آپؐ کے افرادِ خانہ نے دینِ برحق قبول کیا، یعنی آپؐ کی زوجۂ مطہرہ اُم المؤمنین حضرت خدیجہ بنت خویلد رضی اللہ عنہا' نیز آپؐ کی صاحبزادیاں، زینب' رُقیہ' اُمِ کلثومؓ اور فاطمہ رضوان اللہ علیہن (حضرت فاطمہؓ اُس وقت کافی کمسن تھیں)۔

رسول اللہ ﷺ کی حقانیت وصداقت' نیز آپؐ کے پاکیزہ وبے داغ اخلاق وکردار کا یہ بہت بڑا ثبوت تھا کہ سب سے پہلے انہی لوگوں نے آپؐ کی تصدیق کی جو آپؐ کے نہایت قریبی تھے، جن سے آپؐ کی زندگی کا کوئی گوشہ مخفی نہیں تھا۔

☆......رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا تو دینِ اسلام قبول کر چکیں، لیکن ان کا شوہر ابوالعاص بن الربیع اپنی شریکۂ حیات سے تمامتر محبت ومودت کے باوجود اپنے آباؤ اجداد کے دین سے جدائی پر آمادہ نہ ہو سکا۔

مُرورِ زمانہ کے ساتھ جب رسول اللہ ﷺ اور مشرکینِ مکہ کے مابین تلخیاں بڑھتی گئیں اور حق وباطل کے درمیان یہ تنازعہ شدت اختیار کر گیا تب سردارانِ قریش آپس میں یوں کہنے لگے ''محمد ہمیں اور ہمارے آباؤ اجداد کو گمراہ قرار دیتے ہیں، ہمارے بتوں کو باطل اور غلط سمجھتے ہیں، اور ہم ہیں کہ ان کی بیٹیوں کو بہو بنا کر ہم نے اپنے گھروں میں آباد کر رکھا ہے، اور محمد بے غم ہیں کہ ان کی بیٹیاں تو اپنے گھروں میں آباد ہیں......اور یوں بے غم اور بے فکر ہو کر ہماری مخالفت پر خوب کمر بستہ ہیں......لہٰذا ہمیں چاہئے کہ ان کی بیٹیوں کو طلاق

دلوا کران کے گھر بھجوادیں، تاکہ محمد بس اسی غم میں مبتلا رہیں اور یوں ہمارے خلاف بولنا چھوڑ دیں''۔

چنانچہ سردارانِ قریش کی طرف سے اس فیصلے پر عملدرآمد کے طور پر ابولہب کے بیٹوں عتبہ اور عتیبہ نے اپنی اپنی بیویوں یعنی رقیہ اور ام کلثوم کو طلاق دے کران کے والد (یعنی رسول اللہ ﷺ) کے گھر بھیج دیا(۱)

اور پھر یہ سردارانِ قریش ابوالعاص بن الربیع کے پاس پہنچے، اور اس سے شدید مطالبہ کیا کہ وہ بھی اس فیصلے کی پابندی کرتے ہوئے اپنی بیوی زینب کو اولین فرصت میں طلاق دے کر اس کے والد کے گھر چلتا کرے......تب ابوالعاص نے ان کا یہ مطالبہ تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا، جس پر سردارانِ قریش نے اسے یہ پیشکش کی کہ اگر وہ زینب کو طلاق دیدے تو وہ اس کے بدلے تمام ملکِ عرب میں سب سے زیادہ حسین وجمیل لڑکی سے اس کی شادی کرادیں گے......اس پر ابوالعاص نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا ''تمام ملکِ عرب تو کیا......تم اگر تمام دنیا کی سب سے زیادہ حسین وجمیل لڑکی کے ساتھ شادی کی مجھے پیشکش کرو......تب بھی میں اپنی بیوی زینب کو طلاق نہیں دوں گا''۔

رسول اللہ ﷺ کو ایک باپ کی حیثیت سے اپنی دونوں بیٹیوں رقیہؓ وام کلثومؓ کی طلاق کا غم تو ضرور تھا، البتہ ساتھ ہی یہ اطمینان بھی تھا کہ چلو یہ نامناسب اور بے جوڑ رشتہ خود ہی ختم ہو گیا، اور یوں نجات نصیب ہو گئی......

البتہ بڑی بیٹی زینبؓ کا معاملہ آپؐ کیلئے پریشان کن تھا......کہ ابوالعاص اس سے بہت زیادہ

(۱) متعدد مؤرخین کے بقول رقیہ اور ام کلثوم (رضی اللہ عنہما) کا ابولہب کے ان بیٹوں کے ساتھ محض نکاح ہوا تھا، رخصتی کی نوبت ابھی نہیں آئی تھی۔ واللہ اعلم۔

محبت کرتا تھا، اس کی انتہائی عزت بھی کرتا تھا، کسی صورت اسے طلاق دینے پر آمادہ نہیں تھا، لیکن دینِ اسلام قبول کرنے کیلئے بھی تیار نہیں تھا......

ایسے میں آپؐ نہ تو اسے دینِ اسلام قبول کرنے پر مجبور کر سکتے تھے...... کیونکہ عقیدہ وایمان کا تعلق تو انسان کی سوچ اور دل ودماغ سے ہوا کرتا ہے...... لہٰذا زوراور زبردستی سے تو یہ کام ممکن ہی نہیں......

نہ ہی آپؐ کے پاس اتنی طاقت یا اور کوئی ایسا ذریعہ تھا کہ جسے بروئے کار لاتے ہوئے آپؐ ابوالعاص کو مجبور کرتے کہ وہ زینب کو طلاق دیدے۔

اور پھر یہ کہ اُس وقت تک مشرک کے ساتھ نکاح کی حرمت کا شرعی حکم بھی نازل نہیں ہوا تھا، لہٰذا آپؐ نے اس معاملے کو بس اللہ کے حوالے کر دیا۔

اس دوران حضرت زینب رضی اللہ عنہا مسلسل ابوالعاص بن الربیع کو دینِ اسلام قبول کر لینے کا مشورہ دیتی رہیں اور خوب اصرار بھی کرتی رہیں، لیکن ابوالعاص کی طرف سے ہمیشہ یہی جواب ملتا کہ ''میں دل کی گہرائیوں سے اس حقیقت کو جانتا ہوں کہ رسول اللہ ﷺ سچے نبی اور رسول ہیں، جس دین کی طرف وہ دعوت دیتے ہیں وہی دینِ برحق ہے، ان کی ہر بات حق اور سچ ہے...... لیکن میرے لئے بڑی مشکل یہ ہے کہ اتفاقاً میں ان کا داماد ہوں، اگر ہمارے درمیان یہ رشتہ نہ ہوتا تو میں ضرور دینِ اسلام قبول کر لیتا، جبکہ موجودہ صورتِ حال میں اگر میں مسلمان ہو جاؤں تو یہ تمام بڑے بڑے سردارانِ قریش یہ طعنہ دینگے کہ ''ابوالعاص کو دیکھو، محض اپنی ''بیوی'' کی خاطر اس نے آباؤ اجداد کے دین کو چھوڑ دیا، اپنے باپ دادا کے دین سے غداری کر ڈالی محض بیوی کی خاطر...... یعنی بیوی کے سامنے جھک گیا...... ہتھیار ڈال دیئے''۔

ظاہر ہے کہ اُس معاشرے میں یہ بہت بڑا طعنہ تھا......

انہی حالات میں وہاں مکہ میں وقت گذرتا رہا......حتیٰ کہ نبوت کے تیرہویں سال کے آخری دنوں میں جب ہجرت کا حکم نازل ہوا تو رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے شوہر ابوالعاص کے مجبور کرنے پر مکہ میں ہی رہ گئیں۔

☆......ہجرتِ مدینہ کے بعد محض اگلے ہی سال یعنی ۲ھ میں مسلمانوں کو نیست و نابود کر دینے کی غرض سے مشرکینِ مکہ اپنے لشکرِ جرار کے ہمراہ اپنے مذموم عزائم لئے ہوئے مدینہ جا پہنچے، جہاں مدینہ شہر سے باہر کچھ فاصلے پر ''بدر'' کے مقام پر حق و باطل کے درمیان یہ اولین اور انتہائی تاریخی اور یادگار معرکہ پیش آیا۔

جن دنوں مشرکینِ مکہ مسلمانوں کے خلاف اس لشکر کشی کی غرض سے مدینہ کی جانب سفر کی تیاریوں میں مشغول تھے......اُس موقع پر ابوالعاص بن الربیع رسول اللہ ﷺ کے خلاف یا کسی بھی مسلمان کے خلاف کسی قسم کی جارحیت میں شرکت پر کسی طور آمادہ نہیں تھا......اسے کوئی ایسا شوق نہیں تھا، نہ ہی اس کے ایسے رجحانات تھے، وہ کہا کرتا تھا کہ ''میری تو کوئی دشمنی ہی نہیں ہے......نہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ......اور نہ ہی مسلمانوں میں سے کسی ایک بھی فرد کے ساتھ......لہٰذا میں اس جنگ میں کیوں شرکت کروں؟''

لہٰذا ابوالعاص بن الربیع اُن دنوں بس اسی فکر میں مگن رہا کرتا تھا کہ ''کوئی ایسی ترکیب کی جائے ......یا کوئی ایسا معقول بہانہ بنایا جائے......جس کی بدولت میں اس جنگ سے دور رہوں''

لیکن یہ اس کی خام خیالی تھی، کیونکہ ایک تو یہ مشرکینِ مکہ اور مسلمانوں کے مابین اولین معرکہ

تھا......دوم یہ کہ اُس معاشرے میں چونکہ اس کی بڑی حیثیت اور خوب شہرت تھی' لٰہذا اس قدر اہم معاملے سے الگ تھلگ رہنا یا روپوش ہو جانا اس کیلئے کسی صورت ممکن نہیں تھا، لٰہذا بادلِ ناخواستہ اسے بھی مشرکینِ مکہ کے اس لشکر کے ہمراہ نکلنا ہی پڑا۔

☆......ہجرت کے دوسرے سال مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''بدر'' کے مقام پر یہ پہلا معرکہ جب پیش آیا تو اس کے نتائج کچھ یوں ظاہر ہوئے کہ مسلمانوں کو تو اللہ کی طرف سے غلبہ اور فتح و نصرت سے نوازا گیا، جبکہ مشرکینِ مکہ کو شکست و رسوائی کا سامنا کرنا پڑا، ان کے بڑے بڑے نامی گرامی سرداروں سمیت ستر افراد مارے گئے، ستر ہی قیدی بنائے گئے، جبکہ باقی جان بچا کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہو گئے......ابوالعاص بن الربیع کے نصیب نے اسے ان لوگوں میں لا کھڑا کیا جنہیں قیدی بنایا گیا تھا......

رسول اللہ ﷺ نے ان قیدیوں کے انجام کے بارے میں غور و فکر اور مشاورت کے بعد ''فدیہ'' کا فیصلہ فرمایا، یعنی ہر قیدی فدیہ ادا کرے اور اس کے عوض اس قید سے رہائی حاصل کر کے چلتا بنے۔

تب مکہ اور مدینہ کے درمیان بڑے پیمانے پر قاصدوں اور کارندوں کی بھاگ دوڑ اور آمد و رفت شروع ہو گئی، ہر قیدی کا کوئی نہ کوئی رشتے دار مکہ سے کچھ مال لے کر آتا، تاکہ بطورِ فدیہ یہ مال ادا کر کے اپنے رشتے دار قیدی کو چھڑا لے جائے۔

تب حضرت زینب رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابوالعاص بن الربیع کی رہائی کیلئے بطورِ فدیہ ایک ہار بھجوایا، جو کہ ان کی والدہ ام المؤمنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے ابوالعاص کے ساتھ ان کی شادی کے موقع پر انہیں پہنایا تھا، ابوالعاص بن الربیع کا بھائی عمرو بن الربیع یہ ہار لئے ہوئے مکہ سے مدینہ پہنچا۔

رسول اللہ ﷺ کی نظر جب اس ہار پر پڑی تو آپؐ نے اسے پہچان لیا...... پرانی یادیں تازہ ہوگئیں......وفاء شعار شریکۂ حیات خدیجہ بنت خویلد کی یاد......نیز اپنی پیاری بیٹی لختِ جگر اور نورِ نظر زینب کی یاد......تب آپؐ بہت زیادہ افسردہ ورنجیدہ ہوگئے......آپؐ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں......تب آپؐ نے بہت ہی جذباتی انداز میں اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے فرمایا''زینب نے اپنے قیدی کی رہائی کی غرض سے یہ ہار بھجوایا ہے......اگر آپ لوگ مناسب سمجھیں تو اس کے قیدی کو یہ ''فدیہ'' لئے بغیر ہی رہا کردیا جائے ،اور زینب کا یہ ہار بھی اسے لوٹا دیا جائے......''اس پر سبھی نے بیک زبان عرض کیا''اے اللہ کے رسول! آپ کی بات ہمارے لئے سر آنکھوں پر''۔

یوں ابوالعاص بن الربیع کی رہائی بغیر فدیہ لئے طے پاگئی......البتہ اس کی رہائی سے قبل رسول اللہ ﷺ نے یہ شرط رکھی کہ وہ رہائی کے بعد واپس مکہ پہنچتے ہی زینبؓ کو بچوں سمیت بحفاظت مکہ سے مدینہ کی جانب روانہ کردے گا۔

چنانچہ رہائی کے بعد مکہ پہنچتے ہی ابوالعاص بن الربیع نے زینب کو سفر کی تیاری کی تاکید کی، اس دوران رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ(۱) نیز انصارِ مدینہ میں سے ایک شخص کو مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ فرمایا،تاکہ وہ مکہ شہر سے باہر کسی مناسب مقام پر رک کر زینب کا انتظار کرسکیں،اور پھر انہیں اپنی تحویل میں لئے ہوئے بحفاظت مدینہ تک لاسکیں،ابوالعاص کو بھی کسی مناسب ذریعے سے اس چیز کی اطلاع دے دی گئی تھی۔

ان تمامتر انتظامات نیز اپنی طرف سے مکمل تسلی واطمینان کرلینے کے بعد ابوالعاص بن الربیع نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ کیا ہوا اپنا وہ وعدہ وفاء کرتے ہوئے ایک روز اپنے چھوٹے

(۱) حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات [۳۶۳۔۳۷۸] میں ملاحظہ ہو۔

بھائی کِنانہ بن الربیع کی معیت میں اپنی بیوی زینب (رضی اللہ عنہا) کو مکہ سے روانہ کیا۔
کِنانہ بن الربیع بہت ہی نڈر اور بہادر قسم کا نوجوان تھا، اس نے زینبؓ کو بچوں سمیت ''ہودج'' میں بٹھایا(۱) اپنی تلوار سنبھالی، مزید یہ کہ تیر کمان سے مسلح ہو کر دن کی روشنی میں سردارانِ قریش اور تمام مشرکینِ مکہ کی نگاہوں کے سامنے مکہ شہر سے روانہ ہو گیا۔

مشرکینِ مکہ نے جب یہ منظر دیکھا تو خوب بڑبڑانے لگے، اور باہم یوں کہنے لگے کہ ''ہمارے اتنے بڑے دشمن (یعنی رسول اللہ ﷺ) کی بیٹی کو یہ شخص یوں آرام سے اور اس قدر بے خوف وخطر ہماری نگاہوں کے سامنے اس کے باپ کے حوالے کرنے کی غرض سے لئے جا رہا ہے......؟'' اور تب وہ اس سواری کا تعاقب کرنے لگے، مسلسل بڑبڑاتے ہوئے اس اونٹ کے پیچھے پیچھے چلتے رہے...... یوں رفتہ رفتہ مجمع بڑھتا گیا، اور ان کے لب ولہجے میں شدت وتلخی آتی گئی، اس دوران کچھ لوگوں نے اس قدر زور سے اس ''ہودج'' کو دھکا دیا کہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا توازن برقرار نہ رکھ سکیں اور اونٹ سے نیچے آگریں، سخت پتھریلی زمین پر گرنے کی وجہ سے انہیں کافی چوٹیں آئیں، نیز چونکہ ان دنوں وہ امید سے تھیں، لہٰذا ان چوٹوں کی وجہ سے موقع پر ہی وہ حمل بھی ضائع ہو گیا، یہ چیز ان کیلئے جسمانی چوٹوں کے علاوہ بڑے ذہنی ونفسیاتی صدمے کا سبب بھی بنی، اور یوں ان کی طبیعت کافی ناساز ہو گئی۔

نوجوان اور جوشیلا کنانہ بن الربیع جو کہ ابتک ڈٹا ہوا تھا، اور اکیلا ہی اس اتنے بڑے ہجوم کا سامنا کرنے پر مُصر تھا......لیکن اب اس نے جب حضرت زینبؓ کی یہ نازک صورتِ حال دیکھی تو وہ سوچ میں پڑ گیا۔

(۱) اُس دور میں ''پالکی'' نما ایک چیز ہوا کرتی تھی جسے ''ہودج'' کہا جاتا تھا، عورتوں اور بچوں کو اس میں بٹھا کر اسے اونٹ پر لاد کر رسی سے باندھ دیا جاتا تھا۔

اُدھر سردارانِ قریش میں سے ابوسفیان (جواس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) نے جب اس تازہ صورتِ حال کی وجہ سے کنانہ بن الربیع کو قدرے متردد اور گومگو کی کیفیت میں دیکھا تو انہوں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے اس کے قریب جا کر محبت بھرے انداز میں سرگوشی کرتے ہوئے یوں کہا ''بھتیجے! یہ اپنا تیر کمان ذرہ نیچے کرو، اور ٹھنڈے دل کے ساتھ میری بات غور سے سنو''

کِنانہ نے کہا ''بولئے'' اس پر ابوسفیان نے کہا ''ابھی چند روز ہی قبل ہی محمد (ﷺ) اور ان کے ساتھیوں کے ہاتھوں بدر کے میدان میں ہمیں کس قدر ذلت آمیز شکست و ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا ہے، تمام عرب قبائل میں ہم بے عزت ہو کر رہ گئے ہیں، اور تم ہو کہ ہمارے اتنے بڑے دشمن کی اس بیٹی کو یوں دن دہاڑے ہم سب کی نگاہوں کے سامنے لئے جا رہے ہو، تا کہ اسے بحفاظت اس کے باپ تک پہنچا دو، اور ہم بے بس و لاچار کھڑے ہوئے بس منہ تکتے رہیں؟''

پھر قدرے توقف کے بعد مزید کہا ''اگر تم اس طرح زینب کو ہماری نگاہوں کے سامنے مکہ سے نکال کر لے گئے تو تمام عرب قبائل ہمیں مزید بزدلی کا طعنہ دیں گے، اور ہم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے، لہٰذا بھتیجے میری نصیحت قبول کر لو، اسے فی الحال واپس گھر لے جاؤ......تا کہ ہم بے عزتی سے بچ جائیں......اور پھر چند روز بعد مناسب موقع دیکھ کر کبھی رات کے اندھیرے میں اسے لئے ہوئے مکہ سے نکل جانا''۔

تب حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی نازک صورتِ حال کے پیشِ نظر کِنانہ بن الربیع ابوسفیان کی اس نصیحت کو قبول کرتے ہوئے حضرت زینبؓ کو ہمراہ لئے ہوئے واپس گھر لوٹ آیا، اور پھر چند روز گذر جانے کے بعد جب معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو گیا، تب ابوسفیان

کے مشورے پر عمل کرتے ہوئے ایک رات جب ہر طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا، تب وہ حضرت زینبؓ اور ان کے بچوں کو ہمراہ لئے ہوئے خاموشی کے ساتھ مکہ سے روانہ ہو گیا، اور مکہ شہر سے باہر پیشگی منصوبے کے مطابق طے شدہ مقام پر جہاں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ اپنے انصاری ساتھی سمیت ان کے منتظر تھے...... وہاں پہنچ کر کِنانہ بن الربیع نے یہ امانت ان کے حوالے کر دی، اور یوں رسول اللہ ﷺ کی یہ صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ عنہا اپنے دونوں کمسن بچوں (بیٹی اُمامہ، اور بیٹا علی) سمیت بخیر و عافیت مدینہ آ پہنچیں اور اپنے عظیم والد یعنی رسول اللہ ﷺ سے آ ملیں، تب رسول اللہ ﷺ انتہائی مسرور و شاداں ہو گئے، نیز اس موقع پر آپؐ ابوالعاص بن الربیع کی بھی تعریف کرتے رہے کہ "واقعی اس نے وعدہ وفاء کر دکھایا"۔

☆......حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی مدینہ آمد غزوۂ بدر کے فوری بعد یعنی ۲ھ میں ہوئی تھی، اس کے بعد وقت کا سفر جاری رہا، تقریباً پانچ سال کا طویل عرصہ بیت گیا، اس دوران حضرت زینبؓ کیلئے کتنے ہی رشتے آئے، بہت ہی اچھے 'اعلیٰ خاندانی' اور انتہائی شریف النفس قسم کے لوگ مسلسل رشتے بھیجتے رہے...... مگر حضرت زینب رضی اللہ عنہا مسلسل معذرت ہی کرتی رہیں...... محض اس امید پر کہ کاش...... شاید کبھی ابوالعاص بن الربیع مسلمان ہو جائے اور مکہ سے مدینہ چلا آئے...... اور یوں ماہ و سال گذرتے چلے گئے۔

☆......اور پھر ۷ھ میں یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک بار ابوالعاص بن الربیع ایک سو اونٹوں' نیز ایک سو ستر ملازمین پر مشتمل اپنے تجارتی قافلے سمیت ملکِ شام سے واپس مکہ کی طرف محوِ سفر تھا، راستے میں یہ قافلہ جب مدینہ کے قریب سے گذر رہا تھا تب مسلمانوں کے ایک دستے نے اس قافلے کو روکا، مال اپنے قبضے میں لے لیا، اور تمام افراد کو قیدی بنا لیا...... البتہ

ابوالعاص بن الربیع بچ نکلنے میں کامیاب ہوگیا(۱)

اس کے بعد ابوالعاص بن الربیع کچھ عرصہ خفیہ طور پر مدینہ کے آس پاس اِدھر اُدھر گھومتا رہا، آخر ایک رات تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے وہ خفیہ طور پر مدینہ شہر میں داخل ہوا، اور کسی نہ کسی طرح......انجان بن کر......بھیس بدل کر......لوگوں سے پوچھتا ہوا......حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے گھر تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا، اس کی یوں بالکل اچانک آمد پر حضرت زینبؓ انتہائی حیرت زدہ رہ گئیں......تب اس موقع پر اس نے حضرت زینبؓ سے اپنے لئے پناہ طلب کی، جس پر انہوں نے اسے پناہ دے دی۔

اور پھر جب صبح کی روشنی پھیلنے لگی، مدینہ شہر میں مسجدِ نبوی کے مینار سے بلند ہونے والی اذان کی صدا گونجنے لگی......رسول اللہ ﷺ ودیگر مسلمان نمازِ فجر کی ادائیگی کیلئے مسجد پہنچے، نماز سے فراغت کے فوری بعد اچانک وہاں عورتوں کیلئے مخصوص حصے میں سے حضرت زینبؓ کی آواز بلند ہوئی جو یوں کہہ رہی تھیں ''لوگو! میں زینب بنت محمد ہوں، میں آج ابوالعاص کو اپنے گھر میں پناہ دے چکی ہوں، لہٰذا تم سب بھی اسے پناہ دے دو'' (یعنی میں نے اسے جو پناہ دی ہے سب لوگ اس چیز کا لحاظ کریں اور کوئی شخص ابوالعاص کو پریشان نہ

(۱) یہ اُس دور کی بات ہے جب مسلمان اور مشرکینِ مکہ باہم حالتِ جنگ میں تھے، فریقین میں سے جس کو جب موقع ملتا وہ فریقِ مخالف کو نقصان پہنچاتا، مال واسباب پر قبضہ کرلیا جاتا۔

نیز چونکہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے ظلم وزیادتی کے نتیجے میں ہی مسلمان اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر خالی ہاتھ بالکل بے سروسامانی کی کیفیت میں وہاں سے ہجرت کر کے مدینہ چلے آئے تھے......لہٰذا انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ مشرکینِ مکہ کا کوئی تجارتی قافلہ یا اموال واسباب کہیں ہاتھ لگ جائے تو اس پر قبضہ کرلیا جائے......تاکہ اس طرح ان مسلمانوں کے اُس بڑے نقصان کی کچھ تھوڑی بہت تلافی ہوسکے کہ جس کا سبب خود مشرکینِ مکہ ہی تھے، چنانچہ ابوالعاص بن الربیع کے تجارتی قافلے کے ساتھ یہ جو صورتِ حال پیش آئی اس کا پس منظر بھی یہی تھا۔

کرے)۔

حضرت زینبؓ کی یہ آواز اوران کی طرف سے یہ بالکل ہی غیر متوقع اورعجیب وغریب اعلان سننے کے بعدلوگ حیرت کی وجہ سے اِدھراُدھر دیکھنے لگے،خودرسول اللہﷺ کوبھی انتہائی تعجب ہوا،اورآپؐ نے نمازیوں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت فرمایا''جوکچھ میں سن رہاہوں کیاتم نے بھی یہی کچھ سنا ہے؟''

سب نے عرض کیا''جی!اے اللہ کے رسول......ہم بھی یہی سن رہے ہیں''

اس پرآپؐ نے فرمایا''اللہ کی قسم!مجھے تواس بارے میں کچھ علم ہی نہیں ہے،بس جس طرح تم لوگ ابھی پہلی باریہ سب کچھ سن رہے ہو......بعینہٖ اسی طرح میں بھی پہلی بارہی سن رہاہوں''۔

اورپھرآپؐ اپنی بیٹی زینبؓ کے گھرتشریف لے گئے،اورانہیں ابوالعاص بن الربیع کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکیدفرمائی،البتہ اس موقع پرآپؐ نے انہیں یہ تنبیہ بھی فرمادی کہ اب تم دونوں کے درمیان رشتۂ زوجیت برقرارنہیں ہے......تاوقتیکہ وہ دینِ اسلام قبول کرلے۔

اس کے بعدرسول اللہﷺ نے مسلمانوں کے اس دستے سے تعلق رکھنے والے افرادکوبلوایا جنہوں نے ابوالعاص کے اس قافلے کوروکا تھا،اورمال واسباب قبضے میں لے لیاتھا،آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا''ابوالعاص کا ہم سے جوتعلق ہے وہ تم سبھی کے علم میں ہے،تم لوگوں نے اس کے مال پریہ جوقبضہ کرلیاہے......تم لوگ اگراحسان اوربھلائی کے طورپراس کامال اسے لوٹادوتویہ اچھی بات ہوگی......اوراگرتم ایسانہ کرو......تب بھی کوئی حرج نہیں،کیونکہ یہ اللہ کی طرف سے تمہارے لئے مالِ غنیمت ہےاورتم ہی اس کے زیادہ حقدارہو''۔

غور طلب بات ہے کہ یہ وہ دور چل رہا تھا جب مسلمان تنگدستی و مفلسی کا شکار تھے، فتوحات کا اور پھر بڑے پیمانے پر مالِ غنیمت کی آمد کا کوئی سلسلہ اُس وقت تک شروع نہیں ہوا تھا...... لیکن اس کے باوجود رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ گفتگو سنتے ہی ان سب نے بلا تردد اور بیک زبان فوری جواب دیا ''اے اللہ کے رسول! ابوالعاص کا مال ہم اسے واپس لوٹا دیتے ہیں''۔

اس کے بعد جب ابوالعاص بن الربیع اپنا مال و اسباب وصول کرنے کی غرض سے وہاں پہنچا اور ان مسلمانوں کے ساتھ کچھ تعارف ہوا اور گفتگو وغیرہ ہوئی ......تب ان مسلمانوں نے محسوس کیا کہ یہ تو بہت ہی شریف النفس اور انتہائی بااخلاق قسم کا انسان ہے، اور تب وہ آپس میں سرگوشیاں کرتے ہوئے یوں کہنے لگے ''اس قدر شریف اور بااخلاق انسان...... یہ ابوالعاص......کاش یہ مسلمان ہو جاتا''۔

اور پھر وہ سب اس کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بولے:

''اے ابوالعاص! آپ کس قدر شریف انسان ہیں، مکہ میں بھی آپ کا تعلق تو بہت ہی اعلیٰ اور شریف خاندان سے ہے، مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ آپ کا کس قدر قریبی رشتہ ہے......لہٰذا ہمارا مشورہ یہ ہے کہ آپ مسلمان ہو جائیے......اس سے آپ کو جو دینی فائدہ ہوگا وہ یقیناً اپنی جگہ...... لیکن مزید یہ کہ اس طرح آپ آرام سے اپنی باقی زندگی یہاں مدینہ میں اپنے اہل و عیال کے ساتھ بسر کر سکیں گے......اس کے علاوہ مزید یہ کہ آپ کے اس قافلے میں بڑی مقدار میں دیگر مشرکینِ مکہ کا جو سامانِ تجارت ہے......وہ (مالِ غنیمت کے طور پر) آپ کی ملکیت میں آ جائے گا''۔

اس پر ابوالعاص بن الربیع نے انہیں جواب دیتے ہوئے کہا ''یہ تو بہت ہی بری بات ہوگی

کہ میں اپنے نئے دین کی ابتداء ہی ''خیانت'' سے کروں'' (۱)(۲)

اس کے بعد ابوالعاص بن الربیع اپنے قافلے اور تمام اموال واسباب سمیت مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہو گیا۔

مکہ پہنچتے ہی اس نے ہر حقدار کو اس کا حق ادا کیا، اور پھر ان سبھی کو بآوازِ بلند مخاطب کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا ''اے جماعتِ قریش! کیا میرے ذمے تم میں سے کسی کا کوئی مال باقی رہ گیا ہے؟''

اس پر وہ سب بیک زبان بولے ''نہیں اے ابوالعاص! ہم سب اپنا حق وصول کر چکے ہیں، اور ہم نے تمہیں ہمیشہ ہی وفادار اور سچا انسان پایا ہے''۔

تب ابوالعاص بولا ''تم سب اقرار کر رہے ہو کہ میں تم سب کا حق مکمل طور پر ادا کر چکا ہوں اور یہ کہ اب میرے ذمے تم میں سے کسی کا کوئی حق باقی نہیں بچا ہے...... تو اب سن لو...... میں تم سب کے سامنے یہ گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں، اور یہ کہ محمد (ﷺ) اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں''۔

اس کے بعد ابوالعاص نے مزید کہا ''میری تو یہ دلی خواہش تھی کہ میں مدینہ میں ہی اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر دیتا...... لیکن مجھے اندیشہ تھا کہ کہیں تم لوگ یہ گمان نہ کرنے لگو کہ میں

(۱) یعنی اُس دور میں جو چھوٹے تاجر ہوا کرتے تھے جن کی اتنی حیثیت نہیں تھی کہ مستقل ان کا کوئی تجارتی قافلہ تیار ہو سکے...... وہ کسی بڑے تاجر کے ساتھ کچھ معاوضہ طے کر کے اس کے قافلے میں ہی اپنا سامان منگوایا کرتے تھے...... لہٰذا ابوالعاص چونکہ بڑا تاجر تھا اس لئے اس کے سامانِ تجارت میں بڑی مقدار میں مشرکینِ مکہ کے دوسرے متعدد تاجروں کا سامان بھی شامل تھا۔ دینِ اسلام قبول کر لینے کی صورت میں باقی تمام مسلمانوں کی طرح خود اس کیلئے بھی مشرکینِ مکہ کا وہ مال واسباب حلال ہو جاتا...... اس چیز کی طرف اشارہ مقصود تھا۔

(۲) یعنی میرے پاس دیگر مشرکینِ مکہ کا جو مال ہے جو کہ انہوں نے مجھ پر بھروسہ کرتے ہوئے میرے حوالے کر رکھا ہے، مجھے یہ بات پسند نہیں کہ میں کسی بھی شکل میں ان کے ساتھ خیانت کروں اور انہیں دھوکہ دوں۔

محض تمہارا مال ہتھیانے کیلئے مسلمان ہو گیا ہوں ...... لہٰذا اس بدگمانی سے بچنے کی خاطر میں نے اس معاملے کو مؤخر کیا، اور اب جبکہ میں تم سب کا حق مکمل ادا کر چکا ہوں تو میں مکمل بے فکری اور اطمینان کے ساتھ اپنے قبولِ اسلام کا اعلان کر رہا ہوں''۔

☆...... یوں ابوالعاص اب رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ بن گئے ...... اور پھر وہ اولین فرصت میں مکہ سے دوبارہ مدینہ کی جانب محوِ سفر ہو گئے ...... وہاں پہنچتے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری دی اور عرض کیا ''گذشتہ بار میں پناہ کی طلب میں یہاں آیا تھا ...... لیکن اس بار میں مسلمان بن کر یہاں آیا ہوں ...... تا کہ آپ کے سامنے اللہ کی وحدانیت کا' اور آپ کی رسالت کا اقرار کر سکوں''۔

اور پھر رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں انہوں نے بآوازِ بلند کلمۂ حق پڑھا ''أشھد أن لا الٰہ الا اللہ، وأشھد أن محمداً رسول اللہ''۔

اس پر رسول اللہ ﷺ نے بہت زیادہ مسرت واطمینان کا اظہار فرمایا، اور پھر اپنی بیٹی زینبؓ کی مرضی معلوم کرنے کے بعد ان دونوں کو دوبارہ (اکثر اہلِ علم کے بقول پرانے نکاح پر ہی) میاں بیوی کی حیثیت سے زندگی بسر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔

اور یوں سالہا سال کی اس طویل جدائی کے بعد اب یہ دونوں میاں بیوی اپنے دونوں بچوں اُمامہ اور علی سمیت دوبارہ ہنسی خوشی زندگی بسر کرنے لگے اور زندگی دوبارہ رواں دواں ہو گئی ......

یوں ان کی اس نئی زندگی پر رسول اللہ ﷺ بھی بہت زیادہ مسرت کا اظہار فرمایا کرتے' نیز ان کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے، ان دنوں آپؐ اکثر ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کے بارے میں یہ تعریفی کلمات ارشاد فرمایا کرتے تھے:

حَدَّثَنِي فَصَدَقَنِي ، وَوَعَدَنِي فَوَفَّىٰ لِي...... یعنی ''ابوالعاص نے میرے ساتھ ایک بات طے کی تھی ، اور پھر اپنی اس بات کو سچ کر دکھایا، مجھ سے ایک وعدہ کیا تھا، اور پھر اپنا وہ وعدہ وفاء کر دکھایا''۔

یعنی غزوۂ بدر کے موقع پر جب ابوالعاص مسلمانوں کے ہاتھوں قیدی بن گئے تھے، تب آپؐ نے انہیں اس شرط پر رہا کیا تھا کہ '' مکہ واپس پہنچتے ہی زینبؓ کو مکہ سے مدینہ روانہ کر دینا'' تب ابوالعاصؓ نے وعدہ کیا تھا کہ وہ ضرور ایسا ہی کریں گے......اور پھر واقعی انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنے اس قول وقرار کا مکمل لحاظ رکھتے ہوئے اپنے اس وعدے کو پورا کیا تھا، اور زینبؓ کو باعزت اور بخیر وعافیت مدینہ روانہ کر دیا تھا (جیسا کہ گذشتہ صفحات میں اس چیز کا مفصل تذکرہ ہو چکا ہے)۔

اور پھر مدینہ میں یوں ہنسی خوشی وقت گذرتا رہا......

☆......لیکن وقت ہمیشہ ایک جیسا نہیں رہتا......انسان کی زندگی نشیب وفراز کا نام ہے، کبھی خوشی اور کبھی غم، کبھی دھوپ اور کبھی چھاؤں، کبھی مسکراہٹیں اور کبھی آنسو، یہی قانونِ قدرت ہے، اور یہ قانون سبھی کیلئے ہے......خواہ کوئی امیر ہو یا فقیر، خوشحال ہو یا تنگدست، چھوٹا ہو یا بڑا......کسی کیلئے اس قانونِ قدرت سے فرار ممکن نہیں ہے......

چنانچہ حضرت ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ اور ان کی زوجہ محترمہ حضرت زینب بنت الرسول ﷺ کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی معاملہ پیش آیا......

ہوا یہ کہ ۲ھ میں غزوۂ بدر کے فوری بعد مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کے موقع پر حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو مشرکینِ مکہ کی طرف سے جن اذیتوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس کے نتیجے میں یہ کافی زخمی بھی ہوگئی تھیں، سالہا سال گذر جانے کے باوجود انہی زخموں کی تکلیف

مسلسل چلی آرہی تھی، اس دوران ہر قسم کا علاج کروایا تھا، لیکن کوئی افاقہ نہیں ہوسکا تھا، آخر وہ خود کو اللہ کے حوالے کرتے ہوئے مستقل صاحبِ فراش ہوگئی تھیں......بس بستر سے ہی لگ کر رہ گئی تھیں، اور اب مرورِ زمانہ کے ساتھ طبیعت مزید بگڑنے لگی تھی۔

۲ھ میں ان دونوں میاں بیوی میں دوری ہوئی تھی......سالہا سال کی طویل جدائی اور انتظار کے بعد آخر ۷ھ میں دوبارہ یہ دونوں یکجا ہوئے تھے......لیکن اس کے بعد ابھی محض چند مہینے ہی گذرے تھے کہ ۸ھ کے بالکل ابتدائی دنوں میں زینبؓ اس جہانِ فانی سے منہ موڑ گئیں......جب ان کی عمر محض تیس سال تھی......یوں عین جوانی کی عمر میں سب کو افسردہ ورنجیدہ چھوڑ کر چلتی بنیں......

زینبؓ کی وفات ظاہر ہے کہ ابوالعاصؓ کیلئے ......بلکہ خود رسول اللہ ﷺ کیلئے بہت ہی بڑا صدمہ تھا(۱)

اسی افسردگی کے ماحول میں اور انتہائی سوگوار فضاء میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی تجہیز وتکفین کے مراحل سے گذرنے کے بعد جب تدفین کا مرحلہ آیا......تو اس موقع پر آپؐ خود قبر میں اترے، تدفین کے اس عمل کے دوران آپؐ پر رقت طاری ہوگئی، تب آپؐ انتہائی خشوع وخضوع کے ساتھ اپنے رب سے دعاء ومناجات میں مشغول ہوگئے، اس موقع پر آپؐ کی زبان پر بار بار یہ الفاظ آتے: ''اے اللہ! تو جانتا ہے کہ میری بیٹی زینب بہت ہی

(۱) خصوصاً یہ کہ اس سے قبل ۲ھ میں عین غزوۂ بدر کے دن آپؐ کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا بھی وفات پا چکی تھیں، اب ۸ھ میں حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا۔ اور پھر محض اگلے ہی سال ۹ھ میں غزوۂ تبوک سے آپؐ کی واپسی کے فوری بعد آپؐ کی صاحبزادی حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہا بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں......یوں آپؐ نے اپنی چار بیٹیوں میں سے تین کو عین جوانی کی عمر میں خود اپنے ہاتھوں قبر میں اتارا، جبکہ کمسنی میں وفات پا جانے والے آپؐ کے متعدد بیٹے اس کے علاوہ تھے......

کمزور وناتواں ہے......اس لئے اے اللہ تو اس کے ساتھ رحمت ومہربانی کا معاملہ فرمانا‘‘۔
اپنی پیاری بیٹی زینبؓ کی وفات پر جس طرح رسول اللہ ﷺ بہت زیادہ افسردہ تھے......اسی طرح یہ صدمہ ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کیلئے بھی ناقابلِ برداشت تھا......چنانچہ ان دنوں وہ اکثر دنیاومافیہا سے بےخبر......اداس اور پریشان نظر آیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اٹھتے بیٹھتے، گھومتے پھرتے، ہر وقت آنکھوں سے بے اختیار آنسو بہتے رہتے تھے......ان دنوں بعض اوقات لوگوں نے رسول اللہ ﷺ کو انتہائی شفقت ومحبت کے ساتھ خود اپنے دستِ مبارک سے ابوالعاصؓ کی آنکھوں سے آنسو صاف کرتے ہوئے بھی دیکھا......
رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ان سبھی کے ساتھ بہت زیادہ محبت وشفقت کا معاملہ تو پہلے سے ہی چلا آرہا تھا، حتیٰ کہ آپؐ اکثر اُمامہ کو گود میں اٹھائے ہوئے ہی نماز بھی پڑھ لیا کرتے تھے......

البتہ اب ان بچوں کی ماں یعنی حضرت زینبؓ کی وفات کے بعد اس محبت وشفقت اور خبرگیری کے جذبے میں مزید اضافہ ہوگیا تھا، حتیٰ کہ ۸ھ میں فتحِ مکہ کے انتہائی یادگار اور تاریخی موقع پر جب کسی جشن یا شان وشوکت کے مظاہرے کی بجائے آپؐ انتہائی عاجزی وانکساری کے ساتھ، بہت ہی خشوع وخضوع کا مظاہرہ کرتے ہوئے، اپنے رب کے سامنے گردن جھکائے ہوئے، اس کی تسبیح اور حمد وثناء بیان کرتے ہوئے مکہ شہر میں داخل ہو رہے تھے......تب اس تاریخی موقع پر آپؐ نے زینبؓ کے اسی کمسن بیٹے ’’علی‘‘ کو اپنے ہمراہ اونٹ پر بٹھا رکھا تھا......
آپؐ کی پیاری بیٹی، ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کی وفات کے بعد مدینہ میں ابھی محض چند ماہ ہی گذرے تھے......کہ ایک اور انتہائی

افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ ابوالعاصؓ کا یہ کمسن بیٹا علی بیمار پڑ گیا، اور چند دن کے اس بخار کے بعد اچانک ہی داغِ مفارقت دے گیا(۱) یہ واقعہ رسول اللہ ﷺ کیلئے، نیز ابوالعاصؓ کیلئے مزید بہت بڑے رنج والم کا باعث بنا...... جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابوالعاصؓ اب خود کو سنبھال نہ سکے...... مسلسل بسترِ علالت پر ہی اب ان کے شب وروز بسر ہونے لگے۔

۸ھ کے ابتدائی دنوں میں رسول اللہ ﷺ کی صاحبزادی (ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کی زوجۂ محترمہ) حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوا تھا، اور پھر اسی سال کے اواخر میں ان کے کمسن بیٹے علی کی وفات ہوئی، اس کے بعد ۱۱ھ کے ابتدائی مہینوں میں (۱۲/ ربیع الاول) رسول اللہ ﷺ کی رحلت کا سانحہ پیش آیا، اور بالآخر اس کے اگلے ہی سال یعنی ۱۲ھ میں حضرت ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ بھی اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے رب سے جا ملے، اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔

(۱) اللہ کی شان...... یہ دونوں بچے آپس میں بھائی بہن، ایک ہی ماں باپ کی اولاد، ایک ہی گھر میں پیدا ہوئے، ایک ہی جگہ اور ایک ساتھ پرورش پائی...... لیکن بقضائے الٰہی ''علی'' اس قدر کمسنی میں ۸ھ میں وفات پا گیا...... جبکہ اس کی بہن ''اُمامہ'' نے طویل عمر پائی، ۱۱ھ میں حضرت فاطمہ بنت الرسول ﷺ کی وفات کے بعد خود ان کی وصیت پر عمل کرتے ہوئے ان کے شوہر حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے اس اُمامہ سے شادی کی، اور پھر ۴۰ھ میں حضرت علیؓ کی شہادت کے بعد خود حضرت علیؓ کی وصیت کے مطابق اُمامہ کی شادی مُغیرہ بن نوفل بن حارث بن عبدالمطلب کے ساتھ ہوئی۔ اور پھر ۶۶ھ میں کوفہ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

☆ ملاحظہ: الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب میں حضرت ابوالعاص بن الربیع رضی اللہ عنہ کا مختصر تذکرہ ''لقیط بن الربیع'' کے نام سے (الرقم المسلسل: ۲۲۳۰) کیا گیا ہے، جبکہ مفصل تذکرہ کتاب کے آخر میں ''کتاب الکُنیٰ'' میں ابوالعاص بن الربیع کے نام سے (الرقم المسلسل: ۳۰۴۲) کیا گیا ہے۔

الحمد للہ آج بتاریخ ۱۵/ ربیع الأول ۱۴۳۶ھ، مطابق ۶/ جنوری ۲۰۱۵ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ:

معروف صحابیٔ رسول ﷺ ‘ نیز انتہائی اہم تاریخی شخصیت حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ میں قبیلۂ قریش کے مشہور و معزز ترین خاندان ’’بنومخزوم‘‘ سے تھا، مکہ شہر میں اور اس تمام معاشرے میں سیاسی‘ معاشرتی ‘ ثقافتی‘ اور معاشی‘ غرضیکہ ہر لحاظ سے خاندان بنومخزوم کو بڑی قدر و منزلت حاصل تھی۔

خالد بن ولید نے جب مکہ شہر میں اپنی ولادت‘ اور پھر بچپن کے مرحلے کے بعد عہدِ شباب میں قدم رکھا تو بہت جلد ہی ان کی فطری صلاحیتیں ظاہر ہونے لگیں ،ان کی شخصیت میں پوشیدہ ہنر نکھر کر سامنے آنے لگے، بالخصوص شجاعت وجرأت‘ فنونِ حرب میں بے مثال مہارت‘ جنگی تدابیر سے خوب واقفیت‘ نیز بھرپور اور لاجواب قائدانہ صلاحیتیں ......یہ وہ تمام خوبیاں تھیں جن کی بدولت ان کی شخصیت اس معاشرے میں روز بروز خوب نمایاں اور ممتاز ہوتی چلی گئی......حتیٰ کہ آئندہ چل کر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ جب جرأت وشجاعت‘ فنونِ حرب میں بے مثال مہارت‘ اور وسیع وعریض تاریخی فتوحات کے حوالے سے ان کی شخصیت ہمیشہ کیلئے افسانوی اور طلسماتی حیثیت اختیار کر گئی......

دینِ اسلام کے ابتدائی دور میں قریشِ مکہ کے دیگر اکثر و بیشتر سرکردہ افراد کی مانند خالد بھی کافی عرصہ تک دینِ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ رہے......البتہ مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین باقاعدہ لڑی جانے والی تین بڑی جنگوں کے حوالے سے خالد کی صورتِ حال یہ رہی کہ ۲ ھ میں اولین غزوہ یعنی ’’بدر‘‘ کے موقع پر خالد کسی وجہ سے شریک نہیں ہوئے تھے۔

اس کے بعد دوسرا غزوہ یعنی ''اُحد'' جوکہ ۳ھ میں پیش آیا تھا، اس موقع پر خالد مشرکینِ مکہ کے لشکر میں موجود تھے، اس موقع پر ابتداء میں مسلمانوں کی فتح اور مشرکین کی شکست کے آثار کافی نمایاں ہونے لگے تھے، لیکن پھر اچانک مسلمان اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے تھے...... اور اس کے پیچھے خالد ہی کی جنگی مہارت اور عسکری تدبیر کا بڑا عمل دخل تھا......(جس پر خالد کو قبولِ اسلام کے بعد زندگی بھر بڑی ندامت رہی)۔

جبکہ اس سلسلے کی تیسری جنگ یعنی ''خندق'' جوکہ ۵ھ میں پیش آئی تھی، اس موقع پر خالد مشرکینِ مکہ کے لشکر میں موجود تھے، لیکن اس موقع پر کیفیت یہ رہی تھی کہ باقاعدہ یلغار کی نوبت ہی نہیں آئی تھی۔

اس کے بعد ۶ھ میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین معروف معاہدۂ صلح یعنی ''صلحِ حدیبیہ'' کے نتیجے میں جب جنگوں کا یہ سلسلہ کچھ تھم گیا...... تو فطری طور پر بہت سے لوگوں کو اب اس زمانۂ صلح میں نفرتوں، عداوتوں، اور محض جذبات کی دنیا سے نکل کر ٹھنڈے دل ودماغ اور ہوش وحواس کے ساتھ حقیقت پسندانہ طریقے سے صورتِ حال کا جائزہ لینے، نیز ہر قسم کے تعصب اور تنگ نظری سے بالاتر ہوکر دینِ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات کے بارے میں غور وفکر کا موقع ملا...... تب ان مشرکینِ مکہ میں سے بہت سے افراد ایسے تھے کہ اس غور وفکر کے نتیجے میں ان کے دلوں میں دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے خلاف نفرت وعداوت کی چنگاریوں کی بجائے اب وہاں ''ایمان کی بہار'' آنے لگی تھی...... گمراہی کے اندھیرے چھٹنے لگے تھے، اور ان کی جگہ ہدایت کی روشنی پھیلنے لگی تھی۔

یہی وہ دور تھا جب خالد بن ولید کے دل ودماغ پر بھی کچھ ایسی ہی کیفیت طاری رہنے لگی تھی...... خاص طور پر ایک بہترین جنگجو اور بے مثال عسکری مہارت رکھنے والے انسان کی

حیثیت سے جس بات نے خالد کو بہت زیادہ متأثر کر رکھا تھا' وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں بھی یہی خوبیاں (یعنی جرأت وشجاعت' نیز فنونِ حرب اور عسکری تدابیر میں بے مثال مہارت' اور کامیاب منصوبہ بندی) بدرجۂ اتم موجود تھیں، لیکن خاص بات یہ کہ اکثر عسکری ماہرین کا اصل ہدف اور تمامتر جستجو محض جنگ جیتنے کی خاطر ہوا کرتی ہے...... خواہ اس مقصد کیلئے انہیں کچھ بھی کرنا پڑے...... اخلاقی قدروں کو قدموں تلے کچلنا پڑے...... یعنی اخلاق' انصاف' امانت ودیانت' اور انسانیت وشرافت کی ان کے نزدیک کوئی خاص اہمیت نہیں ہوا کرتی...... تمامتر توجہ بس بہرصورت اپنی ''فتح'' پر ہی مرکوز ہوا کرتی ہے......

جبکہ اس کے برعکس رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں جرأت وشجاعت اور بے مثال عسکری مہارت اور کامیاب منصوبہ بندی کی صلاحیت کے ساتھ ساتھ انسانیت وشرافت بھی اپنے عروج پر تھی...... جو کہ خالد کیلئے ایک بہت ہی عجیب بات تھی...... اور درحقیقت یہی وہ اصل وجہ تھی جس کی بناء پر ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت مسلسل گھر کرتی چلی جا رہی تھی۔

اور پھر نوبت یہاں تک جا پہنچی کہ ان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری اور ملاقات کا جذبہ ہمہ وقت موجزن رہنے لگا...... اور پھر رفتہ رفتہ انہوں نے قبولِ اسلام کا فیصلہ اور عزم بالجزم بھی کر لیا، تب یہ اس مقصد کیلئے جلد از جلد مکہ سے مدینہ کی جانب روانگی کے سلسلے میں منصوبہ بندی میں مشغول ہو گئے۔

البتہ اس موقع پر ان کی خواہش یہ تھی کہ مدینہ کی جانب تنہا جانے کی بجائے کاش قریشِ مکہ میں سے انہیں کوئی اپنا ہم خیال شخص مل جائے...... اور دونوں ایک ساتھ مدینہ کی جانب روانہ ہوں...... چنانچہ انہوں نے ایک روز اپنے دیرینہ دوست عثمان بن طلحہ سے اس بارے میں گفتگو کی، دینِ اسلام' نیز پیغمبرِ اسلام کے بارے میں اپنے ان بدلے ہوئے افکار

وخیالات کا تذکرہ واظہار کیا،جس پر عثمان بن طلحہ نے برجستہ جواب دیا کہ ''خالد!یقین جانو......اب تو میرے بھی بالکل ایسے ہی خیالات ہیں''۔

اور پھر ایک روز یہ دونوں علیٰ الصباح روشنی پھیلنے سے قبل ہی مکہ شہر سے نکل گئے......دل میں ایمان کا نور......نیز حُبِّ رسولؐ کا طوفان چھپائے ہوئے یہ دونوں سوئے منزل......یعنی مدینۃ الرسول ﷺ کی جانب رواں دواں ہوگئے۔

اس یادگار اور مبارک سفر کے دوران مکہ شہر کی حدود سے باہر نکلنے کے بعد ان دونوں نے ابھی کچھ ہی مسافت طے کی تھی کہ اچانک ایک جگہ انہیں عمرو بن العاص مل گئے......جو کہ رؤسائے قریش میں سے تھے اور مشرکینِ مکہ کی معزز ترین شخصیات میں ان کا شمار ہوتا تھا، تب اس اچانک ملاقات پر ان تینوں کو خوشگوار حیرت ہوئی،اور یہ خوشگوار حیرت اس وقت عظیم مسرت میں بدل گئی جب عمرو بن العاص نے انہیں یہ راز کی بات بتائی کہ ان کی منزل بھی مدینہ ہی ہے،اور مقصدِ سفر بھی وہی ہے،یعنی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری اور قبولِ اسلام......چنانچہ اب یہ تینوں ایک ساتھ اپنی منزل کی جانب محوِ سفر ہوگئے۔

خالد بن ولید فرماتے ہیں ''آخر اس طویل اور مسلسل سفر کے بعد ہم تینوں مدینہ پہنچے،میری زندگی کا وہ یادگار ترین تھا،جب ۸ھ میں ماہِ صفر کے پہلے دن ہم تینوں ایک ساتھ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے،ہم تینوں میں سے سب سے پہلے میں نے سلام عرض کیا،جس پر آپؐ نے بڑی ہی خندہ پیشانی اور گرمجوشی کے ساتھ میرے سلام کا جواب دیا،میں نے اپنی حاضری کا مقصد بیان کیا،اور آپؐ کے سامنے کلمۂ حق ''أشھد أن لا الٰہ الا اللہ وأشھد أن محمد أرسول اللہ'' پڑھتے ہوئے دینِ برحق قبول کیا......اس پر آپؐ نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے فرمایا: قَد کُنتُ أرَیٰ لَکَ عَقلاً رَجَوتُ أن لَا یُسلِمَکَ اِلّا

اِلـیٰ خَیـر...... یعنی ’’اے خالد! مجھے تمہاری شخصیت میں دانشمندی کے ایسے آثار دکھائی دیتے تھے جن کی بناء پر مجھے یہی امید رہتی تھی کہ تم خیر کے راستے پر آ ہی جاؤ گے‘‘

اس کے بعد میں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی ،اور پھر میں نے عرض کیا ’’اے اللہ کے رسول! ماضی میں دینِ اسلام کے خلاف میں جن کارروائیوں میں ملوث رہا ہوں، آپ اس سلسلے میں اللہ سے میرے لئے معافی کی دعاء فرمائیے‘‘

اس پر آپؐ نے فرمایا: اِنّ الاِسلَامَ یَـجُبُّ مَا قَبلَه ...... یعنی ’’اے خالد! قبولِ اسلام کے بعد گذشتہ تمام گناہ ختم ہو جاتے ہیں‘‘

میں نے عرض کیا: عَـلَـیٰ ذٰلِكَ یَا رَسُولَ اللّٰه...... یعنی ’’اے اللہ کے رسول! اس کے باوجود بھی......بس آپ میرے لئے دعائے مغفرت فرمائیے‘‘

تب آپؐ نے یوں دعاء فرمائی: اَلـلّٰهُـمّ اغفِر لِخَالِد بنِ الوَلِیدِ کُلَّ مَا أوضَعَ فِیهِ مِـن صَـدٍّ عَـن سَبِیـلِكَ ...... یعنی ’’اے اللہ! تو خالد بن ولید کی وہ تمام لغزشیں معاف فرما جو آج تک اس سے تیرے دین کے خلاف سرزد ہوتی رہی ہیں‘‘۔

اور پھر میرے بعد عمرو بن العاص (رضی اللہ عنہ) اور پھر عثمان بن طلحہ (رضی اللہ عنہ) آگے بڑھے، دینِ اسلام قبول کیا، نیز رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی‘‘(۱)(۲)

(۱) غور طلب بات ہے کہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی طرف سے اپنی گذشتہ زندگی، بالخصوص دینِ اسلام کے خلاف اپنی گذشتہ کارروائیوں اور لغزشوں پر اس قدر ندامت ......نیز رسول اللہ ﷺ سے اپنے لئے دعائے مغفرت کی بار بار درخواست اور اس بات پر اصرار......اس سے یقیناً حضرت خالد بن ولیدؓ کے دل میں موجزن ایمانی کیفیت کی خوب عکاسی ہوتی ہے......اور پھر اس کے بعد کی تمام زندگی میں......مشرق و مغرب میں اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر جس طرح حضرت خالدؓ بے مثال اور تاریخی کارنامے انجام دیتے رہے......اس کے پیچھے یقیناً ان کی یہی ایمانی کیفیت کارفرما رہی......جس کی جھلک رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہلی بار حاضری کے موقع پر ہی نظر آگئی تھی......یعنی بار بار اصرار کے ساتھ درخواستِ دعاء...... (باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر......)

☆......غزوۂ مُؤتہ:

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ قبولِ اسلام سے قبل ہمیشہ مشرکینِ مکہ کے لشکر میں شامل رہتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف بڑی کارروائیوں میں ملوث رہے تھے......لیکن اب قبولِ اسلام کے بعد ان کے دل کی دنیا یکسر بدل چکی تھی، اب کفر وشرک اور مسلمانوں کے خلاف نفرت وعداوت کی بجائے ان کی زندگی کا ہر گوشہ ایمان کے نور سے جگمگانے لگا تھا......اب اس نئی اور بدلی ہوئی زندگی میں' ان کے قبولِ اسلام کے محض دو ماہ بعد ہی ......قانونِ قدرت کے عین مطابق......ایک بہت ہی بڑی آزمائش ان کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔

ہوا یہ کہ ۶ھ میں مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''صلحِ حدیبیہ'' کے نام سے جو مشہور تاریخی معاہدہ طے پایا تھا' اس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ اور تمام مسلمانوں کو مشرکینِ مکہ کی جانب سے جب قدرے بے فکری نصیب ہوئی تھی، تب اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپ ﷺ نے دعوتِ اسلام کے اس مبارک سلسلے کو مزید وسعت دینے کا فیصلہ فرمایا تھا، اسی سلسلے میں ان دنوں مختلف فرمانرواؤں' حکمرانوں' امراء وسلاطین' اور والیانِ ریاست کے نام خطوط ارسال کئے گئے تھے جن میں انہیں دینِ برحق قبول کرنے کی دعوت

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۲) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بعد میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں عظیم ترین سپہ سالار اور ''فاتحِ مصر'' کی حیثیت سے معروف ہوئے۔ ان تینوں حضرات یعنی خالد بن ولید، عثمان بن طلحہ اور عمرو بن العاص رضی اللہ عنہم اجمعین کی شخصیت میں جو بڑی خوبیاں اور بے مثال صلاحیتیں نمایاں تھیں، نیز مکہ شہر میں ان کی جو بڑی حیثیت اور اہمیت تھی......اسی چیز کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ نے ان کی مدینہ آمد اور پھر قبولِ اسلام کے موقع پر یہ یادگار الفاظ ارشاد فرمائے تھے ''آج قریشِ مکہ نے اپنے بہترین جگر گوشے میرے حوالے کر دیئے ہیں''۔

دی گئی تھی۔

اسی سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے حارث بن عمیر الأ زدی رضی اللہ عنہ ''بُصریٰ'' کے فرمانروا کے نام تحریر فرمودہ آپؐ کا نامۂ مبارک لئے ہوئے جب مدینہ سے بُصریٰ کی جانب محوِ سفر تھے......تب راستے میں ملکِ شام کی حدود میں ''بلقاء'' نامی ریاست (جوکہ سلطنتِ روم کے تابع تھی) کے فرمانروا شرحبیل الغسانی نے انہیں روکا، تشدد کا نشانہ بنایا، اور پھر انتہائی سنگدلی وسفاکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کے ہاتھ پاؤں رسیوں سے جکڑنے کے بعد انہیں قتل کرڈالا......

رسول اللہ ﷺ کو جب اس افسوسناک واقعے کی اطلاع ملی تو آپؐ انتہائی رنجیدہ ہوگئے، کیونکہ کسی نہتے اور بےقصور انسان کو...... بالخصوص غیرملکی قاصد اور سفارتی نمائندے کو ناحق یوں قتل کرڈالنا یقیناً بہت ہی بڑا جرم تھا، مزید یہ کہ یہ سفارتی آداب کی سنگین خلاف ورزی بھی تھی......

رسول اللہ ﷺ نے یہ انتہائی افسوسناک بلکہ المناک واقعہ پیش آنے پر یہ فیصلہ فرمایا کہ اب رومیوں کے خلاف تادیبی کارروائی ضروری ہوچکی ہے، چنانچہ تین ہزار افراد پر مشتمل ایک لشکر سلطنتِ روم کی جانب روانہ کیا گیا۔ اس موقع پر آپؐ نے اس لشکر کا سپہ سالار حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، اور یہ وصیت فرمائی کہ زید کے بعد سپہ سالاری کے فرائض جعفر بن ابی طالب انجام دیں گے، اور ان کے بعد عبداللہ بن رواحہ (جوکہ انصارِ مدینہ میں سے تھے) انجام دیں گے، اور ان کے بعد باہم مشاورت کے بعد کسی کو سپہ سالار منتخب کرلیا جائے (گویا رسول اللہ ﷺ کو من جانب اللہ خبر دے دی گئی تھی کہ اس موقع پر یہ تینوں حضرات یکے بعد دیگرے شہید ہوجائیں گے......)

اور پھر یہ لشکر حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت مدینہ منورہ سے سوئے منزل رواں دواں ہوگیا......

طویل مسافت طے کرنے کے بعد جب یہ مبارک لشکر جزیرۃ العرب اور سلطنتِ روم کے مابین سرحدی علاقے میں پہنچا تو وہاں ''مؤتہ'' نامی مقام پر (جوکہ رفتہ رفتہ تقسیم در تقسیم کے سلسلوں کے بعد موجودہ ''اُردن'' میں واقع ہے) صورتِ حال جونظر آئی وہ نہایت خلافِ توقع اور انتہائی پریشان کُن تھی، کیونکہ وہاں منظر کچھ ایسا تھا کہ سامنے رومیوں کی ایک لاکھ فوج مقابلے کیلئے موجود تھی، مزید یہ کہ اس سرحدی علاقے میں آباد بہت سے عرب قبائل (غسان وغیرہ) جودینی' معاشی' وسیاسی طور پر سلطنتِ روم ہی کے تابع تھے' ان کے ایک لاکھ جنگجو بھی یہاں رومی فوج کے شانہ بشانہ موجود تھے......یعنی صورتِ حال یہ بنی کہ ایک طرف مسلمان محض تین ہزار......جبکہ دوسری جانب ان کے بالمقابل دولاکھ مسلح اور چاق وچوبند جنگجوؤں پر مشتمل بہت بڑا لشکرِ جرار......

اس خلافِ توقع صورتِ حال کی وجہ سے مسلمان کچھ تردد کا شکار ہوگئے، دوروز تک باہم مشاورت کا سلسلہ چلتا رہا، کسی نے کہا ''ہمیں اب مزید پیش قدمی کی بجائے یہیں رک کر رسول اللہ ﷺ کو اس صورتِ حال سے مطلع کرنا چاہئے اور آپؐ کی طرف سے اس بارے میں کسی فیصلے کا انتظار کرنا چاہئے'' کسی نے کہا ''ہمیں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یہ پیغام بھیجنا چاہئے کہ مزید دستے ارسال کئے جائیں'' اسی دوران حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن انداز میں مشورہ دیتے ہوئے کہا ''ہمارے لئے ناکامی کا کوئی سوال ہی نہیں ہے، ہمارے سامنے تو دونوں ہی صورتوں میں کامیابی ہی کامیابی ہے...... یا شہادت، یا فتح......لہٰذا اس تمام تر تردد کی کیا ضرورت ہے؟''

چنانچہ سبھی نے اس مشورے کو قبول کیا، اور اس پر عمل کرتے ہوئے دشمن کی جانب پیش قدمی شروع کی......فریقین میں کوئی توازن ہی نہیں تھا......ایک طرف فقط تین ہزار مسلمان، اور وہ بھی گھر سے بے گھر، وطن سے بہت دور، یہاں دشمن کی سرزمین پر......جبکہ دوسری جانب دولاکھ جنگجو......خود اپنی ہی سرزمین پر اور اپنے ہی علاقے میں......مگر اس کے باوجود......دونوں جانب سے نہایت زوردار یلغار ہوئی......زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ نہایت بے جگری سے لڑتے ہوئے شہید ہو گئے......تب رسول اللہ ﷺ کے حکم کے مطابق حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے قیادت سنبھالی، بے مثال شجاعت و بہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دور اندر تک چلے گئے......آخر اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر وہاں پردیس میں ''مؤتہ'' کے میدان میں انہوں نے بھی اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا......اور پھر یکے بعد دیگرے ان دونوں عظیم ترین اور بہادر سپہ سالاروں کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے تیسرے سپہ سالار حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ عنہ بھی وہاں ''مؤتہ'' کے مقام پر شہید ہو گئے......

رسول اللہ ﷺ نے انہی تینوں برگزیدہ شخصیات کو یکے بعد دیگرے بالترتیب اس لشکر کا سپہ سالار مقرر فرمایا تھا......لہٰذا اب ان تینوں کی شہادت کے بعد لشکر میں بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا جو کہ انتظامی لحاظ سے یقیناً بہت ہی خطرناک بات تھی، بالخصوص اس قدر نازک ترین صورتِ حال میں کہ جب جنگ اپنے پورے عروج پر تھی، اور اسلامی لشکر انتہائی پریشان کن صورتِ حال سے دوچار تھا، یہی وہ انتہائی اہم' بہت زیادہ نازک' اور فیصلہ کن مرحلہ تھا کہ جب جلد از جلد کسی مناسب ''سپہ سالار'' کا انتخاب از حد ضروری تھا۔

اس دوران انصارِ مدینہ کے خاندان ''بنوعجلان'' سے تعلق رکھنے والے ثابت بن اقرم نامی

شخص نے برق رفتاری کے ساتھ لپک کر جھنڈا اتھام لیا، جس پر سبھی لوگ اس کے اردگرد جمع ہونے لگے، گویا اب یہی ان کا نیا سپہ سالار ہے...... لیکن وہ شخص کچھ دیر دائیں بائیں نگاہ دوڑانے کے بعد آخر خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے بآواز بلند پکارتے ہوئے یوں کہنے لگا ''جلدی کیجئے خالد...... یہ جھنڈا اتھام لیجئے'' لیکن خالد اس چیز کیلئے قطعی آمادہ نہیں تھے، کیونکہ وہ تو ابھی محض دو ماہ قبل ہی مسلمان ہوئے تھے، جبکہ اس لشکر میں بڑی تعداد میں قدیم مسلمان، نیز مہاجرین وانصار میں سے اکابر صحابہ کرام موجود تھے...... بلکہ ایسے حضرات بھی تھے جنہیں حق و باطل کے درمیان اولین معرکہ یعنی ''غزوۂ بدر'' میں شرکت کا عظیم شرف نصیب ہوا تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود یہ ثابت بن اقرم عجلانی جو بڑے ہی اصرار کے ساتھ خالد کو جھنڈا اتھام لینے کی پیشکش کر رہے تھے، یہ خود بھی ''بدری'' تھے (رضی اللہ عنہ)۔

لہٰذا ثابت بن اقرم رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس اصرار کے جواب میں خالدؓ نے انہیں جواب دیتے ہوئے کہا ''میں یہ جھنڈا نہیں تھام سکتا، آپ خود اس کے زیادہ حقدار ہیں، کیونکہ آپ عمر میں مجھ سے بڑے ہیں، نیز قبولِ اسلام میں آپ کو مجھ پر سبقت حاصل ہے، اور سب سے اہم بات یہ کہ آپ تو ''بدری'' ہیں''

تب ثابت بن اقرم رضی اللہ عنہ نے بڑی ہی سنجیدگی کے ساتھ قطعی اور دوٹوک انداز میں کہا ''خالد! اللہ کی قسم! یہ جھنڈا میں نے محض اسی لئے تھاما تھا کہ میں اسے آپ کے حوالے کر سکوں'' اور پھر انہوں نے مجمع کی جانب استفہامیہ انداز میں دیکھتے ہوئے ان سبھی سے پوچھا ''آپ سب کو منظور ہے؟'' جواب میں ہر طرف سے یہی صدا آئی ''منظور ہے''

تب حضرت خالد بن ولیدؓ نے آگے بڑھ کر حضرت ثابت بن اقرمؓ کے ہاتھ سے جھنڈا لے

لیا......اور یوں اسلامی لشکر کے سپہ سالار کی حیثیت سے ذمہ داری سنبھال لی۔

یہی موقع تھا جب سلطنتِ روم کے اس علاقے ''مؤتہ'' سے تقریباً ڈیڑھ ہزار میل کے فاصلے پر مدینہ منورہ میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی جانب سے بذریعۂ وحی اپنے حبیب ﷺ کو صورتِ حال کی اطلاع دی گئی، جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

(اِنَّ النّبِيَّ ﷺ نَعَىٰ زيداً ، وجَعفراً ، وابنَ رَوَاحَة ، قَبلَ أن يَأتِيَهُم خَبَرُهُم ، فَقَال: أَخَذَ الرّايَةَ زيدٌ فَأُصِيبَ ، ثُمّ أخَذَهَا جعفرٌ فَأُصِيبَ ، ثُمّ أخَذَهَا ابنُ رَوَاحَة فَأُصِيبَ ، وَعَينَاهُ تَذرِفَان، حَتّىٰ أخَذَهَا سَيفٌ مِن سُيُوفِ اللّه ......) (۱)

یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے (مدینہ میں) لوگوں کو زید، جعفر، اور ابن رواحہ کی شہادت سے آگاہ کیا، حالانکہ اُس وقت تک کسی اور ذریعے سے یہ خبر مدینہ نہیں پہنچی تھی...... چنانچہ آپ ؐ نے فرمایا ''پہلے زید نے جھنڈا اٹھایا، اور وہ شہید ہو گئے، ان کے بعد جعفر نے جھنڈا اٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے، اور پھر ابن رواحہ نے جھنڈا اٹھایا اور وہ بھی شہید ہو گئے، یہ کہتے ہوئے آپ ؐ کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے، اس کے بعد آپ ؐ نے فرمایا ''اب جھنڈا اللہ کی تلواروں میں سے ایک تلوار نے تھام رکھا ہے''(۲)

اُدھر میدانِ کارزار میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب سپہ سالاری کے فرائض سنبھالے تو صورتِ حال انتہائی نازک تھی......انہیں اس حقیقت کا بخوبی احساس اور مکمل

(۱) بخاری [۳۷۵۷] مناقب خالد بن الولید۔

(۲) یہی وہ موقع تھا کہ جب حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کیلئے آپ ؐ کی طرف سے ''سیف اللہ، یعنی اللہ کی تلوار'' کے الفاظ استعمال کرنے کی وجہ سے حضرت خالدؓ ہمیشہ کیلئے ''سیف اللہ'' یعنی ''اللہ کی تلوار'' کے لقب سے مشہور ہو گئے۔

ادراک تھا کہ یہ تو سرے سے کوئی جنگ ہی نہیں...... کیونکہ تعداد کے لحاظ سے فریقین میں زمین وآسمان کا فرق تھا، مقابلے کا یا فتح کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا......لہٰذا اس انتہائی سنگین اور نازک ترین صورتِ حال میں قیادت کی یہ بڑی بھاری ذمہ داری سنبھالتے ہی انہوں نے فوری طور پر اپنے دل میں یہ اصولی فیصلہ کرلیا کہ اب فتح ہمارا مقصد نہیں ہے، بلکہ اب اصل مقصد محض یہ ہے کہ کسی طرح تمام لشکر کو اس اتنی بڑی مصیبت سے اور آفتِ ناگہانی سے بحفاظت نکال لیا جائے......ورنہ بصورتِ دیگر تمام لشکر کا خاتمہ یقینی ہے، جس کے نتیجے میں مسلمانوں کی بہت بڑی بدنامی ہوگی، سیاسی، عسکری، نفسیاتی، غرضیکہ ہر لحاظ سے یہ چیز مسلمانوں کیلئے بڑے نقصان کا سبب بن جائیگی......جبکہ دشمنوں کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے......لہٰذا اب اصل مقصود فقط یہ تھا کہ کسی طرح تمام لشکر کو یہاں سے اس انداز میں بحفاظت نکال لیا جائے کہ دشمن پر اصل حقیقت ظاہر نہ ہوسکے، اور وہ اسے مسلمانوں کی پسپائی کی بجائے محض جنگی چال ہی سمجھتا رہ جائے......

ظاہر ہے کہ اس مقصد کیلئے کوئی تدبیر دن کی روشنی میں دشمن کی نگاہوں کے سامنے تو اختیار نہیں کی جاسکتی تھی......لہٰذا حضرت خالد بن ولیدؓ نے وہ تمام دن محض تین ہزار افراد پر مشتمل اس لشکر کی قیادت کرتے ہوئے......دولاکھ جنگجوؤں پر مشتمل اس لشکرِ جرار کے مقابلے میں گذارا......نہایت کامیابی کے ساتھ دشمن کی اتنی بڑی فوج کو...... بلکہ اس پورے سمندر کو روکے رکھا......اُس روز حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے شجاعت و بہادری کے ایسے جوہر دکھائے کہ اس سے قبل چشمِ فلک نے ایسے مناظر نہیں دیکھے ہوں گے......اُس روز دن بھر ان کی جو کیفیت رہی اس کا اندازہ اس بات سے بخوبی کیا جاسکتا ہے کہ اُس روز مسلسل تلوار چلاتے چلاتے ان کے ہاتھوں میں ایک دو نہیں بلکہ نو تلواریں ٹوٹیں......

اور جب رات کا اندھیرا ہر طرف چھانے لگا تو اس اندھیرے سے فائدہ اٹھاتے ہوئے حضرت خالد بن ولیدؓ نے نہایت سرعت کے ساتھ راتوں رات اپنے لشکر میں بہت سی تبدیلیاں کیں......جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ دوسرے دن جب صبح کا سورج طلوع ہوا تو رومیوں کو اپنے سامنے مسلمانوں کے لشکر میں سب کچھ بدلا ہوا نظر آیا، تب وہ یہ سمجھے کہ ضرور مسلمانوں کے لشکر میں تازہ دم دستے آپہنچے ہیں......

مزید یہ کہ اسلامی لشکر کے عقب میں وقفے وقفے سے بڑے پیمانے پر گردوغبار اٹھتا ہوا نظر آنے لگا، جو کہ حضرت خالدؓ کے حکم پر بہت سے مسلمان گھڑسوار جان بوجھ کر خود ہی اڑا رہے تھے......اس کا اثر یہ ہوا کہ رومی سمجھے کہ ابھی پیچھے کوئی مزید بڑا لشکر بھی چلا آرہا ہے، اور تب وہ مزید خوفزدہ ہو گئے۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے جب دشمن کے لشکر میں پریشانی اور خوف کے آثار محسوس کئے تو اب انہوں نے اس بڑی تبدیلی سے فوری طور پر فائدہ اٹھاتے ہوئے اپنے لشکر کو پیچھے ہٹنے کی ہدایت کی، اور اس چیز کا بھرپور خیال رکھا کہ یہ پیچھے ہٹنے کا عمل بتدریج اور خوب منظّم طریقے سے ہو، کوئی افراتفری کے آثار نمایاں نہوں، بھگدڑ کا ماحول نظر نہ آئے، نیز یہ کہ دشمن مسلسل اس غلط فہمی میں مبتلا رہے کہ مسلمانوں کی طرف سے یہ پسپائی نہیں ہے، بلکہ دشمن کو پھنسانے اور گھیرنے کیلئے یہ کوئی بڑی جنگی چال اور حکمتِ عملی ہے۔

چنانچہ مسلمان یوں انتہائی منظّم طریقے سے بتدریج پیچھے ہٹتے گئے، یہ منظر دیکھ کر دشمن اس غلط فہمی میں مبتلا رہا کہ مسلمان اس طرح ہمیں اپنے تعاقب پر ورغلا رہے ہیں، تاکہ ہم مسلسل ان کا تعاقب کرتے ہوئے جزیرۃ العرب کے صحرائی علاقے میں جا پہنچیں......جہاں ان مسلمانوں کا راج ہوگا، تب یہ ہمیں گھیر لیں گے، اور پھر وہاں سے زندہ سلامت

واپسی ہمارے لئے ممکن نہیں ہوگی، یا تو ہم وہاں ان مسلمانوں کے ہاتھوں مارے جائیں گے، یا پھر اُس بھیانک صحرا میں بھٹک جانے کے بعد بھوکے پیاسے سسک سسک کر دم توڑنے پر مجبور ہو جائیں گے......اسی خوف اور اندیشے کی وجہ سے وہ مسلمانوں کے تعاقب سے گریز کرتے رہے، اور یوں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ پورے اسلامی لشکر کو بحفاظت وہاں سے نکال لانے میں پوری طرح کامیاب اور سرخرو رہے......اس طرح رومیوں پر' نیز دوسرے بہت سے بیرونی واندرونی' کھلے ہوئے اور چھپے ہوئے' ہرقسم کے دشمنوں پر مسلمانوں کا رعب برقرار رہا......حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے قبولِ اسلام کے فوری بعد پیش آنے والی یہ صورتِ حال فنونِ حرب وضرب میں ان کی بے مثال مہارت' نیز کامیاب جنگی حکمتِ عملی کا بڑا ثبوت تھی۔

☆......فتحِ مکہ:

غزوۂ مؤتہ کے فوری بعد محض اگلے ہی سال یہ صورتِ حال پیش آئی کہ مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''صلحِ حدیبیہ'' کے نام سے ۶ھ میں جو معروف معاہدۂ صلح ہوا تھا، مشرکین کی طرف سے اس کی مسلسل خلاف ورزی کے نتیجے میں آخر اب یہ معاہدہ ختم ہوگیا، اور پھر اس کے نتیجے میں ہی ۸ھ ماہِ رمضان میں ''فتحِ مکہ'' کا تاریخی واقعہ پیش آیا۔

اس موقع پر رسول اللہ ﷺ اپنے دس ہزار جاں نثاروں پر مشتمل لشکر کی قیادت کرتے ہوئے مدینہ سے مکہ کی جانب روانہ ہوئے، تب وہاں پہنچنے کے بعد مکہ شہر میں داخل ہونے سے قبل آپؐ نے جنگی حکمتِ عملی کے طور پر اپنے لشکر کو مختلف حصوں میں تقسیم کیا، چنانچہ اس موقع پر آپؐ نے ''میمنہ'' کا سپہ سالار حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو' اور ''میسرہ'' کا سپہ سالار حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ کو مقرر فرمایا، جبکہ لشکر کے آگے آگے چلتے ہوئے مختلف

پیادہ دستوں کی قیادت حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کو سونپی، البتہ مجموعی اور عمومی طور پر تمام لشکر کی قیادت آپؐ خود ہی فرما رہے تھے۔

یہ لشکر مکہ شہر میں داخل ہونے کے بعد مختلف گلی کوچوں سے گذرتا ہوا جب بیت اللہ کی جانب پیش قدمی کر رہا تھا تب حضرت خالدؓ کی عجیب کیفیت تھی، کیونکہ مکہ شہر کے یہی وہ گلی محلے تھے جہاں وہ کھیل کود کر بڑے ہوئے تھے، اور پھر انہی گلیوں محلوں سے وہ ہمیشہ مختلف مواقع پر مشرکینِ مکہ کے لشکروں کی قیادت کرتے ہوئے روانہ ہوا کرتے تھے...... جبکہ آج انہی گلیوں محلوں سے وہ پیغمبرِ اسلامؐ کی زیرِ قیادت ...... مزید یہ کہ خود بھی اسلامی لشکر کے ایک بہت بڑے حصے ''میمنہ'' کی قیادت کرتے ہوئے' اور بڑی ہی عقیدت ومحبت کے ساتھ ''پرچمِ توحید'' ہاتھ میں تھامے ہوئے...... گذر رہے تھے۔

ماہِ رمضان ۸ھ میں ''فتحِ مکہ'' کا یہ یادگار واقعہ پیش آیا تھا، اس کے فوری بعد ماہِ شوال میں مکہ سے مزید آگے طائف کے مشہور قبائل ''ہوازن'' اور ''ثقیف'' کے خلاف یادگار ''غزوۂ حُنین'' کی نوبت آئی تھی، تب اس موقع پر بھی رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اپنے ہمراہ ہراول دستے میں ہی رکھا تھا۔

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

۷ھ میں غزوۂ موتہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو ''سیف اللہ'' یعنی ''اللہ کی تلوار'' کے عظیم ترین لقب سے نوازا تھا، اس کے بعد ''اللہ کی یہ تلوار'' تادمِ آخر اللہ کے دشمنوں پر بجلی بن کر گرتی رہی اور خوب گھن گرج کے ساتھ ان کے سروں پر کڑکتی رہی......

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ماہِ صفر ۸ھ میں جب مکہ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے

تھے، دینِ برحق قبول کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی......
اس کے بعد وقت کا سفر جاری رہا......حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا۔
اور پھر صورتِ حال یہ پیش آئی کہ آپؐ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد بیک وقت بہت سے فتنوں نے سر اٹھایا، مانعینِ زکوٰۃ کا فتنہ، مرتدین کا فتنہ، جھوٹے مدعیانِ نبوت کا فتنہ......وغیرہ وغیرہ......الغرض اندرونی سازشوں اور بیرونی یلغاروں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا......رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور مسلمانوں کے خلیفۂ اول کی حیثیت سے ان تمام تر فتنوں کی سرکوبی اور بیخ کنی کی ذمہ داری حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پر آپڑی تھی' جسے انہوں نے بڑی عزیمت واستقامت اور بے مثال شجاعت و بہادری کے ساتھ بحسن وخوبی نبھایا......اور تمام فتنوں کا قلع قمع کیا، اور اس مقصد کیلئے متعدد بڑی جنگوں کی نوبت آئی۔
جنگوں کے اس پے درپے سلسلے کے موقع پر ابتداء میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خود ہی اسلامی لشکر کی قیادت کیا کرتے تھے، لیکن اس دوران کبارِ صحابہ کی طرف سے مسلسل یہ اصرار جاری رہا کہ "اے خلیفۃ المسلمین! آپ کیلئے یوں بار بار طویل عرصے تک دور دراز علاقوں کا سفر......اور مدینہ شہر سے دوری کسی صورت مناسب نہیں ہے، لہٰذا آپ مدینہ شہر میں رہتے ہوئے انتظامی امور سنبھالئے، اور سپہ سالاری کے فرائض کسی دوسرے کے حوالے کر دیجئے"
تب اس مسلسل اصرار کی بناء پر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ازسرِ نو متعدد لشکر ترتیب دیئے، متعدد شخصیات کو ان لشکروں کی قیادت کی ذمہ داری سونپی، اور انہیں مختلف علاقوں کی جانب روانہ کیا......اس موقع پر سب سے بڑی' انتہائی خطرناک' اور اہم ترین

ذمہ داری نبھانے کیلئے حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کی نظرِ انتخاب ''سیف اللہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ'' پر پڑی......اور......یہی وہ نقطۂ آغاز تھا کہ جہاں سے خالدؓ کے عروج کا اور بے مثال کامیابیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ چل نکلا......چشمِ فلک نے یہ منظر دیکھا کہ ......یکے بعد دیگرے......مسلسل اور پے در پے ایک میدان سے دوسرے میدان کی طرف' ایک کامیابی سے دوسری کامیابی کی طرف' ایک منزل سے دوسری منزل کی طرف' ایک معرکے سے دوسرے معرکے کی طرف' ایک فتح سے دوسری فتح کی طرف' خالدؓ کے قدم بس بڑھتے ہی چلے گئے...... ہر روز نئے طلوع ہونے والے سورج کے ساتھ خالدؓ کسی نئے میدان میں فتح ونصرت کے جھنڈے گاڑ رہے ہوتے......اور یوں وہ بے مثال جرأت وبہادری اور شاندار کامیابی وکامرانی کی لازوال داستانیں رقم کرتے چلے گئے۔(۱)

☆......''یمامہ'': (۲)

انہی دنوں مرتدین' مانعینِ زکوٰۃ 'اورجھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف ان طوفانی کارروائیوں کے اس تاریخی سلسلے کے دوران سب سے زیادہ خطرناک اورمشکل ترین آزمائش سامنے آ کھڑی ہوئی، اوراُس بڑی خونریز جنگ کی نوبت آئی جوتاریخ میں ''یمامہ'' کے نام سے معروف ہے۔

(۱) یہ وہی زمانہ تھاجب ایک بارحضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ نے جنگی امور کے سلسلے میں کچھ ضروری مشاورت کی غرض سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کوبلوایا تھا، تب وہ کسی دور دراز کے محاذِ جنگ سے سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے تھے، اورحضرت ابوبکرؓ سے ملاقات اور گفتگو کی غرض سے جب وہ مسجد نبوی میں داخل ہور ہے تھے ......تب لوگوں نے وہاں مسجد کے دروازے پران کی یہ کیفیت دیکھی تھی کہ اس وقت انہوں نے لوہے کی جوزرہ پہن رکھی تھی اس کی تمام کڑیاں جابجا ''خاک اورخون'' سے اٹی ہوئی تھیں......

(۲) ''یمامہ'' وہی جگہ ہے جہاں آجکل مشہور شہر ''ریاض'' آباد ہے۔

''یمامہ'' نامی مقام پر مسیلمہ کذاب (نبوت کے جھوٹے دعویدار) نے بہت ہی بڑا فتنہ برپا کر رکھا تھا، بہت سے باغی اور مرتد قبائل کے جنگجو بہت بڑی تعداد میں اس کے جھنڈے تلے اکٹھے ہو گئے تھے، ان کی سرکوبی کی غرض سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پہلے عکرمہ بن ابی جہل رضی اللہ عنہ اور پھر شرحبیل بن حَسَنَہ رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت لشکر روانہ کیا تھا، لیکن دونوں ہی بارنا کام واپس لوٹنا پڑا تھا...... تب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت لشکر روانہ کیا......

اُدھر مسیلمہ کو جب یہ اطلاع ملی کہ اس بار خالد بن ولید رضی اللہ عنہ آرہے ہیں...... تو اس نے از سرِ نو بھرپور تیاری شروع کر دی، اپنی صفوں کو دوبارہ منظّم کیا، اپنے لشکر کو نئے سرے سے ترتیب دی۔

اور پھر تیرہ ہزار سربکف مجاہدین پر مشتمل اسلامی لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی زیرِ قیادت طویل سفر کرتا ہوا جب مدینہ سے یمامہ پہنچا تو وہاں مسیلمہ کذاب کو خوب کیل کانٹے سے لیس چالیس ہزار جنگجوؤں کے ہمراہ مقابلے کیلئے پوری طرح تیار پایا، اور پھر جب دونوں جانب سے بھرپور یلغار ہوئی تو یہ جنگ بہت زیادہ خونریز ثابت ہوئی، ایک ہزار سے زیادہ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین شہید ہوئے، جن میں سے ستر حفاظِ قرآن تھے۔ (۱)

اس خونریز جنگ کے دوران ایک موقع ایسا بھی آیا جب مسلمانوں کی پسپائی اور ہزیمت کے آثار بڑی حد تک نمایاں ہونے لگے...... لیکن اس نازک ترین موقع پر بھی اللہ عزوجل کی طرف سے مسلمانوں کیلئے تائید و نصرت حضرت خالد بن ولیدؓ کی عسکری مہارت کی شکل میں

(۱) یہی وہ موقع تھا جب حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو جلد از جلد ''جمعِ قرآن'' کا مشورہ دیا تھا...... اور اس پر وہ خوب اصرار کرتے رہے تھے۔

ظاہر ہوئی، اور بہت بڑے نقصان کے بعد آخرکار مسلمانوں کو ہی غلبہ نصیب ہوا۔

☆......رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد بڑی سرعت کے ساتھ ان رنگارنگ فتنوں نے جو سر اٹھایا تھا......اندرونی و بیرونی سازشوں اور ریشہ دوانیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ تھا، چہارسو آزمائشوں کی اس یلغار کے نتیجے میں صورتِ حال اس قدر بھیانک اور نازک ترین ہو چلی تھی کہ تمام امت کی بقاء خطرے میں نظر آنے لگی تھی، ملتِ اسلامیہ کی کشتی اس خوفناک بھنور کے درمیان بری طرح ہچکولے کھا رہی تھی......معاملات اس قدر نازک نہج تک جا پہنچے تھے کہ امت دوراہے پر کھڑی تھی......اور ہر طرف بے یقینی کی کیفیت طاری تھی......

ایسے میں خلیفۂ اول کی حیثیت سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ......بتوفیقِ الٰہی......ان تمامتر فتنوں کا جس طرح کامیابی کے ساتھ قلع قمع کیا......اس میں ان کی عزیمت و استقامت کے علاوہ مزید جس چیز کا براہِ راست بہت بڑا عمل دخل تھا......یقیناً وہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی جرأت و شجاعت' فنونِ حرب میں بے مثال مہارت' شاندار حکمتِ عملی' اور لاجواب منصوبہ بندی تھی......

لہٰذا یہ بہت ہی بڑی تاریخی حقیقت ہے کہ تمام امتِ مسلمہ اپنی بقاء کے معاملے میں ہمیشہ کیلئے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے زیرِ احسان ہے، کیونکہ بلاشک وشبہہ یہی وہ عظیم ترین اور بے مثال شخصیت تھی کہ جس نے نوزائیدہ اسلامی ریاست اور امتِ مسلمہ کی طرف بڑھتے ہوئے ان خطرناک ترین طوفانوں کا رُخ......بتوفیقِ الٰہی ہمیشہ کیلئے موڑ دیا تھا(۱)

(۱) چنانچہ اسی تاریخی حقیقت کے اعتراف کے طور پر ہی آج تک یہ جیتی جاگتی حقیقت ہے کہ تمام عالمِ اسلام میں ہر بڑے شہر میں کسی ایک بڑی معروف شاہراہ کا نام ضرور ''شارع خالد بن ولید'' نظر آئے گا۔ دنیا کے کسی بھی کونے میں واقع کسی بھی اسلامی ملک کا کوئی بڑا شہر اس صورتِ حال سے خالی نظر نہیں آئے گا۔

☆......سلطنتِ فارس کے خلاف مہمات:

مرتدین، مانعینِ زکوٰۃ، اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کی طرف سے پیدا کردہ ان فتنوں کی سرکوبی کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو عراق (جو اس زمانے میں سلطنتِ فارس کا حصہ تھا) کی طرف کوچ کرنے کی ہدایت کی، کیونکہ اُن دنوں اہلِ فارس کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف گاہے بگاہے بلاوجہ اشتعال انگیزی اور جارحیت کا سلسلہ چل رہا تھا اور روز بروز اس میں شدت آتی جارہی تھی۔ چنانچہ اس چیز کی روک تھام کی غرض سے مختلف اوقات میں مدینہ سے متعدد لشکر روانہ کئے گئے تھے، تاہم خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں ہوسکی تھی۔

لہٰذا مرتدین اور جھوٹے مدعیانِ نبوت کے خلاف جنگوں کے اس سلسلے سے حضرت خالد بن ولیدؓ کے فارغ ہوتے ہی اب حضرت ابوبکر صدیقؓ نے انہیں عراق پہنچ کر وہاں سلطنتِ فارس کے خلاف برسرِ پیکار اسلامی لشکر کی قیادت سنبھالنے کی تاکید کی۔

چنانچہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ طویل مسافت طے کرتے ہوئے عراق پہنچے، جہاں انہوں نے اسلامی لشکر کی قیادت سنبھالی، اور سلطنتِ فارس کے خلاف پے درپے متعدد بڑی اور بنیادی قسم کی کامیابیاں حاصل کیں، جو بہت جلد آئندہ چل کر مسلمانوں کیلئے بڑی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوئیں۔

☆......روم کے محاذ کی طرف منتقلی......تاریخ کا نیا باب:

یہ وہ زمانہ تھا کہ جب مسلمان بیک وقت بہت سے محاذوں پر دشمنوں کے خلاف برسرِ پیکار تھے، چنانچہ انہی دنوں روئے زمین کی ایک اور عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ روم کی طرف سے مسلمانوں کو جو بڑے خطرات لاحق تھے، ان کے سدِ باب کے طور پر سب سے

پہلے تو خود رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں یادگار غزوۂ مؤتہ اور پھر غزوۂ تبوک کی نوبت آئی تھی، اس کے بعد آپؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے بالکل آخری ایام میں حضرت زید بن حارثہ رضی اللہ عنہ کے بالکل جواں سال بیٹے اُسامہؓ کی زیرِ قیادت سلطنتِ روم کی جانب روانگی کیلئے ایک لشکر تیار فرمایا تھا، لیکن یہ لشکر ابھی مدینہ شہر سے کچھ فاصلے پر ہی تھا کہ آپؐ کی طبیعت زیادہ ناساز ہوجانے کی وجہ سے اس کی روانگی مؤخر کر دی گئی تھی، اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی انتہائی نامساعد حالات کے باوجود اس لشکر کو اس کی منزل کی جانب روانہ کیا تھا اور خود رسول اللہ ﷺ کی طرف سے مقرر فرمودہ نوعمر سپہ سالار سے (اندرونِ مدینہ انہی نامساعد حالات کے پیشِ نظر) اجازت حاصل کر کے مدینہ میں رہ گئے تھے۔

اس کے بعد بھی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مختلف اوقات میں سلطنتِ روم کی طرف سے مسلسل جارحیت کی روک تھام کی غرض سے مختلف شخصیات (مثلاً: ابوعبیدہ عامر بن الجراح، شرحبیل بن حسنہ، یزید بن ابی سفیان، وغیرہ، رضی اللہ عنہم اجمعین) کی زیرِ قیادت مدینہ سے لشکر ارسال کرتے رہے، اور یہ سبھی لشکر وہاں مختلف علاقوں میں رومیوں کے خلاف وسیع پیمانے پر کارروائیوں میں مشغول رہے۔

اس سلسلے میں آخر شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس کیا گیا کہ ان تمام لشکروں کو یکجا کر دیا جائے، چنانچہ اس سلسلے میں بتدریج ضروری اقدامات کئے گئے......اور پھر اس بڑے اور یکجا لشکر کی قیادت سنبھالنے کی غرض سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو پیغام بھجوایا کہ وہ فوری طور پر عراق (یعنی سلطنتِ فارس) کے محاذ سے ملکِ شام (یعنی سلطنتِ روم) کی طرف روانہ ہوجائیں......چنانچہ

حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ عراق کے محاذ پر اپنی جگہ حضرت مُثّنیٰ بن حارثہ رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کرنے کے بعد نہایت سرعت میں وہاں سے ملکِ شام پہنچے، جہاں مسلمان اور رومی آمنے سامنے صف آراء تھے، اور کسی بھی وقت طبلِ جنگ بج سکتا تھا۔

☆......''یرموک'' جہاں ہمیشہ کیلئے تاریخ بدل دی گئی:

ملکِ شام جو کہ اُس دور میں روئے زمین کی عظیم ترین قوت یعنی ''سلطنتِ روم'' کا ایک علاقہ تھا، وہاں ''یرموک'' کے مقام پر(۱) ایک طرف محض چھتیس ہزار سرفروشوں پر مشتمل اسلامی لشکر تھا، جبکہ دوسری طرف ہر قسم کے سامانِ حرب وضرب اور کیل کانٹے سے لیس دو لاکھ چالیس ہزار رومی جنگجو ہمہ وقت مستعد کھڑے ہوئے تھے، یہ صورتِ حال یقیناً بہت زیادہ نازک تھی، ۸ھ میں پیش آنے والے یادگار ''غزوۂ مؤتہ'' کے بعد اب ۱۳ھ میں قسمت نے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو دوبارہ انہی ''رومیوں'' کے مدِ مقابل لا کھڑا کیا تھا......تب انہوں نے قیادت کی عظیم ذمہ داریاں سنبھالتے ہی صورتِ حال کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے لشکر میں مناسب تبدیلیاں کیں اور مختلف ہدایات جاری کیں، اور پھر......میدانِ کارزار گرم ہو گیا......دونوں طرف سے بڑی زوردار یلغار ہوئی......جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ آخر اللہ عزوجل نے اہلِ ایمان کو شاندار اور غیر معمولی فتح ونصرت سے نوازا......اور یہی وہ فتح تھی کہ جو روئے زمین کی عظیم ترین قوت یعنی ''سلطنتِ روم'' کی شکست وریخت اور پھر بتدریج اس کے زوال وانحطاط کا سبب بن گئی......یوں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت لڑی جانے والی اس ''جنگِ یرموک'' کے نتیجے میں روئے زمین کا جغرافیہ ہمیشہ کیلئے بدل گیا......دنیا کی تاریخ ہمیشہ کیلئے بدل گئی۔

(۱) مرورِ زمانہ کے ساتھ مسلسل تقسیم در تقسیم کے نتیجے میں اب ''یرموک'' بھی (مؤتہ کی طرح) اردن میں واقع ہے

☆......معزولی:

عین انہی دنوں مدینہ میں خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے......اور ان کی جگہ مسلمانوں کے خلیفۂ دوم کی حیثیت سے حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے زمامِ خلافت سنبھالی، تب ان عظیم الشان اسلامی فتوحات' نیز اس حوالے سے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے بنیادی کردار کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ بات محسوس کی کہ چہار سو بڑے پیمانے پر کچھ اس قسم کی باتیں زبان زدِ عوام و خواص ہیں جن سے یہ تأثر ملتا ہے کہ ان عظیم الشان فتوحات کو لوگ اللہ کی طرف سے مدد و نصرت اور خالصۃً تائیدِ الٰہی سمجھنے کی بجائے اسے خالد بن ولیدؓ کی ذاتی طور پر جنگی حکمتِ عملی اور عسکری مہارت کا نتیجہ سمجھنے لگے ہیں......ظاہر ہے کہ عقیدہ و ایمان کے لحاظ سے یہ ایک بڑے فتنے کی طرف اشارہ تھا...... چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس فتنے کے آثار کو محسوس کرتے ہوئے اس کے فوری تدارک کے طور پر ''یرموک'' کے فوری بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار کے عہدے سے سبکدوش کرتے ہوئے اسی لشکر میں موجود حضرت ابوعبیدہ عامر بن الجراح رضی اللہ عنہ(۱) کو یہ منصب سنبھالنے کی ہدایت جاری کی۔

☆......نہایت ہی غور طلب ہے یہ بات کہ ایسے موقع پر کہ جب اس قدر وسیع و عریض اسلامی دنیا میں' اور بالخصوص اتنے بڑے اسلامی لشکر میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کو اس قدر بڑے پیمانے پر مقبولیت اور بے پناہ پذیرائی حاصل تھی، وہ ہر دلعزیز اور مثالی شخصیت تھے، ہر ایک کی آنکھ کا تارا بنے ہوئے تھے، چہار سو ان کی عظیم ترین فتوحات کا ایک

(۱) حضرت ابوعبیدہ رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات [۱۲۵۔۱۴۱] پر ملاحظہ ہو۔

سیلاب تھا، ہر طرف ان کی بے مثال کامیابیوں کے چرچے تھے......عین انہی دنوں خلیفۂ وقت کی طرف سے اپنی معزولی کا حکم موصول ہونے پر انھوں نے قطعاً کوئی سرکشی نہیں دکھائی، کوئی اعتراض نہیں کیا، کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا...... بلکہ......اس معاملے میں بھی اپنی بے مثال اور قابلِ فخر عظمت وشرافت کا لازوال ثبوت دیتے ہوئے اس حکم کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا، اور اسی لشکر میں ہی اب نئے سپہ سالار یعنی حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر اپنی خدمات کا سلسلہ جاری رکھا...... یقیناً اس طرح انھوں نے میدانِ جنگ میں اپنی بے مثال ''قابلیت ولیاقت'' کے ساتھ ساتھ اب اس انتظامی معاملے میں بھی ......اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اعلیٰ اخلاق وکردار اور انسانیت وشرافت کے لحاظ سے بھی انتہائی ''عظمت ورِفعت'' کا عملی نمونہ پیش کیا...... یوں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اسلامی لشکر کے عظیم قائد کی حیثیت سے تو اگرچہ یقیناً نظروں سے بڑی حد تک اوجھل ہو گئے......لیکن......اس موقع پر سرکشی وحکم عدولی کی بجائے اس شرافت وانسانیت کے مظاہرے کی بدولت وہ ہمیشہ کیلئے تمام مسلمانوں کے دلوں میں اور زیادہ گھر کر گئے......

☆......**وفات:**

سیف اللہ خالد بن الولید رضی اللہ عنہ امین الأمت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت سلطنتِ روم کے خلاف کارروائیوں کے سلسلے میں ملکِ شام میں ہی مقیم تھے کہ انہی دنوں بیمار پڑ گئے، رفتہ رفتہ مرض شدت اختیار کرتا گیا......آخر ۲۱ھ میں بتاریخ ۱۸/ رمضان المبارک، ملکِ شام کے شہر ''حمص'' میں اکاون (۵۱) سال کی عمر میں دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے......

انتقال سے محض چندروز قبل حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ کے توسط سے خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے نام یہ زبانی وصیت بھجوائی کہ ''اے امیرالمؤمنین! میری وفات کے بعد میرا گھوڑا اور میری تلوار...... یہ دونوں چیزیں آپ کی نگرانی میں اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر وقف رہیں گی، جبکہ مدینہ میں میرا جو گھر ہے، آپ اپنی نگرانی میں وہ بطورِ صدقہ کسی ضرورتمند کو دیدیجئے''۔(۱)

اللہ تعالیٰ اپنے اس بندے خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کے درجات جنت الفردوس میں بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں جنت الفردوس میں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے نوازیں۔

(۱) بعض مؤرخین کے بقول انہی دنوں مدینہ میں خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اکابر صحابۂ کرام سے مشاورت کے بعد حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی دوبارہ سپہ سالار کی حیثیت سے بحالی کا فیصلہ کرلیا تھا، لیکن انہی دنوں ملکِ شام میں حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کا مختصر علالت کے بعد اچانک انتقال ہوگیا، جس پر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ انتہائی افسردہ ہوگئے تھے۔ واللہ اعلم۔

☆ ملاحظہ:

''غزوۂ مؤتہ'' کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ☆ الکامل فی التاریخ لابن الأثیر، جلد:۲ صفحہ:۱۱۲۔
☆ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد ۶: صفحہ:۴۱۲۔
''جنگِ یمامہ'' کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ☆ الکامل فی التاریخ لابن الأثیر، جلد: ۲ صفحہ:۲۱۸۔
☆ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد:۹ صفحہ:۴۶۵ ☆ تاریخ الاسلام للذہبی، جلد:۳ صفحہ:۳۸
''جنگِ یرموک'' کے بارے میں مزید تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو ☆ الکامل فی التاریخ لابن الأثیر، جلد:۲ صفحہ:۲۵۸۔
☆ البدایۃ والنہایۃ لابن کثیر، جلد۹: صفحہ:۵۴۵ (تحقیق: عبداللہ بن عبدالمحسن الترکی۔ دارہجر)



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۹/ ربیع الأول ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱۰/ جنوری ۲۰۱۵ء بروز ہفتہ یہ باب مکمل ہوا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ:

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کا تعلق مکہ میں قبیلۂ قریش سے تھا، یہ ''السابقین الأولین''، یعنی ان عظیم ترین شخصیات میں سے تھے جنہوں نے دینِ اسلام کے بالکل ابتدائی دور میں دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ اسلام قبول کیا کہ جب مسلمان بہت زیادہ مشکلات سے دوچار تھے۔

مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلسل ایذاءرسانیوں کے جو سلسلے تھے، خندہ پیشانی سے یہ انہیں برداشت کرتے رہے اور راہِ حق میں ان کے قدموں میں کبھی لغزش نہیں آئی۔

نبوت کے پانچویں سال جب مشرکینِ مکہ کی طرف سے ایذاءرسانیوں کا سلسلہ عروج پر تھا، تب رسول اللہ ﷺ نے اپنے جاں نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کا مشورہ دیا تھا، جس پر بہت سے صحابۂ کرام اپنا وطن' اپنا گھر بار' اپنا آبائی شہر مکہ' اور اپنا سبھی کچھ چھوڑ چھاڑ کر مکہ سے ملکِ حبشہ کی جانب ہجرت کر گئے تھے، اور انہی مہاجرینِ حبشہ میں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

اور پھر نبوت کے تیرہویں سال کے بالکل آخر میں جب ہجرتِ مدینہ کا حکم نازل ہوا، جس کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ نیز تمام مسلمان مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے، تب ملکِ حبشہ میں موجود مسلمان بھی رفتہ رفتہ حبشہ سے مدینہ منتقل ہو گئے، اور یوں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی مدینہ آپہنچے۔

☆......مدنی زندگی میں جب صورتِ حال تبدیل ہوئی اور مشرکینِ مکہ ودیگر مشرکین ومخالفین کے ساتھ مختلف مواقع پر مسلح تصادم اور متعدد غزوات کی نوبت آئی......تب ایسے

ہر موقع پر حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے ہمیشہ ہی پیش پیش رہے اور بے مثال شجاعت و بہادری کے خوب جوہر دکھاتے رہے۔

☆......حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ اُس دور کے عام انسانوں کی طرح ایک عام قسم کے سیدھے سادھے انسان ہی تھے، لیکن ان کے نصیب میں یہ بات لکھی تھی کہ اُس زمانے میں تمام روئے زمین پر جو دو انتہائی طاقتور ترین اور عظیم سلطنتیں آباد تھیں......یعنی سلطنتِ فارس' اور سلطنتِ روم' جن کا اُس زمانے میں بہت زیادہ رعب اور دبدبہ تھا، خوب شان و شوکت اور بڑی ہیبت تھی......اسی مناسبت سے ظاہر ہے کہ ان دونوں سلطنتوں کے جو بادشاہ تھے ان کی بھی بڑی حیثیت اور بہت زیادہ ہیبت تھی۔

عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ جیسا بالکل سیدھا سادھا صحرا نشین' بلکہ بوریا نشین قسم کا انسان جسے شاہی آداب کی قطعاً کوئی خبر ہی نہیں تھی، اس سیدھے سادھے انسان کے نصیب میں ان دونوں عظیم ترین سلطنتوں کے عظیم فرمانرواؤں سے ملاقات لکھی تھی، اور پھر یہ کہ صرف ملاقات ہی نہیں...... بلکہ دونوں فرمانرواؤں کے ساتھ اس قدر عجیب و غریب قسم کے حالات میں ملاقات......اور پھر اس ملاقات کے موقع پر پیش آنے والے عجیب وغریب اور ہمیشہ کیلئے سبق آموز قسم کے حالات وواقعات......اور پھر اس ملاقات کے دوررس نتائج و ثمرات...... یہ وہ چیز تھی کہ جس کی بناء پر اس سیدھے سادھے اور عام سے انسان کا نام تاریخ میں ہمیشہ کیلئے محفوظ ہو گیا۔

☆......اس کا پس منظر کچھ اس طرح ہے کہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ اور مشرکینِ مکہ کے مابین ''صلحِ حدیبیہ'' کے نام سے طے پانے والے مشہور تاریخی معاہدۂ صلح کے نتیجے میں آپ ﷺ کو مشرکینِ مکہ کی طرف سے کسی حد تک جب بے فکری نصیب ہوئی......تب اس موقع

سے فائدہ اٹھاتے ہوئے آپؐ نے دینِ اسلام کی تبلیغ اورنشرواشاعت کے مبارک سلسلے کومزیدوسعت دینے کافیصلہ فرمایا......کیونکہ (گذشتہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے برعکس) آپؐ کی بعثت ورسالت زمان ومکان کی تمام حدودوقیود سے بالاتر تھی ،آپؐ کو قیامت تک تمام دنیائے انسانیت کیلئے رہبرورہنما بنا کر بھیجا گیا تھا،جیسا کہ قرآن کریم میں ارشادِربانی ہے:﴿قُل یَـا أَیُّهَا النّاسُ اِنّي رَسُولُ اللّٰهِ اِلَیکُم جَمِیعاً......﴾ (۱) یعنی ’’(اے نبیؐ) آپ کہہ دیجئے کہ اے لوگو!میں تم سبھی کی طرف بھیجا ہوااللہ کارسول ہوں......‘‘

چنانچہ اپنے رب کی طرف سے تبلیغِ دین کے اس حکم کی تعمیل کےطور پرآپؐ نے ٦ ھ میں مشرکینِ مکہ کے ساتھ کئے گئے اس ’’معاہدۂ صلح‘‘ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مختلف فرمانرواؤں‘ امراء وسلاطین‘ والیانِ ریاست‘ سربراہانِ مملکت‘اورروٴسائے قبائل کے نام دعوتِ اسلام کےسلسلے میں خطوط تحریرفرمائے۔

☆......ان خطوط کودوردراز کے علاقوں میں ان فرمانرواؤں تک پہنچانابہت ہی مشکل اورخطرناک ترین معاملہ تھا،کیونکہ مسافت بہت زیادہ تھی،اورپھریہ کہ انجان راستے،اَن دیکھی منزل،نہ کوئی ساتھی،نہ کوئی ہمسفر......راستے میں قدم قدم پرجان کاخطرہ،چوروں اورلٹیروں کی طرف سےخطرہ،ویرانوں‘ بیابانوں میں جنگلی جانوروں اوردرندوں کی طرف سےخطرہ......

مزیدیہ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بطورِقاصدیہ خطوط لے جانے والے افرادجن علاقوں کی طرف روانہ ہونے والے تھے،ان کی زبان سےناواقفیت،ان کےمزاج‘ رسم و

(۱)الأعراف[۱۵۸]

رواج' اور آداب سے بے خبر، اور پھر یہ کہ وہاں پہنچنے کے بعد کسی عام انسان سے ملاقات مقصود نہیں ہے، بلکہ ان کے بادشاہ سے ملاقات مقصود ہے، اسے مکتوب پہنچانا ہے، اور سب سے بڑھ کر خطرناک اور نازک معاملہ یہ کہ اسے اپنا' اور اپنے آباؤ اجداد کا دین ترک کر کے نیا دین (دینِ اسلام) قبول کرنے کی دعوت دینی ہے......

اس دنیا میں انسان کسی بھی بات پر صبر و تحمل کا مظاہرہ کر سکتا ہے ......لیکن ''دین'' اور ''مذہب'' کا معاملہ اس قدر حساس اور نازک ترین ہے کہ کوئی بھی شخص خواہ کتنا ہی گیا گذرا کیوں نہو، لیکن وہ اپنے مذہب کے خلاف کچھ سننے کیلئے کسی صورت آمادہ نہیں ہو سکتا...... چہ جائیکہ کسی بادشاہ کو یا سربراہِ مملکت کو جا کر بزبانِ حال یوں کہا جائے کہ ''جناب! آپ اپنا اور اپنے آباؤ اجداد کا وہ دین جس پر آپ کا پورا خاندان صدیوں سے نسل در نسل قائم ہے......آپ اس دین سے کنارہ کشی اختیار کر لیجئے......اور بس ہمارا دین اپنا لیجئے......''

اور پھر بادشاہ بھی اُس دور کے......مکمل مطلق العنان......جس کسی سے خوش ہو گئے تو اس پر آناً فاناً نوازشات کی بارش برسادی، فرش سے اٹھا کر عرش پر پہنچا دیا، اور جس کسی سے بگڑ گئے تو بیک جنبشِ قلم اس کا سر ہی قلم کر ڈالا......ایسے سر پھرے بادشاہ......جن کیلئے نہ کوئی قاعدہ تھا، نہ کوئی قانون......اور نہ ہی کوئی روک ٹوک......لہٰذا ایسے بادشاہ کا کیا بھروسہ؟ کب بگڑ جائے؟ اور نہ جانے کیا سلوک کر ڈالے؟

لہٰذا یہ اس قدر خطرناک مہم تھی کہ اس مہم پر......اور اس سفر پر جانے والے کے بارے میں گویا اس بات کا قوی اندیشہ موجود تھا کہ شاید وہ پلٹ کر نہیں آ سکے گا، اور اگر زندہ سلامت واپس آ گیا تو گویا اسے نئی زندگی نصیب ہوگی (یہ کوئی محض مفروضہ نہیں تھا، بلکہ واقعاتی طور پر اور حقیقت کی دنیا میں یہ واقعہ پیش بھی آیا کہ آپؓ کا نامۂ مبارک لئے ہوئے حضرت

حارث بن عمیر الأزدی رضی اللہ عنہ جب محوِ سفر تھے تب ملکِ شام میں بلقاء کے مقام پر شرحبیل الغسانی نے انہیں نہایت بیدردی کے ساتھ قتل کرڈالا، اور پھر اس کے نتیجے میں ہی غزوۂ مؤتہ کی نوبت آئی تھی)۔

ایسی ہی صورتِ حال میں ایک روز رسول اللہ ﷺ نے اللہ عزوجل کی حمد وثناء بیان کرنے کے بعد اپنے جان نثار صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو مخاطب کرتے ہوئے ارشادفرمایا ''لوگو! میں تمہیں مختلف فرمانرواؤں کی جانب روانہ کرنا چاہتا ہوں ......'' اس پر سبھی نے بیک زبان عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! آپ ہمیں جہاں بھیجنا چاہیں بھیج دیں، ہم حاضر ہیں''۔

تب رسول اللہ ﷺ نے ان میں سے چھ افراد کو منتخب فرمایا، تاکہ آپؐ کے قاصد کی حیثیت سے یہ افراد مختلف فرمانرواؤں تک دعوتِ اسلام کے سلسلے میں یہ خطوط پہنچا سکیں۔

انہی چھ افراد میں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے، جنہیں سلطنتِ فارس کے بادشاہ کسریٰ خسرپرویز تک آپؐ کا مکتوبِ گرامی پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی۔

☆ ......حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے اس سفر کی تیاری شروع کردی......اور پھر آخر ایک روز وہاں مدینہ میں ......اپنی شریکۂ حیات اور اپنے بچوں کو الوداع کہا......اور روانہ ہوگئے، ان کی منزل بہت دور تھی، یعنی ''مدائن'' سلطنتِ فارس کا دارالحکومت (۱)، اس طویل سفر میں کوئی ان کا ہمسفر نہیں تھا، کوئی ساتھی نہیں تھا، بس بالکل یکہ وتنہا......اپنے اللہ پر بھروسہ کئے ہوئے چل دیئے۔

مسلسل سفر کرتے ہوئے......طویل مسافت طے کرنے کے بعد سلطنتِ فارس کی حدود

(۱) جوکہ موجودہ بغداد کے قریب تھا، آج بھی اس کے آثار باقی ہیں۔

میں جا پہنچے، اور پھر وہاں مختلف علاقوں، شہروں، اور بستیوں سے گذرتے ہوئے آخر ان کے دارالحکومت ''مدائن'' جا پہنچے، شاہی دربار کا رُخ کیا، وہاں پہنچنے کے بعد شاہی درباریوں سے ملاقات کی، آمد کا مقصد بیان کیا، جس پر پہریداروں نے اندر جانے کی اجازت دیدی۔

شاہی دربار کے اندر بادشاہ خسرو پرویز بڑے ہی جاہ وجلال کے ساتھ اپنے تخت پر جلوہ افروز تھا، درباریوں، مشیروں، سرکاری افسروں، ودیگر معززین کی بڑی تعداد بھی وہاں موجود تھی......ایسے میں رسول اللہ ﷺ کے یہ جان نثار صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ اپنے بالکل ہی سیدھے سادھے حلیے میں، اور انتہائی سیدھی سادھی پوشاک پہنے ہوئے ......(مزید یہ کہ مدینہ سے مدائن تک اس قدر طویل سفر کی وجہ سے تو لباس اور حلیہ مزید متأثر ہو چکا ہوگا) اس شاہی دربار میں کسریٰ خسرو پرویز کے سامنے پہنچے......

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ نے یہ رعب ودبدبہ، اور یہ شاہی جاہ وجلال اگرچہ اس سے قبل زندگی میں کبھی نہیں دیکھا تھا......لیکن اس کے باوجود ان کے دل میں اپنے اللہ پر جو مضبوط اور غیر متزلزل ایمان تھا......وہ اللہ جو احکم الحاکمین ہے...... جو بادشاہوں کا بادشاہ ہے......لہٰذا اسی ایمانی کیفیت کا نتیجہ تھا کہ اس شاہی دربار میں تمامتر ظاہری شان وشوکت، جاہ وجلال، اور چمک دمک کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا، کسی گھبراہٹ یا پریشانی کی بجائے یہ مکمل طور پر پرسکون اور مطمئن ہی رہے۔

☆......اس شاہی دربار کے جو آداب ومراسم تھے ان کے مطابق ایک شخص نے آگے بڑھ کر ان سے کہا ''یہ خط مجھے دے دو''، لیکن انہوں نے انکار کرتے ہوئے کہا ''رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ نامۂ مبارک تمہارے بادشاہ تک پہنچانے کی غرض سے میرے حوالے کیا

گیا ہے......لہٰذا یہ نامۂ مبارک میں فقط تمہارے بادشاہ ہی کو دوں گا''۔

کسریٰ نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو درباریوں سے کہا''اسے میرے پاس آنے دو''

تب حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کسریٰ کی جانب بڑھے، اس کے قریب پہنچ کر امانت کے تقاضے کی مکمل پاسداری کرتے ہوئے خود اپنے ہاتھ سے وہ نامۂ مبارک کسریٰ کے حوالے کیا۔

کسریٰ نے مترجم کو طلب کیا، اور اسے یہ نامۂ مبارک کھولنے اور پڑھنے کا حکم دیا، مترجم نے پڑھنا شروع کیا''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم، من محمد رسول اللہ، الیٰ کسریٰ عظیم فارس......''

کسریٰ نے جب یہ کیفیت دیکھی اور مترجم کی زبانی یہ عبارت سنی......کہ اس مکتوب میں پہلے بسم اللہ......اس کے بعد''من محمد رسول اللہ''اور پھر اس کے بھی بعد کسریٰ کا نام تحریر کیا گیا ہے......تب وہ انتہائی غضبناک اور آگ بگولہ ہو گیا، اور یوں کہنے لگا (نعوذ باللہ)''اس شخص کی اتنی جرأت کہ میرے نام سے پہلے اس نے اللہ کا نام' اس کے بعد اپنا نام' اور پھر اس کے بھی بعد میرا نام لکھا ہے......؟''

اور پھر اسی جنونی کیفیت میں اس نے رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کر کے پرزے پرزے کر ڈالا......اور پھینک دیا۔

اس کے بعد اس نے اپنے درباریوں کو حکم دیا کہ اس شخص (رسول اللہ ﷺ کے قاصد حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ) کو دھکے دے کر دربار سے نکال باہر کیا جائے۔ چنانچہ حکم کی فوری تعمیل کی گئی......لیکن تب بھی کسریٰ کا غصہ ٹھنڈا نہ ہوا تو کچھ وقت گذرنے کے بعد اپنے درباریوں کو یوں کہنے لگا''ہم نے اسے دربار سے نکال کر بڑی غلطی کی ہے......اسے تو یہیں قتل کر دینا چاہیئے تھا''اور پھر اس نے حکم دیا کہ اس قاصد کو

فوری طور پر تلاش کر کے دوبارہ حاضر کیا جائے، اور یہاں میرے سامنے اس کا سر قلم کیا جائے......

چنانچہ برق رفتاری کے ساتھ کسریٰ کے کارندے ہر طرف پھیل گئے، اور حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کی تلاش میں سرگرداں ہو گئے۔

☆......حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کو جب کسریٰ خسرو پرویز کے شاہی دربار سے نکالا گیا تب وہ سوچ رہے تھے کہ ابھی فی الحال تو فوری طور پر اشتعال اور غصے کی کیفیت کی وجہ سے ان لوگوں نے مجھے دربار سے نکال باہر کیا ہے......لیکن ان لوگوں کا کیا بھروسہ؟ کیا معلوم یہ سر پھرے لوگ میرے تعاقب میں چلے آئیں......؟ نہ جانے میں یہاں ان کے ملک سے اب زندہ سلامت نکل بھی سکوں گا؟ یا یہ کہ مجھے قتل کر دیا جائیگا؟ انہی خیالات میں گم سم وہ چلے جا رہے تھے......لیکن پھر وہ سوچنے لگے کہ رسول اللہ ﷺ نے جو کام میرے ذمے لگایا تھا......یعنی آپؐ کا نامۂ مبارک کسریٰ خسرو پرویز تک پہنچانا......وہ کام تو میں انجام دے ہی چکا ہوں ......لہٰذا اب میں زندہ بچوں......یا ان کے ہاتھوں مارا جاؤں......اب اس بارے میں فکرمند ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے......انہی سوچوں میں گم وہ تیزی کے ساتھ محوِ سفر ہو گئے۔

جبکہ کسریٰ کے کارندے اب دیوانہ وار ہر طرف ان کی تلاش میں خوب سرگرم ہو چکے تھے......لیکن اس دوران وہ مسلسل سفر کرتے ہوئے ان کی دسترس سے دور نکل چکے تھے، اور تلاشِ بسیار کے باوجود کسریٰ کے کارندوں کو ان کا کوئی سراغ نہیں مل سکا تھا۔

☆......حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ سلطنتِ فارس کے دارالحکومت ''مدائن'' سے روانگی کے بعد یکہ و تنہا مسلسل سفر کرتے ہوئے......بہت ہی طویل مسافت طے کرنے

کے بعد آخر بخیر و عافیت واپس مدینہ پہنچ گئے......رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر تمام صورتِ حال بیان کی، اور یہ بھی بتایا کہ کسریٰ نے انتہائی بداخلاقی و بدمزاجی کا مظاہرہ کرتے ہوئے آپؐ کے نامۂ مبارک کو محض اس لئے چاک کر ڈالا کہ اس میں اللہ عزوجل کا، نیز آپؐ کا نام کسریٰ کے نام سے پہلے لکھا ہوا تھا......یہ سننے کے بعد آپؐ نے بس اتنا فرمایا: مَزَّقَ اللّٰہُ مُلکَہ ...... یعنی ''اللہ کرے اس کی بادشاہت بھی اسی طرح پرزے پرزے ہو جائے......''

☆......اُدھر کسریٰ خسرو پرویز کو جب اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ اس نے آپؐ کے قاصد (حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ) کو زندہ سلامت کیوں جانے دیا؟ اور پھر تلاشِ بسیار کے باوجود اس قاصد کا کوئی سراغ بھی نہیں مل سکا......تو اپنی اس ناکامی پر وہ شرمندہ اور کھسیانا ہونے لگا......غصے کی آگ اب اس کے دل و دماغ میں مزید شدت کے ساتھ بھڑکنے لگی......اور تب اس نے ملکِ یمن میں اپنے ماتحت حکمران ''باذان'' کے نام یہ حکم نامہ ارسال کیا کہ ''حجاز میں یہ جو شخص ہے جس نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے (یعنی رسول اللہ ﷺ) بہرصورت اسے اولین فرصت میں گرفتار کر کے میرے روبرو پیش کیا جائے''۔

اس پر باذان نے اپنے کچھ کارندے یمن سے حجاز کی جانب روانہ کئے، یہ کارندے راستے میں جب طائف شہر سے گذر رہے تھے تب وہاں اتفاقاً مشرکینِ مکہ میں سے چند افراد سے ان کی ملاقات ہوئی، دورانِ گفتگو ان مشرکینِ مکہ کو یہ بات معلوم ہوئی کہ باذان کے یہ کارندے کسریٰ خسرو پرویز کی طرف سے جاری کردہ فرمان کی تعمیل کے طور پر (نعوذ باللہ) رسول اللہ ﷺ کو گرفتار کرنے کی غرض سے مدینہ کی طرف محوِ سفر ہیں......تب ان مشرکینِ مکہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا، اور انہوں نے طائف سے مکہ واپس پہنچنے پر تمام مکہ

والوں کو یہ بڑی ''خوشخبری'' سنائی، تب وہ سب بھی نہایت خوشیاں منانے لگے۔

☆......دوسری جانب باذان کے کارندے سفر کرتے ہوئے جب مدینہ پہنچے تو رسول اللہ ﷺ سے ان کی ملاقات ہوئی، یمن کے بادشاہ باذان کا خط آپؐ کے حوالے کرتے ہوئے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا، اور پھر یوں کہنے لگے ''ہمارے بادشاہ کا حکم آپ مان لیجئے، ہمارے ساتھ یمن چلئے، وہاں ہوسکتا ہے کہ ہمارے بادشاہ کو آپ پر رحم آ جائے، اور وہ آپ کی جان بخشی کیلئے کچھ کوشش کرے......کسریٰ کے سامنے آپ کی سفارش کرے، اور تب شاید کسریٰ اپنا یہ حکم واپس لے لے......لیکن اگر آپ ہمارے ساتھ نہیں گئے، تو پھر کسریٰ کے جاہ وجلال اور اس کے غضب سے تو آپ بخوبی واقف ہیں......ایسے میں نہ صرف یہ کہ وہ آپ کو مار ڈالے گا...... بلکہ آپ کی پوری قوم کو اور تمام مسلمانوں کو ہمیشہ کیلئے نیست و نابود کر ڈالے گا......''

رسول اللہ ﷺ ان کی یہ گفتگو سن کر محض مسکرائے......اور پھر قدرے توقف کے بعد فرمایا ''ابھی تم لوگ اپنی اقامت گاہ کی طرف واپس لوٹ جاؤ، کل آنا''

اس پر وہ کارندے سمجھے کہ رسول اللہ ﷺ شاید ان کے ہمراہ ملکِ یمن کی جانب سفر کیلئے تیاری کی غرض سے کچھ مہلت طلب کر رہے ہیں......اور یہ کہ کل وہ ان کے ہمراہ روانہ ہو جائیں گے۔ چنانچہ دوسرے روز یہ کارندے دوبارہ آ گئے، اور آتے ہی پوچھنے لگے ''کیا آپ نے سفر کیلئے ضروری تیاری کر لی ہے؟'' اس پر آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''آج کے بعد تم کسریٰ کی شکل نہیں دیکھ سکو گے، کیونکہ وہ جو تمہارا خدا بنا پھرتا تھا، اللہ کے حکم سے وہ مارا گیا، اور خود اپنے ہی بیٹے کے ہاتھوں مارا گیا''۔

یعنی جس طرح کسریٰ نے رسول اللہ ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کر ڈالا تھا' جس پر آپؐ نے

فرمایا تھا: مَـزَّقَ اللّٰهُ مُلكَه ...... یعنی ''اللہ کرے اس کی بادشاہت بھی اسی طرح پرزے پرزے ہوجائے......'' تو اللہ کی شان ملاحظہ ہو کہ واقعی بعینہٖ ایسا ہی ہوا......کسریٰ خسرو پرویز جیسا عظیم ترین بادشاہ جوخود کو ''شہنشاہ'' یعنی بادشاہوں کا بادشاہ کہلایا کرتا تھا' بالکل ہی غیرمتوقع طور پر مارا گیا......اوراس سے بھی بڑی بدبختی یہ ہوگئی کی خوداپنے ہی لاڈلے بیٹے اوراپنے ولی عہدِ سلطنتِ فارس' یعنی ''شیرویہ'' کے ہاتھوں مارا گیا......جوکہ اپنے باپ کسریٰ کوقتل کرڈالنے کے بعد زبردستی تخت وتاج اورتمام سلطنت کا مالک بن بیٹھا تھا۔

☆......چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے باذان کے ان کارندوں نے جب یہ بات سنی تو وہ انتہائی حیرت زدہ رہ گئے،اور کہنے لگے'' آپ کو کچھ خبر ہے کہ آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟'' آپؐ نے جواب میں فرمایا'' ہاں مجھے خوب خبر ہے،آج رات وہ مارا گیا ہے، تم اپنے بادشاہ باذان کے پاس واپس ملکِ یمن جاؤ،اوراسے بھی یہ خبر سناؤ،اور یہ بھی کہو کہ عنقریب دینِ اسلام ہراس جگہ پہنچنے والا ہے جہاں آج تک کسریٰ کی حکومت تھی،لہٰذا اگر تم دینِ اسلام قبول کرلو تو تمہارا ملکِ یمن ہم بدستور تمہارے تصرف میں ہی رہنے دیں گے، ورنہ تم نقصان اٹھاؤ گے''۔(۱)

چنانچہ باذان کے یہ کارندے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ جوابی پیغام لئے ہوئے مدینہ سے اب واپس ملکِ یمن کی طرف روانہ ہوگئے،ان کے وہاں پہنچنے سے قبل ہی باذان کو شیرویہ کی طرف سے باقاعدہ سرکاری حکمنامہ موصول ہوچکا تھا،جس میں اسے کسریٰ خسرو پرویز کی موت کی اطلاع' نیز شیرویہ کی تخت نشینی کی خبر دی گئی تھی......نیز باذان کو اب

(۱) اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد ''ہم تمہارا ملک بدستور تمہارے تصرف میں رہنے دیں گے'' سے یہ حقیقت خوب عیاں ہوجاتی ہے کہ مسلمانوں کا مقصود کشورکشائی یا مالِ غنیمت ہرگز نہیں، بلکہ محض اللہ کی زمین پر اللہ کے دین کا بول بالا کرنا ہی مطلوب ومقصود تھا۔

شیرویہ کی اطاعت وفرمانبرداری کی تاکید کی گئی تھی۔

باذان کو شیرویہ کی طرف سے موصول شدہ اس سرکاری خط کے ذریعے کسریٰ کی موت کے بارے میں آگاہی کے بعد......اب مزید یہ کہ مدینہ سے واپس آنے والے اپنے ان کارندوں کے ذریعے جب رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھی یہی خبر موصول ہوئی تو وہ انتہائی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے فوری طور پر مسلمان ہوگیا......اور یوں کہنے لگا کہ ''غیب کی یہ خبر تو فقط بذریعۂ وحی ہی کسی کو معلوم ہوسکتی ہے، لہٰذا اس کا یقینی مطلب یہ ہوا کہ محمد (ﷺ) واقعی اللہ کے سچے نبی اور رسول ہیں''۔

غور طلب بات ہے کہ یہ محض اپنا اپنا نصیب ہے......کسریٰ کو دعوتِ اسلام کے سلسلے میں خط تحریر کیا گیا، مگر اس خط کے ساتھ بدسلوکی کی وجہ سے اس کا کس قدر برا اور بھیانک انجام ہوا......جبکہ باذان کو تو ایسا کوئی خط نہیں لکھا گیا تھا......لیکن اس کے باوجود کسریٰ کے اس انجام کی وجہ سے اور اس سے متعلق رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دی گئی اس خبر کی وجہ سے وہ مسلمان ہوگیا......نصیب اپنا اپنا......

☆ یہاں تک تو قصہ تھا حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ کا سلطنتِ فارس کے بادشاہ کسریٰ خسرو پرویز کے ساتھ ملاقات' اور پھر اس کے نتیجے میں پیش آنے والے تاریخی حالات وواقعات سے متعلق......جس کے انتہائی اہم اور تاریخی نتائج یہ ظاہر ہوئے تھے کہ کسریٰ جیسا شان وشوکت اور جاہ وجلال والا بادشاہ خود اپنے ہی لاڈلے بیٹے اور ولی عہدِ سلطنت کے ہاتھوں مارا گیا، کسریٰ کی طرف سے مقرر کردہ ملکِ یمن کا بادشاہ باذان اسی واقعے کے نتیجے میں مسلمان ہوگیا، فارس کے شاہی دربار میں کسریٰ کی موت کے بعد بڑی افراتفری اور بے چینی کا ماحول پیدا ہوگیا، تمام سلطنتِ فارس میں تشویش اور اضطراب کی لہر

دوڑ گئی، ہر طرف اکھاڑ پچھاڑ کا سلسلہ چل نکلا، اور یہ سب کچھ بہت جلد روئے زمین کی اس عظیم ترین قوت یعنی سلطنتِ فارس کے ہمیشہ کیلئے زوال وانحطاط کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

☆......قیصرِ روم کے ساتھ ملاقات:

حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کی اُس دور میں روئے زمین کی دوسری بڑی سلطنت ''روم'' کے بادشاہ کے ساتھ ملاقات اوراس موقع پر پیش آنے والے حالات وواقعات کا مختصر تذکرہ درجِ ذیل ہے:

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دور مسلمانوں کی ترقی اورعروج ' عدل وانصاف وغیرہ......غرضیکہ ہر لحاظ سے......اور بالخصوص فتوحات کے نہایت وسیع وعریض سلسلے کی وجہ سے بہت ہی تاریخی اورمثالی دور تھا،اسی دور میں روئے زمین کی دونوں عظیم ترین قوتوں یعنی سلطنتِ فارس اورسلطنتِ روم کا بیک وقت ان مٹھی بھر صحرانشین مسلمانوں کے ہاتھوں ہمیشہ کیلئے خاتمہ ہوگیا تھا۔

فتوحات کے انہی سلسلوں کے دوران ۱۹ھ میں حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر سلطنتِ روم کے کسی علاقے کی جانب روانہ کیا تھا،اس لشکر میں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے۔

ان دنوں چونکہ بیک وقت متعدد محاذوں پر مسلمان اوررومی باہم برسرِ پیکار تھے،لہٰذا جنگی حکمتِ عملی کے طور پر ایک دوسرے کے بارے میں زیادہ سے زیادہ باخبر رہنے اور معلومات حاصل کرنے کی حتیٰ الامکان کوشش کی جاتی تھی،انہی کوششوں کے نتیجے میں سلطنتِ روم کے بادشاہ ''قیصرِ روم'' تک اپنے سپاہیوں' جاسوسوں' اور مخبروں کے ذریعے مسلمانوں کی انتہائی شرافت' امانت ودیانت' نیز اپنے مذہب کے ساتھ والہانہ اورمخلصانہ وابستگی کے

بارے میں خبریں پہنچتی رہتی تھیں، جنہیں سن کر وہ انتہائی حیران ہوا کرتا تھا، اور سوچا کرتا تھا کہ آخر یہ مسلمان کس قسم کے انسان ہیں؟ اور یہ کس دنیا کی مخلوق ہیں؟

بالخصوص ایک بات جو اس کیلئے بہت ہی زیادہ باعثِ حیرت بنی رہتی تھی، وہ یہ کہ مسلمان اپنے دین کے ساتھ اس قدر مخلص ہیں کہ دین کی سربلندی کی خاطر بوقتِ ضرورت بالکل بلاجھجھک اور بغیر کسی خوف یا تردد کے اپنی جان تک قربان کر دینے سے دریغ نہیں کرتے۔

چنانچہ ایک بار اس نے اپنے سپاہیوں اور جاسوسوں کو تاکید کرتے ہوئے کہا کہ کسی بھی طرح کوئی مناسب موقع دیکھ کر کسی مسلمان سپاہی کو زندہ گرفتار کر کے اس کے سامنے پیش کیا جائے...... تاکہ وہ بذاتِ خود اسے آزما سکے۔

چنانچہ رومی سپاہی اس مقصد کیلئے متعدد مقامات پر بڑی منصوبہ بندیاں کرتے رہے، آخر ایک روز کسی مقام پر انہوں نے مکر وفریب اور حیلے بازی کے ذریعے چند مسلمان سپاہیوں کو اپنی گرفت میں لے لیا، جن میں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

اور پھر ان مسلمانوں کو قیصرِ روم کے سامنے پیش کیا گیا، تب اس موقع پر اس کے سپاہیوں نے تعارف کراتے ہوئے بطورِ خاص یہ بات بھی بتائی کہ ان مسلمانوں میں ایک بہت اہم ترین انسان بھی ہے، کیونکہ وہ ان کے نبی (ﷺ) کے ساتھیوں (یعنی صحابۂ کرام) میں سے ہے، اور ابتدائی زمانے کا اصلی اور پکا مسلمان ہے، اس پر قیصر نے بڑی مسرت کا اظہار کیا، کیونکہ اسے اپنی خواہش کے عین مطابق ایک اصلی اور حقیقی مسلمان کو جانچنے اور پرکھنے کا موقع مل گیا تھا۔

چنانچہ ان قیدیوں کو قیصر کے روبرو پیش کیا گیا، تب وہ ان تمام قیدیوں میں سے بطورِ خاص حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کی شخصیت کا بغور جائزہ لینے لگا...... کچھ دیر ٹکٹکی

باندھے ان کی جانب دیکھتا رہا، اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے یوں گویا ہوا :

☆ قیصر: ''اے قیدی! ہماری طرف سے تمہارے لئے ایک پیشکش ہے''

☆ عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ: ''کیا ہے وہ پیشکش؟''

☆ قیصر: تم دینِ اسلام ترک کر کے نصرانی بن جاؤ، تب ہم تمہیں اس قید سے رہا بھی کر دیں گے، مزید یہ کہ تم اپنی باقی تمام زندگی بڑی عزت کے ساتھ نہایت راحت و آرام میں بسر کرو گے''

☆ عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ: ''جس چیز کی طرف تم مجھے دعوت دے رہے ہو اُس سے مجھے موت زیادہ پسند ہے''

☆ قیصر: تم مجھے بہادر اور خوددار قسم کے انسان دکھائی دیتے ہو، اس لئے میں چاہتا ہوں کہ تم میری یہ پیشکش قبول کر لو، میں تمہیں اپنی اس اتنی بڑی سلطنت میں حصے دار بنالوں گا......''

☆ تب زنجیروں میں جکڑے ہوئے اس قیدی (عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ) نے جواب دیا ''اللہ کی قسم! اگر تم اپنی تمام تر سلطنت بھی میرے حوالے کر دو، تب بھی میں لمحہ بھر کیلئے بھی محمد ﷺ کے دین سے دستبرداری قبول نہیں کروں گا''۔

☆ قیصر: ''تب میں تمہیں قتل کر ڈالوں گا''

☆ عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ: ''ٹھیک ہے، جو چاہو کرو''

تب قیصر کے حکم پر حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کو پھانسی دینے کی غرض سے سولی تیار کی گئی، اور پھر انہیں سولی پر چڑھانے کے بعد گلے میں پھندا ڈالنے سے قبل قیصر نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ''اس قیدی کے بازوؤں کے قریب نشانہ باندھ کر تیر چلاؤ'' جس پر حکم کی فوری تعمیل کی گئی، تیر ان کے بازوؤں کو چھوتے ہوئے مسلسل گذرتے رہے،

اس دوران قیصر بار بار وہی پیشکش دہراتا رہا کہ ''ہمارا دین اختیار کرلو، تمہیں رہا کردیا جائیگا''، لیکن قیدی مسلسل انکار کرتا رہا، تب ان کی ٹانگوں کے قریب تیر برسائے جانے لگے، قیصر کی طرف سے وہی اصرار...... قیدی کی طرف سے وہی انکار...... جبکہ اس دوران مسلسل تیر ان کی ٹانگوں کو چھوتے ہوئے گذرتے رہے۔

اس کے بعد قیصر نے یہ سلسلہ موقوف کرکے ایک بڑی دیگ میں تیل بھر کر اسے تیز آگ پر چڑھانے کا حکم دیا، حکم کی فوری تعمیل کی گئی، تیل جب خوب کھولنے لگا تو حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کے ساتھیوں میں سے ایک شخص کو حاضر کیا گیا اور تمام لوگوں کی نظروں کے سامنے اس کھولتے ہوئے تیل میں اسے زندہ ڈال دیا گیا، تب عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ ودیگر تمام لوگوں نے اپنی آنکھوں سے رونگٹے کھڑے کردینے والا یہ منظر دیکھا کہ کھولتے ہوئے اس تیل میں گرتے ہی اس شخص کا گوشت ہڈیوں سے الگ ہوگیا، اور اس کی چمکتی ہوئی ہڈیاں نظر آنے لگیں...... اور تب رومیوں کے بادشاہ قیصر نے معنیٰ خیز نگاہوں سے اس قیدی (عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ) کی جانب دیکھا، گویا آنکھوں ہی آنکھوں میں یہ جتلانا چاہتا ہو کہ ابھی تمہارا بھی یہی انجام ہونے والا ہے...... لہٰذا اس موقع پر اس نے ایک بار پھر انہیں دینِ نصرانیت قبول کرلینے کی پیشکش کی، لیکن انہوں اب بھی انکار ہی کیا، تب اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ '' اب اس قیدی کو بھی اسی طرح اس دیگ میں کھولتے ہوئے تیل میں پھینک دیا جائے''۔

شاہی حکم کی تعمیل کرتے ہوئے سپاہی فوراً اس قیدی (عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ) کی جانب لپکے، اور خوب مضبوطی کے ساتھ اسے دبوچے ہوئے اس دیگ کی طرف بڑھنے لگے، اس کیفیت میں یہ قیدی جب دیگ کے قریب پہنچا تو اس کی آنکھوں سے کچھ آنسو بہہ نکلے۔

یہ منظر دیکھ کر بادشاہ (قیصرِ روم) نہایت خوش ہونے لگا، اور یوں سمجھنے لگا کہ آخر جیت میری ہی ہوئی، اور یہ مسلمان ڈر گیا، اپنا بھیانک انجام دیکھ کر یہ اب خوفزدہ ہوگیا ہے، اس نے اپنی شکست تسلیم کرلی ہے، دنیا بھر میں یہ جو بات مشہور چلی آرہی ہے کہ ''مسلمان کبھی موت سے نہیں ڈرتا'' ہم نے یہ بات آج غلط ثابت کر دکھائی ہے، ہماری نگاہوں کے سامنے یہ مسلمان...... بلکہ یہ مسلمانوں کے پیغمبر کا ساتھی...... یہ صحابی...... آخر اس نے آج ہمارے سامنے ہتھیار ڈال دیئے...... اور آنسو بھی بہا رہا ہے......

قیصر سمجھا کہ معاملہ یہ ہے...... رونے کی وجہ بھی یہی ہے...... تب اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ ''رُک جاؤ...... دیکھو یہ رو رہا ہے...... اسے میرے پاس لاؤ'' چنانچہ قیدی کو واپس لایا گیا، تب اسے مخاطب کرتے ہوئے قیصر کہنے لگا ''آخر تم ڈر گئے...... چلو اب تم نصرانی بن جاؤ، ہمارا دین اختیار کرلو......''

لیکن تب قیصر یہ منظر دیکھ کر انتہائی حیرت زدہ رہ گیا کہ اس بار تو قیدی نے پہلے سے بھی زیادہ جوش وخروش اور عزم بالجزم کے ساتھ اس پیشکش کو یکسر ٹھکرا دیا...... تب نہایت تعجب کے عالم میں اس نے قیدی سے دریافت کیا ''اب بھی وہی انکار...... تو پھر تم رو کیوں رہے تھے......؟''

اس پر قیدی نے جواب دیا ''میں تو اس لئے رو رہا تھا کہ میں کتنے ہی دنوں سے تمہاری قید میں جکڑا ہوا بے بس اور لاچار انسان...... اپنی یہ کمزور سی جان اللہ کی راہ میں پیش کر رہا ہوں، کاش میرے جسم پر جتنے بال ہیں، میری اتنی ہی جانیں ہوتیں، اور میں اپنی وہ تمام جانیں اللہ کی راہ میں قربان کرسکتا......''

قیدی (یعنی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ) کی زبانی یہ عجیب وغریب بات سن

کروہ سرکش اور مغرور و متکبر بادشاہ حیران و پریشان رہ گیا......اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ کیسی بات کہہ رہا ہے یہ قیدی......؟ اللہ کی راہ میں اتنی زیادہ جانیں قربان کر دینے کی آرزو کر رہا ہے......حالانکہ ابھی کچھ ہی دیر قبل اپنے ساتھی کا دردناک انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ چکا ہے؟

آخر بادشاہ (قیصرِ روم) نے سوچا کہ یہ تو واقعی موت سے ڈرتا ہی نہیں، حالانکہ موت سے زیادہ خوفناک چیز اور کیا ہو سکتی ہے؟ وہ بھی ایسی موت؟ مگر اسے تو قطعاً کوئی فکر ہی نہیں ہے، کوئی اثر ہی نہیں ہو رہا اس پر، لہٰذا اسے ستانے اور پریشان کرنے کیلئے ''سزائے موت'' کی بجائے کوئی اور ترکیب سوچنا ہو گی......

اور پھر قدرے توقف کے بعد......اور کچھ غور و فکر کے بعد وہ کہنے لگا ''کیا تمہیں یہ بات منظور ہے کہ تم میرے سر کو بوسہ دو......؟ اس کے بدلے میں تمہیں آزاد کر دوں گا''

تب حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ نے اس سے دریافت فرمایا ''کیا تم میرے تمام ساتھیوں کو بھی رہا کر دو گے؟''

قیصر نے کہا ''ہاں......تمہارے تمام ساتھی قیدیوں کو بھی رہا کر دوں گا''

تب حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ نے اپنے دل میں سوچا کہ ''اگرچہ یہ شخص (قیصرِ روم) یقیناً اللہ کا اور اس کے دین کا دشمن ہے، لیکن اگر اس کی اس پیشکش کو قبول کرتے ہوئے میں ابھی اس کا سر چوم لیتا ہوں ......اور اس کے عوض صرف مجھے ہی نہیں...... بلکہ میرے تمام ساتھیوں کو بھی اس قید سے رہائی نصیب ہو جائے گی......اور ہم سبھی کی جان بچ جائے گی......تو اس میں کوئی قباحت نہیں ہے''

اور تب حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر اس بادشاہ (یعنی قیصرِ

روم) کے سر کو بوسہ دیا......تب بادشاہ نے فوری طور پر تمام قیدیوں کی رہائی اور آزادی کا حکم دیتے ہوئے انہیں حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ کے حوالے کیا......اور ان سبھی کو اپنی مرضی سے جہاں وہ چاہیں...... چلے جانے کی اجازت دی......

تب یہ تمام حضرات طویل سفر طے کرنے کے بعد سلطنتِ روم کے اُس علاقے سے جب مدینہ واپس پہنچے......تو انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو اس تمام واقعے سے مطلع کیا۔

حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے بڑے ہی انہماک، خوب توجہ اور دلچسپی کے ساتھ تمام واقعہ سنا......جس پر وہ انتہائی متأثر ہوئے، اور بطورِ خاص اس بات پر بڑی مسرت کا اظہار کیا کہ عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ نے کس طرح دانشمندی سے کام لیتے ہوئے بادلِ ناخواستہ اُس مغرور بادشاہ کے سر کو بوسہ دیا......اور یوں اپنے تمام ساتھیوں کو زندہ سلامت لئے ہوئے آخر واپس مدینہ آ پہنچے......

اور پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کچھ دیر تک قیصر کی قید سے رہائی پا کر زندہ سلامت آنے والے ان افراد کی جانب بغور دیکھتے رہے......اور پھر حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کی جانب بغور دیکھتے ہوئے فرمایا: حَـقٌّ عَلَىٰ كُلِّ مُسلِمٍ أن يُقَبِّلَ رَأسَ عَبدِ اللّهِ بن حُذَافَة ...... یعنی ''یقیناً ہر مسلمان پر عبداللہ بن حذافہ کا یہ حق بنتا ہے کہ وہ ان کے سر کو بوسہ دے......'' اور پھر فوراً ہی مزید فرمایا: وَأَنَـا أبدَأُ بِذَلِكَ ...... یعنی ''اس کام کی ابتداء میں خود کرتا ہوں......''

اور پھر سب سے پہلے خود خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے آگے بڑھ کر حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ کے سر کو بوسہ دیا......اس کے بعد اُس وقت

وہاں موجود دیگر تمام حضرات نے بھی ان کے سر کو بوسہ دیا...... کیونکہ اِنہوں (یعنی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ) نے اُس ظالم وجابر اور مغرور ومتکبر بادشاہ (قیصرِ روم) کے سر کو بوسہ دے کر اپنے ان تمام مسلمان ساتھیوں کی جان بچائی تھی...... لہٰذا یہ یقیناً اس اعزاز اور قدر افزائی کے مستحق تھے کہ سبھی مسلمان اب ان کے سر کو بوسہ دیں۔

☆......یہ ہے داستان اس شخص کی جو مکہ شہر میں دوسرے سبھی عام لوگوں کی طرح پلا بڑھا...... جس کی شخصیت میں بظاہر ایسی کوئی خاص بات نہیں تھی جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کیلئے تاریخی اور یادگار شخصیت بن جائے...... لیکن اللہ کو یہی منظور تھا...... کہ مکہ کے گلی کوچوں میں پرورش پانے والا یہ عام اور سیدھا سادھا انسان...... ہمیشہ کیلئے تاریخی شخصیت بن جائے...... چنانچہ اللہ کی مشیت ومرضی سے ہی اُس وقت تمام روئے زمین کی دو عظیم ترین سلطنتوں کے انتہائی طاقتور، مطلق العنان، ظالم وجابر، اور مغرور ومتکبر بادشاہوں سے ان کی ملاقات ہوئی، اور پھر اس حوالے سے کس قدر اہم، یادگار، اور سبق آموز حالات وواقعات بھی پیش آئے، یہی وہ سبب تھا جس کی بناء پر یہ سیدھا سادھا اور ''عام انسان'' اللہ کی مرضی سے ہمیشہ کیلئے ''عظیم انسان'' بن گیا...... یہاں تک کہ خلیفۃ المسلمین حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ جیسے عظیم ترین انسان (جنہیں دنیا ''فاروقِ اعظم'' کے لقب سے یاد کرتی ہے) نے خود آگے بڑھ کر اس عظیم انسان کے سر کو بوسہ دیا...... نیز اُس وقت وہاں موجود دوسرے تمام مسلمانوں کو بھی یہی حکم دیا کہ ہر کوئی آگے بڑھ کر ان کے سر کو بوسہ دے......

☆......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے دعوتِ اسلام کے سلسلے میں مختلف فرمانرواؤں کے نام خطوط تحریر کئے جانے کا واقعہ ۶ھ میں پیش آیا تھا، تب آپؐ کی طرف سے سلطنتِ فارس

کے بادشاہ کسریٰ خسرو پرویز کے نام تحریر فرمودہ نامۂ مبارک حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمیؓ نے پہنچایا تھا...... چنانچہ ۶ھ میں رسول اللہ ﷺ کے قاصد کی حیثیت سے ان کی ملاقات کسریٰ خسرو پرویز کے ساتھ ہوئی تھی۔

جبکہ اس کے تقریباً تیرہ سال بعد ۱۹ھ میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران سلطنتِ روم کے بادشاہ قیصر کے ساتھ ان کی ایک قیدی کی حیثیت سے ملاقات کا واقعہ پیش آیا تھا۔

اس کے بعد خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (فاتحِ مصر) کی زیرِ قیادت جب یہ مصر میں اسلامی لشکر میں خدمات انجام دے رہے تھے......تب ان کی طبیعت ناساز ہوگئی، رفتہ رفتہ مرض شدت اختیار کرتا گیا، آخر وہیں مصر میں ہی ان کا انتقال ہوگیا، اور وہیں انہیں سپردِ خاک کیا گیا۔

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ صحابی حضرت عبداللہ بن حذافہ السہمی رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے......

اللہ تعالیٰ جنت الفردس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۲۵/ ربیع الأول ۱۴۳۶ھ، مطابق ۱۵/ جنوری ۲۰۱۵ء بروز جمعرات یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ:

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ مدینہ کے باشندے تھے، یعنی ''انصارِ مدینہ'' میں سے تھے، مدینہ کے مشہور قبیلے ''خزرج'' کے خاندان ''بنوسَلَمَہ'' سے ان کا تعلق تھا۔(۱)

حضرت کعب بن مالکؓ نے اس قدر ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا تھا کہ ہجرت سے قبل جب نبوت کا تیرہواں سال چل رہا تھا، حج کے موقع پر منیٰ میں ''عقبہ'' نامی مقام پر مدینہ سے آئے ہوئے حجاج میں سے بہتّر افراد نے پیشگی منصوبے کے مطابق رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات کی تھی، اور آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی' جسے تاریخ میں ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔(۲) اور یہی وہ موقع تھا کہ جب مدینہ کے ان باشندوں نے رسول اللہ ﷺ کو باقاعدہ مدینہ چلے آنے کی دعوت دی تھی، اور پھر اسی کے نتیجے میں ہی ''ہجرتِ مدینہ'' کا یادگار واقعہ پیش آیا تھا، جو آگے چل کر دنیا کی تاریخ میں اولین ''اسلامی ریاست'' کے قیام' نیز مسلمانوں کے بے مثال عروج کا سبب بنا تھا۔

''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے اس یادگار موقع پر رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کرنے' اور پھر اس موقع پر آپؐ کو مستقل طور پر مدینہ چلے آنے کی دعوت دینے' نیز آپؐ کی حفاظت کی خاطر بوقتِ ضرورت اپنی جان و مال' اہل وعیال' اور سبھی کچھ قربان کردینے کا عہد و پیمان کرنے والے ان بہتّر خوش نصیب اور عظیم ترین افراد میں حضرت کعب بن مالکؓ بھی

(۱) مدینہ منورہ میں مسجد قبلتین کے قریب یہ مشہور خاندان ''بنوسَلَمَہ'' آباد تھا۔

(۲) جبکہ اس سے قبل نبوت کے بارہویں سال عقبہ کے مقام پر ہی مدینہ سے آئے ہوئے بارہ افراد نے بیعت کی تھی جسے ''بیعتِ عقبہ اولیٰ'' کہا جاتا ہے۔

شامل تھے۔

اور پھر نبوت کے چودھویں سال کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کر گئے، جہاں ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا۔

☆......رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپؐ کی خدمت، صحبت، علمی استفادہ، اور کسبِ فیض کے سلسلے میں پیش پیش اور نمایاں رہے......لیکن پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جوان کیلئے بہت ہی بڑی آزمائش کی صورت میں سامنے آکھڑا ہوا۔اور وہ واقعہ تھا ''غزوۂ تبوک''۔

۹ھ میں پیش آنے والا یہ ''غزوۂ تبوک'' بہت سی خصوصیات کی بناء پر دیگر غزوات سے کافی مختلف ثابت ہوا تھا، البتہ یہ اور بات ہے کہ وہاں ''تبوک'' کے مقام پر پہنچنے کے بعد باقاعدہ کسی جنگ کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، اور جو بڑے خطرات سروں پر منڈلا رہے تھے، اللہ نے اپنے خاص فضل وکرم سے انہیں رفع دفع فرمادیا تھا......لیکن اس کے باوجود اس غزوے کے موقع پر کچھ ایسے مخصوص حالات سے مسلمانوں کو دوچار ہونا پڑا تھا کہ جو اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر پیش نہیں آئے تھے، مثلاً:

☆......اس سے قبل تمام غزوات مشرکینِ عرب کے خلاف پیش آئے تھے(۱)

(۱) سوائے ''مؤتہ'' کے، جو کہ ۸ھ میں ''رومیوں'' کے خلاف پیش آیا تھا، لیکن مجموعی طور پر مؤتہ کے موقع پر صورتِ حال ایسی نہیں تھی کہ جیسی تبوک کے موقع پر تھی، نیز یہ کہ وہ اتنے بڑے پیمانے پر نہیں تھا، وہ تو رسول اللہ ﷺ کے ایک قاصد کے رومیوں کے ہاتھوں قتل کا واقعہ پیش آنے کے بعد آپؐ نے محض تادیبی کارروائی کی غرض سے تین ہزار افراد پر مشتمل لشکر سلطنتِ روم کی جانب روانہ فرمایا تھا، البتہ وہاں پہنچنے کے بعد اچانک بالکل ہی غیر متوقع صورتِ حال پیش آگئی تھی جس کی وجہ سے معاملہ بڑی نزاکت اختیار کر گیا تھا......تاہم اصل میں یہ غزوۂ مؤتہ بڑے پیمانے پر نہیں تھا، مزید یہ کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی اس موقع پر شریک نہیں تھے۔لہٰذا رومیوں کے خلاف پہلے اور حقیقی اصل غزوے کی حیثیت سے روانگی ''غزوۂ تبوک'' کے موقع پر ہی ہوئی تھی۔

چند غزوات یہود کے خلاف بھی پیش آئے تھے، مدینہ میں' اور پھر خیبر میں' لیکن یہود بھی زمانۂ دراز سے نسل در نسل جزیرۃ العرب میں ہی آباد تھے......

غرضیکہ اب تک جتنے بھی غزوات پیش آئے تھے ان میں کیفیت یہی تھی کہ مسلمانوں اور فریقِ مخالف میں عقیدہ وایمان کے لحاظ سے تو اگرچہ یقیناً بہت بڑا فرق تھا (بلکہ یہی چیز تو وجہِ نزاع اور سببِ اختلاف تھی) تاہم یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ زبان' بول چال' لب ولہجہ' فنونِ حرب' نیز سامانِ حرب وضرب کے لحاظ سے مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے مابین مکمل مشابہت ومماثلت تھی، لشکر کی تعداد' نیز اسلحہ ودیگر ساز وسامان کی تعداد کے لحاظ سے تو فرق موجود تھا، کہ مسلمانوں کی تعداد ہمیشہ دشمن کے مقابلے میں کم رہی، سامان حرب وضرب کی بھی قلت کا سامنا رہا، لیکن جو سامانِ جنگ دشمن کے پاس تھا، بعینہٖ وہی سامانِ جنگ مسلمانوں کے پاس بھی تھا......بس تعداد میں فرق تھا۔

جبکہ غزوۂ تبوک کے موقع پر ایک بالکل نئے اور نامانوس دشمن کا سامنا تھا، جس کی زبان قطعی مختلف تھی، جنگ لڑنے کے طور طریقے مختلف تھے، سامانِ جنگ جداگانہ نوعیت کا تھا......

غرضیکہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں کو ایک ایسے دشمن کا سامنا تھا جو ہر لحاظ سے نیا اور قطعی نامانوس تھا۔

☆......یہ جنگ دنیا کی عظیم ترین قوت ''سلطنتِ روم'' کے خلاف لڑی جانے والی تھی۔

☆......مدینہ سے تبوک تک مسافت بہت زیادہ تھی، راستہ دشوار گذار تھا۔

☆......سخت ترین گرمی کا موسم تھا، یہی وجہ تھی کہ منافقین اس موقع پر باہم ایک دوسرے کو یوں کہتے پھر رہے تھے: ﴿لَا تَنفِرُوا فِي الحَرِّ......﴾ یعنی ''اس قدر شدید گرمی میں نہ نکلو......'' یوں یہ منافقین اپنی اس قسم کی باتوں کے ذریعے سبھی کیلئے پست ہمتی' بددلی' اور

حوصلہ شکنی کا سبب بن رہے تھے......

تب اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ان کیلئے یہ شدید ترین وعید نازل ہوئی تھی: ﴿قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ أَشَدُّ حَراً لَوكَانُوا يَفقَهُونَ......﴾ (۱) یعنی ''کہہ دیجئے کہ جہنم کی آگ تو بہت زیادہ گرم ہے، کاش وہ اس بات کو سمجھتے''

یعنی یہ منافقین جس گرمی سے بچنے کی خاطر اس غزوے کیلئے نکلنے سے کترا رہے ہیں' ان کا یہ عمل انہیں اُس جہنم کی آگ تک پہنچا دے گا جس کی گرمی تو دنیا کی اس گرمی سے بہت زیادہ سخت ہے......تب یہ کیا کریں گے؟

☆......یہ غزوہ ایسے وقت پیش آیا جب کھجوریں پکنے کا موسم تھا، سال بھر کے انتظار کے بعد اب اپنی شب و روز کی محنت کا پھل جب اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آنے لگا تھا...... ایسے میں اسے چھوڑ کر چلتے بننا......جبکہ اس بارے میں کوئی اندازہ ہی نہیں تھا کہ واپسی کب ہوگی؟ بالخصوص یہ کہ ان کی زندگی میں کھجور کی بہت بڑی اہمیت تھی، کھجور ہی ان کی خوراک تھی، کھجور پر ہی ان کی معیشت اور گذر بسر کا بڑی حد تک انحصار تھا۔

☆......اس غزوے کے موقع پر اس قدر مشکلات کا سامنا تھا کہ اس غزوے میں شرکت کرنے والے ہمیشہ کیلئے ''مؤمن'' جبکہ پیچھے رہ جانے والے ''منافق'' کہلائے، یعنی اس غزوے میں شرکت یا عدمِ شرکت ہمیشہ کیلئے ایمان کا اور نفاق کا معیار بن گئی......

☆......قرآن کریم (سورہ توبہ) میں اس غزوے سے متعلق اتنی بڑی تعداد میں آیات نازل کی گئیں' نیز تفصیلی حالات و واقعات کا تذکرہ کیا گیا......کہ کسی دوسرے غزوے کے موقع پر اتنی بڑی تعداد میں قرآن کریم کی آیات نازل نہیں ہوئیں۔

(۱) توبہ/براءۃ [۸۱]

☆......حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خالص اور حقیقی مؤمن تھے، البتہ یہ کہ وہ اس یادگار اور اہم ترین غزوۂ تبوک میں شریک نہیں ہوئے، اس کی کیا وجہ تھی؟ کیا حالات وواقعات پیش آئے تھے؟ اور پھر کیا نتیجہ برآمد ہوا تھا؟ یقیناً اس میں ہمیشہ کیلئے ہر مسلمان کیلئے بڑا سبق پوشیدہ ہے۔

اس سلسلے میں ایک طویل حدیث ہے، جس میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود اپنا واقعہ بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں: (۱)

''غزوۂ تبوک سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر میں غیر حاضر نہیں رہا تھا، سوائے ''غزوۂ بدر'' کے، کیونکہ بدر کے موقع پر تو صورتِ حال اس وجہ سے قطعی مختلف تھی کہ اس موقع پر تو باقاعدہ غزوے کا اعلان ہی نہیں ہوا تھا، رسول اللہ ﷺ اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ مشرکینِ مکہ کے اُس ''عیر'' (تجارتی قافلے) کو روکنے کی غرض سے مدینہ سے نکلے تھے جو ملکِ شام سے مکہ کی جانب واپس جاتے ہوئے مدینہ کے قریب سے گذر رہا تھا، لیکن اس تجارتی قافلے کی بجائے آمنا سامنا ہو گیا تھا مشرکینِ مکہ کے جنگی لشکر سے، جو اس تجارتی قافلے کو بچانے کی خاطر مکہ سے مدینہ پہنچا تھا، اللہ کی طرف سے اسی میں کوئی حکمت تھی'' (یعنی مسلمانوں کا اس تجارتی قافلے کی بجائے جنگی لشکر کے ساتھ جو سامنا ہو گیا، اسی میں اللہ کے علم میں کوئی حکمت تھی'')۔(۲)

(۱) اس مشہور و معروف حدیث کی ابتداء اس طرح ہے: لَم أتَخَلّف عن رسول اللّه ﷺ في غَزوة غزاها قطّ الا في تبوك ...... کتبِ حدیث، تفسیر، و تاریخ میں یہ حدیث موجود ہے، امام نووی نے ریاض الصالحین میں ''باب التوبہ'' میں ذکر کی ہے۔

(۲) مسلمان چونکہ مشرکینِ مکہ کی طرف سے ظلم وزیادتی کے نتیجے میں ہی اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر خالی ہاتھ

(باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر......)

لہٰذا غزوۂ بدر محض اتفاقیہ طور پر پیش آ گیا تھا، اس کیلئے باقاعدہ کوئی اعلان نہیں کیا گیا تھا، کیونکہ رسول اللہ ﷺ تو اس موقع پر جنگ کے ارادے سے نکلے ہی نہیں تھے، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ صرف کعب بن مالکؓ ہی نہیں' بلکہ بہت سے صحابۂ کرام اس میں شریک نہیں ہوئے تھے، جس پر انہیں کوئی ملامت نہیں کی گئی تھی۔

اور جب ''غزوۂ تبوک'' کا موقع آیا تو......جیسا کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ خود صورتِ حال بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں......''اس موقع پر میرے حالات بہت اچھے تھے، خوشحالی تھی، دوصحتمند' تندرست' اور تیز رفتار اونٹنیاں بھی میرے پاس تھیں، جبکہ اس سے قبل کبھی کسی غزوے کے موقع پر ایسا نہیں ہوا تھا کہ بیک وقت دو اونٹنیاں میری ملکیت میں ہوں، نیز اس سے قبل کبھی میرے حالات بھی اس قدر اچھے نہیں تھے''

☆......رسول اللہ ﷺ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر احتیاطی تدبیر کے طور پر حتیٰ الامکان رازداری سے کام لیا کرتے تھے......مثلاً یہ کہ کب روانگی ہوگی؟ کس راستے سے روانگی ہوگی؟ وغیرہ......

لیکن غزوۂ تبوک کے موقع پر ایسا نہیں کیا گیا، بلکہ عام منادی کردی گئی، اور سبھی لوگوں کو خوب زیادہ سے زیادہ تیاری کی ہدایت کی گئی، کیونکہ اس موقع پر صورتِ حال بہت زیادہ

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ

بالکل بے سروسامانی کی کیفیت میں وہاں سے ہجرت کرکے مدینہ چلے آئے تھے......لہٰذا انہیں اس بات کی اجازت تھی کہ مشرکینِ مکہ کا کوئی تجارتی قافلہ یا اموال واسباب کہیں ہاتھ لگ جائے تو اس پر قبضہ کرلیا جائے......تاکہ اس طرح ان مسلمانوں کے اُس بڑے نقصان کی کسی حد تک تلافی ہو سکے کہ جس کا سبب خود مشرکینِ مکہ ہی تھے، چنانچہ یہی وجہ تھی کہ مسلمان مشرکینِ مکہ کے اس قافلے کو روکنے کی غرض سے نکلے تھے، لیکن بقضائے الٰہی وہاں اس تجارتی قافلے کی بجائے مشرکین کے جنگی لشکر سے ٹکر ہوگئی، جس کے نتیجے میں ''غزوۂ بدر'' کی نوبت آئی۔

سنگین تھی...... چنانچہ سبھی لوگ بھرپور طریقے سے تیاری میں مشغول ہوگئے، دوردراز کے علاقوں سے بھی بڑی تعداد میں دستے مدینہ پہنچنے لگے...... لہٰذا ایسے میں جب ہرکوئی نہایت جوش وخروش اور زوروشور کے ساتھ تیاری میں مشغول ومنہمک تھا...... تب صرف منافق قسم کے لوگ ہی تھے کہ جو اس غزوے میں شرکت سے بچنے کے حیلے بہانے تلاش کررہے تھے کہ بس کسی بھی طرح ان کی جان بچ جائے...... یہ لوگ کوئی تیاری بھی نہیں کررہے تھے، اور یوں گویا قدرت کی طرف سے اس بڑی آزمائش کے ذریعے خالص اور سچے مؤمنوں اور منافقوں کے مابین تمیز اور پہچان کا معیار مقرر کردیا گیا تھا، نیز اس طرح اُس اسلامی معاشرے میں مسلمانوں کے درمیان جو چھپے ہوئے دشمن اور آستین کے سانپ تھے...... قدرت کی طرف سے اب انہیں بےنقاب کئے جانے کا انتظام ہورہا تھا۔

☆......البتہ تین افراد ایسے تھے جو حقیقی مؤمن تھے، یعنی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ‘ حضرت ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ‘ اور حضرت مُرارۃ بن الربیع رضی اللہ عنہ، یہ تینوں مؤمنِ خالص تھے، لیکن اس کے باوجود اس موقع پر یہ تینوں بھی نہیں جاسکے...... یقیناً اس میں بھی اللہ عزوجل کی جانب سے کوئی بڑی حکمت ومصلحت پوشیدہ تھی......

☆......حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ’’رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمانوں نے اس سفر کیلئے خوب تیاری کی‘ اور اس کے بعد ایک روز وہ سب مدینہ سے روانہ ہوگئے...... لیکن میں چونکہ اپنے کھجوروں کے باغ سے متعلق کچھ کام کاج میں الجھا ہوا تھا، اس لئے میں نے سوچا کہ میں کل روانہ ہوں گا، اور خوب تیز رفتاری کے ساتھ سفر کرتا ہوا ان کے ساتھ جاملوں گا...... لیکن دوسرے روز بھی میں اپنا وہ کام نپٹا نہیں سکا...... تب سوچا کہ کل جاملوں گا...... آخر مجھے خوب اندازہ ہوگیا کہ اب بہت دیر ہوچکی ہے...... اب میں

کسی صورت لشکر کے ساتھ نہیں مل سکتا......''(۱)

☆......آخر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ مدینہ میں ہی بیٹھے رہ گئے......فرماتے ہیں کہ ''میں جب بھی گھر سے نکلتا......تو اپنے پرانے ساتھیوں میں سے مجھے کوئی نظر نہ آتا...... رسول اللہ ﷺ بھی نظر نہ آتے......بس گلی کوچوں میں کھیلتے کودتے بچے نظر آتے تھے...... کبھی کوئی معذور شخص نظر آجاتا جو واقعی عذر کی وجہ سے نہیں جاسکا تھا، یا پھر کبھی کوئی ایسا شخص نظر آجاتا جو سر سے پاؤں تک نفاق میں ڈوبا ہوا ہوتا تھا، یعنی منافق قسم کا انسان...... جو اپنے نفاق کی وجہ سے نہیں گیا، جب جانے کا وقت تھا تب چھپ کر اپنے گھر میں دبکا بیٹھا رہا......اور اب جبکہ سبھی جاچکے ہیں تو یہ یہاں گھومتا پھر رہا ہے......اس قسم کے لوگوں پر جب میری نگاہ پڑتی......تو میں خود اپنے بارے میں بھی سوچنے لگتا......اور تب میرا دل بجھ جاتا......اور میں یہ سوچ کر انتہائی شرمسار اور غمگین ہوجاتا کہ ''میں بھی تو انہی کی طرح یہاں بیٹھا ہوا ہوں' لہٰذا کیا میرا شمار ان بچوں' عورتوں' معذوروں' اور منافقوں میں ہے؟''

☆......اُدھر دوسری طرف رسول اللہ ﷺ اپنے لشکر کے ہمراہ مدینہ سے روانگی کے بعد

(۱) یہاں ایک بہت بڑا علمی فائدہ اور سبق یہ پوشیدہ ہے کہ انسان کو ہر کام اپنے وقت پر ہی نمٹا لینا چاہئے، اور یہ جو بہت سے لوگوں کی عادت ہوا کرتی ہے کہ ہمیشہ زبان پر یہی جملہ رہتا ہے کہ ''کل کرلوں گا'' اس سے بہر صورت گریز کرنا چاہئے، کیونکہ بسا اوقات یہ چیز بڑی پریشانی کا اور بڑے نقصان کا باعث بن جایا کرتی ہے...... بالخصوص دینی معاملات میں تو اس چیز سے اجتناب کی بہت زیادہ ضرورت ہے، نماز' روزہ' حج' زکوٰۃ' وغیرہ تمام دینی فرائض کی بروقت اور فوری ادائیگی کا مکمل اہتمام والتزام کیا جائے، بصورتِ دیگر خود بخود اس قسم کے حالات درپیش آتے رہیں گے کہ مسلسل تاخیر ہوتی چلی جائیگی، اور پھر انسان کے پاس صرف ندامت ہی رہ جائیگی...... جیسا کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کے ساتھ یہ معاملہ پیش آیا کہ روانگی کا مکمل عزم موجود تھا، تیاری بھی خوب کر رکھی تھی، لیکن کسی وجہ سے جب تاخیر ہوگئی......تو پھر تاخیر ہوتی ہی چلی گئی......آخر یہ تاخیر ان کیلئے بہت زیادہ پریشانی اور بڑی آزمائش کا سبب بن گئی۔

مسلسل سفر کرتے ہوئے آخر منزلِ مقصود یعنی ''تبوک'' جا پہنچے، اس دوران تمام راستے میں آپؐ نے کعبؓ کے بارے میں کسی سے کوئی استفسار نہیں فرمایا، البتہ طویل مسافت طے کرتے ہوئے تبوک پہنچ جانے کے بعد ایک روز جب آپؐ اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ کسی جگہ تشریف فرما ہے تھے، تب آپؐ نے اچانک انہیں مخاطب کرتے ہوئے دریافت فرمایا: أین کعب بن مالك......؟ یعنی ''کعب بن مالک کہاں ہیں......؟'' تب ایک شخص نے جواب دیا کہ ''اے اللہ کے رسول! کعب تو نہیں آئے''

اس موقع پر اتفاقاً وہاں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ بھی موجود تھے(۱) انہوں نے جب یہ صورتِ حال دیکھی تو انہیں یہ فکر لاحق ہونے لگی کہ ''کہیں ایسا نہو کہ کعب کی غیر حاضری کی خبر سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ کو صدمہ پہنچے، یا آپؐ کے قلبِ مبارک میں کعب کے خلاف کوئی ناگواری اور کدورت پیدا ہونے لگے......'' لہٰذا انہوں نے فوراً ہی کعبؓ کی طرف سے دفاع کی غرض سے ان کے بارے میں کوئی ایسی مبہم اور گول مول قسم کی بات کی جس سے یہ تأثر دینا مقصود تھا کہ کعب منافق نہیں ہیں، بلکہ وہ تو بہت ہی اچھے انسان ہیں، ضرور انہیں کوئی عذر پیش آ گیا ہوگا جس کی وجہ سے وہ نہیں آ سکے''

تاہم رسول اللہ ﷺ نے نہ تو اس پہلے شخص کی بات کا کوئی جواب دیا (جس نے آپؐ کے استفسار کے جواب میں یہ بتایا تھا کہ کعب تو نہیں آئے) اور نہ ہی معاذ بن جبلؓ کی اس بات کا کوئی جواب دیا (جس میں انہوں نے کعبؓ کی طرف سے کچھ صفائی پیش کرنے کی کوشش کی تھی) آپؐ نے اس موقع پر بس خاموشی اختیار فرمالی۔

☆......رسول اللہ ﷺ نے اپنے لشکر کے ہمراہ بیس روز تبوک میں قیام فرمایا، اور پھر وہاں

(۱) جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ صفحات [۶۲۳-۶۳۹] میں ملاحظہ ہو۔

سے واپسی کا سفر شروع ہوا، تبوک میں یہ بیس روزہ قیام' نیز آمدورفت ملا کر کل یہ پچاس دن کا سفر رہا۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو جب یہ خبر ملی کہ رسول اللہ ﷺ تبوک سے واپس مدینہ کی جانب روانہ ہو چکے ہیں، تو اس سوچ میں پڑ گئے کہ آپؐ کی جب مدینہ تشریف آوری ہوگی تو میں کیا کہوں گا......؟

اور پھر آخر آپؐ واپس مدینہ پہنچ گئے، آپؐ کا معمول تھا کہ ہمیشہ سفر سے واپسی کے موقع پر اپنے گھر تشریف لے جانے کی بجائے پہلے مسجد جایا کرتے تھے، وہاں دو رکعت نماز ادا کرتے، اس کے بعد کچھ دیر وہیں تشریف فرما رہتے، تاکہ سب سے ملاقات وغیرہ کا سلسلہ بھی ہو جائے......اس کے بعد آپؐ اپنے گھر تشریف لے جاتے۔

حضرت کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں ''رسول اللہ ﷺ جب مسجد میں تشریف فرما تھے، تب میں دیکھتا رہا کہ بڑی تعداد میں منافقین آتے رہے، آپؐ کے سامنے مختلف حیلے بہانے بناتے رہے، جھوٹی کہانیاں سناتے رہے، جھوٹے عذر پیش کرتے رہے، اور جھوٹی قسمیں کھا کر اپنی جان چھڑاتے رہے......اور ہنسی خوشی وہاں سے جاتے رہے......جبکہ میں نے یہ پختہ عزم کر رکھا تھا کہ میں جھوٹ نہیں بولوں گا، میں مسجد میں داخل ہوا، آپؐ کی خدمت میں سلام عرض کیا......آپؐ نے سلام کا جواب دیا، قدرے تبسم فرمایا، لیکن اس تبسم میں کچھ ناراضگی کی آمیزش بھی شامل تھی، پھر آپؐ نے فرمایا: ''میرے قریب آؤ'' اس پر میں قریب آ گیا، تب آپؐ نے مجھ سے دریافت فرمایا ''کعب! تم کیوں پیچھے رہ گئے؟'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! مجھے کوئی عذر درپیش نہیں تھا، میں نے دو تیز رفتار اونٹنیاں بھی تیار کر رکھی تھیں، آج اگر میں آپ کی بجائے کسی دنیاوی بادشاہ کے سامنے ہوتا تو کوئی جھوٹا

بہانہ بنا کر اپنی جان چھڑا لیتا، لیکن میں آپ کے سامنے ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا''
الغرض منافقین کے برعکس حضرت کعب بن مالکؓ نے ایمان داری اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے بالکل درست اور اصل بات بتادی کہ نہ تو مجھے کوئی عذر تھا، نہ ہی کوئی جسمانی یا مالی رکاوٹ اور پریشانی لاحق تھی......
حضرت کعب بن مالکؓ کی یہ بات سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: أمّا ھذا فقد صَدَق ...... یعنی''یہی ہے جس نے سچ بولا ہے''اور پھر مزید فرمایا''جاؤ، یہاں تک کہ اللہ تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نازل فرمائے''
تب کعبؓ وہاں سے چل دیئے......ایمان کی شمع دل میں لئے ہوئے، اپنے اللہ پر مکمل بھروسہ کئے ہوئے، اور اپنا معاملہ بس اسی کے حوالے کرتے ہوئے......
اس موقع پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو ذہنی ونفسیاتی طور پر پریشانی تو بہت زیادہ لاحق تھی، بالخصوص اس بات کی وجہ سے کہ یہ منافق قسم کے لوگ کس طرح جھوٹے بہانے بنا بنا کر اور جھوٹی قسمیں کھا کر چھوٹ گئے......اور بس ہنسی خوشی چلتے بنے......بات ختم ہوگئی......جبکہ میرا اب نہ جانے کیا بنے گا......؟ لیکن اس پریشانی کے ساتھ ہی انہیں یہ اطمینان بھی تھا کہ میں نے اللہ کے رسول ﷺ کے سامنے جھوٹ نہیں بولا، یوں بیک وقت ''پریشانی اور اطمینان'' کی یہ ملی جلی کیفیت ان پر طاری تھی......
اس دوران ان کی قوم''بنوسَلَمہ'' کے کچھ لوگوں نے انہیں مشورہ دیتے ہوئے کہا''اے کعب! آپ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں دوبارہ جائیے، اور عرض کیجئے کہ مجھے کوئی عذر درپیش تھا، جس کی وجہ سے میں اس غزوے سے پیچھے رہ گیا، آپ کی یہ بات سن کر رسول اللہ ﷺ آپ کیلئے دعائے مغفرت کریں گے، جس پر اللہ آپ کو معاف فرمادے گا......اور بس

بات ختم ہوجائیگی......''

کعبؓ کی قوم کے یہ لوگ کعبؓ کے سامنے اپنے اس مشورے پر اصرار کرتے رہے، حتیٰ کہ کچھ دیر کیلئے کعبؓ اس بارے میں تردد کا شکار ہو گئے......

آخرانہوں نے سوچا کہ'' معلوم کیا جائے کہ کیا میرے علاوہ کوئی اور شخص بھی ایسا ہے جس نے راست گوئی سے کام لیا ہو......اوراس وجہ سے اس کا معاملہ بھی مجھ جیسا ہی ہو...... چنانچہ تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ دوافراد ایسے ہیں جنھوں نے سچ بولا، جس پر انہیں بھی رسول اللہ ﷺ کی طرف سے وہی بات کہی گئی جو اِنہیں (یعنی حضرت کعب رضی اللہ عنہ) کو کہی گئی تھی، یعنی اللہ کی طرف سے فیصلے کا انتظار......''

اور یہ دوحضرات ہلال بن امیہ اور مُرارۃ بن الربیع (رضی اللہ عنہما) تھے، حضرت کعبؓ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو انہیں یہ سوچ کر کافی اطمینان نصیب ہوا کہ'' یہ دونوں تو اللہ کے برگزیدہ ترین بندے ہیں، حتیٰ کہ غزوۂ بدر میں شرکت کا عظیم شرف بھی انہیں نصیب ہوا ہے، لہٰذا فکر کی ضرورت نہیں، کیونکہ ان دونوں کے ساتھ جو ہوگا وہی میرے ساتھ بھی ہوجائیگا'' اور یہ بات سوچ کر انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اب دوبارہ حاضری کا اور اپنے لئے کوئی عذر پیش کرنے کا ارادہ بالکل ہی ترک کر دیا، اور اپنے اسی ''سچ'' پر قائم رہتے ہوئے بس خود کو اللہ کے حوالے کر دینے کا عزم بالجزم کر کے بیٹھ گئے۔

☆......اور پھر اسی کیفیت میں چند روز ہی گذرے تھے کہ رسول اللہ ﷺ نے یہ حکم صادر فرمایا کہ ہر کوئی ان تینوں سے مکمل قطعِ تعلق کر لے، تب سبھی نے ان سے مکمل قطعِ تعلق کر لیا، حتیٰ کہ سبھی نے ان سے بات چیت' سلام وکلام' سب کچھ ترک کر دیا، تب یہ تینوں بہت زیادہ پریشان اور انتہائی افسردہ ہو گئے......اور یوں بس اپنے ہی لوگوں کے درمیان اجنبی

بن کررہ گئے، جس شہر میں پیدا ہوئے، جہاں ساری زندگی گذاری، جن گلی کوچوں میں کھیل کود کر بڑے ہوئے...... اب وہی جگہ اور اپنا وہی شہر انہیں اجنبی محسوس ہونے لگا...... یا یوں کہہ لیا جائے کہ...... یہ خود اب اس شہر میں اجنبی بن کر رہ گئے...... اب انہیں وہاں وحشت محسوس ہونے لگی، نہ کسی کے ساتھ کوئی تعلق باقی رہا، نہ کوئی رشتہ برقرار رہا، نہ کوئی میل جول ہے، نہ ملاقات ہے، نہ سلام وکلام کا کوئی سلسلہ ہے، کوئی بات نہیں کرتا، کوئی سلام نہیں کرتا، اگر یہ خود سلام کرتے ہیں تو کوئی ان کے سلام کا جواب نہیں دیتا، یہاں تک کہ خود رسول اللہ ﷺ بھی اپنی تمامتر رحمت وشفقت کے باوجود' اور اپنی تمامتر خوش اخلاقی کے باوجود...... ان کے سلام کا جواب نہیں دیتے......

حضرت کعبؓ فرماتے ہیں کہ ''میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتا، سلام عرض کرتا، اور یہ سوچ کر خوب غور سے آپؐ کے ہونٹوں کی جانب دیکھتا کہ آپؐ نے اگرچہ زبان سے تو میرے سلام کا جواب نہیں دیا...... لیکن...... ممکن ہے کہ آپؐ کے ہونٹوں میں جنبش ہوئی ہو...... آواز تو نہیں آئی...... لیکن ممکن ہے کہ آپؐ نے شاید آہستہ سے جواب دیا ہو......''

☆...... قابلِ غور ہے یہ بات کہ وہ، معاشرہ جسے ''خیر القرون'' کے نام سے یاد کیا گیا، تمام انسانی تاریخ میں بہترین معاشرہ، جہاں خود رسول اللہ ﷺ کا وجودِ مسعود تھا، آپؐ کا وہ مبارک زمانہ، وہ عہدِ نبوی، اس بے مثال اور اس مبارک ترین معاشرے میں جس کو سبھی چھوڑ دیں، اور جس سے سبھی منہ موڑ لیں، جس سے کوئی بات نہ کرے، جسے کوئی سلام کا جواب تک نہ دے...... ظاہر ہے کہ یہ کتنی بڑی آزمائش تھی...... یونہی وقت گذرتا رہا، حتیٰ کہ ان تینوں کو یہ زمین اپنی تمامتر کشادگی کے باوجود اپنے لئے تنگ محسوس ہونے لگی...... اور پھر اس سے بھی بڑھ کر نوبت یہاں تک جا پہنچی...... کہ انہیں خود اپنا وجود اپنے لئے بوجھ

محسوس ہونے لگا......ان کی اسی کیفیت کو قرآن کریم میں اس طرح بیان کیا گیا ہے:

﴿وَضَاقَت عَلَيهِمُ الأرضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ عَلَيهِمْ أنفُسُهُمْ ......﴾ (۱)

یعنی ''یہاں تک جب یہ زمین اپنی تمام وسعتوں کے باوجود ان پر تنگ ہوگئی، اور ان کی زندگیاں ان پر دوبھر ہوگئیں......''

یوں یہ تینوں خود اپنوں کے درمیان، اپنے ہی شہر میں اجنبی بن کر رہ گئے......اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ خود اپنی ذات سے اجنبی ہو گئے......اپنے آپ سے بیگانے ہو گئے......

☆ ......اور پھر جب اسی کیفیت میں چالیس دن گذر گئے، تو رسول اللہ ﷺ نے ان تینوں کو یہ حکم دیا کہ اپنی بیویوں سے علیحدہ ہو جائیں......اور ان سے ترکِ تعلق کر لیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بھیجا ہوا قاصد یہ حکم لئے ہوئے حضرت کعب بن مالکؓ کے پاس پہنچا، اور آپؐ کی طرف سے یہ حکم سنایا: اِنّ النّبِيّ ﷺ يَأمُرُكَ أن تَعتَزِلَ اِمْـرَأتَك...... یعنی ''رسول اللہ ﷺ نے آپ کیلئے یہ حکم بھجوایا ہے کہ آپ اپنی بیوی سے دوری اختیار کر لیجئے......'' تب انہوں نے اس قاصد سے دریافت کیا ''کیا میں اسے طلاق دے دوں؟ یا کیا کروں؟'' اس پر قاصد نے آپؐ کی طرف سے وہی پیغام دہرایا، بعینہٖ وہی الفاظ دہرائے، اپنی طرف سے کوئی مطلب بیان نہیں کیا، کوئی خودساختہ تشریح پیش نہیں کی، کوئی تاویل نہیں کی، بلکہ مکمل امانت و دیانت کے ساتھ وہی الفاظ دہرائے جو رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمائے تھے۔

یہ حکم موصول ہونے کے بعد حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنی اہلیہ سے کہا: اِلْحَقِي بأهلِك یعنی ''اپنے میکے چلی جاؤ......'' اور تب وہ اپنے میکے چلی گئیں، اور یوں ان کیلئے یہ

(۱) سورۃ التوبہ/ براءۃ [۱۱۸]

آزمائش اب بہت زیادہ شدت اختیار کر گئی، کیونکہ اب گھر بھی ویران ہو چکا تھا۔

☆......ان دنوں اپنی کیفیت بیان کرتے ہوئے کعب بن مالکؓ فرماتے ہیں:

''جب نوبت یہاں تک جا پہنچی تو میرے دونوں ساتھی (ہلال بن امیہ اور مُرارۃ بن الربیع) تو بس اپنے اپنے گھر میں بند ہو کر بیٹھ گئے جہاں وہ سارادن روتے رہتے تھے...... جبکہ میں تو ان کی بنسبت کافی جوان' باہمت' اور حوصلہ مند تھا، لہٰذا گھر میں بند ہو کر بیٹھ جانے اور گریہ وزاری میں اپنے شب وروز بسر کرنے کی بجائے میں گھومتا پھرتا تھا، ہر نماز کے وقت مسجد بھی جاتا اور وہاں دیگر تمام نمازیوں کے ساتھ باجماعت نماز بھی پڑھا کرتا تھا، میں (فرائض کے بعد سنتیں پڑھتے وقت) نماز کے دوران کن اکھیوں سے چوری چوری رسول اللہ ﷺ کی جانب دیکھا کرتا تھا، تب میں محسوس کرتا کہ آپؐ میری جانب دیکھ رہے ہیں......لیکن جونہی میں سلام پھیرتا' آپؐ اپنا چہرہ دوسری جانب موڑ لیتے......

پھر مسجد سے نکلنے کے بعد بازاروں میں گھومتا پھرتا، لوگوں کو دیکھتا، ان کے قریب جاتا، اس امید کے ساتھ کہ شاید کوئی مجھ سے بات کرے، لیکن کوئی بھی مجھ سے بات نہ کرتا، اس لئے کہ یہ تو رسول اللہ ﷺ کا حکم تھا، اور وہ سبھی حضرات رسول اللہ ﷺ کے ہر حکم کی تعمیل ضروری سمجھتے تھے......

ایک روز جب اسی کیفیت میں میں مدینہ کے کسی بازار میں چلا جا رہا تھا، لوگوں کی طرف سے یہ بے رخی اب میرے لئے قطعی ناقابلِ برداشت ہوتی جا رہی تھی......آخر چلتے چلتے میں ابوقتادہ کے باغ تک جا پہنچا، جو کہ میرے چچازاد بھائی تھے' نیز ہم میں آپس میں بہت زیادہ محبتیں اور قربتیں تھیں، میں نے دیوار کے اوپر سے جھانک کر دیکھا تو مجھے وہاں ابوقتادہ نظر آئے، میں نے انہیں سلام کیا......مگر اللہ کی قسم......انہوں نے میرے سلام کا جواب

تک نہیں دیا......(۱)

میں نے ابوقتادہؓ کو اللہ کی قسم دے کر کہا ''کیا تم نہیں جانتے کہ مجھے اللہ اور اس کے رسولؐ سے بہت زیادہ محبت ہے؟''لیکن انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، میں نے دوسری بار یہی سوال دہرایا، تب بھی انہوں نے کوئی جواب نہیں دیا، حالانکہ وہ میرے بارے میں خوب اچھی طرح جانتے تھے کہ مجھے واقعی اللہ اور اس کے رسول سے بہت زیادہ محبت ہے، تب میں نے تیسری بار قسم دے کر پھر یہی سوال دہرایا، جس پر انہوں نے فقط اتنا کہا ''اللہ ورسولہ اعلم''یعنی یہ تو اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں'' تب میری آنکھوں سے آنسو بہنے لگے......''

(یعنی کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو مسلسل گذشتہ کئی روز سے سبھی لوگوں کی طرف سے ترکِ تعلق کا جو سامنا تھا، اور دوسرے دونوں حضرات (ہلال بن امیہ اور مُرارۃ بن الربیع) کے برعکس ابتک وہ اس صورتِ حال کو برداشت کرتے چلے آرہے تھے، نماز بھی مسجد میں حاضر ہو کر باجماعت ادا کیا کرتے تھے، بازاروں میں بھی گھوما پھرا کرتے تھے اس امید پر کہ شاید کوئی مجھ سے بات کرے......الغرض اس کیفیت کے باوجود ابتک یہ نفسیاتی صدمہ

(۱) حضرت ابوقتادہ انصاری رضی اللہ عنہ نے سلام کا جواب تک نہیں دیا......حالانکہ انہیں یہ بات خوب معلوم تھی کہ کعبؓ کس قدر نفسیاتی صدمے سے دوچار ہیں، سبھی نے انہیں چھوڑ رکھا ہے، قطعِ تعلق کر رکھا ہے، کتنے ہی دن اسی کیفیت میں گذر چکے ہیں، مزید یہ کہ ان دونوں میں باہم کس قدر قریبی رشتہ تھا، کتنا گہرا تعلق تھا، کس قدر محبتیں تھیں، لیکن اس سب کچھ کے باوجود......سلام کا جواب تک نہیں دیا...... کیونکہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہی حکم تھا، اللہ اور رسولؐ کے دین کے معاملے میں......نیز اللہ اور رسولؐ کے کسی بھی حکم کے معاملے میں کسی کے ساتھ ذرہ برابر رعایت برتنے کی کوئی گنجائش نہیں، اللہ کے دین کے معاملے میں تمام تعلقات ہیچ تھے، ان کی نظر میں ہر وہ تعلق اور ہر وہ رشتے داری بے معنیٰ اور بے حیثیت تھی جس سے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے کسی حکم کی خلاف ورزی ہوتی ہو......یہی ان کی سوچ تھی......اور اسی کے مطابق ان سبھی کا عمل بھی تھا۔

ایک حد کے اندر تھا، لیکن آج جب چچازاد بھائی کے ساتھ انہیں اس صورتِ حال سے دوچار ہونا پڑا...... تو اب دل ٹوٹ گیا...... اور ابتک انہوں نے اپنے دل میں درد کا جو ایک سمندر چھپا رکھا تھا...... اب وہ آنسو بن کر بہنے لگا......)

☆......اس کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اس باغ سے واپس چل دیئے...... چلتے چلتے دوبارہ مدینہ کے اسی بازار میں پہنچ گئے، وہی اداسی کی کیفیت طاری تھی، اسی کیفیت میں افسردہ و رنجیدہ چلے جارہے تھے کہ اچانک ان کے کان میں کسی کی آواز پڑی، کوئی ''نبطی'' یعنی شامی شخص تھا (واضح ہو کہ ملکِ شام اُس وقت سلطنتِ روم کا حصہ تھا، یعنی بالفاظِ دیگر یہ ''رومی'' شخص تھا) جو ہر راہ گیر کو روک روک کر اس سے پوچھتا پھر رہا تھا کہ ''کعب بن مالک کے بارے میں کوئی مجھے بتائے، ان سے ملاقات کہاں اور کس طرح ہو سکے گی؟''

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''میں نے اسے بتایا کہ میں ہی کعب بن مالک ہوں، تب اس نے مجھے ایک خط تھمادیا، جو کہ میرے نام رومیوں کے بادشاہ کی طرف سے تحریر کردہ تھا، میں نے وہ خط پڑھنا شروع کیا، اس کا مضمون کچھ اس طرح تھا ''ہمیں خبر ملی ہے کہ آپ کے ساتھی (یعنی رسول اللہ ﷺ) نے آپ کے ساتھ بڑی زیادتی اور ناانصافی کی ہے، جبکہ آپ جیسے لائق و فائق اور قابل ترین انسان کی یہ ناقدری اور بے توقیری کسی صورت مناسب نہیں ہے، لہٰذا آپ کیلئے ہماری طرف سے یہ پیغام ہے کہ آپ یہ ذلت و ناقدری کی زندگی چھوڑ کر ہمارے پاس چلے آیئے، یہاں ہر طرح آپ کی عزت افزائی اور قدردانی کی جائیگی اور آپ کے عین شایانِ شان سلوک روا رکھا جائے گا''(۱) (حاشیہ آئندہ صفحے پر......)

حضرت کعب بن مالکؓ مزید فرماتے ہیں ''یہ خط پڑھتے ہی میری زبان سے بے اختیار یہ الفاظ نکلے: وھٰذہٖ مِن البَلَاء...... یعنی ''اب یہ ایک اور آزمائش آ کھڑی ہے'' تب میں نے فوراً ہی بغیر کسی تاخیر کے اس خط کو وہاں قریب ہی موجود ایک تندور میں پھینک دیا'' (۱)

☆......اس کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ مزید فرماتے ہیں:

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۱) یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ اہلِ حق کو راہِ حق سے برگشتہ کرنے کی غرض سے اہلِ باطل کس طرح ہمہ وقت نظر رکھتے ہیں، موقع کی تلاش میں رہتے ہیں...... انہیں ورغلانے کیلئے کیا کیا چالیں چلتے ہیں اور کیسے کیسے جال بچھاتے ہیں...... لہٰذا اہلِ حق کو اس سلسلے میں ہمہ وقت انتہائی باخبر اور چوکنا رہنے کی اشد ضرورت ہے۔

حاشیہ صفحہ ہذا:

(۱) یہ بات غور طلب ہے کہ وہ شخص جسے اپنوں کی طرف سے قطعِ تعلق، بے رخی، اور بیزاری کا سامنا ہو، تمام شہر مدینہ میں کوئی اس کے ساتھ بات چیت تک کرنے کا روادار نہو، جو خود اپنے ہی شہر میں اجنبی بن کر رہ گیا ہو، خود اپنے ہی گھر میں خود کو پردیسی محسوس کرنے لگا ہو، اس تکلیف اور اس صدمے کی وجہ سے جس کا دل شب و روز خون کے آنسو روتا ہو...... ایسے میں ایک اتنے بڑے بادشاہ کی طرف سے ازخود اس پیشکش کا موصول ہونا...... کہ تم ہمارے پاس چلے آؤ، ہم تمہاری خوب قدر کریں گے، ہر طرح تمہارا خیال رکھیں گے...... ظاہر ہے کہ ایسے میں ایمان پر اور راہِ حق پر ثابت قدم رہنا بہت بڑی آزمائش ہی تھی......

کوئی اور شخص ہوتا تو اس نادر موقع کو غنیمت جانتا، اور اس پیشکش سے جلد از جلد بھرپور فائدہ اٹھانے کی پوری کوشش کرتا...... لیکن حضرت کعب بن مالکؓ کا اس موقع پر ردِ عمل اور اندازِ فکر یہ تھا کہ اس پیشکش کو غنیمت جاننے اور اس پر خوشی منانے کی بجائے انہوں نے اسے اپنے لئے ایک اور بڑی آزمائش سمجھا...... اور جلد از جلد اس سے نجات حاصل کرنے کی غرض سے اس خط کو تندور میں جلا کر راکھ کر ڈالا، تاکہ ابھی فوری طور پر یہ دروازہ ہمیشہ کیلئے بند ہو جائے، اور اس کا کوئی اثر اور نام و نشان بھی باقی نہ رہے...... تاکہ آئندہ کبھی کسی فتنے کا سبب نہ بن سکے......

ظاہر ہے کہ یہ اندازِ فکر اور یہ طرزِ عمل صرف وہی شخص اپنا سکتا ہے جس کے دل میں یقین بہت زیادہ راسخ ہو، جس کا دل ایمان کے نور سے جگمگا رہا ہو، اور جس کا دل ہر قسم کے شک و شبہہ سے مکمل پاک ہو...... اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی ایمانی کیفیت یقیناً ایسی ہی تھی۔

''جب دس دن مزید گذر گئے (یعنی چالیس دن پہلے......اوراب مزید دس دن، یوں جب کُل پچاس دن گذر چکے) توایک روز جب میں اپنے گھر کی چھت پر نمازِ فجر پڑھنے کے بعد بیٹھاہواتھا(۱) تواچانک مجھے کسی کی آواز سنائی دی، جو بآوازِ بلند یوں پکار رہاتھا: یا کعب بن مالك أبشِر...... یعنی''اے کعب بن مالک! آپ کیلئے بڑی خوشخبری ہے......''تب میں فوراًہی اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوگیا،اور میں سمجھ گیا کہ میرے لئے اس آزمائش سے نجات کاوقت اب آچکاہے(یعنی انہوں نے سوچا کہ باقی تمام تفصیل بعد میں پتہ چلتی رہیگی، فی الحال فوری طور پربس اللہ کے سامنے سجدہ ریز ہوگئے)''

عین اسی وقت تین الگ الگ گھڑسوار بھی خوشخبری لئے ہوئے مسجدِنبوی سے اپنی اپنی منزل کی جانب روانہ ہوئے،ایک کعب بن مالک کے گھر کی طرف،دوسراہلال بن امیہ' اور تیسرامرارۃ بن الربیع (رضی اللہ عنہم اجمعین) کے گھر کی طرف......

چنانچہ تھوڑی ہی دیر میں وہ گھڑسوار کعبؓ کے گھر جاپہنچا......لیکن وہ شخص جو کہ پہلے ہی بڑی ہی بےچینی اور بےقراری کے عالم میں دور سے ہی پکارتاہوا......اور بآوازِ بلند یا کعب بن مالك أبشر...... کی صدالگاتاہواپیدل چلاآرہاتھا......اس کی یہ صدااُس گھڑسوار سے پہلے پہنچ گئی تھی،اور یوں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ تک یہ عظیم ترین خوشخبری

(۱) یعنی ابتداء میں تو کافی دنوں تک کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہرنماز مسجد میں حاضر ہوکر سبھی مسلمانوں کے ساتھ باجماعت ادا کرتے رہے،لیکن جب وہاں مسجد میں' نیز آمدورفت کے دوران تمام راستے میں کوئی ان سے سلام وکلام نہ کرتا......حتیٰ کہ ان کے چچازاد بھائی نے بھی ان کے سلام کاجواب تک نہیں دیا،تو یہ چیزان کیلئے مزید صدمے کاباعث بننے لگی......جب بھی یہ گھر سے باہر نکلتے اور یہی صورتِ حال پیش آتی،تو صدمہ تازہ ہوجاتا......تب انہوں نے آخری دنوں میں گھر سے نکلنا چھوڑدیا،نماز بھی گھر میں ہی پڑھنے لگے۔اورتب ایک روزنمازِ فجر کے بعد جب یہ اپنے گھر کی چھت پر بیٹھے ہوئے تھے تو ایسے میں یہ واقعہ پیش آیا......

سب سے پہلے اُسی شخص کے ذریعے پہنچی، لہٰذا جب وہ ان تک پہنچا تو انہوں نے فرطِ مسرت کی وجہ سے' اوراپنے جذبات سے مغلوب ہوکر' اپناوہ لباس جواس وقت انہوں نے پہن رکھا تھا......بطورِانعام اس شخص کودے دیا......اورخود پڑوسیوں سے دوسرے کپڑے مانگ کر پہن لئے......

مقصد یہ کہ اُس وقت فوری طور پرانہیں جوکچھ میسر تھاوہ اس خوشخبری لانے والے کوبطورِ انعام پیش کردیا، کیونکہ وہ اس قدر عظیم خوشخبری لایا تھا کہ اسے انعام دینے میں ذرہ برابر تاخیر انہیں گوارانہیں تھی۔

اورپھر جب اس گھڑسوار قاصد نے بھی یہی خوشخبری سنائی تو یہ چیز حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے مزید مسرت کا باعث بنی، نیز اس موقع پراس قاصد نے یہ پیغام بھی پہنچایا کہ ''اے کعب! رسول اللہ ﷺ مسجد میں آپ کو یادفرمارہے ہیں'' تب حضرت کعبؓ فوری طور پرمسجد کی جانب روانہ ہوگئے، چونکہ یہ خبر بڑی سرعت کے ساتھ تمام شہرمدینہ میں پھیل چکی تھی، لہٰذااس موقع پرانہیں مبارکباد پیش کرنے کی غرض سے ان کے گھر سے مسجد تک پورے راستے میں دونوں جانب لوگوں کا بہت بڑاجمِ غفیر اکٹھا ہوچکا تھا، ہرطرف سے لوگ اُمڈتے چلے آرہے تھے، کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے یہ بہت ہی عظیم شرف اور بڑااعزاز تھا کہ ان کی قبولیتِ توبہ کے بارے میں باقاعدہ قرآن کریم کی آیات نازل ہوئی تھیں......جوکہ اہلِ ایمان تاقیامت پڑھتے رہیں گے......(۱)

(۱) یہ بات قابلِ غور ہے کہ حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جوکہ رسول اللہ ﷺ کے تربیت یافتہ تھے، ان حضرات کے دلوں میں باہم ایک دوسرے کیلئے کس قدر خلوص ومحبت کے جذبات موجزن تھے کہ جس شخص کے علم میں سب سے پہلے یہ خوشخبری آئی' وہ ازخودفوری طور ''ابشر یاکعب بن مالک'' کی صدائیں لگاتاہوامسجد نبوی سے حضرت کعب بن مالکؓ کے گھر کی جانب رواں دواں ہوگیا...... (باقی حاشیہ آئندہ صفحے پر......)

اس کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ مسجد نبوی پہنچے جہاں اُس وقت رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے، نیز آپؐ کے اردگرد بڑی تعداد میں صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی موجود تھے، ان تمام حضرات میں سب سے پہلے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہوکر نہایت گرمجوشی کے ساتھ حضرت کعبؓ کا استقبال کیا، مصافحہ کیا، اور بڑی مسرت کا اظہار کرتے ہوئے پرتپاک انداز میں انہیں مبارکباد پیش کی......

باقی از حاشیہ صفحہ گذشتہ:

اس کے بعد مزید یہ کہ اس یادگار موقع پر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا اتنی بڑی تعداد میں فوج درفوج وہاں جمع ہونا، اور انتہائی والہانہ اور پرجوش انداز میں حضرت کعبؓ کو مبارکباد پیش کرنا، ان کی اس خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا...... ہر کوئی اس موقع پر انتہائی بیتاب اور بے قرار تھا کہ جلد از جلد خوب گرمجوشی کے ساتھ انہیں مبارکباد پیش کر سکے، گویا یہ حضرات ارشادِ ربانی ''انما المؤمنون اخوۃ'' یعنی ''تمام مؤمن بھائی بھائی ہیں'' نیز فرمانِ نبوی ''لایؤمن أحدکم حتیٰ یحب لأخیہ مایحب لنفسہٖ'' یعنی ''تم میں سے کوئی شخص حقیقی مؤمن نہیں ہوسکتا تاوقتیکہ وہ اپنے (مسلمان) بھائی کیلئے بھی وہی چیز پسند کرنے لگے جو چیز وہ خود اپنے لئے پسند کرتا ہے'' کی عملی تفسیر اور جیتی جاگتی تصویر تھے۔

یقیناً اس میں ہمارے لئے بھی یہ بہت اہم سبق ہے کہ اگر کسی کو کوئی نعمت یا خوشی نصیب ہو تو ہمیں اس کی خوشی کو اپنی خوشی سمجھنا چاہئے، اس پر اظہارِ مسرت کرتے ہوئے خوب گرمجوشی کے ساتھ اسے مبارکباد پیش کرنی چاہئے...... بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ہمیں خود موقع کی تلاش اور جستجو میں رہنا چاہئے کہ کسی طرح ہم کوئی ایسا کام کرسکیں جو دوسروں کیلئے باعثِ مسرت بن سکے۔

نیز اس واقعے سے یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جو کوئی خوشخبری لایا ہو، اسے حسبِ توفیق اور مناسبِ حال کوئی ہدیۂ تحفۂ یا انعام وغیرہ سے نوازا جائے، ورنہ کم از کم یہ کہ اس کیلئے دعائے خیر کی جائے، خیرسگالی کے جذبات کا اظہار کیا جائے...... تاکہ اس طرح اس کے احسان کا بدلہ احسان سے دیا جاسکے، نیز اس بات کا عملی اظہار ہوسکے کہ ہمیں اس کے اس اقدام اور اس جذبے کی خوب قدر اور احساس ہے...... نیز یہ کہ جس طرح وہ ہمارا خیرخواہ ہے (تبھی تو خوشخبری لایا ہے) بعینہٖ اسی طرح ہمارے دل میں بھی اس کیلئے خیرخواہی کے جذبات موجزن ہیں۔

اس موقع پر ان کے اس والہانہ انداز کے بارے میں حضرت کعبؓ کے بیٹے عبداللہ اپنے والد کے بارے میں کہتے ہیں: کَانَ لَا یَنسَاھَا لِطَلحَۃ یعنی ''اس موقع پر طلحہ کے اس انداز کو میرے والد زندگی بھر ہمیشہ یاد کرتے رہے''(۱)

☆......حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اُس موقع پر مسجدِ نبوی میں موجود حضرات صحابہؓ

(۱) حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس موقع پر اس قدر گرمجوشی اور والہانہ انداز کے اظہار پر حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ جو اس قدر متأثر ہوئے اس کی متعدد وجوہات تھیں، مثلاً یہ کہ:

(الف) وہ موقع بہت زیادہ یادگار اور جذباتی تھا، لہٰذا اس جذباتی موقع پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کا یہ جذباتی انداز ہمیشہ کیلئے یادگار بن گیا۔

(ب) اس معاشرے میں حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کی بڑی حیثیت تھی، مکی دور میں بھی، اور پھر مدنی دور میں بھی، وہ السابقین الاولین، نیز عشرہ مبشرہ میں سے بھی تھے، لہٰذا اس قدر اہم ترین شخصیت کی طرف سے اس والہانہ انداز کی اپنی جگہ بڑی اہمیت تھی۔

(ج) حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ مہاجرین میں سے تھے، جبکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ انصارِ مدینہ میں سے تھے، اگرچہ اُس مثالی اور ہر قسم کے تعصب سے پاک معاشرے میں مہاجرین وانصار میں کوئی تفریق نہیں تھی، وہ باہم شیر وشکر تھے......لیکن بہرحال یہ حقیقت تو اپنی جگہ موجود تھی کہ ''مہاجرین'' کا تعلق مکہ سے تھا، جبکہ ''انصار'' مدینہ کے باشندے تھے، لہٰذا مہاجرین میں سے ہونے کے باوجود ایک انصاری کیلئے اس قدر گرمجوشی اور والہانہ انداز اختیار کرنا......اس چیز نے حضرت کعب رضی اللہ عنہ کو بطورِ خاص بہت زیادہ متأثر کیا۔

(د) بہت سے علماء ومؤرخین نے اس موقع پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے اس والہانہ انداز کے بارے میں اظہارِ خیال کرتے ہوئے یہ امکان بھی ظاہر کیا ہے کہ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین وانصار میں ''مؤاخات'' کا جو مثالی اور مبارک رشتہ قائم فرمایا تھا، اور اس طرح انہیں باہم ایک لڑی میں پرو دیا تھا......تب آپؐ نے حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ اور حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو ایک دوسرے کا بھائی بنایا تھا......لہٰذا ہوسکتا ہے کہ حضرت کعبؓ کی قبولیتِ توبہ کے اس یادگار موقع پر اسی ''رشتۂ مؤاخاۃ'' کی وجہ سے فطری طور پر حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ حضرت کعب رضی اللہ عنہ کیلئے اس قدر جذباتی ہوگئے تھے۔

واللہ أعلم۔

کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اس جمِ غفیر میں سے گذرتے ہوئے آخر رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، ان یادگارترین لمحات کی منظرکشی کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں: فَلَمّا سَلّمتُ عَلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ وَهُوَ يَبرُقُ وَجهُه مِنَ السُّرُور...... وَكَانَ اِذا سُرّ استَنَارَ وَجهُه كأنّهٗ قِطعَةُ قَمَر ، وَكُنّا نَعرِفُ مِنهُ ذٰلِك ...... یعنی ''میں نے جب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں سلام عرض کیا' اُس وقت آپؐ کا رُخِ انور فرطِ مسرت کی وجہ سے چمک رہا تھا......آپؐ جب کبھی مسرور ہوتے تو آپؐ کا رُخِ انور اس طرح چمک اٹھتا تھا جیسے چاند کا ٹکڑا ہو......آپؐ کے اس مزاج سے ہم سبھی خوب واقف تھے''

اور پھر سلام ودعاء کے اس سلسلے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت کعب بن مالکؓ کو مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: أبشِر بِخَيرِ يَومٍ مَرَّ عَلَيكَ مُنذُ وَلَدَتكَ أُمُّكَ یعنی ''اے کعب! تمہاری پیدائش کے بعد سے ابتک آج کا یہ دن تمہارے لئے سب سے بہترین دن ہے'' (۱)

---

(۱) کیونکہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ودیگر دونوں حضرات (ہلال بن امیہ رضی اللہ عنہ، نیز: مرارۃ بن الربیع رضی اللہ عنہ) کی قبولیتِ توبہ کی خبر بذریعۂ وحی دی گئی، اس بارے میں قرآنی آیات نازل ہوئیں ﴿وَعَلَى الثّلَاثَةِ اللّذينَ خُلِّفُوا ...... ﴾ (سورہ توبہ، آیت: ۱۱۸) یہ قرآنی آیات اہلِ ایمان تا قیامت پڑھتے رہیں گے دنیا کے کونے کونے میں مسجدوں میں' محرابوں میں' گھروں میں' مسلمان تلاوتِ قرآن کے دوران یہ آیات بھی پڑھیں گے......اور ثوابِ دارین کے مستحق قرار پائیں گے......یوں ان تینوں حضرات کا قصہ اور ان کا تذکرہ قیامت تک کیلئے محفوظ ہو گیا، نیز اہلِ ایمان کیلئے موجبِ اجر وثواب اور باعثِ خیر وبرکت بن گیا (بلکہ اس سورت کا نام ''توبہ'' اسی واقعے کی وجہ سے معروف ہوا) لہٰذا ان تینوں حضرات کیلئے ان کی تمام زندگی میں آج کا دن یقیناً سب سے زیادہ مبارک اور بہترین تھا۔

اس کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا ''اے اللہ کے رسول! یہ ہماری توبہ کی قبولیت کی خوشخبری آپ کی طرف سے ہے؟ یا اللہ عزوجل کی طرف سے ہے؟'' (۱)

اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا ''یہ خوشخبری اللہ کی طرف سے ہے''

رسول اللہ ﷺ کی زبان مبارک سے یہ جواب سننے کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ فرطِ مسرت سے مزید جھوم جھوم اٹھے......اور بے اختیار آپؐ کی خدمت میں یوں عرض کرنے لگے ''اے اللہ کے رسول! اللہ کی طرف سے میرے لئے اس اتنی بڑی نعمت (یعنی قبولیتِ توبہ کی خوشخبری) کا اب تقاضا یہ ہے کہ اب میں اپنا تمام مال اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں''

(یعنی چونکہ اپنے اس دنیاوی مال واسباب سے متعلق مسائل ومصروفیات کی وجہ سے ہی میں اس غزوے سے پیچھے رہ گیا تھا، یہی مال میرے لئے اتنی بڑی آزمائش کا سبب بنا، اور اب اللہ کی طرف سے یہ اتنی بڑی خوشخبری آئی ہے، لہٰذا میں چاہتا ہوں کہ اس خوشی کے موقع پر بطورِ شکر اس تمام مال واسباب کو اللہ کی راہ میں صدقہ کردوں کہ جس میں الجھ کر میں اس

(۱) غورطلب ہے یہ بات کہ حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کو اتنی بڑی پریشانی اور طویل آزمائش کے بعد اب یہ اس قدر عظیم خوشخبری نصیب ہوئی تھی......لیکن اس کے باوجود یہ فکر دامن گیر تھی کہ نہ جانے یہ خوشخبری اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے یا نہیں؟

کیونکہ اگر یہ خوشخبری اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہے تو یہ چیز مزید مسرت اور بڑے اعزاز کا باعث ہوگی۔ نیز یہ کہ اسی صورت میں ہی نجات کا اصل اور حقیقی سامان ہو سکے گا......بصورتِ دیگر اگر محض رسول اللہ ﷺ نے اپنی طرف سے ان تینوں کی حالت پر رحم کھاتے ہوئے انہیں یہ خوشخبری سنادی ہو......تو پھر اللہ کے سامنے کیا بنے گا......؟ لہٰذا اس بارے میں مکمل اطمینان اور تسلی کی غرض سے حضرت کعب بن مالکؓ نے یہ استفسار کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! یہ خوشخبری آپ کی طرف سے ہے؟ یا اللہ عزوجل کی طرف سے؟''

اتنی بڑی آزمائش میں پھنس گیا تھا)

اس پر رسول اللہ ﷺ نے جواب میں یوں ارشاد فرمایا: أمسِك عَلَيكَ بَعضَ مَالِكَ ، فَهُوَ خَيرٌ لَكَ ...... یعنی "اپنا کچھ مال اپنے لئے بھی سنبھال کر رکھو، اسی میں تمہارے لئے بہتری ہے"۔

(یعنی پورا مال صدقہ کر دینے کی بجائے کچھ صدقہ کر دو، اور کچھ اپنے لئے رکھ لو، تا کہ کل تمہارے کام آسکے)۔

چنانچہ آپؐ کے اس ارشاد پر عمل کرتے ہوئے حضرت کعب بن مالکؓ نے اپنا کچھ مال فی سبیل اللہ صدقہ کر دیا، جبکہ کچھ مال اپنے لئے رکھ لیا۔(۱)

(۱) اس سے یہ بات واضح وثابت ہوتی ہے کہ انسان کو جب بھی اللہ کی طرف سے کوئی نعمت، کوئی خوشی، کوئی بہتری کوئی ترقی نصیب ہو تو اسے چاہئے کہ اس منعم ومحسن کے ساتھ اپنا تعلق مزید مضبوط ومستحکم کرے، اس کی اطاعت وفرمانبرداری کی مزید فکر وجستجو کرے۔ نیز یہ کہ بطورِ شکر اس کی راہ میں کچھ صدقہ وخیرات بھی کرے...... جس طرح حضرت کعب بن مالکؓ نے اس خوشی کے موقع پر اللہ کی راہ میں اپنا مال صدقہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا، جس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس چیز سے منع نہیں فرمایا، بلکہ اس کی اجازت دی۔

(۲) نیز حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ودیگر دونوں حضرات (ہلال بن امیہ اور مرارۃ بن الربیع رضی اللہ عنہما) کے ساتھ پیش آنے والے اس تاریخی واقعے میں تمام دنیائے انسانیت اور بالخصوص امتِ مسلمہ کیلئے تاقیامت جو اہم ترین سبق اور پیغام پوشیدہ ہے، وہ ہے "صدق کی فضیلت واہمیت" کیونکہ ان تینوں حضرات کو اس موقع پر "سچ" بولنے کی بدولت ہی یہ عظیم مقام ومرتبہ نصیب ہوا، جبکہ بڑی تعداد میں منافقین نے اس موقع پر جھوٹ بول کر وقتی طور پر اگرچہ جان تو چھڑا لی، لیکن اللہ کی عدالت میں ان کا کیا بنے گا؟

اس سے یہی بات واضح ہوئی کہ "سچ" کا دامن تھامے رکھنے میں ہی انسان کیلئے دونوں جہانوں میں صلاح وفلاح کا اور نجات کا راز پوشیدہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۃ توبہ کی یہ آیات جن میں ان تینوں حضرات کی قبولیتِ توبہ کا تذکرہ ہے، ان آیات کے فوری بعد اگلی ہی آیت میں اہلِ ایمان کو "سچ" کا دامن تھامے رکھنے کی تاکید وتلقین کی گئی ہے: ﴿يَاأَيّهَا اللّذينَ آمنوا اتّقُوا اللّهَ وَكُونُوا مَعَ الصّادِقِين﴾ (سورہ توبہ:۱۱۹)

☆......انصارِ مدینہ سے تعلق رکھنے والے یہ جلیل القدر صحابی حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ ہجرتِ مدینہ سے کچھ قبل یعنی نبوت کے تیرہویں سال ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے موقع پر مسلمان ہوئے تھے، یوں یہ ان عظیم ترین اور انتہائی خوش نصیب انسانوں میں سے تھے جن کی طرف سے اس بیعت کے موقع پر دعوت اور پرزور اصرار کے نتیجے میں ہی رسول اللہ ﷺ و دیگر مسلمانوں کی مکہ سے مدینہ کی طرف ہجرت کا یادگار واقعہ پیش آیا تھا، اور پھر یہی واقعۂ ''ہجرتِ مدینہ'' ہی روئے زمین پر اولین اسلامی ریاست کے قیام کا 'اور بہت ہی وسیع پیمانے پر مشرق و مغرب میں چہار سو اسلامی فتوحات کا پیش خیمہ ثابت ہوا تھا......

ہجرتِ مدینہ سے چند ماہ قبل دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ برحق قبول کرنے کے بعد سن ۹ ہجری میں غزوۂ تبوک کے تاریخی موقع پر حضرت کعبؓ اتنی بڑی آزمائش سے دوچار ہوئے، اور پھر بتوفیقِ الٰہی ''سچ'' کا دامن تھامے رکھنے کی وجہ سے ان کیلئے من جانب اللہ قبولیتِ توبہ کا اعلان ہوا......

اس کے بعد وقت کا سفر جاری رہا......رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے خلفائے راشدین کا دور بھی دیکھا، آخری عمر میں یہ مدینہ سے ملکِ شام منتقل ہو گئے تھے، جہاں انہوں نے مستقل رہائش اختیار کر لی تھی، آخر وہیں ملکِ شام میں ہی ۵۰ھ میں ۷۷ سال کی عمر میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔

الحمد للہ آج بتاریخ یکم/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۱/ جنوری ۲۰۱۵ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ:

ہجرتِ مدینہ کے بعد ابھی محض دوسرا سال ہی چل رہا تھا کہ مشرکینِ مکہ مسلمانوں کو نیست و نابود کر ڈالنے کی غرض سے اپنے لشکرِ جرار سمیت آدھمکے تھے، تب ایک روز مدینہ شہر سے کچھ باہر "بدر" کے مقام پر مشرکین کے اس لشکر کو روکنے کی خاطر مسلمان اپنی صفیں درست کرنے میں مشغول تھے، اور جب یہ کام ہو چکا، صفیں درست ہو چکیں، تب آخری لمحات میں رسول اللہ ﷺ اس لشکر پر اور ان صفوں پر "آخری نگاہ" ڈال رہے تھے، تاکہ خوب اطمینان کر لیا جائے کہ سب کچھ درست ہے، نیز یہ کہ ہر کوئی اپنی مناسب جگہ پر موجود ہے۔ رسول اللہ ﷺ اُس وقت بدر کے میدان میں مسلمانوں کے جس لشکر پر اطمینان کی غرض سے "آخری نگاہ" ڈال رہے تھے' درحقیقت یہ وہ "پہلا لشکر" تھا جو کچھ ہی دیر بعد آپؐ کی زیرِ قیادت مشرکینِ مکہ سے ٹکر لینے والا تھا، دینِ اسلام کا سورج طلوع ہونے کے بعد یہ اولین' تاریخی' اور ہمیشہ کیلئے فیصلہ کن معرکہ پیش آنے والا تھا، وہ معرکہ جس پر آئندہ ہمیشہ کیلئے امتِ مسلمہ کی بقاء کا انحصار تھا...... یہی وجہ تھی کہ خود رسول اللہ ﷺ اس نازک ترین موقع پر بار بار اپنے دونوں ہاتھ بلند کر کے اپنے رب سے مناجات اور دعاء و فریاد کرتے ہوئے یہ الفاظ دہرا رہے تھے کہ "اے اللہ! آج اگر یہ تیرے مٹھی بھر مسلمان بندے مارے گئے، تو پھر آج کے بعد قیامت تک تیری اس زمین پر تیرا نام لیوا کوئی نہیں ہوگا"

آپؐ اس موقع پر انتہائی گڑگڑا کر' اور اس قدر بیتابی کے ساتھ دعاء و مناجات میں مشغول تھے' نیز بار بار اپنی زبانِ مبارک سے یہی کلمات دہرا رہے تھے' اور بڑی ہی بیقراری کی کیفیت میں آپؐ بار بار اپنے دونوں ہاتھ فضاء میں اس قدر بلند فرماتے...... کہ آپؐ کے

کندھے پر رکھی ہوئی چادر بار بار پیچھے زمین پر گر جاتی......حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ چادر اٹھا کر آپؐ کے کندھوں پر ڈالتے......اور پھر تھوڑی ہی دیر میں وہ چادر دوبارہ زمین پر گر جاتی...... مسلسل یہی کیفیت جاری تھی......

ایسے میں ایک بار اسی دعاء وفریاد کے دوران جب آپؐ نے اتفاقاً پلٹ کر اپنے ساتھیوں کی جانب نگاہ ڈالی......تو سامنے ایک بالکل ہی نوعمر لڑکے کو کھڑا ہوا پایا......جو کہ آپؐ کے ساتھ کچھ بات کرنا چاہتا تھا، کچھ کہنا چاہتا تھا، اس لڑکے کی عمر ابھی تیرہ سال مکمل نہیں ہوئی تھی، تیرہواں سال چل رہا تھا، اس کے انداز سے سمجھداری' خوب دانشمندی' اور فہم وفراست جھلک رہی تھی، اس کے سراپا سے اور حلئے سے خاندانی شرافت ونجابت ظاہر ہو رہی تھی۔

اس نوجوان نے اپنے ہاتھ میں چمکتی ہوئی تلوار تھام رکھی تھی، دیکھنے والوں کو یہ منظر بڑا ہی عجیب محسوس ہو رہا تھا، کیونکہ اس کی یہ تلوار خود اس کے اپنے قد سے بھی بڑی تھی......

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ جب اس نوعمر پر پڑی تو اس نے موقع غنیمت جانا، اور آپؐ کے قریب پہنچ کر بڑی ہی معصومیت کے ساتھ یوں کہنے لگا "اے اللہ کے رسول! میں آپ پر قربان، مجھے اجازت مرحمت فرمایئے کہ میں آپ کے جھنڈے تلے اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر دشمنوں کے خلاف لڑی جانے والی اس اولین جنگ میں شرکت کر سکوں"

اس کی معصومیت اور یہ بیساختہ پن دیکھ کر......نیز اس کی یہ برجستہ گفتگو سن کر......آپؐ بہت زیادہ متأثر ہوئے، اور شفقت بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھنے لگے، اور پھر پیار سے اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے آپؐ نے اس وقت اسے واپس چلے جانے کی ہدایت کی، اور تسلی دیتے ہوئے یوں فرمایا "برخوردار! ابھی تم بہت چھوٹے ہو، البتہ آئندہ

کبھی یہ موقع تمہیں ضرور ملے گا''۔

تب یہ نوعمر لڑکا نہایت اداس اور غمگین......اپنی تلوار زمین پر گھسیٹتا ہوا واپس چل دیا، رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت حق و باطل کے درمیان اس اولین معرکے کے موقع پر شرکت کے عظیم شرف سے محرومی پر وہ کافی افسردہ تھا......

اور جب وہ اسی کیفیت میں بوجھل قدموں کے ساتھ وہاں سے واپس روانہ ہو رہا تھا' تب لوگوں نے دیکھا کہ اس کے ہمراہ اسی طرح بوجھل قدموں کے ساتھ ایک عورت بھی چل دی، جو کہ اس نوعمر لڑکے کی ماں تھی، جس کا نام ''نوار بنت مالک'' (رضی اللہ عنہا) تھا، دراصل وہی اپنے اس نوعمر نورِ نظر کو لئے ہوئے مدینہ سے سفر کرتی ہوئی یہاں ''بدر'' کے مقام پر پہنچی تھی، تاکہ اس کا یہ نوعمر بیٹا رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے حق و باطل کے درمیان اس اولین معرکے میں شرکت کے شرف سے سرخرو ہو سکے۔

لیکن اب وہاں سے واپس جاتے ہوئے وہ سوچ رہی تھی کہ کاش اگر آج میرا شوہر زندہ ہوتا تو وہ بھی اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر دیگر مسلمانوں کے شانہ بشانہ رسول اللہ ﷺ کے جھنڈے تلے یہاں اس اولین معرکے کے موقع پر موجود ہوتا......لیکن وہ تو یہ موقع آنے سے پہلے ہی اس دنیا سے منہ موڑ گیا......لہٰذا اگر وہ نہیں' تو کاش میں اپنے اس بیٹے کو ہی اس مقام پر دیکھ سکتی......لیکن رسول اللہ ﷺ نے تو اسے اس کی کمسنی کے باعث لوٹا دیا......

انہی سوچوں میں گم ماں بیٹا دونوں ''بدر'' کے مقام سے سفر کرتے ہوئے واپس مدینہ میں اپنے گھر پہنچے۔

رسول اللہ ﷺ نے اس نوعمر لڑکے کو میدانِ جنگ سے لوٹاتے وقت اگرچہ یہ کہتے ہوئے تسلی تو دی تھی کہ ''ابھی تم چھوٹے ہو' البتہ آئندہ کبھی تمہیں ضرور موقع دیا جائے گا''، لیکن اس کے

باوجود وہاں سے واپسی پر وہ کافی اداس تھا......

آخر اس کے ذہن میں ایک نیا خیال آیا، وہ یہ کہ "میدان جنگ سے تو اگرچہ مجھے میری کمسنی کے باعث لوٹا دیا گیا، لیکن کیوں نہ میں دینِ اسلام کی سر کی بلندی کی خاطر، نیز پیغمبرِ اسلام کی خدمت اور صحبت و معیت کے شرف سے ہمکنار رہونے کی خاطر......میدانِ جنگ کی بجائے کوئی دوسرا میدان تلاش کروں، جہاں عمر کا مسئلہ آڑے نہ آئے، اور میری یہ کمسنی رکاوٹ نہ بن سکے......"

آخر غور و فکر کے بعد اس نے یہ فیصلہ کیا کہ "میدانِ جنگ" کی بجائے "علم و معرفت" کے میدان میں دینِ اسلام کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیا جائے، اور اس مقصد کیلئے اس نے سوچا کہ "میں شب و روز رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہوں گا، آپؐ کے روزانہ کے معمولاتِ زندگی میں آپؐ کی خدمت بھی انجام دوں گا، نیز اٹھتے بیٹھتے ہمہ وقت آپؐ سے اللہ کے دین کا علم بھی حاصل کر سکوں گا"

تب اس نے اپنی ماں کے سامنے اپنی اس نئی خواہش کا اظہار کیا، ماں نے جب بیٹے کی زبانی یہ بات سنی تو اسے بے حد مسرت ہوئی، اور اسے یہ بات بہت زیادہ پسند آئی، لیکن پھر جلد ہی وہ یہ سوچ کر پریشان ہونے لگی کہ کہیں اس بار بھی رسول اللہ ﷺ اس کے لختِ جگر کو واپس نہ لوٹا دیں......لہٰذا اس بار اس خاتون نے اپنے خاندان کے ایک معزز شخص کو بھی اپنے ہمراہ لیا، اور یوں یہ تینوں افراد ایک روز رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے، اور وہاں پہنچنے کے بعد نہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا "اے اللہ کے رسول! یہ ہمارا بچہ ہے "زید بن ثابت" اللہ کی کتاب میں سے سترہ سورتیں اسے زبانی یاد ہیں، نیز یہ کہ یہ وہ سترہ سورتیں بالکل اسی طرح درست پڑھتا ہے جس طرح اللہ کی طرف

سے آپ کے قلبِ مبارک پر نازل کی گئی ہیں''

یہ بات سننے کے بعد رسول اللہ ﷺ نے نہایت مسرت کا اظہار فرمایا، نیز اس نوعمر کو دعائے خیر و برکت سے بھی نوازا۔

اور پھر قدرے توقف کے بعد وہ دونوں (یعنی اس نوعمر لڑکے کی ماں' نیز اس کے خاندان کا وہ معزز شخص) یوں کہنے لگے''اے اللہ کے رسول! اس کے علاوہ اس لڑکے میں بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ یہ کافی سمجھدار ہے، لکھنا پڑھنا بھی جانتا ہے......''

اور پھر ڈرتے ڈرتے عرض کیا''دراصل یہ آپ کی خدمت میں رہنا چاہتا ہے، تاکہ اس طرح اسے آپ کی خدمت کا شرف بھی نصیب ہو سکے، نیز یہ کہ یہ آپ سے اللہ کے دین کا علم بھی حاصل کر سکے''

تب رسول اللہ ﷺ نے اس نوعمر کی جانب بغور دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا''برخوردار! تمہیں اللہ کی کتاب میں سے جو کچھ یاد ہے' اس میں سے کچھ ہمیں بھی سناؤ''

تب اس نے قرآن کریم کی تلاوت شروع کی، اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے یہ بات محسوس فرمائی کہ واقعی اس نوعمر لڑکے کا تلاوتِ قرآن کا انداز بہت ہی عمدہ اور دلنشین ہے، اس کے ہونٹوں سے نکلتے ہوئے قرآنی کلمات چمکتے ہوئے خوبصورت موتیوں کی مانند محسوس ہو رہے تھے، مزید یہ کہ اس کی تلاوت کے انداز سے یوں محسوس ہو رہا تھا کہ گویا یہ کلمات محض اس کی زبان سے ہی نہیں' بلکہ دل کی گہرائیوں سے نکل رہے ہوں، نیز یہ کہ جو کچھ وہ اپنی زبان سے پڑھ رہا ہے' اس کے معنیٰ و مفہوم سے وہ خوب واقف بھی ہے، اور پھر یہ کہ اس پر اس کا خوب مضبوط و مستحکم ایمان بھی ہے، اور اس کلامِ الٰہی کے ساتھ اس کا بہت زیادہ جذباتی تعلق اور والہانہ لگاؤ بھی ہے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے اس نوعمر لڑکے کی زبانی تلاوتِ قرآن سننے کے بعد بڑی مسرت کا اظہار فرمایا، اور پھر فوری طور پر ہی اسے اپنی صحبت میں رہنے کی اجازت بھی مرحمت فرمادی...... یوں اس نوعمر لڑکے کو اب ہمیشہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی ''حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ'' کے نام سے پکارا جانے لگا......

اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو ''یہود'' کی زبان سیکھنے کی تاکید فرمائی، کیونکہ اُس دور میں مدینہ اور اس کے مضافات میں یہود بڑی تعداد میں آباد تھے، وہ عربی بھی بولتے تھے، اور اپنی زبان ''عبرانی'' بھی بولا کرتے تھے، البتہ ان کی تحریریں اور خط وکتابت کے تمام سلسلے ان کی اپنی زبان یعنی ''عبرانی'' میں ہی ہوا کرتے تھے، رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی مختلف معاملات میں ان کا خط وکتابت کا سلسلہ چلتا رہتا تھا، یہی وجہ تھی کہ آپؐ نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہود کی زبان سیکھنے کی تاکید فرمائی تھی۔

چنانچہ آپؐ کی طرف سے اس حکم کی تعمیل کرتے ہوئے حضرت زیدؓ نے بڑی سرگرمی اور مکمل توجہ کے ساتھ یہود کی زبان سیکھنا شروع کی، اور خوب محنت کرتے ہوئے مختصر عرصے میں ہی عبرانی زبان پر تقریر وتحریر دونوں لحاظ سے ہی خوب عبور حاصل کرلیا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ جب کبھی ان یہودِ مدینہ کے ساتھ کوئی خط وکتابت کرنا چاہتے، یا یہود کی طرف سے اگر کوئی خط موصول ہوتا، تو ایسے موقع پر یہ نوجوان زید بن ثابتؓ ترجمے کا کام انجام دیا کرتے، یوں حضرت زید بن ثابتؓ اب رسول اللہ ﷺ کے ''مترجم'' کی حیثیت سے پہچانے جانے لگے۔

اسی کیفیت میں جب کچھ وقت گذر چکا......رسول اللہ ﷺ کو زید بن ثابتؓ کی فہم وفراست'

لیاقت وقابلیت، اورسب سے بڑھ کر یہ کہ ان کی امانت ودیانت پرخوب یقین اور مکمل بھروسہ ہوگیا......تب آپؐ نے ان دنیاوی اور زمینی معاملات کے علاوہ مزید یہ کہ ''آسمانی امانت'' بھی ان کے حوالے کردی، یعنی آسمان سے نازل ہونے والی قرآنی آیات کی کتابت کا مقدس ترین فریضہ بھی ان کے سپرد فرمادیا، یوں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اب آپؐ کے مترجم (یا ترجمان) سے بڑھ کر مزید یہ کہ ''کاتبِ وحی'' بھی مقرر ہو گئے۔ چنانچہ جب بھی قرآن کریم کی کوئی نئی آیت نازل ہوتی، آپؐ زیدؓ سے وہ آیت لکھواتے، وقتاً فوقتاً......مرورِ زمانہ کے ساتھ......قرآنی آیات نازل ہوتی رہیں، زیدؓ لکھتے رہے...... اور یوں آسمان سے نازل ہوتی ہوئی ان قرآنی آیات کے ساتھ ساتھ ہی زیدؓ بڑے ہوتے رہے......گویا ان کی تربیت ہی ان نازل ہوتی ہوئی قرآنی آیات کے ساتھ ہوئی......

لہٰذا ظاہر ہے کہ ان آیات کے بارے میں زید بن ثابتؓ کا علم کس قدر راسخ ہوگا، ان آیات کے معانی ومفاہیم کے بارے میں انہیں کس قدر گہری معرفت وبصیرت حاصل رہی ہوگی، نیز ان آیات کے ساتھ ان کا کس قدر جذباتی لگاؤ اور تعلقِ خاطر رہا ہوگا......

چنانچہ جب وہ ان آیات کے ساتھ ساتھ بڑے ہوتے گئے تو یوں خود بخود ان کی زندگی ان آیات میں موجود اللہ کے احکام کے مطابق بنتی چلی گئی، ان کا اخلاق وکردار، نیز عادات واطوار اللہ کی مرضی کے مطابق ڈھلتے چلے گئے۔

مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے نکلتی ہوئی وہ بالکل تازہ بتازہ قرآنی آیات، نیز آپؐ کے ہونٹوں سے ادا ہوتے ہوئے قرآن کے وہ نورانی کلمات، جو اب تک کسی کی سماعت تک نہیں پہنچے تھے، سب سے پہلے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو یہ آیات اور یہ کلمات سننے کا عظیم شرف نصیب ہوتا، اور وہ بھی براہِ راست رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے،

لہٰذا یہی وجہ تھی کہ زیدؓ کے دل کے دریچے کھلتے گئے، ان کا دل قرآن کے نور سے منور ہوتا گیا، قرآنی علوم' بلکہ ربانی علوم مسلسل ان پر منکشف ہوتے چلے گئے۔

اس کا نتیجہ بہت جلد یہ ظاہر ہوا کہ اس معاشرے میں خود رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں ہی یہ نوجوان یعنی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ قرآنی علوم کے بارے میں مستند ترین ''مرجع'' تصور کئے جانے لگے۔

اسی کیفیت میں وقت گذرتا رہا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا، زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہر لمحہ آپؐ کی خدمتِ اقدس میں حاضر رہے، نہایت ذوق وشوق اور بے مثال جذبے کے ساتھ آپؐ کی خدمت' نیز تحصیلِ علم اور کسبِ فیض میں مشغول ومنہمک رہے، آپؐ بھی ہمیشہ زیدؓ کے ساتھ انتہائی عنایت اور شفقت ومحبت کا معاملہ فرماتے رہے، اور تادمِ آخر ان سے انتہائی مسرور ومطمئن رہے......

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کی مسلسل صحبت ومعیت علمی استفادہ اور کسبِ فیض' نیز اس سلسلے میں مسلسل محنت وکوشش' جدوجہد' اور سعیِ پیہم کا نتیجہ یہ تھا کہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو دینی علوم میں اس قدر بلند ترین مقام ومرتبہ نصیب ہوا کہ اُس دور میں اور اُس معاشرے میں کہ جہاں ہر طرف صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی مبارک ہستیاں تھیں جن کی تربیت براہِ راست خود رسول اللہ ﷺ نے فرمائی تھی، جہاں چہار سو بڑے بڑے جبالِ علم موجود تھے، وہاں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو علمی لحاظ سے بہت خاص حیثیت حاصل تھی اور انہیں علم ومعرفت کی دنیا میں انتہائی بلند پایہ شخصیت تصور کیا جاتا تھا۔

خصوصاً قرآن کریم اور اس سے متعلق جو بھی علوم تھے' ان کے بارے میں حضرت زید بن

ثابت رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ سبھی سے منفرد اور ممتاز تھا، اور اس کی بنیادی وجہ یہی تھی کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں رہتے ہوئے، خود آپؐ کے حکم پر ''کتابتِ وحی'' کی عظیم ترین خدمت، اور یہ مقدس ترین فریضہ سرانجام دینے کا شرف اور اعزاز جس قدر بڑے پیمانے پر حضرت زید بن ثابتؓ کے حصے میں آیا......اس قدر بڑے پیمانے پر یہ شرف حضرات ''کاتبینِ وحی'' میں سے کسی اور شخصیت کے حصے میں نہیں آیا۔(۱)

لہٰذا قرآن کریم آج چودہ سو چھتیس سال گذر جانے کے باوجود دنیا کے کونے کونے میں پڑھا جا رہا ہے، اس کی تلاوت، نیز اس کی پاکیزہ ومقدس تعلیمات پر عمل کے ذریعے اہلِ ایمان اپنے لئے دونوں جہانوں میں خیر وخوبی اور صلاح وفلاح کا سامان اپنے دامن میں سمیٹ رہے ہیں ......یقیناً اس کے پیچھے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی اس محنت وکوشش کا بہت بڑا عمل دخل ہے جو وہ......بتوفیقِ الٰہی......''کاتبِ وحی'' کی حیثیت سے انجام دیتے رہے، لہٰذا اس سلسلے میں تمام امت یقیناً ان کی مرہونِ منت ہے۔

(۱) اگرچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کے علاوہ دیگر کاتبینِ وحی بھی یقیناً یہ عظیم خدمت انجام دیتے رہے، خصوصاً یہ کہ زید بن ثابتؓ تو مدینہ کے باشندے تھے، مدنی دور میں (یعنی ہجرت کے بعد) مسلمان ہوئے تھے، مدنی دور دس سال کے عرصے پر، جبکہ اس سے قبل مکی دور تیرہ سال کے عرصے پر محیط تھا، مکہ مکرمہ میں یہ خدمت سب سے زیادہ حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ انجام دیتے رہے تھے......

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مکی دور میں مسلمان مغلوب اور مجبور ومقہور تھے، ان کا کوئی مستقل معاشرہ نہیں تھا، اپنا کوئی نظامِ زندگی نہیں تھا، جبکہ مدینہ میں اپنا معاشرہ اور اپنا نظام تھا، بلکہ باقاعدہ مستقل اسلامی ریاست وجود میں آچکی تھی، لہٰذا اب زندگی کے ہر شعبے سے متعلق تفصیلی احکام پر مشتمل قرآنی آیات بکثرت نازل ہوتی رہیں، الغرض مدنی دور اگرچہ مکی دور کی بنسبت مختصر تھا، لیکن قرآنی آیات مدنی دور میں بہت زیادہ نازل ہوئیں، بنسبت مکی دور کے، اور اس مدنی دور میں ''کتابتِ وحی'' کی خدمت سب سے زیادہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ ہی انجام دیتے رہے، لہٰذا مجموعی طور پر یہ شرف سب سے زیادہ بڑے پیمانے پر انہیں ہی نصیب ہوسکا۔

☆......جس طرح خودرسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں قرآنی علوم سے متعلق تمام معاملات میں ہرکوئی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی خاص حیثیت اورمقام ومرتبے کا معترف رہا......بعینہٖ یہی کیفیت رسول اللہ ﷺ کا مبارک دورگذرجانے کے بعد حضرات خلفائے راشدین کے دورمیں بھی برقراررہی......

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے فوری بعد جب صورتِ حال یکسر بدل کررہ گئی تھی ،تب اس بدلی ہوئی صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے بیک وقت بہت سے فتنوں نے سراٹھایا تھا (جھوٹے مدعیانِ نبوت ،منکرینِ زکوٰۃ ،مرتدین ،وغیرہ) تب رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین کی حیثیت سے ان تمامتر فتنوں کی سرکوبی وبیخ کنی کی عظیم ذمہ داری حضرت ابوبکرصدیق رضی اللہ عنہ کے کندھوں پرآپڑی تھی ٗ جسے انہوں نے بڑی ہی عزیمت واستقامت اورایمانی جذبے کے ساتھ بحسن وخوبی نبھایا تھا۔

☆......جمعِ قرآن:

انہی دنوں ظاہرہونے والے فتنوں کے اسی سلسلے میں نبوت کے ایک جھوٹے دعویدار ’’مُسیلمہ کذاب‘‘ کی طرف سے برپاکردہ فتنہ بھی بڑی ہی شدومد کے ساتھ اٹھا تھا ،جس کے نتیجے میں مشہور ومعروف جنگ ’’یمامہ‘‘ کی نوبت آئی تھی ،یہ بہت ہی خطرناک اورنازک ترین موقع تھا ،انجامِ کاراگرچہ مسلمانوں کوفتح نصیب ہوئی تھی ،مسیلمہ بھی ماراگیا تھا ،لیکن اس جنگ کے دوران مسلمانوں کوشدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا ،جانی نقصان بھی بہت زیادہ ہوا تھا ،ایک ہزار سے زائد مسلمان شہید ہوئے تھے ،جن میں سے ستر حفاظِ قرآن تھے......ایک ہی جنگ میں ایک ساتھ ستر حفاظِ قرآن کی شہادت......یہ صورتِ حال یقیناً بہت ہی پریشان کن تھی......کیونکہ اگریہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا تو پھر

''حفاظتِ قرآن'' کا کیا انتظام ہوگا؟

یہ بات اگرچہ تمام مسلمانوں کیلئے ہی باعثِ تشویش تھی، لیکن بالخصوص حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ مسلسل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے سامنے اصرار کرتے رہے کہ جلد از جلد قرآن کریم کو یکجا کر کے کتابی شکل میں محفوظ کر لیا جائے، اس پر حضرت ابوبکرؓ ابتداء میں تو یہ جواب دیتے رہے کہ ''جو کام خود رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا' میں وہ کام کس طرح انجام دے سکتا ہوں''، لیکن بالآخر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف سے مسلسل اصرار کے نتیجے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اس بارے میں شرحِ صدر ہو گیا، اور وہ اس چیز پر آمادہ ہو گئے۔

ظاہر ہے کہ یہ ''جمعِ قرآن'' انتہائی اہم اور نازک ترین کام تھا جو کہ دو چار آدمیوں کے بس کی بات نہیں تھی، لہٰذا اس مقصد کیلئے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے متعدد ایسے افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جنہیں حفظِ قرآن کے حوالے سے بڑی شہرت' نیز علوم القرآن میں خوب مہارت اور مکمل دسترس حاصل تھی، ان میں سے ہر ایک کا اپنی جگہ بڑا نام تھا اور بلند مقام تھا......اور پھر ان تمام حضرات پر مشتمل اس کمیٹی کا سربراہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا گیا......اس کمیٹی میں شامل ان تمام حضرات نے اس بات پر خوشدلی سے اتفاق کیا، ان میں سے کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا، بلکہ ان سبھی حضرات نے زید بن ثابتؓ کی اس سربراہی پر اپنی طرف سے مسرت کا اور مکمل اطمینان کا اظہار کیا۔

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کیلئے یہ چیز یقیناً بہت بڑی آزمائش تھی، اور بہت ہی بڑی ذمہ داری تھی، کیونکہ اس چیز کا تعلق ''کتاب اللہ'' کے ساتھ تھا، لہٰذا یہ انتہائی حساس اور نازک ترین معاملہ تھا۔

جبکہ معاملے کی اس نزاکت کے ساتھ ساتھ یہ اللہ کے دین اور اللہ کے کلام کی بہت عظیم

ترین خدمت بھی تھی، حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کیلئے یہ بہت بڑا اشرف اور اعزاز بھی تھا کہ وہ کمیٹی جو پہلی بار قرآن کریم کو کتابی شکل میں یکجا کرنے کا مبارک ترین کام انجام دے رہی تھی، یہ اس کمیٹی کے سربراہ تھے......نیز اس سے رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین اور خلیفۃ المسلمین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ودیگر اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا جو مقام و مرتبہ تھا، ان کے علم پر انہیں جو مکمل اعتماد تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی امانت و دیانت پر جو بھروسہ تھا......اس واقعے سے اس چیز کی بھی خوب عکاسی ہوتی ہے......گویا رسول اللہ ﷺ کے اولین جانشین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ، ودیگر اکابر صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے نزدیک ''قرآن کریم'' کے بارے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا علم ''حرفِ آخر'' کی حیثیت رکھتا تھا......

چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی زیرِ نگرانی اس کمیٹی نے پہلی بار ''جمعِ قرآن'' کی یہ عظیم خدمت انجام دیتے ہوئے قرآن کریم کو کتابی شکل میں یکجا اور محفوظ کرلیا...... یقیناً اس حوالے سے تمام امتِ مسلمہ تا قیامت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی مرہونِ منت رہے گی۔

☆......''رسمِ عثمانی......اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ'':

خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کا دور آیا، جو کہ یادگار اور بے مثال فتوحات کا دور تھا، جس کے نتیجے میں اسلامی ریاست مشرق و مغرب میں بہت زیادہ وسعت اختیار کرگئی ...... مزید یہ کہ ان مفتوحہ علاقوں سے تعلق رکھنے والے غیر عرب باشندے بھی بہت بڑی تعداد

میں دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے تھے۔

اور پھر حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد خلیفۂ سوم کی حیثیت سے جب حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھالا تو کیفیت یہی تھی کہ اسلامی ریاست کا رقبہ بہت زیادہ وسعت اختیار کر چکا تھا......مزید یہ کہ اب خود حضرت عثمانؓ کے دور میں بھی کافی فتوحات ہوئیں......جس کے نتیجے میں مزید غیر عرب باشندے مسلمان ہوتے چلے گئے......جو کہ دینِ اسلام کی حقانیت وصداقت کا بہت بڑا ثبوت تھا کہ مشرق ومغرب میں جو کوئی بھی اپنی آنکھوں سے تعصب کی عینک اتار کر سچے دل اور خلوصِ نیت کے ساتھ قرآنی تعلیمات کا مطالعہ کرے، وہ ان پاکیزہ تعلیمات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا......

لیکن اس کے ساتھ ہی ''قرآن کریم'' کے حوالے سے اس موقع پر ایک قابلِ تشویش صورتِ حال یہ پیش آئی کہ دور دراز کے علاقوں سے ایسی خبریں موصول ہونے لگیں کہ قرآن کریم کے بعض کلمات کے تلفظ کے معاملے میں لوگوں میں اختلاف کی نوبت آرہی ہے۔

دراصل قرآن کریم کے بعض کلمات اس طرح تحریر تھے کہ انہیں ایک سے زائد طریقے سے پڑھا جاسکتا تھا (بالخصوص جبکہ اُس دور میں حروف پر نقطے وغیرہ بھی نہیں لگائے جاتے تھے) قرآن کریم چونکہ عربی زبان میں ہے لہٰذا اہلِ زبان یعنی عربوں کیلئے تو اس میں کوئی دقت نہیں تھی، کیونکہ وہ قرآنی کلمات کے معانی ومفاہیم سے واقف تھے، لہٰذا وہ بخوبی جانتے تھے کہ کس کلمے کو کس طرح پڑھنا ہے......البتہ جو اہلِ زبان نہیں تھے، ان کیلئے یہ معاملہ کافی نازک تھا......بالخصوص دور دراز کے ایک علاقے ''آرمینیا'' کے محاذ پر مسلمان

سپاہی اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر دن بھر دشمن کے خلاف برسرِ پیکار رہنے کے بعد رات کی تاریکی پھیلتے ہی جب اپنے رب کے ساتھ راز و نیاز' اور دعاء و مناجات میں مشغول ہو جاتے، ان کے خیموں سے تلاوتِ قرآن کی آوازیں بلند ہونے لگتیں، تو ایسے میں یہ بات شدت کے ساتھ محسوس کی جاتی کہ قرآن کریم کے بعض کلمات کے تلفظ میں ان میں فرق اور اختلاف پایا جاتا، کوئی کس طرح تلفظ کرتا، اور کوئی کس طرح...... یوں ان میں اختلاف کی نوبت آتی...... قرآن جو کہ اللہ کا کلام ہے، اور جو کہ تمام مسلمانوں کو اتفاق واتحاد کا سبق سکھاتا ہے...... خود اسی قرآن کے تلفظ اور تلاوت کے بارے میں ہی اگر اختلاف کی نوبت آنے لگے...... مزید یہ کہ مسلمان سپاہی اگر باہم اختلاف کرنے لگیں (وہ بھی قرآن کریم کے بارے میں) تو ظاہر ہے کہ معاملہ کس قدر سنگین تصور کیا جائے گا......

چنانچہ وہاں ''آرمینیا'' کے اس محاذ پر اسلامی لشکر کے سپہ سالار حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ (۱) نے اس صورتِ حال کی نزاکت اور سنگینی کو بڑی شدت کے ساتھ محسوس کیا، اور پھر آرمینیا سے بہت طویل سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے، جہاں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال کی نزاکت سے آگاہ کیا، اور جلد از جلد اس معاملے کے مناسب حل کیلئے کسی فوری اقدام کی اہمیت و ضرورت کی طرف انہیں متوجہ کیا۔

چنانچہ فوری اور ہنگامی طور پر اس معاملے کے سدِ باب کی غرض سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے اکابرِ صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے مشاورت کے بعد یہ فیصلہ فرمایا کہ ''قرآن کریم کا ایک نیا نسخہ تیار کیا جائے، جس میں ہر کلمے کو اور ہر لفظ کو فقط اسی طرح

(۱) حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ ملاحظہ ہو، صفحات [۵۹۷-۶۲۲]۔

تحریر کیا جائے کہ جس طرح اس کا تلفظ مقصود ہے، کسی اور طرح اسے پڑھا ہی نہ جا سکے''۔

چنانچہ اس فیصلے پر عملدرآمد کی غرض سے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کبارِ صحابہ میں سے متعدد ایسے افراد پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دی جنہیں تمام دینی علوم ' بالخصوص قرآنی علوم میں خوب مہارت اور بے مثال دسترس حاصل تھی......اور پھر اس کمیٹی کے سربراہ کے طور پر انہوں نے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا (جیسا کہ اس سے قبل ''جمعِ قرآن'' کے موقع پر خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی انہیں ہی منتخب فرمایا تھا)

چنانچہ اس مقصد کیلئے مخصوص رسم الخط پر اتفاق کیا گیا، اور پھر اس مخصوص اور طے شدہ رسم الخط کے مطابق قرآن کریم کا ازسرِنو نیا نسخہ تیار کیا گیا (حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی طرف نسبت کے طور پر یہ مخصوص رسم الخط ہمیشہ کیلئے ''رسمِ عثمانی'' کے نام سے معروف ہو گیا)۔

اس موقع پر قرآن کریم کی ازسرِنو کتابت کا یہ عظیم کام بھی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی سربراہی میں ہی انجام دے گیا...... یوں ''حفاظتِ قرآن'' کے حوالے سے حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی یہ بھی ایک یادگار ترین دینی خدمت ' نیز تمام امت پر تا قیامت ان کی طرف سے یہ بھی ایک احسانِ عظیم تھا۔

☆......علم الفرائض:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قرآن کریم کے ساتھ جو والہانہ لگاؤ اور تعلقِ خاطر تھا ' نیز قرآنی علوم میں انہیں جو غیر معمولی مہارت اور دسترس حاصل تھی......ظاہر ہے کہ......بتوفیقِ الٰہی...... یہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کی

محبت، صحبت ومعیت، اور کسبِ فیض کے معاملے میں خاص دلچسپی، خلوصِ نیت، جذبۂ صادق نیز سالہا سال تک ''کتابتِ وحی'' کا مقدس ترین فریضہ سرانجام دیتے رہنے کا ہی نتیجہ وثمرہ تھا......

قرآنی علوم میں اس مہارت ودسترس کے علاوہ مزید یہ کہ دیگر اسلامی علوم میں بھی یہ کسی سے کم نہیں تھے......خصوصاً ایک اہم ترین علم جسے ''علم الفرائض'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، جس سے مراد ہے ''میراث کی تقسیم کا علم'' یعنی کسی انسان کی وفات کے بعد اس کے ورثہ میں اس کی چھوڑی ہوئی وراثت کی تقسیم کا طریقِ کار اور اس سے متعلق شرعی احکام۔

یہاں اس بات کو سمجھنا ضروری ہے کہ دینِ اسلام میں ''حقوق اللہ'' کے ساتھ ساتھ ''حقوق العباد'' کی بھی بہت بڑی اہمیت ہے، بالخصوص مالی معاملات میں اس کی اہمیت مزید بڑھی ہوئی ہے، یہی وجہ ہے کہ ہر فوت شدہ شخص کیلئے اس کے وارثوں کی تعیین خود قرآن کریم میں کردی گئی ہے(۱) مزید یہ کہ ان وارثوں میں سے ہر وارث کا حصہ بھی مکمل وضاحت وصراحت کے ساتھ متعین کر دیا گیا ہے، جو خواہ زیادہ ہو یا کم ......بہر صورت اس وارث کے حوالے کیا جانا ضروری ہے(۲)

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ اس علم (علم الفرائض، یا علمِ میراث) میں چونکہ کافی حسابی باریکیاں ہوا کرتی ہیں، نیز یہ کہ فوت شدہ شخص کے وارثوں میں سے ہر ایک کا اس کے ساتھ جس نوعیت کا رشتہ ہوا کرتا ہے اس کی بناء پر بسا اوقات اس تقسیم میں پیچیدہ صورتِ حال پیش آجایا کرتی ہے......جبکہ اس چیز کا تعلق بھی ''مالی حقوق'' سے ہے، لہٰذا یہ معاملہ

(۱) یہی کیفیت مستحقینِ زکوٰۃ کے معاملے میں بھی نظر آتی ہے کہ تمام مستحقین (مصارفِ زکوٰۃ) کا تعین خود قرآن کریم میں کر دیا گیا ہے ﴿اِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلفُقَرَاءِ وَالمَسَاکِینِ وَالعَامِلِینَ عَلَیهَا ......﴾ (التوبۃ[۶۰]

(۲) ﴿......مِمَّا قَلَّ مِنهُ أو کَثُرَ نَصِیباً مفرُوضاً......﴾ (النساء[۷]

انتہائی نازک اور حساس ہوا کرتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرونِ اُولیٰ اور خود صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مبارک دور سے ہی ہمیشہ آج تک تمام دینی علوم میں ''علم الفرائض'' کی بڑی اہمیت رہی ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، بلکہ اس میں مہارت اور دسترس حاصل کرنے کیلئے بڑی محنت اور عرق ریزی کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔

چنانچہ حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو اس علم میں خاص مہارت اور دسترس حاصل تھی، عوام وخواص سبھی اس معاملے میں ان کی طرف رجوع کیا کرتے تھے، بڑے بڑے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن میں سے ہر کوئی اپنی جگہ علم کا سمندر تھا......ان سبھی کا یہی معمول تھا کہ اس حوالے سے (یعنی تقسیمِ میراث میں) اگر کوئی پیچیدہ صورتِ حال درپیش آجاتی تو وہ انہی کی طرف رجوع کیا کرتے تھے۔

☆......**خلیفۂ اول کے انتخاب میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا کردار:**

رسول اللہ ﷺ کی صحبت اور مسلسل کسبِ فیض نیز اس سلسلے میں خاص توجہ، غیر معمولی ذوق وشوق، اور دلچسپی کی بدولت حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کو جس طرح علمی میدان میں خاص مقام ومرتبہ حاصل تھا......اسی طرح اُس دور میں مسلمانوں کے باہم معاشرتی مسائل نیز سیاسی معاملات میں بھی ان کی اصابتِ رائے پر سب متفق تھے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا جاں گداز واقعہ جب پیش آیا، جس کے نتیجے میں تمام مسلمان انتہائی رنج وغم کی کیفیت سے دوچار تھے......لیکن عین اسی وقت رنج وغم کی اس کیفیت کے علاوہ مزید ایک اہم ترین معاملہ جو درپیش تھا، جس پر آئندہ ہمیشہ کیلئے تمام امت کی بقاء کا دارومدار تھا......وہ یہ کہ رسول اللہ ﷺ کا جانشین اب کون ہوگا؟

رسول اللہ ﷺ کا جسدِ اطہر اب تک ان لوگوں کے درمیان موجود تھا، تجہیز و تکفین ابھی تک نہیں ہوئی تھی...... کہ اس دوران یہ معاملہ خطرناک صورتِ حال اختیار کرنے لگا، طرح طرح کی آوازیں بلند ہونے لگیں...... سازشی عناصر، چھپے ہوئے دشمن، اور فتنہ پرداز قسم کے لوگوں نے اپنے ناپاک عزائم کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے بھاگ دوڑ کے سلسلے شروع کر دیئے......

کوئی کہنے لگا ''رسول اللہ ﷺ مہاجرین میں سے تھے، لہٰذا اب آپؐ کی خلافت وجانشینی بھی محض مہاجرین ہی کا حق ہے''

کوئی کہنے لگا ''انصار کی دعوت پر رسول اللہ ﷺ اپنا شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ تشریف لائے...... لہٰذا انصار خلافت کے زیادہ حقدار ہیں''

کسی نے کہا ''دو خلیفہ ہونے چاہئیں...... ایک مہاجرین میں سے، اور ایک انصار میں سے''

الغرض اس وقت صورتِ حال ایسی تھی کہ کسی بھی لمحے یہ معاملہ خطرناک رُخ اختیار کر سکتا تھا، اور عین ممکن تھا کہ صورتِ حال اس قدر بگڑ جائے کہ معاملہ ہاتھوں سے نکل جائے......

ایسے میں ''سقیفۂ بنی ساعدہ'' نامی مقام پر (جو کہ اب مسجدِ نبوی کے اندر ہے) بلند ہوتی ہوئی ان رنگا رنگ آوازوں کے درمیان حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فیصلہ کن انداز میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے بآوازِ بلند کہا ''ابوبکر! اپنا ہاتھ بڑھایئے'' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جب اپنا ہاتھ ان کی جانب بڑھایا تو حضرت عمرؓ نے فوراً اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھتے ہوئے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر یوں کہا ''لوگو! یہی ہمارے خلیفہ ہیں، میں ان کے ہاتھ پر بیعت کر رہا ہوں، لہٰذا تم سب بھی انہی کے ہاتھ پر بیعت کر لو''۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی اس جرأت' نیز ان کی طرف سے اس فوری اور بروقت اقدام کی وجہ سے معاملہ کافی حد تک سنبھل گیا، بات بگڑنے سے بچ گئی......تاہم اس کے باوجود اصل معاملہ تو ''انصار'' کا تھا، کیونکہ مدینہ کے اصل باشندے تو وہی تھے، ایسے میں ان کی مرضی کے بغیر اس بارے میں کوئی حتمی فیصلہ اور کوئی پائیدار قسم کا اقدام بہت مشکل تھا......لہٰذا یہ بات انتہائی ضروری تھی کہ خود انہی میں سے کوئی ایسی آواز بلند ہو کہ جو سب کیلئے اس قدر واجب الاحترام ہو کہ اس کی مخالفت میں بولنے کی کوئی جرأت نہ کرے......

چنانچہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ کے اس طرزِ عمل کے فوری بعد حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (جو خود انصارِ مدینہ میں سے تھے) اپنی قوم (یعنی انصار) کی جانب متوجہ ہوئے، اور بآوازِ بلند مکمل وقار' اور متانت وسنجیدگی کے ساتھ بس انہوں نے ایک فیصلہ سنا دیا......

وہ شخص جو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت میں رہا، وہاں رہتے ہوئے اللہ عزوجل کی جانب سے نازل ہونے والی وحی لکھتا رہا، قرآنی آیات تحریر کرتا رہا، یہی وجہ تھی کہ اس کا اپنا دل بھی قرآن کے نور سے منور تھا، اور اسی لئے اس کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات میں خاص تأثیر تھی، اس کی ہر بات مخاطب کے دل میں اتر جانے والی تھی......قرآن اور اللہ کے پاکیزہ کلام کی برکت سے......

چنانچہ اس نازک ترین موقع پر بھی کہ جب امت کی وحدت سخت خطرے میں تھی......امت کی کشتی ہچکولے کھا رہی تھی......ایسے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے مکمل عزم اور حوصلے کے ساتھ، مختصر مگر ٹھوس اور دوٹوک فیصلہ سناتے ہوئے فرمایا ''اے جماعتِ انصار! رسول اللہ ﷺ چونکہ خود مہاجرین میں سے تھے، لہٰذا اب ان کا جانشین بھی مہاجرین

میں سے ہی ہوگا''

اور پھر قدرے توقف کے بعد مزید فرمایا''ہم زندگی بھر رسول اللہ ﷺ کے ''انصار'' بنے رہے، لہٰذا اب آئندہ بھی ہم ہمیشہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کے جانشین کے ''انصار'' (یعنی مددگار) ہی بنے رہیں گے''

یعنی اللہ کے دین کی نشرواشاعت' نیز ہر خیر وخوبی کو عام کرنے' اور ہر برائی کو لگام دینے کے معاملے میں ہم اب بھی بدستور ''انصار'' (مددگار) اور دست وبازو بنے رہیں گے، جیسا کہ خود رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں ہم اسی مقصد کیلئے انصار بنے رہے۔(۱)

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی طرف سے اس دوٹوک اعلان کے ساتھ ہی تمام انصارِ

(۱) یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس موقع پر انصار کا خلافت سے دستبرداری پر رضامند ہوجانا بھی ان کے ''ایثار'' کا ایک مظہر تھا......حضرات انصار کی طرف سے ہمیشہ ہر نازک موقع پر یہ ''ایثار'' ہی ان کی اتنی بڑی خوبی تھی کہ جس کی وجہ سے خود قرآن کریم میں ان شاندار الفاظ میں ان کی تعریف بیان کی گئی: ﴿وَيُؤثِرُونَ عَلَىٰ أنفُسِهِم وَلَوكَانَ بِهِم خَصَاصَةٌ......﴾ (الحشر:۹) یعنی''وہ خود اپنے اوپر ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو، خواہ وہ خود کتنے ہی محتاج ہوں......''

نیز حضرات انصار کی منقبت وفضیلت اور مقام ومرتبہ رسول اللہ ﷺ کے اس ارشاد سے بھی خوب واضح ہوتا ہے کہ ''لَوأنّ النَّاسَ سَلَكُوا شِعْباً وَ سَلَكَتِ الأنصارُ شِعْباً لَسَلَكتُ شِعْبَ الأنصارِ'' یعنی''اگر تمام لوگ کسی راستے پر چل رہے ہوں، اور انصار کسی دوسرے راستے پر چل رہے ہوں......تو میں ضرور اسی راستے پر ہی چلوں گا جس پر انصار چل رہے ہوں گے''۔

نیز ایک موقع پر آپؐ نے حضرات انصارِ مدینہ کیلئے ان الفاظ میں دعاء فرمائی''اَللّٰھُمّ ارحَمِ الأنصار، وَأبنَاءَ الأنصَار، وَأبنَاءَ أبنَاءِ الأنصَار'' یعنی''اے اللہ! تو انصار پر رحم فرما، انصار کے بچوں پر بھی رحم فرما، اور انصار کے بچوں کے بچوں پر بھی رحم فرما'' (السیرۃ النبویہ لابن ہشام/ ج۴/ص۱۶۱۔رقم النص:۱۸۴۴)۔

انصارِ مدینہ کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس والہانہ انداز کا اظہار......اور اس قدر جذباتی انداز میں ان کیلئے' نیز ان کی نسلوں کیلئے یہ دعاء......یقیناً اس سے حضرات انصار کی شان اور منقبت وفضیلت ظاہر ہوتی ہے۔

مدینہ مطمئن ہوگئے، اور نہایت جوش وخروش کے ساتھ ہنسی خوشی آگے بڑھ کر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کرنے لگے...... یوں خفیہ دشمنوں کی طرف سے تیار کی گئی وہ تمام سازشیں دم توڑ گئیں...... امت کی وحدت پارہ پارہ ہونے سے بچ گئی......
اس عظیم کارنامے' یعنی اس نازک موقع پر انصار کو سمجھانے اور انہیں قائل کرنے' نیز مہاجرین وانصار کو یکجا اور متحد رکھنے میں حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے جو بنیادی کردار ادا کیا...... یقیناً ان کا یہ کارنامہ ہمیشہ ناقابلِ فراموش تصور کیا جاتا رہے گا۔

☆......اس نازک ترین موقع پر حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا یہ ناقابلِ فراموش اور تاریخی کردار...... ان کا یہ مختصر مگر دوٹوک فیصلہ...... اور پھر تمام انصارِ مدینہ کی طرف سے اس فیصلے کی پذیرائی ...... یقیناً یہ سب کچھ ان کے خلوصِ نیت اور ایمانی جذبے کا ہی نتیجہ تھا...... عرصۂ دراز تک کتابتِ وحی کی مقدس ترین خدمت سرانجام دیتے رہنا' رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا والہانہ اور جذباتی لگاؤ اور تعلقِ خاطر' آپؐ کی خدمتِ اقدس میں رہتے ہوئے مسلسل علمی استفادہ' کسبِ فیض' اور پھر اس کے نتیجے میں اُس معاشرے میں ان کا وہ بلندترین مقام ومرتبہ...... یہی وہ تمام اسباب تھے جو اس موقع پر ان کے اس مختصر مگر ٹھوس فیصلے کی مقبولیت وپذیرائی کا سبب بنے...... نیز یہی وجہ تھی کہ اس معاشرے میں تمام بڑے بڑے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو خود جبالِ علم تصور کئے جاتے تھے...... وہ ان کا بے حد احترام کیا کرتے تھے......

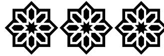
☆......**وفات:**

اسی کیفیت میں وقت کا سفر جاری رہا...... حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نہایت ذوق وشوق اور بے مثال جذبے کے ساتھ اللہ کے دین کی خدمت اور نشر واشاعت میں ہمیشہ ہی

مشغول ومنہمک رہے،اسی چیز کو تادمِ آخر اپنا اوڑھنا بچھونا اور اپنا شیوہ وشعار بنائے رکھا ، حتیٰ کہ ۴۵ھ میں مدینہ منورہ میں ان کا انتقال ہوگیا......

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جاملے...... جب ان کی عمر چھپن برس تھی۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۶/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ،مطابق ۲۶/ جنوری ۲۰۱۵ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی جو کہ ''ابوایوب انصاری'' کی کنیت سے معروف ہوگئے، جبکہ ان کا نام خالد بن زید تھا، مدینہ کے مشہور و معروف اور معزز ترین خاندان ''بنونجار'' سے ان کا تعلق تھا۔

رسول اللہ ﷺ کے دادا محترم یعنی عبدالمطلب کی والدہ سلمیٰ بنت عمرو کا تعلق بھی اسی خاندان سے ہی تھا، لہٰذا اس طرح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس خاندان ''بنونجار'' کی رشتے داری بنتی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے والد عبداللہ بن عبدالمطلب جب سیدہ آمنہ بنت وہب کے ساتھ شادی کے محض چند ماہ بعد ملکِ شام کی طرف تجارتی سفر پر روانہ ہوگئے تھے، اور پھر وہاں سے واپسی کے موقع پر دورانِ سفر بیمار پڑ گئے تھے، مکہ اور ملکِ شام کے درمیان وہ تجارتی شاہراہ جس پر اُس زمانے میں تجارتی قافلے چلا کرتے تھے' وہ مدینہ کے قریب سے گذرتی تھی، چنانچہ واپسی کے اس سفر کے دوران جب راستے میں عبداللہ کی طبیعت زیادہ ناساز ہوئی اور ان کیلئے سفر جاری رکھنا کافی مشکل ہوگیا، ایسے میں یہ قافلہ جب مدینہ کے قریب سے گذر رہا تھا، تو موقع غنیمت جانتے ہوئے عبداللہ سفر جاری رکھنے کی بجائے مدینہ میں ہی رک گئے تھے، ''خاندانِ بنونجار'' کے ساتھ اپنی اسی قرابت داری کی وجہ سے انہوں نے مدینہ میں اسی خاندان میں قیام کیا تھا، اور تب ان کی طبیعت سنبھل نہیں سکی تھی، چند دن کی علالت کے بعد وہیں مدینہ میں ہی ان کا انتقال ہوگیا تھا، اور پھر وہیں تدفین بھی ہوئی تھی۔

عبداللہ بن عبدالمطلب کے انتقال کے بعد مکہ میں ان کے لختِ جگر یعنی رسول اللہ ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی تھی، آپؐ کی ولادت کے بعد آپؐ کی والدہ آمنہ بنت وہب ہمیشہ سوچا کرتی تھیں کہ میرا یہ نورِنظر جو کہ پیدائشی یتیم ہے، اس نے اپنے باپ کا نام تو سنا ہے، مگر زندگی بھر آنکھیں باپ کی شکل دیکھنے کیلئے ترستی رہیں گی...... باپ کی شکل دیکھنا تو اسے نصیب نہو سکا، لیکن کم ازکم یہ کہ کاش یہ کسی طرح اپنے باپ کی قبر ہی دیکھ لے......لیکن مکہ سے مدینہ کے درمیان فاصلہ بہت زیادہ تھا، راستہ دشوار گذار تھا، سفری سہولیات کا فقدان تھا، لہٰذا وہ مسلسل بے چینی کے ساتھ انتظار کرتی رہیں کہ یہ بچہ کچھ بڑا ہو جائے، اس طویل سفر کے قابل ہو سکے تو میں اسے وہاں لے جاؤں......آخر جب اس بچے کی عمر کا چھٹا سال چل رہا تھا تب وہ اسے ہمراہ لئے ہوئے مدینہ گئی تھیں......اور تب اپنے اس نورِنظر کی معیت میں انہوں نے بھی وہاں مدینہ میں خاندان ''بنونجار'' کے ساتھ اس قرابت داری کی وجہ سے اسی خاندان میں ہی قیام کیا تھا۔(۱)

☆......اور پھر تقریباً سینتالیس سال کا طویل عرصہ گذر جانے کے بعد ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی جب مکہ سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تھی، تب ابتداء میں چند روز آپؐ نے مضافاتی بستی ''قباء'' میں قیام فرمایا تھا، اس کے بعد جب آپؐ وہاں سے اندرونِ مدینہ شہر کی جانب روانہ ہوئے تھے......تب آپؐ کی اونٹنی مختلف محلوں، بستیوں، اور مختلف قبائل کے مساکن سے گذرتی ہوئی آگے بڑھتی جا رہی تھی......راستے میں لوگوں کا بڑا جمعِ غفیر تھا، ایسے میں بار بار بہت سے لوگ فرطِ عقیدت اور جذبات کی شدت کی وجہ سے آگے بڑھ کر آپؐ کی اونٹنی کی مہار تھام لیتے، اور اسے روکنے کی کوشش کرتے......تب

(۱) اسی سفر سے واپسی کے موقع پر مدینہ اور مکہ کے درمیان ''ابواء'' نامی مقام پر سیدہ آمنہ بنت وہب کی طبیعت ناساز ہوگئی تھی، اور پھر وہیں ان کی وفات ہوگئی تھی، اُس وقت ان کی عمر پچیس سال تھی۔

آپؐ بڑی شفقت سے بار بار انہیں مخاطب کرتے ہوئے یوں ارشاد فرماتے: دَعُـوهَـا فَاِنّهَا مَأمُورَة ...... یعنی ''اسے چھوڑ دو، یہ تو اللہ کے حکم سے چل رہی ہے......''

آخر مسلسل چلتے چلتے ایک مقام پر پہنچ کر اونٹنی رک گئی، اور پھر کچھ دیر اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد بیٹھ گئی، یہ بعینہٖ وہی جگہ تھی جہاں آج مسجدِ نبوی آباد ہے......اور یہی اُس معزز ترین خاندان ''بنونجار'' کا محلّہ تھا۔

اس یادگار ترین موقع پر اگرچہ وہاں مدینہ میں (جس کا نام اُس وقت یثرب تھا) سبھی لوگوں نے اپنے محبوب ترین مہمان یعنی رسول اللہ ﷺ کیلئے اپنے گھروں کے' نیز اپنے دلوں کے دروازے کھول رکھے تھے، ہر کوئی دیدہ ودل فرشِ راہ کئے ہوئے تھا......لیکن آپؐ کی اونٹنی چلتے چلتے جب خود ہی ایک جگہ رک گئی ، اور پھر اسی جگہ بیٹھ بھی گئی ،تو اب ظاہر ہے کہ اس مقام پر سب سے قریب ترین جو گھر تھا، اسی گھر کے مکینوں کا ہی اب سب سے بڑا حق تھا......اور وہ گھر جس کسی کا تھا، اس خوش نصیب ترین انسان کا نام تھا ''ابوایوب انصاری''، تب حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ ہی نہیں رہا......قدرت ان پر اتنی مہربان ہوگئی تھی، اللہ کی طرف سے انہیں یہ اتنا بڑا اعزاز اور اتنی بڑی خوشی نصیب ہوئی تھی......گویا ان کی تو قسمت ہی جاگ اٹھی تھی۔

چنانچہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ بڑی ہی بیتابی کے ساتھ لپکے، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، انتہائی والہانہ انداز میں خوش آمدید کہا، نیز آپؐ کا جو کچھ مختصر سامان تھا لپک کر اسے اٹھایا......اور دیوانہ وار وہ سامان لئے ہوئے اپنے گھر کے دروازے کی طرف چل دیئے......گویا دنیا بھر کا کوئی قیمتی ترین خزانہ مل گیا ہو، اور انہیں یہ اندیشہ ہو کہ کہیں یہ خزانہ مجھ سے چھن نہ جائے......اس لئے بہت جلدی اور فوراً سے پیشتر اس خزانے

کو لے جا کر بحفاظت اپنے گھر میں چھپا دیا جائے......یہی کیفیت اس وقت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی ہورہی تھی۔

☆......حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر دو منزلہ تھا، چنانچہ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے قیام کیلئے گھر کا بالائی حصہ خالی کرنے کا فیصلہ کرلیا، تاکہ خود میاں بیوی دونوں نیچے رہیں، اور آپؐ بالائی منزل پر رہیں......ادب کا تقاضا بھی یہی تھا کہ آپؐ اوپر رہیں، نیز یہ بات بھی پیشِ نظر تھی کہ یہ دونوں میاں بیوی اگر اوپر رہیں گے تو وہاں اٹھتے بیٹھتے اور چلتے پھرتے ان کے قدموں کی آواز نیچے آئیگی' یوں آپؐ کے آرام میں خلل واقع ہوگا، نیز شاید کچھ گرد و غبار بھی نیچے گرے جو آپؐ کیلئے پریشانی کا سبب بنے گا......(کیونکہ اُس دور میں مکانات کچے تھے، لہٰذا اس چیز کا اندیشہ تھا)

چنانچہ ان دونوں میاں بیوی نے رسول اللہ ﷺ کو جب اس بارے میں مطلع کیا تو آپؐ نے جواب میں فرمایا کہ میرے لئے نیچے رہنا ہی زیادہ مناسب ہوگا، ساتھ ہی یہ وجہ بھی بیان فرمائی کہ میرے پاس تو بکثرت لوگوں کی آمد و رفت کا سلسلہ رہے گا، لہٰذا میرے لئے نیچے ہی قیام بہتر رہے گا(کیونکہ ہمہ وقت آتے جاتے ملاقاتیوں کیلئے اوپر آنا جانا مشکل ہوگا، نیز گھر والوں کیلئے بھی یہ چیز دشواری کا سبب بنے گی) اس پر ابوایوبؓ اور ام ایوبؓ دونوں نے رسول اللہ ﷺ کی خواہش کا احترام کیا اور دونوں اوپر ہی رہے۔

جب رات ہوئی، رسول اللہ ﷺ آرام فرمانے لگے، تب یہ دونوں میاں بیوی بھی آپؐ سے رخصت لے کر اوپر چلے آئے، اور آرام کی غرض سے لیٹ گئے، لیکن ابھی تھوڑی ہی دیر گذری تھی کہ ابوایوبؓ اٹھ کر بیٹھ گئے، اور نہایت ہی پریشانی کے عالم میں اپنی اہلیہ محترمہ کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگے''ام ایوب! یہ ہم نے کیا کیا؟ رسول اللہ ﷺ نیچے

اورہم اوپر؟ ہم یہاں اوپر چلتے پھرتے رہیں......جبکہ رسول اللہ ﷺ نیچے؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ اب ہمارا چلنا پھرنا اٹھنا بیٹھنا......سب رسول اللہ ﷺ کے اوپر ہوگا......؟ اوراس سے بھی بڑھ کر یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی طرف تو آسمانوں سے وحی آتی ہے، فرشتے آتے ہیں، لہٰذا جس ہستی کا رشتہ آسمان والوں سے ہو......اسے تو ضروراوپر ہی ہونا چاہئے، ہم اوپر کس طرح رہ سکتے ہیں؟''

یہی باتیں سوچ کر یہ دونوں میاں بیوی انتہائی پریشان ہوگئے، ان کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اب کیا کریں؟ آخر دونوں ایک کونے میں چلے گئے، جہاں انہیں یقین تھا کہ اس جگہ ہم رسول اللہ ﷺ کے اوپر نہیں ہوں گے، تمام رات دونوں اسی طرح اس کونے میں دبکے پڑے رہے، اگر کبھی کسی ضروری کام سے چلنا پڑتا تو کمرے کے درمیان میں چلنے کی بجائے کونوں میں دیوار کے ساتھ چپک چپک کر چلتے......تمام رات اسی کیفیت میں گذر گئی۔

جب صبح ہوئی تو ابوایوب انصاریؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور بڑی ہی بیتابی کے ساتھ عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! اللہ کی قسم، آج رات تو لمحہ بھر کیلئے بھی نہ تو میں ہی آنکھ جھپک سکا، اور نہ ہی اُم ایوب''

آپؐ نے حیرت سے دریافت فرمایا کہ ''کیا وجہ ہوگئی؟''

ابوایوبؓ نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! ہم اوپر......آپ نیچے......یہ کیسے ممکن ہے؟''

تب آپؐ نے فرمایا ''هَوِّن عَلَيكَ يَا أبا أيّوب! اِنّه أهوَن علينا أن نكونَ فِي السُّفلِ، لكثرَةِ من يغشانا مِن النّاس۔ یعنی ''اے ابوایوب! آپ اس قدر فکر مند نہوں، میرے لئے تو بس یہی بہتر ہے کہ میں یہیں نیچے ہی رہوں، کیونکہ میرے

پاس تو بکثرت ملاقاتی آتے جاتے رہیں گے''۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے یہ ارشادِ گرامی سننے کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے اس حکم کی تعمیل کی، اور مطمئن ہو گئے...... شب و روز گذرتے رہے...... حتیٰ کہ ایک بار ایسا ہوا کہ جب سردی خوب عروج پر تھی، سخت ٹھنڈی اور طوفانی ہوائیں چل رہی تھیں، تب ایک رات اچانک ان کا مٹکا کسی طرح ٹوٹ گیا، پانی تیزی کے ساتھ بہنے لگا، اور ہر طرف پھیل گیا (چونکہ اُس دور میں مکانات کچے تھے، اور اس قدر معیاری اور مضبوط بھی نہیں تھے کہ جس طرح موجودہ دور میں ہوا کرتے ہیں، لہٰذا) اب انہیں یہ اندیشہ ہونے لگا کہ یہ پانی نیچے رسول اللہ ﷺ پر نہ ٹپکنے لگے...... یا یہ کہ بہتا ہوا نیچے نہ پہنچ جائے...... یوں آپؐ کیلئے یہ چیز بڑی زحمت کا باعث بن جائیگی......

دونوں میاں بیوی کو محض ایک ہی لحاف میسر تھا، جسے وہ دونوں ہی اوڑھتے تھے، ایسے میں انہیں وہ بہتا ہوا پانی صاف کرنے کیلئے فوری طوری پر گھر میں کوئی چیز نہیں ملی...... لہٰذا وہ دونوں پریشانی میں جلدی جلدی اپنے اسی لحاف سے پانی خشک کرنے لگے، انتہائی شدید سردی کی رات ...... پھر یہ کہ مٹکا بھی ٹوٹ گیا، جس کی وجہ سے پانی پھیل گیا، یوں سردی مزید بڑھ گئی، پانی بھی ضائع ہو گیا، اُس دور میں پانی کا حصول کوئی آسان کام نہیں تھا، بڑی تگ ودو اور جدوجہد کے بعد پانی نصیب ہوا کرتا تھا...... اس کے علاوہ اصل فکر اس بات کی تھی کہ یہ پانی اب کہیں بہتا ہوا یا ٹپکتا ہوا نیچے نہ پہنچ جائے...... مزید یہ کہ اس قدر شدید سردی میں پانی صاف کرنے کی تکلیف...... نیز یہ کہ لحاف بھی فقط ایک ہی میسر تھا، وہ بھی بھیگ چکا اس پانی کو خشک کرنے کی کوشش میں...... اب کیا ہوگا؟ باقی رات کس طرح گذرے گی؟ سردی سے حفاظت کیسے ہوگی؟

یہ دونوں میاں بیوی تو روزِ اول سے ہی اسی تشویش میں مبتلا تھے کہ بالائی منزل پر ہماری رہائش، جبکہ رسول اللہ ﷺ نیچے تشریف فرما ہیں...... یہ کسی طرح مناسب نہیں......دل نہیں مانتا......اگرچہ رسول اللہ ﷺ نے انہیں اس بارے میں تسلی دی تھی اور مطمئن کرنے کی کوشش بھی فرمائی تھی......لیکن بہرحال ان دونوں میاں بیوی (ابوایوب اورام ایوب) کی طرف سے آپؐ کیلئے ادب واحترام کی یہ انتہاء تھی......ظاہر ہے کہ یہ دونوں خوش نصیب ترین افراد ''باادب بانصیب'' کے پوری طرح مصداق تھے،اسی لئے تو خالقِ کائنات کی طرف سے اپنے حبیب ﷺ کے اولین میزبان کے طور پر انہی دونوں میاں بیوی کو منتخب کیا گیا تھا......

چنانچہ یہ دونوں تو پہلے دن سے ہی اوپر رہائش پر مطمئن نہیں تھے،مزید یہ کہ اس رات پیش آنے والا یہ واقعہ ......جو کہ ان کیلئے بڑی پریشانی کا باعث بنا......لہٰذا جب صبح ہوئی تو ابوایوب انصاریؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے،اورنہایت ہی ادب کے ساتھ عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! آپ کا حکم سرآنکھوں پر......لیکن ......ہمارا دل کسی صورت اس بات کو قبول نہیں کرتا کہ ہم میاں بیوی اوپر ہوں اور آپ نیچے......''

اس بار رسول اللہ ﷺ نے ابوایوب رضی اللہ عنہ کی یہ جو کیفیت ملاحظہ فرمائی تو آپؐ صورتِ حال کو سمجھ گئے،لہٰذا ازراہِ شفقت ان کی اس گذارش کو قبول کرتے ہوئے آپؐ بالائی منزل پر منتقل ہو گئے،جبکہ وہ دونوں میاں بیوی نیچے چلے آئے۔

☆......رسول اللہ ﷺ نے تقریباً سات ماہ مسلسل اپنے میزبان حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں قیام فرمایا،حتیٰ کہ اس دوران ان کے گھر سے متصل جس جگہ ہجرت کے موقع پر آپؐ کی اونٹنی آکر بیٹھ گئی تھی......اسی مقام پر مسجدِ نبوی کی تعمیر مکمل ہوگئی،نیز مسجد

سے متصل ہی رسول اللہ ﷺ کیلئے مستقل رہائش کا انتظام بھی کرلیا گیا......لہٰذا آپؐ ابوایوب انصاریؓ کے گھر سے اب وہاں منتقل ہوگئے......لیکن اب بھی رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ دونوں ایک دوسرے کے پڑوسی ہی تھے......کتنے اچھے......اور کس قدر مبارک تھے یہ دونوں پڑوسی......

رسول اللہ ﷺ جب تک ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے گھر میں مقیم تھے......ابوایوبؓ تب بھی ہر لمحہ اور ہر آن......آپؐ پر دل وجان سے فدا ہوئے جاتے تھے......جبکہ رسول اللہ ﷺ بھی ابوایوبؓ کے ساتھ انتہائی شفقت ومحبت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے......دونوں طرف سے ہی یہی سلسلے چلتے رہے......اس کے بعد اب جبکہ آپؐ وہاں سے منتقل ہوگئے......تب بھی دونوں طرف یہی تعلقِ خاطر برقرار رہا......گھر تو جدا جدا ہوگئے، لیکن محبتیں اور قربتیں اسی طرح قائم ودائم رہیں......

☆......انہی دنوں ایک بار ایسا ہوا کہ سخت گرمی کے دنوں میں عین دوپہر کے وقت جب خوب گرم لو چل رہی تھی، جھلسا دینے والی گرم ہواؤں کی وجہ سے سبھی لوگ اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے ہوئے تھے، گلی کوچوں میں سناٹا چھایا ہوا تھا، ایسے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے نمودار ہوئے، اور مسجد نبوی کے آس پاس گھومنے لگے، کچھ ہی دیر گذری تھی کہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ بھی وہاں پہنچ گئے، انہیں تعجب ہوا کہ اس قدر شدید گرمی میں یہاں اس وقت اکیلئے یہ کیا کررہے ہیں، نیز انہیں حضرت ابوبکرؓ کے چہرے پر کچھ پریشانی کے آثار بھی محسوس ہوئے......تب انہوں نے دریافت کیا ''اے ابوبکر! اس وقت آپ یہاں کیا کررہے ہیں؟''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جواب دیا ''مجھے بھوک نے بہت زیادہ ستا رکھا ہے،

کچھ سمجھ میں نہیں آیا، تو میں یہاں چلا آیا''

یہ سن کر حضرت عمرؓ نے فرمایا ''میرا بھی بالکل یہی حال ہے''

کچھ ہی دیر گذری تھی کہ رسول اللہ ﷺ وہاں تشریف لائے، اور ان دونوں کو اس وقت وہاں دیکھا تو وجہ دریافت فرمائی......ان دونوں نے وہی وجہ بتادی کہ ''بھوک نے ستا رکھا ہے''

اس پر آپؐ نے فرمایا ''میری بھی یہی کیفیت ہے''

اس کے بعد آپؐ نے ان دونوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''چلو، تم دونوں میرے ساتھ چلو......''

اور پھر یہ تینوں حضرات چل دیئے، سامنے چند قدم کے فاصلے پر ہی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کا گھر تھا، وہاں پہنچ کر رسول اللہ ﷺ رک گئے، اور ان کے دروازے پر دستک دی، جس پر ان کی اہلیہ ام ایوبؓ نے دروازہ کھولتے ہوئے کہا ''مرحبا اے اللہ کے نبی''

آپؐ نے دریافت فرمایا ''ابوایوب کہاں ہیں؟''

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ اس وقت اپنے گھر سے متصل ہی عقبی حصے میں اپنے کھجوروں کے درختوں میں کچھ کام کاج کر رہے تھے، انہوں نے آپؐ کی آواز سنی تو وہ اپنا کام چھوڑ کر فوراً ہی حاضرِ خدمت ہوگئے، آپؐ کو' نیز آپؐ کے دونوں ساتھیوں کو وہاں دیکھ کر نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یوں کہنے لگے ''مرحبا اے اللہ کے نبی، اور مرحبا اے اللہ کے نبی کے ساتھیو''

اس کے بعد حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ نے تینوں معززترین اور گرامی قدر مہمانوں کو گھر میں بٹھایا، اور خود اپنے انہی کھجوروں کے درختوں کی طرف چل دیئے، اور پھر

فوراً ہی کھجوروں کا ایک پورا گچھا درخت سے کاٹ کر لے آئے، جس میں ''تمر'' یعنی خشک کھجوریں بھی تھیں، ''رُطب'' یعنی تازہ بھی تھیں، اور ''بُسر'' یعنی کچھ کچی پکی درمیانی قسم کی بھی تھیں، اور یہ پورا گچھا معزز مہمانوں کے سامنے پیش کر دیا...... یہ منظر دیکھ کر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''ابوایوب! بس کچھ خشک کھجوریں توڑ لی ہوتیں...... یہ پورا گچھا توڑ لانے کی ضرورت تو نہیں تھی'' اس پر انہوں نے عرض کیا ''بس...... میرا جی چاہا کہ میں یہ پورا گچھا ہی پیش کر دوں'' اور پھر مزید عرض کیا ''دیکھئے میں ابھی آپ حضرات کیلئے بکری بھی ذبح کرنے والا ہوں''

تب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ''اگر بکری ذبح کرنا ہی چاہتے ہو تو دیکھنا کوئی دودھ والی بکری ذبح نہ کرنا'' (۱)

اس کے بعد ابوایوب انصاریؓ اور ان کی اہلیہ محترمہ ام ایوبؓ نے جلدی جلدی بکری ذبح کر کے اس کا گوشت ہنڈیا میں چڑھا دیا...... اس کا کچھ سالن تیار کیا، کچھ بھون لیا، اسی دوران ساتھ ساتھ ہی ام ایوبؓ نے کچھ روٹیاں بھی پکا لیں......

اور جب یہ کھانا پیش کیا گیا...... تو رسول اللہ ﷺ نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا، گوشت کا سالن بھی...... کچھ بھنا ہوا گوشت بھی...... تازہ تازہ گرم روٹیاں بھی...... رنگا رنگ مختلف انواع و اقسام کی کھجوروں کا پورا گچھا بھی......

تب اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے کھانے کی جانب غور سے دیکھا...... اور پھر کھانا شروع

(۱) یعنی آپ ﷺ کو یہ اندیشہ ہوا کہ شاید یہ مروت میں ہمارے لئے اب بکری ذبح کریں گے، ممکن ہے کہ ان کے ہاں صرف دودھ دینے والی بکری ہی دستیاب ہو جس کا یہ دودھ پیتے ہوں گے، لیکن اب اگر مروت میں انہوں نے ہمارے لئے وہی بکری ذبح کر ڈالی تو ان کے پاس دودھ کا پھر کیا انتظام ہوگا؟'' اس لئے تاکید فرمائی کہ دودھ والی بکری ذبح نہ کرنا۔

کرنے سے پہلے آپؐ نے ایک روٹی لی، اس پر گوشت کا ایک ٹکڑا رکھا، اور ابوایوبؓ کو پکڑاتے ہوئے فرمایا ''ابوایوب! جایئے ذرہ جلدی سے یہ فاطمہ کو دے آیئے، کیونکہ کتنے ہی دن گذر چکے ہیں کہ اس نے ایسا لذیذ کھانا نہیں کھایا......'' (۱)

اس کے بعد مہمانوں نے خوب سیر ہو کر کھانا کھایا، کھانے سے فراغت کے بعد رسول اللہ ﷺ فرمانے لگے ''تازہ روٹیاں، گوشت، انواع واقسام کی کھجوریں......'' اور اس کے ساتھ ہی آپؐ کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے......اور پھر آپؐ نے مزید فرمایا ''اللہ کی قسم! یہی وہ نعمتیں ہیں جن کے بارے میں قیامت کے روز تم سے سوال کیا جائے گا، لہٰذا جب کبھی تمہیں ایسی نعمت نصیب ہو، اور تم اس کی طرف ہاتھ بڑھانے لگو، تو یوں کہو ''بسم اللہ'' اور جب کھا چکو، تو کہو ''الحمد للہ''۔ (۲)

(۱) اس سے معلوم ہوا کہ اولاد کی محبت، اور ان کیلئے فکر، خیر خواہی و ہمدردی کا جذبہ ''توکل'' یا اسی طرح ''پیغمبرانہ شان'' کے خلاف نہیں ہے......جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اللہ سبحانہ وتعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں جب اپنی اہلیہ محترمہ ہاجرا اور شیر خوار بچے اسماعیل (علیہ السلام) کو ویران وسنسان اور غیر آباد مقام پر (یعنی مکہ میں) چھوڑا تھا......تب وہاں سے واپس روانگی کے وقت ان کیلئے بہت سی دعائیں کی تھیں، جن میں ان کیلئے امن وامان، سکون واطمینان، عقیدہ وایمان کی سلامتی، عبادت کی توفیق، اور خوشحالی وفراوانی کا اللہ سے سوال کیا گیا تھا...... لہٰذا اولاد کی محبت اور ان کی فکر نہ تو توکل کے خلاف ہے، اور نہ ہی پیغمبرانہ شان کے منافی ہے، بلکہ دین ودنیا کا یہی حسین امتزاج، اعتدال اور توازن ہی پیغمبرانہ طریقہ ہے، اور یہی دینِ اسلام کا مزاج ہے۔

(۲) صحیح ابن حبان [۵۲۱۶] الموسوعۃ الشاملہ۔ نیز: المعجم الصغیر للطبرانی [۱۸۵] موقع الجامعۃ الاسلامیہ بالمدینۃ المنورۃ، موسوعۃ الکتب الاسلامیۃ۔

یہاں یہ وضاحت مناسب ہوگی کہ اس واقعے سے ملتا جلتا واقعہ صحیح مسلم میں بھی مذکور ہے، حدیث [۲۰۳۸] کتاب الأشربۃ، باب [۲۰] جواز استتباعہٖ غیرہٗ الیٰ دار من یثق برضاہ بذلک، البتہ وہاں اس واقعے میں حضرت فاطمہؓ کا تذکرہ نہیں ہے، نیز حضرت ابوایوب انصاریؓ کی بجائے ''رجل من الأنصار'' یعنی ''انصار میں سے ایک شخص'' کے الفاظ ہیں۔ (باقی حاشیہ آئندہ صفحہ پر......)

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو یوں رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے فوری بعد آپؐ کی مہمان نوازی کا جو شرف حاصل ہوا......ظاہر ہے یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی......اللہ کے حبیب' خیرالبشر' افضل الرسل' سیدالاولین والآخرین' رحمۃ للعالمین' رسول اکرم' صلی اللہ علیہ وسلم' کی یہ میزبانی یقیناً بہت ہی عظیم اعزاز تھا' جس کیلئے خالقِ ارض وسماء کی طرف سے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا گیا تھا۔

اسی کیفیت میں مدینہ میں وقت گذرتا رہا، شب وروز کا یہ سفر جاری رہا، حتیٰ کہ رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر گیا......آپؐ ہمیشہ تادمِ آخر اپنے صحابیؓ نیز اپنے اولین میزبان حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ سے انتہائی مسرور و مطمئن رہے۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہمیشہ نہایت ذوق وشوق' توجہ اور لگن کے ساتھ آپؐ کی خدمت' نیز آپؐ کی صحبت میں رہتے ہوئے علمی استفادہ اور کسبِ فیض میں مشغول ومنہمک رہے، نیز آپؐ کے مبارک دور میں جتنے بھی غزوات پیش آئے' ہر غزوے کے موقع پر ہمیشہ پیش پیش رہے۔

اور پھر اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر حق وباطل کے درمیان پیش آنے والے ہر معرکے میں ان کی شرکت کا یہ سلسلہ عہدِ نبوی کے بعد خلفائے اربعہ کے دور میں بھی جاری رہا، اور پھر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی ان کی یہی کیفیت رہی......

حاشیہ از صفحہ گذشتہ:

اس کے علاوہ ترمذی، حدیث[۲۳۶۹] باب[۳۹] ماجاء فی معیشۃ أصحاب النبی ﷺ" میں بھی ایسا ہی ایک واقعہ مذکور ہے، لیکن وہاں حضرت ابوایوب انصاریؓ کی بجائے ابوالہیثم بن التیہان الانصاریؓ کا تذکرہ ہے۔ واللہ أعلم۔

چنانچہ دینِ برحق کی سربلندی اور طاغوتی قوتوں کے خلاف لشکرکشی کے موقع پر ان کی مسلسل شرکت کے اس طویل سلسلے کا آخری واقعہ یہ تھا کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوران جب سلطنتِ روم کے دارالحکومت ''قُسطَنطِنیہ''(۱) پر حملے کی غرض سے جب لشکر تیار کیا گیا......اُس وقت حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کافی عمر رسیدہ اور کمزور ہو چکے تھے، ان کی عمر اسّی سال سے تجاوز کر چکی تھی، مگر اس کے باوجود ہمت مضبوط تھی......اللہ کے دین کی سربلندی کیلئے......طاغوتی قوتوں کی سرکوبی کیلئے......ان کا حوصلہ بلند تھا، اور عزم پختہ تھا......لہٰذا اپنی اس جسمانی کمزوری کے باوجود وہ بڑے ہی جذبے اور جوش و خروش کے ساتھ اس لشکر کے ہمراہ روانہ ہو گئے......

لیکن یہ لشکر جب اپنی منزلِ مقصود کی جانب روانہ ہوا تو اس طویل سفر کی صعوبتوں، نیز اس عمر میں طبعی عوارض اور کمزوری کی وجہ سے ان کی طبیعت ناساز ہونے لگی، اس موقع پر لشکر کے سپہ سالار و دیگر ذمہ دار افراد مستقل ان کی مزاج پرسی، تیمارداری، اور خبرگیری کرتے رہے......

آخر اسی کیفیت میں راستے میں ہی ایک روز ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی، تب انہوں نے لشکر کے سپہ سالار و دیگر اپنے تمام ساتھیوں کو کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا ''میری طرف سے اس لشکر میں موجود تمام سپاہیوں کو سلام پہنچانا، اور یہ پیغام بھی پہنچانا کہ:

''ابوایوب کی طرف سے تمہاری لئے یہ وصیت ہے کہ منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد دشمن کے خلاف خوب ڈٹ کر لڑیں، نیز یہ کہ اگر وہ وقت آنے سے قبل ہی میری روح پرواز کر گئی تو

(۱) عام طور پر اس تاریخی شہر کو لوگ ''قسطنطنیہ'' کہتے ہیں، حالانکہ یہ ''قُسطَنطِینیہ'' ہے۔ یہ تاریخی شہر قُسطنطینیہ آجکل ''استنبول'' کے نام سے مشہور و معروف موجودہ ترکی کا ایک شہر ہے۔

اس جنگ کے موقع پر مجھے اٹھا کر میدانِ جنگ میں لے جائیں، اور وہاں مجھے ضرور اپنے ہمراہ ہی رکھیں، اور پھر جنگ کے خاتمے پر مجھے وہاں قُسطَنطینیہ شہر کی فصیل کے پہلو میں دفن کریں''۔

یہ تھے آخری الفاظ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے، ان آخری الفاظ کے ساتھ ہی انہوں نے آخری ہچکی لی، اور اپنی جان اپنے اللہ کے سپرد کردی......

چنانچہ سپاہیوں نے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی اس وصیت پر عمل کرتے ہوئے ان کی میت کو اس سفر کے دوران' اور پھر منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد اس تاریخی اور یادگار معرکے کے موقع پر میدانِ جنگ میں بھی مسلسل اپنے ہمراہ ہی رکھا......کیونکہ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ کی یہی خواہش تھی، اور یہی جذبہ تھا......کہ بہرصورت اس معرکے میں شریک ہوں......موت کا وقت تو اللہ کی طرف سے مقرر ہے، یہی سوچ کر وہ اس معرکے میں شرکت کی غرض سے عازمِ سفر ہوئے تھے، اب اگر موت کا وہ طے شدہ وقت منزل پر پہنچنے سے پہلے ہی آ گیا......تو اللہ کی مرضی......لہٰذا پھر اس معرکے میں جان نکلنے کے بعد ہی شرکت کی جائے گی......لیکن کسی صورت اس معرکے سے پیچھے رہنا انہیں قبول نہیں تھا۔

(یعنی شرکت کا عزم کر رکھا تھا، جذبہ صادق تھا اور نیت خالص تھی، موت کا مقرر وقت وہاں پہنچنے سے پہلے ہی آ گیا، تو بغیر جان کے ہی شرکت سہی......)

منزلِ مقصود پر پہنچنے کے بعد اسلامی لشکر کے ذمہ داروں نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کی وصیت کے مطابق دورانِ جنگ ہر مرحلے پر ان کے جسد اطہر کو اپنے ہمراہ ہی رکھا (یہ ان کی کرامت تھی کہ وفات کے بعد اتنے دن گذر جانے کے باوجود ان کا جسم بدستور درست

حالت میں رہا)

اور پھر جنگ کے اختتام پر ان کی وصیت کے مطابق انہیں قُسطَنطینیہ (استنبول) شہر کی فصیل کے ساتھ سپردِ خاک کر دیا گیا۔

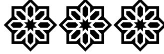
یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ آخری سانس تک اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر کوشاں رہے، اور اسی مقصد کی خاطر منزلِ مقصود کی جانب سفر کے دوران ۵۲ھ میں اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے جب ان کی عمر اسّی برس سے متجاوز ہو چکی تھی۔

حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ مدینہ کے باشندے تھے، جب بھی شہر مدینہ کا تذکرہ ہوگا تو رسول اللہ ﷺ کا تذکرہ بھی ہوگا، نیز ہجرت کے موقع پر آپؐ کی مدینہ تشریف آوری' اور پھر حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں آپؐ کے قیام کا تذکرہ بھی ہوگا...... کہاں شہر مدینہ......؟ کہاں ہزاروں میل دور قُسطَنطینیہ (استنبول)؟ کہاں مدینہ میں خاندان بنونجار کا وہ محلّہ، اور اس محلے میں وہ نخلستان، اور اس نخلستان میں حضرت ابوایوب انصاریؓ کا وہ چھوٹا سا سیدھا سادھا سا گھر...... جہاں خیر البشر' امام الأنبیاء والمرسلین' رحمۃ للعالمین' رسول اکرم ﷺ مہمان بن کر تشریف لائے تھے...... اور پھر اس گھر میں ان دونوں میاں بیوی کی طرف سے آپؐ کی خدمت کے سلسلے میں وہ جذباتی انداز...... وہ معصومانہ باتیں...... جب سخت سردی کے موسم میں پانی کا مٹکا ٹوٹ گیا تھا...... پانی بہہ رہا تھا، ایک ہی رضائی تھی، جس سے یہ دونوں میاں بیوی وہ پانی صاف کرتے رہے...... خود رات بھر تکلیف میں رہے، مگر جان سے پیارے اپنے اس مہمان (ﷺ) کو کوئی تکلیف نہیں پہنچنے دی...... اور جب ایک بار رات بھر دونوں میاں بیوی کونے میں دبکے رہے......

یہ سوچ کر کہ ہم اوپر اور رسول اللہ ﷺ نیچے......؟ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟

وہ چھوٹا سا گھر تو مدینہ کے نخلستان میں تھا (جہاں اب مسجدِ نبوی پوری آب وتاب کے ساتھ آباد ہے) مگر......وہاں سے ہزاروں میل دور استنبول میں یہ اپنی آخری آرامگاہ (جو کہ بحکمِ الٰہی جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہوگی) میں ابدی نیند سو رہے ہیں......یقیناً یہ اسی جذبے کا کرشمہ ہے جو اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر ان کے دل میں موجزن تھا......ان کا یہی مبارک جذبہ آج بھی اہلِ ایمان کو دعوتِ غور وفکر دے رہا ہے......

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۲/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق یکم فروری ۲۰۱۵ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے جلیل القدر صحابی حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا اصل نام زید بن سہل تھا، لیکن یہ اپنی کنیت (ابوطلحہ) سے معروف ہوگئے، ان کا تعلق مدینہ کے مشہور اور معزز ترین خاندان ''بنونجار'' سے تھا۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب رسول اللہ ﷺ کی مکہ سے مدینہ کی جانب ہجرت کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا، اُن دنوں ایک روز انہیں یہ خبر ملی کہ خاندان بنونجار کی ایک معزز خاتون جس کا نام رُمیصاء بنت ملحان النجاریہ تھا اور جو کہ اُم سُلَیم کی کنیت سے معروف تھی' اس کا شوہر کسی جنگ کے موقع پر مارا گیا ہے۔

اُس دور میں (جسے زمانۂ جاہلیت کے نام سے یاد کیا جاتا ہے) قبائلی جنگوں کے سلسلے چلتے رہتے تھے، معمولی باتوں پر اختلاف اور جھگڑا اور پھر خونریزی ......یہی ان کا روزمرہ کا معمول تھا......

کبھی پانی پینے پلانے پہ جھگڑا کبھی گھوڑا آگے بڑھانے پہ جھگڑا

اور پھر یہی معمولی جھگڑے بڑی تباہ کن جنگوں کی شکل اختیار کر لیا کرتے، یہ جنگیں درنسل درنسل عرصۂ دراز تک جاری رہتیں......جس کے نتیجے میں بڑی تعداد میں لوگ مارے جاتے، عورتیں بیوہ ہوجاتیں، بچے یتیم ہوجاتے......یوں اس معاشرے میں مردوں کی تعداد کم' جبکہ عورتوں کی تعداد زیادہ تھی، اب ان بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت کا کیا بنے گا؟ ان کی سرپرستی کون کرے گا؟ اور ان کا ٹھکانہ کہاں ہوگا......؟ یہی وہ مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے اس معاشرے میں ان بیوہ عورتوں کے ساتھ شادی کا عام رواج تھا اور

یہ سلسلہ ان کے ہاں چلتا رہتا تھا...... کہ کوئی مارا گیا......اس کی بیوہ کے ساتھ کسی اور نے شادی کرکے اسے اوراس کے یتیم بچوں کو اپنے گھر میں بسالیا......

جن دنوں اس معزز خاتون اُمِ سُلیم کا شوہر مارا گیا اور یہ خبر ابوطلحہ تک بھی پہنچی ......یہ تقریباً اُن دنوں کی بات تھی کہ جب دعوتِ حق کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں نبوت کے گیارہویں سال حج کے موقع پر منیٰ میں ''یثرب''یعنی مدینہ سے تعلق رکھنے والے چھ افراد مشرف باسلام ہوئے تھے،اور پھر اس کے اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال حج کے موقع پر منیٰ میں ہی آپؐ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مدینہ سے تعلق رکھنے والے بارہ افراد نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خفیہ ملاقات کی تھی، نیز اس موقع پر انہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی ، جسے ''بیعتِ عقبہ اُولیٰ'' کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر انہوں نے گذارش کی تھی کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو ہمارے ساتھ مدینہ روانہ فرمایئے ،تاکہ وہ وہاں ہمیں اللہ کے دین کی تعلیم دے سکے''

اس پر آپؐ نے اپنے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ فرمایا تھا، یوں حضرت مصعبؓ رسول اللہ ﷺ کے اولین سفیر اور نمائندے کے طور پر' نیز معلم و مربی کی حیثیت سے مدینہ پہنچے تھے۔(۱)

مدینہ پہنچنے کے بعد ان کی محنت وکوشش اور دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں اب وہاں بڑی سرعت کے ساتھ دینِ اسلام کی نشر واشاعت ہونے لگی تھی ، دینِ اسلام' اور پیغمبرِ اسلام

(۱) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ ملاحظہ ہو،صفحات [۳۷۹۔۳۹۶]۔

کے چرچے گھر گھر ہونے لگے تھے،اور یوں بہت جلد مدینہ شہر ''لا الٰہ الا اللہ'' کے نور سے جگمگانے لگا تھا......

چنانچہ مدینہ شہر میں وہ لوگ جو کہ اُس دور میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی ان دعوتی کوششوں کے نتیجے میں مسلمان ہوئے تھے، انہی میں اُم سُلیم بھی شامل تھیں، جنہوں نے اپنے آباؤاجداد کے دین یعنی کفر وشرک سے کنارہ کشی اختیار کرتے ہوئے دینِ برحق قبول کرلیا تھا...... جبکہ ان کا شوہر بدستور پرانے دین پر ہی قائم تھا۔

اور پھر انہی دنوں کسی جنگ کے موقع پر اُم سُلیم کے شوہر کی موت واقع ہوگئی تھی، اور عام رواج کے مطابق اب اسے بھی اپنے لئے' نیز اپنے بچوں کیلئے کسی سہارے کی ضرورت تھی، چنانچہ اب بہت سے لوگ اس طرف متوجہ ہوئے، جن میں ابوطلحہ بھی شامل تھے۔

ابوطلحہ نے اس خیال سے کہ کہیں مجھ سے پہلے ہی کوئی اور شخص اس سلسلے میں اُم سُلیم سے بات طے نہ کرلے...... فیصلہ کیا کہ مجھے اس بارے میں تاخیر نہیں کرنی چاہئے ...... اور پھر جلد ہی ایک روز وہ اُم سُلیم کے گھر کی طرف چل دیئے ...... اس یقین کے ساتھ کہ اُم سُلیم انہیں دوسرے تمام لوگوں کے مقابلے میں ترجیح دے گی، کیونکہ اس معاشرے میں ان کی خاص حیثیت تھی، خوشحال بھی بہت تھے، شجاعت و بہادری میں بھی بے مثال تھے، مزید یہ کہ گھڑسواری' تیراندازی' ودیگر فنونِ حرب وضرب میں انہیں بڑی مہارت حاصل تھی......

البتہ راستے میں چلتے چلتے انہیں یاد آیا کہ اُمِ سُلیم تو اب اپنا مذہب تبدیل کرچکی ہے، مسلمان ہوچکی ہے...... جبکہ میں آباؤاجداد کے دین پر ہی قائم ہوں...... لہٰذا کہیں ایسا نہو کہ اس وجہ سے وہ اس رشتے کو ٹھکرا دے، اور میرے ساتھ شادی سے انکار کردے...... لیکن جلد ہی وہ یہ سوچ کر مطمئن ہوگئے کہ اُمِ سُلیم کے قبولِ اسلام کے بعد بھی اس کا شوہر تو بدستور پرانے

دین پر ہی قائم رہا تھا، اور دونوں میں میاں بیوی کا رشتہ برقرار تھا...... لہٰذا میرے رشتے کو وہ محض اس وجہ سے کیوں ٹھکرائیگی؟

انہی سوچوں میں گم ابوطلحہ آخر اُم سُلیم کے گھر جا پہنچے، دروازہ کھٹکھٹایا، تعارف کے بعد اندر آنے کی اجازت طلب کی، اس وقت اتفاقاً گھر میں اُمِ سُلیم کا نوعمر بیٹا اَنس بھی موجود تھا۔(۱)

سلام ودعاء اور رسمی گفتگو کے بعد ابوطلحہ نے آمد کا مقصد بیان کیا...... جس پر اُم سُلیم نے جواب دیا ''ابوطلحہ! آپ جیسے اچھے انسان کا رشتہ ٹھکرانا مناسب تو نہیں ہے، لیکن...... بات یہ ہے کہ ہمارا دین جدا جدا ہے، لہٰذا یہ رشتہ قبول کرنا میرے لئے ممکن نہیں ہے''

ابوطلحہ نے یہ خلافِ توقع جواب سنا تو یوں کہنے لگے ''اُم سُلیم! انکار کی یہ تو کوئی وجہ نہ ہوئی''

اس پر اُمِ سُلیم نے کہا ''پھر آپ کیا سمجھتے ہیں، میری طرف سے انکار کی کیا وجہ ہے؟''

ابوطلحہ بولے ''انکار کی وجہ یقیناً یہی ہوسکتی ہے کہ شاید کوئی مجھ سے قبل تمہیں زیادہ سونے چاندی کی پیشکش کر چکا ہے''

ابوطلحہ کی زبانی یہ بات سنتے ہی اُمِ سُلیم برجستہ بولیں ''ابوطلحہ! میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتی ہوں کہ اگر آپ مسلمان ہو جائیں تو میں بغیر کسی مہر کے ہی آپ کا رشتہ منظور کرلوں گی...... آپ کا قبولِ اسلام ہی میرے لئے مہر ہوگا...... اور بس''

تب ابوطلحہ کہنے لگے ''یہ کیسے ممکن ہے کہ میں اپنے آباؤ اجداد کے دین سے روگردانی اختیار کرلوں......؟''

(۱) یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جن کی عمر اس وقت محض نو سال تھی، جو کہ بعد میں رسول اللہ ﷺ کے خادمِ خاص اور بڑے جلیل القدر صحابی کی حیثیت سے معروف ہوئے، ان کا مفصل تذکرہ صفحہ [۵۷۰] پر ملاحظہ ہو۔

اس پر اُم سُلیم مسکراتے ہوئے کہنے لگیں ''ابوطلحہ! کیا آپ نہیں جانتے کہ جس خدا کی آپ عبادت کرتے ہیں' اور آپ سے پہلے آپ کے آباؤاجداد بھی جس کی عبادت کرتے چلے آئے ہیں...... آپ کا وہ خدا تو محض اس زمین سے اُگا ہوا ہے(۱) ذرہ سوچئے...... کیا آپ کو ایسے خدا کی عبادت کرتے ہوئے شرم محسوس نہیں ہوتی کہ جسے آپ خود کسی درخت کے تنے سے کاٹ کر تیار کرتے ہیں...... جبکہ اسی کے ساتھ کی باقی لکڑی کو چولہے میں جھونک کر اس پر کھانا پکا لیتے ہیں......؟''

اُم سُلیم کی زبانی یہ عجیب وغریب بات سن کر ابوطلحہ پہلی بار اس بارے میں عجیب سی شرمندگی محسوس کرنے لگے، اور پھر قدرے توقف کے بعد کہنے لگے ''تمہاری یہ بات تو بالکل درست ہے، حقیقت تو یہی ہے''

اور پھر کچھ دیر غور وفکر کے بعد اُم سلیم سے دریافت کیا ''اگر میں مسلمان ہونا چاہوں تو مجھے کیا کرنا ہوگا؟ کہاں جانا ہوگا؟

اُم سُلیم نے جواب دیا ''آپ کو کہیں بھی جانے کی قطعاً ضرورت ہی نہیں، یہ کام تو ابھی اور یہیں ہوسکتا ہے...... بس آپ کو یہ کرنا ہوگا کہ سچے دل سے اور خلوصِ نیت کے ساتھ کفر وشرک سے ہمیشہ کیلئے توبہ کریں، اپنی زبان سے ''کلمۂ حق'' یعنی ''أشهد أن لا اله الا الله، وأشهد أن محمداً رسول الله'' پڑھیں، اور پھر سیدھے اپنے گھر جا کر اپنے اس بت کو توڑ ڈالیں جس کی آپ' اور آپ کے آباؤاجداد نسل درنسل عبادت کرتے چلے آرہے ہیں''۔

(۱) اُس دور میں پتھر کے بت بھی ہوا کرتے تھے، اور لکڑی کے بھی، جن علاقوں میں درخت وغیرہ نہیں تھے وہاں اکثر پتھروں کو تراش کر بت تیار کئے جاتے تھے (مثلاً مکہ میں) جبکہ جہاں درخت اور باغ وغیرہ ہوا کرتے تھے وہاں اکثر درختوں کے تنوں کو کاٹ کر بت بنائے جاتے تھے (مثلاً مدینہ میں) لہٰذا اُم سُلیم کا یہی مقصد تھا کہ تمہارا وہ خدا تو محض زمین سے اگی ہوئی ایک لکڑی ہے......

چنانچہ اُمِ سُلیم کی اس نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ابوطلحہ نے ایسا ہی کیا، اسی وقت کلمۂ حق پڑھتے ہوئے مسلمان ہوگئے، اور پھر گھر پہنچتے ہی اپنے اس خاندانی بت کو توڑ کر پھینک دیا...... نیز اس کے بعد اُمِ سُلیم رضی اللہ عنہا کے ساتھ ان کی شادی بھی ہوگئی، تب مدینہ شہر میں یہ بات مشہور ہوگئی کہ اُمِ سُلیمؓ نے اپنی شادی میں ''مہر'' کے طور پر فقط یہ مطالبہ رکھا کہ ابوطلحہ مسلمان ہوجائیں، ان کے ''قبولِ اسلام'' کو ہی اپنے لئے مہر قرار دیا، اس کے سوا اور کچھ مطالبہ نہیں کیا...... حالانکہ اس موقع پر عورتیں بہت کچھ مانگا کرتی ہیں...... لیکن اُمِ سُلیم نے کچھ بھی نہیں مانگا...... یوں اس معاشرے میں کہ جہاں اُمِ سُلیم کو پہلے ہی کافی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا...... اب ان کی عزت ہمیشہ کیلئے مزید بڑھ گئی......

☆...... حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اب دینِ اسلام قبول کرنے کے بعد مدینہ میں حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مجلس میں بڑی پابندی کے ساتھ حاضر ہونے لگے، نہایت ذوق وشوق اور خوب توجہ وانہماک کے ساتھ دینی علم حاصل کرتے، مزید یہ کہ ان کے ہمراہ مدینہ میں گلی گلی قریہ قریہ گھوم پھر کر دینِ برحق کی نشر واشاعت کی خاطر شب وروز کوشاں وسرگرداں رہتے، اپنا مال ودولت' اپنی شہرت وحیثیت' نیز اپنی تمامتر توانائیاں اور صلاحیتیں اب انہوں نے اسی مقصد کیلئے وقف کردیں۔

☆...... نبوت کے بارہویں سال منیٰ میں بیعتِ عقبہ ثانیہ کے موقع پر جب اس بیعت میں شریک بارہ افراد کی طرف سے درخواست اور گذارش کے جواب میں رسول اللہ ﷺ نے اپنے اولین سفیر' نیز معلم ومربی کی حیثیت سے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان افراد کے ہمراہ مدینہ روانہ فرمایا تھا...... چنانچہ مدینہ پہنچنے کے بعد ان کی اس محنت وکوشش کے نتیجے میں...... بتوفیقِ الٰہی...... دینِ اسلام بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتا چلا گیا تھا......

جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ محض اگلے ہی سال یعنی نبوت کے تیرہویں سال حج کے موقع پر مدینہ سے حجاج کا جو قافلہ مکہ کی جانب روانہ ہوا' اس میں بہتّر افراد ایسے تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ برحق قبول کر چکے تھے، لہٰذا انہوں نے مکہ پہنچنے کے بعد منیٰ میں ہی عقبہ کے مقام پر رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات' نیز آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی (یعنی بیعتِ عقبہ ثانیہ) اور پھر یہی وہ موقع تھا کہ جب ان حضرات نے مکہ میں نامساعد حالات کے پیشِ نظر رسول اللہ ﷺ کو اب مستقل طور پر اپنا آبائی شہر مکہ چھوڑ کر مدینہ چلے آنے کی دعوت دی تھی......جس کے نتیجے میں ہجرتِ مدینہ کا انتہائی اہم ترین واقعہ پیش آیا تھا (جو کہ تاریخِ اسلام میں ہمیشہ کیلئے فیصلہ کن تبدیلی کا نقطۂ آغاز ثابت ہوا تھا) الغرض یہ خوش نصیب ترین افراد جو اس تاریخی اور مبارک ترین بیعت کے موقع پر موجود تھے اور جنہوں نے آپ ﷺ کو مدینہ چلے آنے کی دعوت دی تھی' انہی میں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

مزید یہ کہ اس بیعت کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے ان بہتّر افراد میں سے بارہ افراد کو ''نقیب'' مقرر فرمایا تھا، یعنی مدینہ واپسی کے بعد وہاں دینِ اسلام اور مسلمانوں سے متعلق جو بھی معاملات تھے' ان کی دیکھ بھال اور نگرانی کے فرائض سرانجام دیتے رہنا...... چنانچہ یہ بارہ ''نقباء'' جن کا انتخاب خود رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا، ان میں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

☆......اس کے کچھ ہی عرصے بعد جب رسول اللہ ﷺ مکہ سے ہجرت فرما کر مدینہ تشریف لے آئے......تب حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ ہمیشہ آپؐ کی خدمت' صحبت ومعیت اور کسبِ فیض میں پیش پیش رہنے لگے......آپؐ کے ساتھ انہیں انتہائی عقیدت ومحبت تھی،

جوکہ ان کے رگ وپے میں سرایت کرگئی تھی۔

☆......ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد یعنی ۲ھ سے ہی مشرکینِ مکہ کی طرف سے مسلمانوں کے خلاف مسلح لشکرکشی کا سلسلہ شروع ہوگیا تھا جس کے نتیجے میں مدنی زندگی میں متعدد غزوات کی نوبت آتی رہی، ایسے میں ہر غزوے کے موقع پر حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت ہمیشہ پیش پیش رہے اور بے مثال جرأت وشجاعت کا مظاہرہ کرتے رہے......

بالخصوص ۳ھ میں تاریخی غزوۂ اُحد کے موقع پر جب مسلمان اپنی ہی ایک غلطی کی وجہ سے جیتی ہوئی جنگ ہار گئے تھے، اور تب انہیں بڑی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا تھا، ایسے میں ایک موقع ایسا بھی آیا تھا جب رسول اللہ ﷺ کے ہمراہ محض گنتی کے چند افراد رہ گئے تھے، جوکہ اس نازک ترین موقع پر آپؐ کی طرف سے مدافعت وحمایت کی خاطر بڑی ہی بے جگری اور ثابت قدمی کے ساتھ لڑتے رہے تھے......انہی مٹھی بھر افراد میں حضرت ابوطلحہ انصاریؓ بھی شامل تھے، جو اس موقع پر دشمنوں کو آپؐ سے دور رکھنے کی خاطر مسلسل تیراندازی کرتے رہے، حتیٰ کہ اُس روز ان کے ہاتھوں میں پے در پے تین کمانیں ٹوٹیں۔(۱)

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا آپؐ کے ساتھ ہمیشہ ہی جو والہانہ قرب اور دلی تعلق رہا اس کا اندازہ اس بات سے بھی کیا جاسکتا

(۱) یہاں یہ وضاحت ہوجائے کہ غزوۂ اُحد کے موقع پر ہی حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ کا کردار بھی بہت یادگار اور تاریخی تھا، جو اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کی حفاظت کی خاطر دشمنوں کے تیروں کو مسلسل اپنے ہاتھوں پر روکتے رہے تھے، جس کی وجہ سے ان کا ایک ہاتھ مستقل مفلوج ہوگیا تھا، لہٰذا یہ بات یاد رہے کہ وہ حضرت طلحہ بن عبیداللہ رضی اللہ عنہ تھے جو کہ ''عشرہ مبشرہ'' میں سے، نیز مہاجرینِ مکہ میں سے تھے (ان کا تذکرہ صفحات [۱۹۵۔۲۰۸] پر ملاحظہ ہو) جبکہ یہ حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ ہیں جو کہ مدینہ کے باشندے تھے۔

ہے کہ یہ تعلقِ خاطر محض ان کی ذات تک ہی محدود نہیں تھا، بلکہ ان کے پورے گھرانے کیلئے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے بہت زیادہ شفقتوں اور عنایتوں کے سلسلے تھے۔

چنانچہ ان کا ایک کم سن بیٹا جو ''ابوعمیر'' کے نام سے معروف تھا، اس نے ایک چھوٹا سا پرندہ پال رکھا تھا جسے عربی میں ''نُغیر'' کہا جاتا ہے، یہ کم سن بیٹا ہر وقت اپنے اس پرندے کے ساتھ کھیلتا رہتا تھا اور اسے بہت زیادہ لاڈ پیار کیا کرتا تھا...... چنانچہ آپؐ جب بھی اسے دیکھتے تو اسے مخاطب کرتے ہوئے یوں دریافت فرمایا کرتے تھے: یا أبا عُمیر! ما فَعَلَ النُغَیر...... ؟ یعنی ''اے ابوعمیر! تمہارے نُغیر کی کیا خبر ہے......؟''

اور پھر ایک روز اچانک وہ پرندہ مرگیا، جس پر ابوعمیر انتہائی رنجیدہ اور ہمہ وقت بجھا بجھا سا رہنے لگا...... ایسے میں رسول اللہ ﷺ جب بھی اسے دیکھتے تو اسے تسلی دیا کرتے اور اسے خوش کرنے کی کوشش کیا کرتے......

اسی طرح حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے ایک ''ربیب'' (یعنی ان کی اہلیہ محترمہ اُم سُلیم کے پہلے شوہر سے بیٹے) جن کا نام انس بن مالک (رضی اللہ عنہ) تھا، آپؐ ان کے ساتھ بہت زیادہ شفقت وعنایت کا معاملہ فرمایا کرتے تھے۔

اسی طرح حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے اس ''ربیب'' یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے چچا حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بہت ہی والہانہ اور جذباتی تعلق تھا، غزوۂ اُحد کے موقع پر انہوں نے اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر جس طرح بے مثال شجاعت وبہادری کے ساتھ لڑتے ہوئے اپنی جان کا نذرانہ پیش کیا تھا وہ تاریخِ اسلام کا ایک یادگار واقعہ ہے، حتیٰ کہ اسی واقعے کے حوالے سے قرآن کریم کی یہ عظیم آیت نازل ہوئی تھی ﴿مِنَ المُؤمِنِینَ رِجَالٌ صَدَقُوا مَا عَاهَدُوا اللّٰهَ

عَـلَيـهِ ......﴾ (۱) یعنی ''ایمان والوں میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ جو عہد کیا تھا وہ پورا کر دکھایا''۔(۲)

اسی طرح حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ اُم سُلیم کی بہن (حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی خالہ) ''اُم حرام'' بڑی تاریخی شخصیت تھیں ، صحابیات میں ان کا بڑا مقام ومرتبہ تھا، یہ رسول اللہ ﷺ کے مشہور ومعروف اور جلیل القدر صحابی حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کی اہلیہ تھیں ،جن کا رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہمیشہ بہت خاص اور قریبی تعلق رہا تھا۔

☆......حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی اہلیہ محترمہ اُم سُلیم کی اپنے سابق شوہر سے بھی اولاد تھی ،جن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ قابلِ ذکر تھے،اور پھر حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ ان کی شادی کے بعد اللہ نے ان دونوں کو مزید اولاد سے نوازا۔

خاص طور پر ان دونوں کے ایک بیٹے کا تذکرہ تمام کتبِ حدیث میں بڑی تفصیل کے ساتھ مذکور ہے جس میں تمام مسلمانوں کیلئے بہت بڑا سبق اور اہم ترین نصیحت ہے ، بالخصوص ''صبر'' اور ''رِضاء بالقضاء'' کے باب میں یہ واقعہ ہمیشہ بطورِ مثال بیان کیا جاتا ہے۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ ان دونوں کا ایک کمسن بچہ تھا، جو ایک بار بیمار پڑ گیا، کافی دن گذر گئے ،لیکن اس کی طبیعت سنبھل نہیں سکی، یہ چیز ان دونوں کیلئے بڑی پریشانی کا سبب

(۱) سورۃ الأحزاب[۲۳]

(۲) یہاں وضاحت ہوجائے کہ یہ آیت اگرچہ بطورِ خاص اور بالتحدید حضرت انس بن النضر رضی اللہ عنہ کے بارے میں تو نازل نہیں ہوئی ......تاہم اس کا جو شانِ نزول تھا اور اس سے جن عظیم ترین افراد کی طرف اشارہ مقصود تھا ان میں یہ یقیناً شامل تھے، بلکہ سرِ فہرست تھے۔

بنی ہوئی تھی۔

ایک روز ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ جب کسی ضروری کام کاج کے سلسلے میں گھر سے باہر گئے ہوئے تھے، تب ان کی غیر موجودگی میں بچے کی طبیعت اچانک مزید بگڑ گئی، حالت کافی نازک ہوگئی، اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ اپنے ماں باپ کو داغِ مفارقت دے گیا......

اب بچے کی ماں یعنی اُم سُلیم (رُمیصاء بنت ملحان النجاریہ رضی اللہ عنہا) کو ایک تو اپنے ننھے معصوم لختِ جگر کی موت کا صدمہ کھائے جا رہا تھا، اس کے علاوہ مزید اب انہیں یہ پریشانی لاحق تھی کہ بچے کا باپ تو صبح سے ہی گھر سے باہر گیا ہوا ہے، ہمارے لئے رزق کے انتظام کے سلسلے میں صبح سے جدوجہد میں مشغول ہوگا، اور جب دن بھر کی محنت اور جدوجہد کے بعد تھکاوٹ سے چور شام کو لوٹ کر گھر آئے گا، تب ہم اس کی خدمت کی بجائے اور اس کیلئے راحت وآرام کے انتظام کی بجائے...... یہ اس قدر المناک خبر اسے سنائیں گے......؟

آخر کچھ وقت گذرنے کے بعد اُم سُلیم کے ہوش وحواس جب قدرے بحال ہونے لگے تو انہوں نے گھر میں سب کو سختی کے ساتھ یہ تاکید کی کہ ''شام کو ابوطلحہ جب گھر آئیں گے تو خبردار! انہیں اس بچے کی وفات کے بارے میں کوئی کچھ نہیں بتائے گا...... جو کچھ بھی بتانا ہوگا...... اور جس طرح بتانا ہوگا...... یہ نازک ترین کام میں خود ہی انجام دوں گی''

اور پھر بچے کے اوپر چادر اڑھا دی، اور اسے ڈھانپ دیا۔

جب شام ہوئی، ابوطلحہ رضی اللہ عنہ گھر آئے...... تھکاوٹ سے چور...... لیکن حسبِ توقع گھر میں قدم رکھتے ہی انہوں نے سب سے پہلے یہی سوال کیا کہ ''بچے کی طبیعت اب کیسی ہے؟''

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ چونکہ علیٰ الصبح گھر سے جب روانہ ہوئے تھے اُس وقت

بچے کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی، لہٰذا گھر سے روانگی کے بعد دن بھر وہ اسی پریشانی میں مبتلا رہے تھے......اُس دور میں آجکل کی طرح رابطے کی کوئی سہولت میسر نہیں تھی......لہٰذا تمام دن وہ اسی فکر میں کھوئے رہے تھے کہ......نہ جانے......گھر میں کیا ہو رہا ہوگا؟ بچے کی کیا کیفیت ہوگی؟ یہی وجہ تھی کہ دن بھر کے انتظار کے بعد شام کو گھر پلٹتے ہی سب سے پہلے انہوں نے بچے کی خیریت دریافت کی۔

شوہر کی زبانی یہ سوال سن کر اُم سُلیمؓ کچھ دیر کیلئے اندر سے لرز کر رہ گئیں، بہت زیادہ گھبرا گئیں، لیکن فوراً ہی خود کو سنبھالا، حوصلہ مضبوط کیا، اور یوں کہا: هُوَ أسْكَنُ مَا كَانَ، یعنی ''پہلے کی بنسبت اب وہ آرام میں ہے'' (۱)

ابوطلحہؓ بیوی کی زبانی یہ جواب سن کر مطمئن ہوگئے، مزید یہ کہ جب انہوں نے یہ منظر دیکھا کہ بچے کے اوپر تو چادر اُڑھا رکھی ہے......تو انہوں نے چادر ہٹا کر اسے دیکھنا بھی اُس وقت مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں ایسا کرنے کی وجہ سے اس کی نیند میں خلل واقع نہو جائے۔

اُس روز اُم سُلیمؓ نے کھانا بھی ابوطلحہؓ کی آمد سے قبل ہی تیار کرلیا تھا، تاکہ جیسے ہی وہ گھر پہنچیں تو انہیں فوراً کھانا پیش کر دیا جائے، اور یوں وہ مشغول ہو جائیں اور فوری طور پر ان کی توجہ بچے کی طرف نہ جائے......چنانچہ اب فوراً ہی انہوں نے کھانا پیش کر دیا، کچھ وقت اس طرح گذر گیا، ابوطلحہؓ یہ سوچ کر اب کافی مطمئن اور بے فکر بھی تھے کہ بچے کی طبیعت تو آج بہتر ہے......آرام سے سو رہا ہے، لہٰذا کھانے کے بعد بھی دیر تک میاں بیوی کے درمیان

(۱) یعنی یہ بات کہتے وقت اُم سُلیم نے دل میں نیت یہ کی ہوگی کہ بچہ جب تک زندہ تھا بیمار تھا، بڑی تکلیف میں تھا......لیکن اب زندگی ہی نہیں رہی تو تکلیف بھی ختم ہوگئی......نیز یہ مطلب بھی ہوسکتا ہے کہ یہ تو بہت چھوٹا معصوم بچہ تھا، لہٰذا موت کے بعد کے مراحل میں اس کیلئے کوئی حساب وکتاب نہیں ہوگا، کوئی عذاب نہیں ہوگا، لہٰذا اس کیلئے تو اگلے جہان میں بہتری ہی ہے۔

خوشگوار ماحول میں گفتگو چلتی رہی، حتیٰ کہ اس دوران ازدواجی معاملات کی نوبت بھی آئی۔
یہ سب کچھ ہو جانے کے بعد اُم سُلیم رضی اللہ عنہا نے اپنے شوہر ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کو مخاطب کرتے ہوئے...... بڑے ہی حوصلے کے ساتھ...... پُرسکون انداز میں یوں کہا: يَـا أَبَـا طَلحة! أرَأيتَ لَو أنّ قَوماً أعَارُوا عَارِيَتَهُم أهلَ بَيتٍ ، فَطَلَبُوا عَارِيَتَهُم ، أ لَهُم أن يَمنَعُوهُم؟ یعنی ''اے ابوطلحہ! اگر کسی نے کسی کے پاس اپنی کوئی چیز بطورِ امانت رکھوائی ہو، اور پھر کچھ عرصے بعد وہ اپنی امانت واپس طلب کرے، تو جس کے پاس امانت رکھوائی ہے، کیا اسے اس بات کا حق ہے کہ وہ اس کی امانت لوٹانے سے انکار کر دے؟''
ابوطلحہؓ نے فوری اور برجستہ جواب دیا کہ ''نہیں......اسے کوئی حق نہیں پہنچتا''
تب اُم سُلیمؓ نے کہا: فَـاحْتَسِـبْ ابنَكَ ...... یعنی ''لہٰذا......اب آپ بھی اپنے بیٹے کے بارے میں بس اللہ سے ثواب کی امید رکھئے''
(یعنی ہمارے پاس وہ اللہ کی امانت تھی، اللہ نے اپنی امانت واپس لے لی، لہٰذا اب آپ اللہ سے ثواب کی امید رکھتے ہوئے اس صدمے پر صبر سے کام لیجئے)
یہ بات ابوطلحہؓ کیلئے بالکل ہی اچانک اور غیر متوقع تھی، لہٰذا اپنی اہلیہ کی زبانی وہ یہ خبر سن کر بہت ناراض ہوئے، اور خوب غصے کی کیفیت میں یوں کہنے لگے: تَـرَكْـتِـنِي، حَتّـىٰ اِذا تَـلَطَخْتُ...... ثُمّ أخْبَرتِنِي بِابْنِي......؟ یعنی ''اب......اتنا کچھ ہو جانے کے بعد تم مجھے میرے بیٹے کی موت کی خبر سنا رہی ہو؟
اور پھر صبح ہوتے ہی ابوطلحہؓ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور یہ تمام صورتِ حال بیان کی...... جسے سننے کے بعد آپؐ نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا: بَـارَكَ اللّٰهُ لَكُمَا فِي لَيلَتِكُمَا ...... یعنی ''آج رات کے تم دونوں کے اس تعلق میں اللہ

خیر و برکت عطاء فرمائے......"

اس کے بعد جب کچھ عرصہ گزر چکا تو اُم سُلیم کو حمل کے آثار محسوس ہونے لگے......وقت گذرتا رہا، اور ولادت کے دن قریب آتے گئے۔

☆......حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا یہ معمول تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت اور صحبت ومعیت میں زیادہ سے زیادہ وقت گذارنے کی کوشش کیا کرتے تھے، حتیٰ کہ اگر کبھی آپؐ مدینہ سے باہر کسی سفر پر تشریف لے جاتے، تب بھی ابوطلحہؓ ہمیشہ آپؐ کے ہمراہ ہی رہا کرتے......تاکہ دورانِ سفر آپؐ کی خدمت' نیز بوقتِ ضرورت آپؐ کی حفاظت اور حمایت ومدافعت کا فریضہ بھی انجام دیا جاسکے......

چنانچہ ایک بار رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ابوطلحہ رضی اللہ عنہ کسی سفر پر گئے ہوئے تھے، اُس وقت ان کی اہلیہ اُم سُلیم بھی ہمراہ تھیں، سفر سے واپسی پر جب یہ حضرات مدینہ سے کچھ فاصلے پر تھے......تو شام ہونے لگی، آپؐ کا معمول یہ تھا کہ آپؐ جب بھی کسی سفر سے واپس تشریف لاتے تو رات کے وقت اپنے گھر نہیں لوٹتے تھے، بلکہ ہمیشہ دن کی روشنی میں ہی گھر تشریف لایا کرتے تھے۔

چنانچہ اُس روز بھی جب شام ہونے لگی تو آپؐ نے اب کسی جگہ توقف کئے بغیر سفر جاری رکھا......تاکہ رات کا اندھیرا چھانے سے قبل گھر پہنچ سکیں......

جبکہ عین اسی وقت اُم سُلیم رضی اللہ عنہا کو دردِ زِہ محسوس ہونے لگا، اب یہ میاں بیوی دونوں بہت زیادہ پریشان ہونے لگے......کیونکہ اس حالت میں سفر جاری رکھنا بہت مشکل تھا، اور اگر یہ دونوں رُک جاتے ہیں، تو رسول اللہ ﷺ کا ساتھ چھوٹ جائے گا، اور یہ چیز بھی انہیں کسی صورت گوارا نہیں تھی......

آخراس نازک موقع پرحضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ خوب دل لگا کراور گڑگڑا کر اللہ سے دعاء ومناجات میں مشغول ومنہمک ہوگئے، دورانِ دعاء وہ بار بار یہ الفاظ دہراتے کہ ''یااللہ! تو خوب جانتا ہے کہ مجھے یہ بات بہت زیادہ پسند ہے کہ تیرے رسول ﷺ جب بھی مدینہ سے کہیں روانہ ہوں تو میں بھی ان کے ہمراہ رہوں، اور جب بھی ان کی مدینہ واپسی ہوتب بھی میں ان کے ہمراہ ہی رہوں......لیکن......یااللہ تو دیکھ رہا ہے کہ آج میں یہ کیسی مشکل میں پھنس گیا ہوں''

دعاء ومناجات اوراللہ کے سامنے فریاد کا سلسلہ کچھ دیراسی طرح جاری رہا......اور پھر اچانک ہی اُم سُلیم انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہنے لگیں ''اے ابوطلحہ! میں جو تکلیف محسوس کررہی تھی وہ اب ختم ہوچکی ہے......لہٰذا اب اطمینان کے ساتھ سفر جاری رکھئے'' (یعنی اس نازک موقع پرابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی دعاء فوری طور پرقبول ہوئی، جوکہ یقیناً ان کی کرامت تھی اوران کے اخلاص کا نتیجہ تھا)

اورپھرمدینہ شہرپہنچتے ہی اُم سُلیم کودوبارہ وہی تکلیف محسوس ہوئی، اورتب ان کے ہاں بیٹے کی ولادت ہوئی، ولادت کے فوری بعداُم سُلیمؓ نے اپنے اس نومولودنورِنظرکواپنے بیٹے انس (یعنی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ، جواُن کے پہلے شوہرسے تھے) کی گود میں ڈالتے ہوئے یہ تاکید کی کہ اسے فوراً رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں لے جاؤ......نیز کچھ کھجوریں بھی ہمراہ بھیجیں......

چنانچہ انس (رضی اللہ عنہ) اس نومولودکولئے ہوئے آپؐ کی خدمتِ اقدس میں پہنچے، آپؐ نے اس نومولودکودیکھ کرنہایت مسرت کا اظہارفرمایا، نیز ایک کھجوراپنے دانتوں سے چبا کر کچھ نرم کی، اورپھراس کا کچھ حصہ اپنی انگشتِ مبارک سے اس بچے کوچٹایا(۱)

نیز اس موقع پر آپؐ نے اس بچے کا نام ''عبداللہ'' تجویز فرمایا، اور اسے دعائے خیر و برکت سے بھی نوازا۔(۱)

رسول اللہ ﷺ نے اس نومولود کیلئے دعائے خیر و برکت فرمائی تھی، اولاً تو اس کی ولادت سے بہت پہلے جب ان دونوں میاں بیوی کا وہ کمسن بیٹا وفات پا گیا تھا، اور تب اُس موقع پر آپؐ نے ارشاد فرمایا تھا: بَـارَكَ اللّٰهُ لَكُمَا فِي لَيلَتِكُمَا ...... یعنی ''آج رات کے تم دونوں کے اس تعلق میں اللہ خیر و برکت عطاء فرمائے''

اور پھر اُس واقعے کے بعد اب اِس نومولود کی پیدائش ہوئی تھی، لہٰذا ظاہر ہے کہ آپؐ کی یہ دعاء اسی نومولود کیلئے تھی......مزید یہ کہ اِس کی ولادت کے فوری بعد اب آپؐ نے دوبارہ اسے دعائے خیر و برکت سے نوازا......

لہٰذا اسی کا یہ اثر تھا کہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے اس بچے میں' اور پھر مزید یہ کہ آگے اس کی نسل میں بھی اس خیر و برکت کے آثار جاری رہے، چنانچہ یہ بچہ (عبداللہ بن ابی طلحہ الانصاریؓ) جب بڑا ہوا تو اللہ نے اسے یکے بعد دیگرے نو بیٹے عطاء فرمائے، جو بڑے ہونے کے بعد انتہائی شریف النفس ثابت ہوئے تھے، نیز بڑے ہونے کے بعد یہ سب عالمِ دین اور حافظِ قرآن بھی بنے۔

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۱) عربی میں اس عمل کو ''تحـنیک'' کہا جاتا ہے، یعنی نومولود کو فوری طور پر کوئی چیز چٹانا، مقصد یہ کہ آپؐ نے اپنی انگشتِ مبارک سے وہ کھجور جسے آپؐ نے چبایا بھی تھا، اس نومولود کو چٹائی۔

(۱) یہ واقعہ مشہور و معروف متفق علیہ حدیث میں مذکور ہے جس کی ابتداء اس طرح ہے: كَـانَ ابنٌ لأبي طَلحَةَ يَشتَكِي ، فَخَرَجَ أبوطَلحَة ، فَقُبِضَ الصّبِيُ ...... امام نووی رحمہ اللہ نے ریاض الصالحین میں ''باب الصبر'' میں یہ حدیث درج کی ہے، نمبر: ۴۴۔

☆......سخاوت وفیاضی:

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ جس طرح ہمیشہ امن اور جنگ' سفر اور حضر' ہر موقع پر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر رہے' آپؐ کی صحبت ومعیت' علمی استفادہ' اور کسبِ فیض میں ہمہ وقت مشغول ومنہمک رہے......نیز دینِ برحق کی سربلندی کیلئے ہمیشہ پیش پیش رہے......اسی طرح ان کی ایک خاص بات یہ بھی تھی کہ اللہ نے انہیں کافی خوشحالی وفراوانی سے نوازا تھا......اللہ کے دیئے ہوئے اس مال ودولت میں سے یہ ہمیشہ اللہ کی راہ میں' اللہ کے بندوں کی فلاح وبہبود کی خاطر' نیز اللہ کے دین کی سربلندی اور نشر واشاعت کی خاطر نہایت ہی سخاوت وفیاضی اور دریادلی کے ساتھ اپنا مال خرچ کیا کرتے تھے۔

اس حوالے سے ان کا ایک واقعہ کافی مشہور ہے جو کہ اکثر کتبِ تفسیر وحدیث وتاریخ میں مفصل مذکور ہے۔

واقعہ کچھ اس طرح ہے کہ مدینہ میں مسجدِ نبوی سے متصل ان کا ایک باغ تھا(۱) جس میں بکثرت کھجوروں کے درخت تھے،اس کے علاوہ اس میں انگور بھی بہت زیادہ تھے،ان کے اس باغ کی کھجوریں اور انگور بہت ہی اعلیٰ قسم کے اور انتہائی خوش ذائقہ تھے،دور دور تک ان کے اس باغ کی اور اس کے میٹھے اور لذیذ ترین پھلوں کی بڑی شہرت تھی،نیز اس میں ایک کنواں بھی تھا جس کا پانی کافی خوش ذائقہ تھا......جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے ربیب) فرماتے ہیں:

کَانَ أبُوطَلحَةَ أکثَرَ الأنصَارِ بِالمَدِینَةِ مَالاً مِن نَخلٍ ، وَکَانَ أحَبّ أموَالِهٖ اِلَیهِ بَیرَحَاء ، وَکَانت مُستَقبِلَةَ المَسجد ، وَکَان رسُولُ اللّٰهِ ﷺ یَدخُلُها ،

(۱)اب یہ مقام مسجدِ نبوی کے اندر ہے، بابِ فہد (باب نمبر۲۲) سے بالکل متصل......

وَيَشرَبُ مِن مَاءٍ فيها طَيّب ، فلَمّا نَزلَت هٰذهِ الآية : ﴿لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّىٰ تُنفِقُوا مِمّا تُحِبُّونَ﴾ (۱) قَامَ أبُوطَلحَةَ الىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ فَقَالَ : يَا رَسُولَ اللّٰه! اِنّ اللّٰهَ تَعَالىٰ أنزَلَ عَلَيكَ : ﴿لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّىٰ تُنفِقُوا مِمّا تُحِبُّونَ﴾ وَاِنّ أحَبَّ مَالِي الَيَّ بيرَحَاء ، وَاِنّهَا صَدَقَةٌ لِلّٰهِ تَعَالىٰ ، أرجُو بِرَّهَا وَذُخرَهَا عِندَ اللّٰهِ تَعَالَىٰ ، فَضَعهَا يَا رَسُولَ اللّٰه حَيثُ أرَاكَ اللّٰه ، فَقَال رَسُولُ اللّٰهِ ﷺ : بَخٍ ، ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ ، ذٰلِكَ مَالٌ رَابِحٌ ، وَقَد سَمِعتُ مَا قُلتَ ، وَاِنّي أرَىٰ أن تَجعَلَهَا فِي الأقرَبِينَ ، فَقَالَ أبُوطَلحَة : اَفعَلُ يَا رَسُولَ اللّٰه! ، فَقَسَمّهَا أبُوطَلحَةَ فِي أقَارِبِهٖ وَبَنِي عَمِّهٖ ۔ (۲)

ترجمہ(ابوطلحہ کھجوروں کے باغات کے اعتبار سے تمام انصارِ مدینہ میں مالدارترین شخص تھے، اورانہیں اپنے تمام اموال میں ’’بیرحاء‘‘ نامی باغ سب سے زیادہ پسند تھا، جوکہ مسجدِ نبوی کے بالکل سامنے ہی تھا، رسول اللہ ﷺ اکثر اس باغ میں تشریف لایا کرتے اور وہاں کا لذیذ پانی نوش فرمایا کرتے تھے، پھر جب یہ آیت ﴿لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّىٰ تُنفِقُوا مِمّا تُحِبُّونَ﴾ نازل ہوئی تب ابوطلحہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے، اورعرض کیا ’’اے اللہ کے رسول! اللہ تعالیٰ نے آپ پر یہ آیت نازل فرمائی ہے: ﴿لَن تَنَالُوا البِرَّ حَتّىٰ تُنفِقُوا مِمّا تُحِبُّونَ﴾ یعنی (تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکوگے، تا آنکہ تم اپنی پسندیدہ چیزیں [اللہ کی راہ میں] خرچ کرو) اور مجھے اپنے تمام مالوں میں سب سے محبوب

(۱) آل عمران [۹۲]

(۲) صحیح بخاری [۱۴۶۱] کتاب الزکاۃ، باب (نمبر۴۴) الزکاۃ علیٰ الأقارب ۔ نیز: صحیح مسلم [۹۹۸] کتاب الزکاۃ، باب (نمبر۱۴) فضل النفقۃ والصدقۃ علیٰ الأقربین ۔ امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں یہ حدیث [۲۹۷] ’’باب الانفاق مما یحب ومن الجید‘‘ میں ذکر کی ہے۔ (باب: ۳۷)۔

''بیرحاء'' ہے،لہٰذا میں اسے اللہ کیلئے صدقہ کرتا ہوں، میں اللہ سے اس کے اجر وثواب کی' اوراُس کے پاس اس کے ذخیرہ ہونے کی امید رکھتا ہوں، پس آپ اللہ کی دی ہوئی سمجھ کے مطابق جہاں مناسب سمجھیں اسے تصرف میں لائیں، اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اوہو! یہ تو بڑا ہی نفع بخش مال ہے،تم نے جو کچھ کہا ہے' میں نے وہ سن لیا ہے،میری رائے یہ ہے کہ تم اسے اپنے قرابت داروں میں تقسیم کر دو،ابوطلحہ نے عرض کیا'' ٹھیک ہے اے اللہ کے رسول! میں ایسا ہی کروں گا''۔چنانچہ انہوں نے اسے اپنے رشتے داروں اور چچازاد بھائیوں میں تقسم کر دیا)

اس یادگار واقعہ سے یقیناً حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا مقام ومرتبہ' زہد فی الدنیا' اللہ کا قرب حاصل کرنے کیلئے فکر وجستجو' انفاق فی سبیل اللہ' سخاوت وفیاضی' اور اللہ ورسول ﷺ کے ہر حکم کی فوری تعمیل وتنفیذ کا جذبہ اور اہتمام والتزام ظاہر ہوتا ہے۔

☆......اسی کیفیت میں مدینہ شہر میں شب وروز گذرتے رہے،حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ محبت وعقیدت' صحبت ومعیت' اور کسبِ فیض کے یہ سلسلے قائم ودائم رہے،آپؐ کی حیاتِ طیبہ کے دوران ہمیشہ ہی تادمِ آخر تعلقِ خاطر اسی طرح برقرار رہا......اور پھر جب آپؐ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کا جاں گداز واقعہ پیش آیا تھا' تب آپؐ کی قبر مبارک کی کھدائی کا کام بھی انہوں نے ہی انجام دیا تھا۔

(۱) اس واقعہ سے یہ بات بھی واضح وثابت ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں عمدہ واعلیٰ قسم کا مال خرچ کیا جائے، نہ کہ معمولی اور ردی......اسی لئے امام نوویؒ نے ریاض الصالحین میں یہ حدیث[۲۹۷]''باب الانفاق مما یحب ومن الجید''میں ذکر کی ہے۔(باب:۳۷)۔

نیز یہ کہ انفاق فی سبیل اللہ،صدقہ وخیرات اور زکوٰۃ ادا کرتے وقت اپنے قرابت داروں کو مقدم رکھا جائے،اسی لئے امام بخاری رحمہ اللہ نے یہ حدیث[۱۴۶۱] کتاب الزکاۃ، باب الزکاۃ علیٰ الأ قارب''میں ذکر کی ہے۔

حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ اس مسافر خانے میں اور جہانِ فانی میں تقریباً بیس سال مزید بقیدِ حیات رہے۔

اس دوران ان کے چند معمولات ایسے رہے جو خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، یہی وجہ ہے کہ مؤرخین نے اس چیز کا بطورِ خاص تذکرہ کیا ہے۔

☆ ایک تو یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے بعد انہوں نے یہ جو بیس سال کا عرصہ اس دنیا میں گذارا، اس دوران یہ روزے بہت زیادہ رکھا کرتے تھے، یہ ان کا ہمیشہ انتہائی مرغوب اور پسندیدہ ترین عمل رہا۔

☆ دوسری بات یہ کہ ''انفاق فی سبیل اللہ'' کا بڑے پیمانے پر ہمیشہ بہت زیادہ اہتمام والتزام کرتے رہے۔

☆ تیسری بات یہ کہ اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر ہمیشہ اسلامی لشکر کے ہمراہ مختلف محاذوں پر دشمن کے خلاف برسرِ پیکار رہتے۔

چنانچہ ایک بار خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت کے دوران مدینہ سے مسلمانوں کا ایک لشکر جب کسی محاذ کی جانب روانہ ہونے والا تھا، تب انہوں نے بھی اس لشکر کے ہمراہ روانگی کی تیاری شروع کر دی، اس وقت یہ کافی عمر رسیدہ اور ضعیف ہو چکے تھے، لہٰذا ان کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے ان کے جوان بیٹوں' نیز بہت سے اعزہ واحباب نے کافی اصرار کیا کہ ''آپ اس سفر پر مت جایئے، ہم جوان لوگ جو جا رہے ہیں، بس یہی کافی ہے''۔

مزید ان سب نے انہیں سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ ''رسول اللہ ﷺ کے

مبارک دور میں ہر غزوے کے موقع پر آپ شریک رہے اور پیش پیش رہے، اس کے بعد خلیفۂ اول اور پھر خلیفۂ دوم کے زمانے میں بھی آپ کی یہی کیفیت رہی، لہٰذا بس وہ بہت کافی ہو چکا، اب آپ کو اس عمر میں اپنی صحت کی فکر کرنی چاہئے اور آرام کرنا چاہئے''
لیکن حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ نے کسی کی ایک نہ سنی، اور اپنے اس عزم اور اس فیصلے پر قائم رہے کہ ''میں ضرور جاؤں گا''۔

چنانچہ لشکر مدینہ سے روانہ ہوا، تقریباً ڈیڑھ ہزار کلومیٹر کا سفر طے کرنے کے بعد یہ لشکر ملکِ شام پہنچا، وہاں سے مزید آگے بڑھنے کے بعد مختلف محاذوں پر سلطنتِ روم کے مختلف فوجی دستوں کے ساتھ جنگوں اور جھڑپوں کے سلسلے شروع ہو گئے......

جنگوں اور جھڑپوں کے اسی سلسلے کے دوران آخر اس لشکر کو اب ایک ایسے محاذ پر پہنچنا تھا جس کیلئے بحری سفر ضروری تھا (۱)

چنانچہ اسلامی لشکر کا وہ بحری بیڑا محاذ کی جانب روانہ ہو گیا، اور جب یہ بحری بیڑا خشکی سے

(۱) خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بڑے پیمانے پر فتوحات کا جو سلسلہ تھا وہ ان کے بعد کافی حد تک خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی جاری رہا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب دور دراز کے علاقوں میں مختلف محاذوں پر کارروائیوں کیلئے محض بری (زمینی) فوج کافی نہیں تھی، کیونکہ بہت سے ایسے علاقے تھے جہاں رومی فوج سمندری راستوں سے مسلمانوں کے خلاف کارروائیاں کیا کرتی تھی، جارحیت اور اشتعال انگیزی کے یہ سلسلے چلتے رہتے تھے، لہٰذا خلیفۂ سوم کے زمانے میں پہلی بار تاریخِ اسلام میں بحری فوج (نیوی) تیار کی گئی تھی، جس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا تھا کہ اب خشکی سے نکل کر سمندر کی وسعتوں پر بھی مسلمانوں کی برتری قائم ہو گئی تھی، اسی بحری فوج کے ذریعے اُن دنوں مسلمانوں نے سلطنتِ روم کے خلاف بہت سی تاریخی اور فیصلہ کن قسم کی جنگیں سمندر کے پانیوں میں ہی لڑی تھیں، جن کے نتیجے میں مسلمانوں نے بہت سے ساحلی شہر اور متعدد جزیرے فتح کئے تھے، جن میں سے اہم ترین جزیرہ ''قبرص'' (Cyprus) تھا۔ چنانچہ اسی دور کی یہ بات ہے جب اس لشکر کو سمندری سفر کرنا پڑا جس میں حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ بھی شامل تھے۔

بہت دور بیچ سمندر میں تھا، تب حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کی طبیعت ناساز ہوگئی (بالخصوص یہ کہ انہیں سمندری سفر کا اس سے قبل کوئی تجربہ بھی نہیں تھا) رفتہ رفتہ مرض شدت اختیار کرتا گیا......اور پھر اس چند روزہ علالت کے بعد وہیں بحری جہاز میں ہی ان کا انتقال ہوگیا......

ان کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے اور دیگر ساتھی مسلسل اس انتظار میں رہے کہ دورانِ سفر کہیں کوئی خشکی نظر آئے ......بس اتنی سی خشکی نظر آجائے ......کہ جہاں ان کی قبر تیار کی جاسکے......اسی کیفیت میں یہ بحری بیڑا سمندر کی وسعتوں میں...... چلتا رہا......سمندر کا سینہ چاک کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا رہا......حتیٰ کہ چلتے چلتے سات دن گذر گئے...... لیکن کہیں کوئی خشکی کا ٹکڑا نظر نہیں آیا......

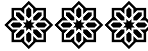
اس دوران سات دن گذر جانے کے باوجود حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے جسم میں کوئی تغیر یا تعفن پیدا نہیں ہوا، ان کا جسم مکمل طور پر درست حالت میں رہا، بالکل صحیح اور تر وتازہ......گویا بس آرام سے گہری نیند سو رہے ہوں......چادر اوڑھے ہوئے......

آخر سات دن گذر جانے کے بعد آٹھویں دن خشکی کا ٹکڑا نظر آیا......تب ان کے بیٹوں اور ساتھیوں نے وہاں قبر کھودی، اور انہیں وہاں سپردِ خاک کیا......ایسی جگہ......جس کے بارے میں انہیں کوئی علم نہیں تھا کہ یہ کون سی جگہ ہے؟ سمندر کے بیچوں بیچ......ایک بالکل مختصر سا زمین کا ٹکڑا......ساحل سے بہت دور......اس زمین سے بہت دور......اور اس زمین پر آباد انسانوں کی اس دنیا سے بہت دور......وطن سے بہت دور......اپنے شہر مدینہ سے بہت دور......اہل وعیال اور اعزہ واحباب سے بہت دور......کسی نامعلوم مقام پر...... گمنام جگہ پر......سمندر کے بیچوں بیچ......کہ جہاں ان کے گھر والے زندگی بھر کبھی دوبارہ

ان کی قبر بھی نہیں دیکھ سکیں گے...... کیونکہ کچھ اندازہ ہی نہیں ہوسکا کہ بیچ سمندر میں یہ اتنی ذرہ سی خشکی...... آخر یہ ہے کونسی جگہ......؟

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ...... اگرچہ ہمیشہ کیلئے اپنوں سے بہت دور چلے گئے...... اُس گمنام جگہ پر...... لیکن اپنوں سے اس دوری کا یقیناً انہیں کوئی غم نہیں ہوگا...... کیونکہ وہ ان تمامتر دوریوں کے باوجود اپنے ''اللہ'' سے تو یقیناً بہت قریب تھے......

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۱۹/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ، مطابق ۸/ فروری ۲۰۱۵ء بروز اتوار یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّكَ أنتَ السَّمِيعُ العَلِيمُ ، وَتُب عَلَينَا اِنَّكَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِيمُ

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ:

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا تعلق مدینہ میں مشہور ومعزز ترین خاندان ''بنونجار'' سے تھا، نبوت کے بارہویں سال بیعتِ عقبہ اولیٰ کے فوری بعد جب رسول اللہ ﷺ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو معلم ومربی کی حیثیت سے مدینہ والوں کی جانب روانہ فرمایا تھا، تب وہاں مدینہ میں ان کی تبلیغی کوششوں اور دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں بڑی سرعت کے ساتھ دینِ اسلام کی نشرواشاعت ہونے لگی تھی......چنانچہ انہی دنوں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی والدہ ''اُم سُلیم'' (جو کہ اس کنیت سے معروف تھیں، اصل نام رُمیصاء بنت ملحان النجاریہ تھا) بھی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مشرف باسلام ہوگئی تھیں......البتہ ان کا شوہر بدستور اپنے آبائی دین یعنی کفروشرک پر ہی قائم رہا، اور پھر کچھ عرصے بعد کسی قبائلی جنگ کے موقع پر مارا گیا......اور تب اُم سُلیمؓ کی شادی انہی کے خاندان ''بنونجار'' کے ایک معزز ترین شخص حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کے ساتھ ہوگئی۔(۱)

اُم سُلیمؓ کی حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کے ساتھ شادی کے وقت ان کے بیٹے انس بن مالکؓ کی عمر محض نو سال تھی، بالکل ہی بچپن کا زمانہ تھا، لہٰذا اس کے بعد گویا ان کی تربیت بڑے پیمانے پر حضرت ابوطلحہ انصاریؓ کی سرپرستی میں ہوئی۔

اس کے بعد محض اگلے ہی سال......جب نبوت کا تیرہواں سال چل رہا تھا......حجِ بیت اللہ کے موقع پر مدینہ سے آئے ہوئے حجاج میں سے بہتّر افراد ایسے تھے جو آپ ﷺ کی ہجرتِ مدینہ سے قبل ہی آپ ﷺ کے سفیر اور قاصد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے دعوتِ

(۱) حضرت ابوطلحہ انصاری رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ گذشتہ صفحات [۵۴۷-۵۶۹] میں گذر چکا ہے۔

اسلام کے سلسلے میں کی جانے والی کوششوں کے نتیجے میں دینِ اسلام قبول کر چکے تھے اوراب حجِ بیت اللہ کے موقع پر منیٰ میں انہوں نے رسول اللہ ﷺ سے خفیہ ملاقات' نیز آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی جو تاریخ میں ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے نام سے معروف ہے،اور پھر اسی یادگار موقع پر ہی ان بہتّر افراد نے آپ ﷺ کو مدینہ تشریف آوری کی دعوت دی تھی، نیز آپؐ کی ہرطرح حفاظت وحمایت کا عہد و پیمان کیا تھا......انہی بہتّر خوش نصیب ترین افراد میں حضرت ابوطلحہ انصاریؓ (یعنی حضرت انس بن مالکؓ کے سرپرست) بھی شامل تھے۔

اور پھر اسی دعوت کے نتیجے میں رسول اللہ ﷺ ودیگر تمام مسلمان رفتہ رفتہ مکہ سے مدینہ ہجرت کر گئے تھے۔

ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی جب مدینہ تشریف آوری ہوئی تب حضرت انس بن مالکؓ کی عمر محض دس سال تھی،اس موقع پر ان کی والدہ اُمِ سُلیم انہیں ہمراہ لئے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئی تھیں ، اورعرض کیا تھا کہ ''اے اللہ کے رسول!میری یہ دلی خواہش ہے کہ میرا یہ بیٹا آپ کی خدمت میں رہے،تاکہ روزمرہ کے کام کاج میں یہ آپ کی خدمت بھی انجام دے، نیز آپ ہی کی زیرِ سرپرستی اس کی تربیت اورنشو ونما ہو،تاکہ اس طرح یہ اعلیٰ اخلاق وکردار اپنا سکے......لہٰذا آپ اسے اجازت مرحمت فرمایئے''

اس پر آپؐ نے اس نوعمر یعنی انس بن مالکؓ کو اپنی صحبت ومعیت میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائی......چنانچہ اب انس بن مالکؓ کے شب وروز آپؐ کی خدمت اورصحبت ومعیت میں بسر ہونے لگے......گویا اب ان کیلئے آپؐ ہی والد' معلم ومربی' سرپرست' اور

سبھی کچھ تھے، آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے انس بن مالکؓ آپؐ کے ہرقول وفعل' ہر ادا' ہر انداز' اور ہر نقل وحرکت کو بغیر دیکھتے ، اس سے بہت کچھ سیکھتے ، اور پھر اسے اپنا لیتے، اور اپنی روزمرہ کی زندگی میں اسے اپنا معمول بنا لیتے......

ہجرتِ مدینہ کے بعد اب رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کا یہ مدنی دور جو کہ دس سال کے عرصے پر محیط تھا......اس تمام عرصے میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ مسلسل آپؐ کی خدمت کا مبارک فریضہ سرانجام دیتے رہے، آپؐ کی مبارک شخصیت' نیز آپؐ کے پاکیزہ اخلاق وکردار سے یہ بہت زیادہ متأثر تھے، ان کے قلب وجگر میں' اور رگ وپے میں آپؐ کی محبت' نیز آپؐ کیلئے احترام اور عقیدت کے جذبات رچ بس گئے تھے......جس کا اظہار ان کے ان الفاظ سے ہوتا ہے: (کَان رَسُولُ اللّٰہِ ﷺ أحسَنَ النّاسِ خُلُقاً) (۱)

یعنی ''رسول اللہ ﷺ تو تمام لوگوں میں سب سے زیادہ اچھے اخلاق کے حامل تھے''

نیز: (مَا مَسِسْتُ دِیبَاجاً وَلَا حَرِیراً ألیَنَ مِن کَفِّ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ ، وَلَا شَمَمْتُ رَائِحَۃً قَطُّ أطیَبَ مِن رَائِحَۃِ رَسُولِ اللّٰہِ ﷺ ، وَلَقَد خَدَمتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ عَشرَ سِنِینَ ، فَمَا قَالَ لِي أُف قَطُّ ، وَمَا قَالَ لِي لِشَیٍٔ فَعَلتُہٗ لِمَ فَعلتَہٗ ؟ وَلَا لِشَیٍٔ لَم أفعَلُہٗ: ألَا فَعَلْتَ کَذا؟) (۲)

یعنی ''میں نے رسول اللہ ﷺ کی ہتھیلی سے زیادہ نرم کوئی ریشم نہیں چھوا، اور رسول اللہ ﷺ کے جسم اطہر سے پھوٹنے والی خوشبو سے زیادہ پاکیزہ خوشبو کبھی نہیں سونگھی، اور میں نے

(۱) صحیح بخاری، کتاب الأدب، باب الکنیۃ للصبی ☆ صحیح مسلم، کتاب الفضائل، باب کان رسول اللہ ﷺ أحسن الناس خُلُقاً۔ (ریاض الصالحین: باب نمبر ۷۳: حسن الخلق۔ حدیث: ۶۲۱)

(۲) صحیح بخاری [۳۵۶۱] کتاب المناقب، باب (نمبر ۶۸۰) صفۃ النبی ﷺ۔ ☆ صحیح مسلم [۲۳۰۹] نیز [۲۳۳۰] (ریاض الصالحین: باب نمبر ۷۳: حسن الخلق۔ حدیث: ۶۲۲)

رسول اللہ ﷺ کی دس سال خدمت کی، آپ نے مجھے کبھی اُف تک نہیں کہا، اور جو کام میں نے کیا' اس کی بابت یہ نہیں کہا کہ تم نے یہ کیوں کیا؟ اور جو کام میں نے نہیں کیا' اس کی بابت یہ نہیں کہا کہ تم نے اس طرح کام کیوں نہیں کیا؟''

☆......رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کا تعلق محض خدمت تک محدود نہیں تھا، بلکہ طلبِ علم اور کسبِ فیض کا سلسلہ بھی نہایت اہتمام والتزام کے ساتھ جاری تھا، اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ آپ ؐ انس ؓ کیلئے معلم ومربی بھی تھے، بلکہ آپ ؐ نے انہیں ہمیشہ اپنے بچوں ہی کی طرح سمجھا، مزید یہ کہ آپ ؐ نے انہیں اپنا ''امین السر'' یعنی ''خاص رازدان'' بھی مقرر فرمایا۔(۱)

جیسا کہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: خَدَمتُ رَسُولَ اللّٰہِ ﷺ عَشْرَ سِنِینَ ، فَلَم یضرِبْنِي ضَربَةً قَطُّ ، وَلَم یَسُبَّنِي ، وَلَم یَعْبِسُ فِي وَجْهِي ، وَكَانَ أوّلُ مَا وَصَّانِي بِهٖ أن قَالَ: یَا بُنَيّ! اُكتُم سِرّي تَكُن مُؤمِناً فَمَا أخبَرتُ بِسِرِّهٖ أحَداً وَإن كَانَت أُمّي ، وَأزوَاجُ النَّبِيّ ﷺ یَسألنَنِي أن أُخبِرَهُنَّ فَلَا أُخبِرُهُنّ ، وَلَا أُخبِرُ بِسِرِّهٖ أحَداً أبَداً (۲)(۳)

(۱) رسول اللہ ﷺ اپنے اس عظیم ترین دینی منصب اور مقام ومرتبے کے ساتھ اب مدینہ میں ''اسلامی ریاست'' کے فرمانروا بھی تھے، لہٰذا ظاہر ہے کہ اس حیثیت سے بہت سے حساس قسم کے معاملات درپیش آیا کرتے تھے......جن کے بارے میں رازداری ضروری تھی، جبکہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ تو خادمِ خاص کی حیثیت سے ہمیشہ آپ ؐ کے بہت نزدیک ہی رہتے تھے، جس کی وجہ سے بہت سے سرکاری رازان کے علم میں آتے تھے......لہٰذا آپ ؐ نے انہیں ان تمام ریاستی وسرکاری معاملات کے بارے میں مکمل رازداری برتنے کا حکم دیا تھا۔ (۲) طبرانی۔ (۳) یہاں یہ تذکرہ مناسب ہوگا کہ رسول اللہ ﷺ نے اگرچہ حضرت انس بن مالک ؓ کو رازداری کی تاکید فرمائی تھی، تاہم ''صاحب سرّ رسول اللہ ﷺ'' یعنی آپ ؐ کے خاص ''رازدان'' کی حیثیت سے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ معروف ہیں، ان کا مفصل تذکرہ صفحہ [۵۹۷] پر ملاحظہ ہو۔

ترجمہ ''میں نے دس سال مسلسل رسول اللہ ﷺ کی خدمت انجام دی، اس دوران آپؐ نے کبھی مجھے زدوکوب نہیں کیا، کبھی میرے ساتھ بدکلامی نہیں کی، کبھی میرے سامنے ترش روئی کا مظاہرہ نہیں کیا، آپؐ نے سب سے پہلے مجھے جس بات کی تاکید فرمائی وہ یہ تھی کہ ''اے بچے! میرے راز کو ہمیشہ چھپائے رکھنا' تم مؤمن بن جاؤ گے'' چنانچہ میں نے کبھی کسی کے سامنے آپؐ کا کوئی راز ظاہر نہیں کیا...... حتیٰ کہ اپنی والدہ کے سامنے بھی نہیں...... بعض اوقات آپؐ کی ازواج مطہرات مجھ سے آپؐ کا کوئی راز پوچھا کرتی تھیں، لیکن میں نے انہیں بھی کبھی کچھ نہیں بتایا، بلکہ میں نے تو کبھی کسی کے سامنے بھی آپؐ کا کوئی راز فاش نہیں کیا''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کے حسنِ اخلاق کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: كَانَ رَسُولُ اللّٰه ﷺ مِن أحسَنِ النّاسِ خُلُقاً ، فَأرسَلَنِي يَوماً لِحَاجَةٍ ، فَخَرَجتُ ، حَتّىٰ أمُرَّ عَلَىٰ صِبيَانٍ وهُم يَلعَبُونَ فِي السُّوقِ ، فَاِذَا بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ بَقَفَايَ مِن وَرَائِي ، فَنَظَرتُ اِلَيهِ وَهُوَ يَضحَكُ ، فَقَالَ: يَا أُنَيس! أذَهَبتَ حَيثُ أمَرتُكَ؟ قَال: فَقُلتُ: نَعَم ، أنَا ذَاهِبٌ يَا رَسُولَ اللّٰه (۱)

ترجمہ ''رسول اللہ ﷺ تمام لوگوں میں سب سے بڑھ کر خوش اخلاق تھے، ایک روز آپؐ نے مجھے کسی کام سے کہیں بھیجا، میں روانہ ہو گیا، راستے میں بازار میں کچھ بچے کھیل رہے تھے، میں بھی ان کے ساتھ کھیل کود میں لگ گیا، کچھ دیر بعد اچانک آپؐ نے آکر مجھے گُدی سے دبوچ لیا، میں نے جب پلٹ کر آپؐ کی جانب دیکھا تو آپ ﷺ مسکرا دیئے، پھر آپؐ

(۱) مسلم [۲۳۱۰] باب حسن خلقہ ﷺ۔ (صحیح مسلم بشرح النووی۔ ج:۱۵۔ ص:۱۰۲)

نے مجھ سے دریافت فرمایا ''اے اُنیس! کیا تم وہاں گئے جہاں میں نے تمہیں بھیجا تھا؟'' میں نے عرض کیا ''جی! اے اللہ کے رسول! میں ابھی جاتا ہوں'' (۱)

(مقصد یہ کہ اس موقع پر بھی آپؐ نے انہیں کسی ملامت یا سرزنش کی بجائے محبت وشفقت کا معاملہ ہی فرمایا)۔

☆......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے شفقتوں اور عنایتوں کا یہ سلسلہ محض عارضی وفانی دنیا کی زندگی تک ہی محدود نہیں تھا...... بلکہ آپؐ نے انہیں آخرت میں بھی اپنی شفاعت سے شادکام کرنے کی خوشخبری سنائی تھی۔ جیسا کہ یہ فرماتے ہیں: سَأَلْتُ النَّبِيَّ ﷺ أن يَشفَعَ لِي يَومَ القِيَامَةِ ، فَقَالَ : أنَا فَاعِلٌ ، قُلتُ: يَا رَسُولَ اللّه! أينَ أطلُبُكَ؟ قَالَ: أُطلُبْنِي أوّلَ مَا تَطلُبُنِي عَلَىٰ الصِّرَاط، قُلتُ: فَاِن لَم أَلقَكَ عَلَىٰ الصِّرَاط؟ قَال: فَاطلُبْنِي عِندَ المِيزَان ، قُلتُ: فَاِن لَم أَلقَكَ عِندَ المِيزَان؟ قَالَ: فَاطلُبْنِي عَندَ الحَوض، فَاِنِّي لَا أُخطِئُ هٰذِهِ الثّلَاثَ المَوَاضِع ۔ (۲)

ترجمہ ''میں نے رسول اللہ ﷺ سے اپنے لئے روزِ قیامت شفاعت کی گذارش کی، اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا ''ہاں، میں ایسا کروں گا'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! (میدانِ حشر میں) میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ آپؐ نے فرمایا ''سب سے پہلے تم مجھے ''صراط'' (یعنی پل صراط) کے قریب تلاش کرنا، میں نے عرض کیا ''اگر صراط پر آپؐ سے ملاقات نہ ہو سکی تو؟'' آپؐ نے فرمایا ''تب مجھے تم ''میزان'' (یعنی انسانوں کے اعمال تولنے

(۱) آپؐ نے اس موقع پر ''انس'' کی بجائے ''اُنیس''، یعنی تصغیر کا صیغہ استعمال فرمایا، جس سے حضرت انسؓ کیلئے شفقت ومحبت کا اظہار مقصود تھا، یعنی ''اے چھوٹے سے انس''، جیسے ''طفل'' کے معنیٰ بچہ، جبکہ ''طفیل'' چھوٹا سا بچہ، اسی طرح ''حسن'' خوبصورت، جبکہ ''حُسین'' چھوٹا سا خوبصورت۔ (۲) الصحیح المسند [۲۴]۔

کیلئے ترازو) کے قریب تلاش کرنا'' میں نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول! اگر میزان کے قریب بھی آپؐ سے ملاقات نہ ہوسکی تو؟'' آپؐ نے فرمایا ''تب مجھے تم ''حوض'' (یعنی حوضِ کوثر) کے قریب تلاش کرنا، کیونکہ ان تینوں مقامات میں سے کسی ایک مقام پر میں ضرور موجود ہوں گا''۔

☆...... عن أنس بنِ مَالكٍ رضِيَ اللّٰهُ عَنهُ قَال: جَاءَ رَجُلٌ اِلَىٰ رَسُولِ اللّٰهِ ﷺ، فَقَال: يَا رَسُولَ اللّٰه! مَتَىٰ السّاعه؟ قَال: وَمَا أعْدَدتَ لِلسّاعَة؟ قَال: حُبُّ اللّٰهِ وَ رَسُولِهِ، قَال: فَاِنّكَ مَعَ مَن أحْبَبْتَ، قَال: أنَس: فَمَا فَرِحْنَا بِشَيءٍ بَعدَ الِاسلَامِ فَرَحاً أشَدَّ مِن قَولِ النّبِيّ ﷺ: ((فَاِنّكَ مَعَ مَن أحْبَبْتَ)) قَال أنَس: فَأنَا أُحِبُّ اللّٰهَ وَ رَسُولَهُ، وَأبَابَكر، وَعُمَر، فَأرجُو أن أكُونَ مَعَهُم، لِحُبّي اِيّاهُم، وَاِن لَم أعمَل بِأعمَالِهِم (۱)

ترجمہ: ''حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور دریافت کیا کہ ''اے اللہ کے رسول! قیامت کب آئے گی؟'' اس پر آپؐ نے فرمایا ''تم نے قیامت کیلئے کیا تیاری کی ہے؟'' اس نے عرض کیا ''اللہ اور اس کے رسول کی محبت'' تب آپؐ نے فرمایا ''تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو'' (اس کے بعد حضرت انسؓ نے مزید فرمایا) ''ہم (یعنی تمام صحابۂ کرام) اپنے قبولِ اسلام کے بعد کبھی کسی بات پر اس قدر خوش نہیں ہوئے تھے کہ جس قدر ہم اُس روز آپ ﷺ کا یہ ارشاد سن کر خوش ہوئے کہ ''تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت کرتے ہو'' (اس کے بعد حضرت انسؓ نے مزید فرمایا) ''یہی وجہ ہے کہ میں اللہ اور اس

(صحیح مسلم [۲۶۳۹] کتاب البر والصلة والآداب۔ باب (نمبر ۵۰) المرء مع من أحب (صحیح مسلم بشرح النووی۔ ج:۱۶۔ ص:۲۸۶)۔

کے رسول ﷺ سے محبت کرتا ہوں، نیز ابوبکرؓ اور عمرؓ سے محبت کرتا ہوں، لہٰذا مجھے یہ امید ہے کہ میں (قیامت کے روز) انہی کے ساتھ ہوں گا، ان سے محبت کی وجہ سے، اگرچہ میرے اعمال اس قدر اچھے نہیں ہیں جس قدر اُن کے تھے''۔(۱)(۲)

☆......حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمت' صحبت ومعیت' اور کسبِ فیض کا یہ سلسلہ بدستور جاری رہا......مکمل پابندی اور بڑے ہی شوق اورانہماک کے ساتھ یہ ہمیشہ آپؐ کی خدمت میں حاضر رہتے، خواہ وہ کوئی ذاتی خدمت ہو، علمی محفل ہو، یا میدانِ جنگ ہو۔

چنانچہ حضرت انسؓ ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر آپؐ کی زیرِ قیادت شریک رہے اور پیش پیش رہے......حتیٰ کہ ظہورِ اسلام کے بعد حق وباطل کے درمیان اولین معرکہ ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر بھی یہ حاضر تھے (اُس وقت ان کی عمر محض بارہ سال تھی، لہٰذا یہ باقاعدہ جنگ میں شریک تو نہیں ہوئے تھے، البتہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی غرض سے مسلسل وہاں موجود رہے تھے)(۳) (حاشیہ آئندہ صفحے پر ملاحظہ ہو)

---

(۱) رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد کہ ''تم اسی کے ساتھ ہوگے جس سے تم محبت رکھتے ہو'' سننے پر تمام صحابۂ کرام کو بے انتہاء خوشی ہوئی......لہٰذا اسی شوق اور اسی جذبے کی وجہ سے کہ قیامت کے روز رسول اللہ ﷺ کی صحبت ومعیت نصیب ہوجائے......حضرت انسؓ ودیگر تمام صحابۂ کرام کے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کیلئے عقیدت ومحبت مزید بڑھ گئی......چونکہ یہاں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت انسؓ کی عقیدت ومحبت کا تذکرہ کیا جارہا ہے لہٰذا اس ضمن میں یہ حدیث بھی یہاں ذکر کی گئی ہے۔

(۲) اس حدیث سے اچھے لوگوں کی صحبت ومعیت اور ان کے ساتھ عقیدت ومحبت کی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ نیز اس سے فکرِ آخرت کی ضرورت واہمیت واضح ہوتی ہے، کہ جس طرح ان صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اُجمعین کے دلوں میں فکرِ آخرت کا اور وہاں کی صلاح وفلاح کا جذبہ موجزن تھا......اور اسی جذبے کی وجہ سے وہ رسول اللہ ﷺ سے آخرت کے بارے میں وقتاً فوقتاً سوالات کرتے رہتے تھے، یہی کیفیت ہر مسلمان کی ہونی چاہئے۔

اسی طرح ۵ھ میں ''بیعتِ رضوان'' کے یادگار اور مبارک ترین موقع پر بھی یہ شریک تھے (۱)

☆......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اپنے خادمِ خاص حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے محبتوں' شفقتوں' اور عنایتوں کا جو سلسلہ تھا اُس کا اظہار اس بات سے بھی ہوتا ہے کہ آپ ؐ انہیں مختلف مواقع پر صلاح وفلاح اور خیر و برکت کی دعاؤں سے نوازتے رہے۔ چنانچہ یہ فرماتے ہیں:

دَخَلَ النَّبِيُّ ﷺ عَلَينَا ، وَمَا هُوَ اِلّا أنَا ، وَأُمِّي ، وَأُمُّ حَرَام خَالَتِي ، فَقَالَت أُمِّي: يَا رَسُولَ اللّه! خُوَيدِمُكَ ، اُدعُ اللّهَ لَهُ ، قَال أنَس: فَدَعَا لِي بِكُلِّ خَير، وَكَانَ فِي آخِرِ مَا دَعَا لِي بِهٖ أن قَالَ: ((اللّهُمّ أكثِر مَالَهُ وَ وَلَدَهُ وَبارِك لَهُ فِيه . (۲)

رسول اللہ ﷺ ایک روز ہمارے گھر تشریف لائے ،اُس وقت گھر میں صرف میں' میری والدہ' اور میری خالہ اُم حرام موجود تھیں،تب میری والدہ نے عرض کیا ''اے اللہ کے رسول!

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۳) یہی وجہ ہے کہ بہت سے اہلِ علم کے بقول ان کا شمار ''بدریین'' میں نہیں ہے،لیکن بہر حال رسول اللہ ﷺ کی خدمت کی غرض سے یہ ''غزوۂ بدر'' کے موقع پر حاضر تھے۔

(۱) ''رضوانی حضرات''،یعنی بیعتِ رضوان کے موقع پر جو حضرات موجود تھے ان کا بڑا مقام ومرتبہ ہے اور انہیں قرآن کریم میں اللہ کی طرف سے ''رضوان''،یعنی رضامندی وخوشنودی کی عظیم ترین خوشخبری سے شادکام کیا گیا ہے۔جیسا کہ ارشاد ہے:﴿لَقَد رَضِيَ اللّهُ عَنِ المُؤمِنِينَ اِذ يُبَايِعُونَكَ تَحتَ الشَّجَرَةِ ......﴾ یعنی ''یقیناً اللہ خوش ہو گیا ان مؤمنین سے جبکہ وہ درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے.....'' (سورۃ الفتح:۱۸)

(۲) صحیح مسلم [۲۴۸۱] باب من فضائل انس بن مالک ؓ۔

یہ آپ کا چھوٹا سا خادم ہے (یعنی انسؓ) آپ اس کیلئے اللہ سے دعاء فرمایئے، اس پر آپؐ نے میرے لئے ہر خیر وخوبی کی دعاء فرمائی، اور آخر میں آپؐ نے یہ الفاظ کہے "اے اللہ! تو اسے مال اور اولاد کی فراوانی اور اس میں خیر وبرکت عطاء فرما"۔

اسی طرح حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

دَعَا لِي رَسولُ اللّه ﷺ ثَلَاثَ دَعَوَاتٍ ، قَد رَأيتُ مِنهُمَا اثنَتَينِ فِي الدُّنيَا ، وَأنَا أرجُو الثّالِثَةَ فِي الآخِرَة ۔ (۱)

یعنی "رسول اللہ ﷺ نے میرے لئے تین دعائیں فرمائیں، جن میں سے دو کی قبولیت میں اس دنیا میں ہی دیکھ چکا ہوں، جبکہ تیسری کی قبولیت کی میں آخرت میں امید رکھتا ہوں (۲)

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے خیر وبرکت کی ان دعاؤں کا ہی یہ نتیجہ تھا کہ انہیں اللہ کی طرف سے خوب آل واولاد اور خوشحالی وفراوانی نصیب ہوئی، چنانچہ ان کا ایک باغ تھا جس کے قرب وجوار میں اسی جیسے تمام باغ سال میں ایک بار، جبکہ ان کا وہ باغ سال میں دوبار پھل دیا کرتا تھا، نیز یہ کہ اس باغ میں نہایت خوشگوار خوشبو مہکا کرتی تھی جس کا اثر دور دور تک پہنچا کرتا تھا......(۲)

☆......رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کیلئے شفقتوں اور

(۱) صحیح مسلم [۲۴۸۱] باب من فضائل انس بن مالکؓ۔

(۲) ان تین دعاؤں میں سے دو کا تعلق اس دنیاوی زندگی سے ہوگا، لہٰذا ان کی قبولیت اور ان کا اثر اس دنیا میں ہی نظر آ گیا......جبکہ تیسری دعاء کا تعلق آخرت سے ہوگا، لہٰذا فرمایا کہ اس کی قبولیت کی میں وہاں آخرت میں امید رکھتا ہوں۔

(۲) وَكَانَ لَهُ بُستَانٌ يَحمِلُ فِي السّنَةِ الفَاكِهَةَ مَرّتَين، وَكَان فِيهَا رَيحَانٌ يَجِدُ مِنهُ رِيحَ المِسْكِ ...... (الترمذي:٣٨٣٣۔ باب مناقب أنس بن مالك)

دعاؤں کے یہ جو سلسلے تھے، نیز آپ ﷺ کی تربیت اور سرپرستی کے جو مبارک ثمرات تھے......انہی کا ایک اثر یہ تھا کہ حضرت انس ؓ کے ہر عمل، ہر ادا، ہر انداز، اور ہر عبادت میں آپ ﷺ کے ساتھ بہت زیادہ مشابہت پائی جاتی تھی......جیسا کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: مَا رأيتُ أحداً أشبَهَ صَلَاةً بِرَسُولِ اللّٰهِ ﷺ مِن ابنِ أُمّ سُلَيم ۔ (۱)

یعنی ''میں نے کوئی ایسا شخص نہیں دیکھا جس کی نماز رسول اللہ ﷺ کی نماز سے اس قدر مشابہ ہو کہ جس قدر اُمِ سُلیم کے بیٹے (یعنی انس بن مالک ؓ) کی نماز آپ ﷺ کی نماز سے مشابہ ہے''۔

☆......مزید یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو چند قیمتی ترین اور بہت ہی اہم اور مفید نصیحتیں فرمائی تھیں، جنہیں یہ بڑے ہی اہتمام اور جذبے کے ساتھ زندگی بھر خود بھی یاد کرتے رہے، اپنے ذہن میں تازہ کرتے رہے، نیز دوسروں کو بھی یہی نصیحتیں فرماتے رہے......مثلاً:

☆ اِذا دَخَلْتَ عَلیٰ أهلِكَ فَسَلِّم ، يَكُونُ بَرَكَةً عَلَيكَ وَعَلَیٰ أهلِ بَيتِكَ ۔

ترجمہ ''تم جب اپنے گھر داخل ہو تو اہلِ خانہ کو سلام کیا کرو، یہ چیز تمہارے لئے، نیز تمہارے اہلِ خانہ کیلئے باعثِ خیر و برکت ہوگی۔

☆ يَا بُنَيّ! اِن قَدَرْتَ أن تَجعَلَ مِن صَلَاتِكَ فِي بَيتِكَ شَيئاً فَافعَل ، فَاِنّهُ يُكثِرُ خَيرَ بَيتِكَ ۔

ترجمہ ''اے میرے بچے! اگر ہو سکے تو کچھ نماز گھر میں بھی پڑھ لیا کرو، اس سے تمہارے گھر

(۱) ابن سعد فی الطبقات الکبریٰ: ۷/۲۰-۲۱۔

میں خیر و برکت میں اضافہ ہوگا''(۱)

☆ يَا بُنَيّ! اِن استَطَعتَ أن لَا تَزَالَ تُصَلِّي، فَافعَل،فَاِنّ المَلَائِكَةَ لَا تَزَالُ تُصَلِّي عَلَيكَ ، مَا دُمتَ تُصَلِّي ۔

ترجمہ''اے میرے بچے !تم سے جس قدر بن پڑے نماز پڑھتے رہو، کیونکہ جب تک تم نماز میں مشغول رہوگے' فرشتے تمہارے لئے دعائے خیر کرتے رہیں گے''(۲)

☆ يَا بُنَيّ! اِن قَدَرتَ أن تُمسِيَ وَ تُصبِحَ وَلَيسَ فِي قَلبِكَ غِشٌّ لِأَحَدٍ ، فَافعَل ۔

ترجمہ''اے میرے بچے! اگر تم سے بن پڑے تو اپنی ہر صبح اور ہر شام اس کیفیت میں بسر کرنا کہ تمہارے دل میں کسی کے خلاف کوئی کینہ نہ ہو''

☆ يَا بُنَيّ! اِرحَمِ الصَّغِيرَ ، وَ وَقِّرِ الكَبِيرَ ، تَكُن مِن رُفَقَائِي يَومَ القِيَامَةِ ۔

ترجمہ''اے میرے بچے! چھوٹے پر رحم کرو، بڑے کی عزت کرو،نتیجہ یہ ہوگا کہ تم جنت میں میرے ساتھیوں میں سے ہوگے''۔(۳)

☆......نبوت کے چودہویں سال ہجرتِ مدینہ کے موقع پر رسول اللہ ﷺ کی جب مکہ سے مدینہ تشریف آوری ہوئی تھی' تب حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ دس سال کے تھے،اس

(۱) یعنی نفل نماز یا اسی طرح سنتیں کبھی کبھی گھر میں بھی پڑھنی چاہئیں،اس سے گھر میں خیر و برکت ہوگی، نیز یہ چیز گھر کے افراد کیلئے تعلیم وتربیت اور اسی طرح ترغیب کا باعث بنے گی،مزید یہ کہ اس طرح ''ریاء'' سے بھی حفاظت رہے گی۔

(۲) ارشادِ ربانی:﴿فَاِذَا فَرَغتَ فَانصَب ، وَاِلَىٰ رَبِّكَ فَارغَب﴾ کا یہی مفہوم ہے(یعنی:پس جب تم فارغ ہوجاؤ تو عبادت میں محنت کرو،اور اپنے رب سے ہی دل لگاؤ)(سورۃ الم نشرح)

(۳) مذکورہ تمام نصائح پر مشتمل حدیث[۵۹۹۱] الطبرانی (فی الأوسط۱۲۳/۶) نیز ترمذی،ابن حبان،وغیرہ نے روایت کی ہے۔البتہ بعض اہلِ علم کے بقول اس کی سند میں کچھ ضعف ہے۔واللہ أعلم۔

کے بعد آپ ؐ کا مدینہ میں دس سال قیام رہا، اس دوران حضرت انس ؓ مسلسل آپ ؐ کی خدمت میں رہے...... حتیٰ کہ آپ ؐ اس جہانِ فانی سے رحلت فرماتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے...... تب حضرت انس ؓ کی عمر بیس سال تھی۔

رسول اللہ ﷺ کے انتقال کے بعد حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیاسی سال مزید اس دنیا میں رہے...... چونکہ انہیں کم عمری (دس سال کی عمر) سے ہی رسول اللہ ﷺ کی خدمت‘ صحبت و معیت‘ علمی استفادہ‘ اور کسبِ فیض کا بہت زیادہ موقع ملا تھا، لہٰذا انہیں بہت بڑے علمی خزانے کا امین تصور کیا جاتا تھا، آپ ؐ کی رحلت کے بعد ہر طرف سے تشنگانِ علم بہت بڑی تعداد میں ان کے پاس تحصیلِ علم کی غرض سے آتے رہے، اور یہ (حضرت انس ؓ) بیاسی سالہ اس طویل دور میں علومِ نبویہ کی ترویج اور نشر و اشاعت میں ہمہ تن مصروف و منہمک رہے......

☆......رسول اللہ ﷺ کی اس جہانِ فانی سے رحلت کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کو ’’بحرین‘‘ کا ’’والی‘‘ (گورنر) مقرر کیا تھا، چنانچہ یہ مدینہ سے بحرین منتقل ہو گئے تھے، جہاں یہ والی کی حیثیت سے فرائض انجام دیتے رہے۔ اور پھر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں اپنے اس عہدے سے مستعفی ہو کر واپس مدینہ چلے آئے تھے۔

حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں اللہ کے دین کی سربلندی‘ اور دشمنانِ دین کی سرکوبی کی غرض سے مدینہ سے مختلف محاذوں کی جانب وقتاً فوقتاً لشکروں کی روانگی کا سلسلہ جاری رہتا تھا...... حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بھی اکثر کسی نہ کسی

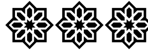
لشکر کے ہمراہ روانہ ہوا کرتے تھے۔اور پھر آخر مستقل طور پر ''بصرہ'' میں مقیم ہوگئے تھے، جہاں تادمِ آخر علمِ دین کی نشرواشاعت کے سلسلے میں بڑے وسیع پیمانے خدمات سرانجام دیتے رہے......

اُن دنوں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم أجمعین کی بڑی تعداد مستقل طور پر بصرہ میں آباد ہوگئی تھی ،اور پھر رفتہ رفتہ یکے بعدیگرے وہ اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے گئے ......

ان پاکیزہ وبرگزیدہ ترین شخصیات میں سے (یعنی بصرہ میں مقیم حضرات صحابۂ کرام میں سے)حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ آخری تھے۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے یہ خادمِ خاص اور جلیل القدر صحابی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ' بصرہ میں ۹۳ھ میں ایک سودوسال کی عمر میں اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلندفرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت ومعیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۲۴/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ،مطابق ۱۳/فروری ۲۰۱۵ء بروز جمعہ یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ:

اُن دنوں مدینہ شہر میں دو بڑے مشہور قبائل آباد تھے، ایک ''اوس'' اور دوسرا ''خزرج'' پھر ان کے چھوٹے چھوٹے متعدد ذیلی قبائل اور شاخیں تھیں، قبیلۂ اوس کے ذیلی قبائل میں خاندان ''بنوعبدالأشہل'' کی بڑی حیثیت اور شان وشوکت تھی، خاص بات یہ کہ اس خاندان کو بہت ہی'' طاقتور'' تصور کیا جاتا تھا......اُن دنوں اس طاقتور خاندان کے سردار کا نام ''اُسید بن الحُضیر'' تھا، جو کہ اپنی سخت گیری' تندمزاجی' اور جوشیلے پن کی وجہ سے بڑی شہرت کا حامل تھا......

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب رسول اللہ ﷺ ابھی مکہ میں ہی تشریف فرما تھے اور ہجرتِ مدینہ کا واقعہ تاہنوز پیش نہیں آیا تھا، دعوتِ اسلام کے سلسلے میں آپؐ مشرکینِ مکہ کی طرف سے کافی حد تک مایوسی کے بعد اب بیرونِ مکہ سے آنے والوں کی طرف زیادہ توجہ مرکوز فرمانے لگے تھے۔

چنانچہ نبوت کے گیارہویں سال آپؐ جب موسمِ حج کے موقع پر بیرونِ مکہ سے آئے ہوئے حجاج کی رہائشگاہوں میں گھوم پھر کر پیغامِ حق پہنچانے میں مشغول تھے، تب آپؐ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے چھ افراد نے دینِ برحق قبول کیا تھا، جن کا تعلق مدینہ سے تھا، اس کا نتیجہ یہ ظاہر ہوا کہ آئندہ سال یعنی نبوت کے بارہویں سال مدینہ سے آنے والے حجاج میں سے بارہ افراد نے منیٰ میں عقبہ کے مقام پر آپؐ سے خفیہ ملاقات کی، نیز آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی جسے ''بیعتِ عقبہ اُولیٰ'' کہا جاتا ہے۔

ان بارہ افراد نے مکہ سے اپنے شہر مدینہ کی جانب روانگی سے قبل رسول اللہ ﷺ کی خدمت

میں گذارش کی کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو ہمارے ساتھ روانہ فرما دیجئے تا کہ وہ ہمارے شہر مدینہ میں ہمیں اللہ کے دین کی اور قرآن کی تعلیم دے سکے'' اس پر آپؐ نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ روانہ فرمایا تھا(۱)

مدینہ پہنچنے کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے ''قباء'' نامی مضافاتی بستی میں قیام کیا تھا جہاں ان کے میزبان حضرت اسعد بن زُراہ رضی اللہ عنہ تھے، جو کہ قبیلۂ خزرج کے سرداروں میں سے تھے۔(۲)

چنانچہ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے مدینہ آمد کے بعد نہایت خلوص اور جذبے کے ساتھ دینِ برحق کی طرف دعوت اوراس کی نشر واشاعت کے سلسلے میں جدوجہد کا آغاز کیا۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اپنی اس جائے قیام پر دینِ اسلام کی دعوت وتبلیغ کے

---

(۱) حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ ملاحظہ ہو، صفحات [۳۷۹-۳۹۶]۔

(۲) حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ ان چھ افراد میں سے تھے جنہوں نے نبوت کے گیارہویں سال حج کے موقع پر منیٰ میں رسول اللہ ﷺ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے دینِ برحق قبول کیا تھا، اور پھر اس کے اگلے ہی سال (نبوت کے بارہویں سال) بیعتِ عقبہ اولیٰ کے موقع پر بھی موجود تھے، مزید یہ کہ اس بیعت کے بعد حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی مدینہ تشریف آوری ہوئی تھی، اس کے بعد اگلے سال (نبوت کے تیرہویں سال) بیعتِ عقبہ ثانیہ میں بھی یہ شریک تھے، اور پھر اس بیعت کے کچھ ہی عرصے بعد جب رسول اللہ ﷺ ہجرت کرتے ہوئے مدینہ تشریف لائے تھے تب مدینہ میں اندرونِ شہر کی جانب پیش قدمی کی بجائے آپؐ نے ابتدائی چند ایام ''قباء'' میں گذارے تھے، جہاں آپؐ نے مسجدِ قباء کی بنیاد بھی رکھی تھی، تب آپؐ نے وہاں ''قباء'' میں انہی (حضرت اسعد بن زُرارہؓ) کے یہاں قیام فرمایا تھا۔ غرضیکہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا بہت خاص قریبی تعلق اور جذباتی لگاؤ تھا......البتہ یہ کہ دینِ اسلام کا عروج دیکھنے سے قبل ہی یہ اس جہانِ فانی سے کوچ کر گئے، آپ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے فوری بعد جن دنوں مسجدِ نبوی کی تعمیر کا کام چل رہا تھا' تب ایک روز انہیں سینے میں تکلیف محسوس ہوئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے ان کا انتقال ہو گیا۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔

علاوہ مزید یہ کہ مدینہ کے مختلف محلوں اور بستیوں میں گھوم پھر کر بھی یہ مبارک فریضہ سرانجام دیا کرتے تھے، اور تب ہمیشہ ان کے میزبان حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ بھی ان کے ہمراہ ہوا کرتے تھے۔

ایسے ہی ایک روز جب یہ دونوں حضرات دعوت وتبلیغ کے سلسلے میں اپنے گھر سے نکلے، چلتے چلتے دونوں ایک باغ میں پہنچے، وہاں ایک کنواں تھا، جس کا پانی خوب ٹھنڈا اور میٹھا تھا، ان دونوں نے اس کنویں سے پانی پیا، اور پھر کچھ سستانے کی غرض سے کنویں کے ساتھ ہی کھجور کے درختوں کی گھنی چھاؤں میں بیٹھ گئے۔

رفتہ رفتہ وہاں لوگ جمع ہونے لگے، تب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں گفتگو کا آغاز فرمایا، لوگ خوب توجہ اور بڑی ہی دلچسپی کے ساتھ ان کی باتیں سننے لگے...... مجمع بڑھتا چلا گیا۔

اتفاق سے یہ باغ قبیلۂ اوس کے ذیلی خاندان ''بنوعبدالأشہل'' سے تعلق رکھنے والے کسی شخص کی ملکیت تھا، جبکہ حضرت اسعد بن زُرارہ رضی اللہ عنہ کا تعلق مخالف قبیلے ''خزرج'' سے تھا، دونوں قبیلوں کے درمیان قدیم رنجش اور دشمنی تھی......

مزید یہ کہ اس باغ میں نئے دین (دینِ اسلام) کے بارے میں گفتگو کی جارہی تھی اور اس کی طرف دعوت دی جارہی تھی، وہ بھی ایسے شخص کی طرف سے کہ جس کا تعلق مخالف قبیلے سے تو کیا...... سرے سے مدینہ شہر سے ہی اس کا کوئی تعلق نہیں تھا، وہ تو محض اجنبی تھا، کیونکہ وہ تو مکہ کا باشندہ تھا، یعنی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ۔

اسی دوران کسی نے یہ خبر اُسید بن الحُضیر تک پہنچادی جو کہ اس طاقتور ترین خاندان ''بنوعبدالأشہل'' کا سردار تھا، اس مخبر نے یہ اطلاع پہنچائی کہ وہ اجنبی جو مکہ سے آیا ہوا ہے،

وہ یہاں قریب ہی ہمارے خاندان کے ایک شخص کے باغ میں بیٹھا ہوا نئے دین کی طرف دعوت دے رہا ہے......اور یہ کہ اسے یہاں لانے والا اس کا میزبان اسعد بن زُرارہ ہے، جو کہ مخالف قبیلے (خزرج) سے تعلق رکھتا ہے......اسی نے اپنے اس اجنبی مہمان کو اتنی شہ دے رکھی ہے، اور اسی کی پشت پناہی کی وجہ سے اس اجنبی کا حوصلہ اس قدر بڑھ چکا ہے۔

یہ سب کچھ سن کر وہ سردار اُسید بن الحُضیر نہایت غضبناک ہو گیا، اپنا نیزہ سنبھالا، اور اس باغ کی طرف چل دیا، اس کی تندی وتیزی اور سخت مزاجی کے تو پہلے ہی بڑے چرچے تھے، اور اب تو بطورِ خاص ......بات ہی ایسی نازک تھی......کہ مخالف قبیلے سے تعلق رکھنے والا وہ سردار اسعد بن زُرارہ......اس کے ہمراہ وہ اجنبی مہمان جس کا مدینہ سے کوئی تعلق ہی نہیں تھا......اور ہمارے علاقے میں......ہمارے خاندان سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کے باغ میں بیٹھ کر......ہمارے ہی لوگوں کو ہمارے دین سے برگشتہ کرنے کی کوشش......اور ایک نئے دین کی طرف دعوت......ظاہر ہے یہ سب کچھ بہت نازک معاملہ تھا......یہی وہ سب باتیں تھیں جن کی وجہ سے اس وقت اُسید بن الحُضیر کا غصہ اپنے عروج کو پہنچ رہا تھا......

چنانچہ اُسید بن الحُضیر اپنا چمکتا ہوا نیزہ لہراتا ہوا، اور اپنی آنکھوں سے شعلے برساتا ہوا وہاں آ دھمکا، وہاں پہنچنے کے بعد سیدھا وہ حضرت مصعبؓ کے قریب پہنچا، اور اپنا نیزہ لہراتے ہوئے بڑے ہی جاہ وجلال کے ساتھ ان کے بالکل سامنے کھڑے ہو کر انہیں گھورنے لگا، اور پھر انہیں مخاطب کرتے ہوئے کرخت آواز اور درشت انداز میں یوں کہنے لگا ’’اجنبی نوجوان! تمہاری یہ ہمت......؟ کہ تم ہمارے علاقے میں آکر ان سیدھے سادھے لوگوں کو

ورغلا رہے ہو؟ انہیں ان کے آبائی دین سے برگشتہ کر کے نیا دین اپنانے پر اُکسا رہے ہو؟ ایسے خدا کی عبادت کی ترغیب دے رہے ہو کہ جسے کسی نے کبھی دیکھا ہی نہیں ہے؟ ہم تو اپنے خداؤں (بتوں) کو اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، ہمیں جب ان سے کچھ مانگنا ہوتا ہے، ہم ان کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے مانگتے ہیں، جبکہ جس خدا کی عبادت کی طرف تم دعوت دے رہے ہو وہ تو نظر ہی نہیں آتا، کسی کو جب اس کا پتہ ہی معلوم نہیں تو پھر وہ اس کی عبادت کرنے کہاں جائے گا؟ اور اس سے کس طرح کچھ مانگ سکے گا؟''

تب اس نازک ترین موقع پر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے کسی گھبراہٹ کے بغیر مکمل سکون واطمینان کے ساتھ، دھیمے لہجے میں، بڑے ہی پر اعتماد انداز میں اُسید کو مخاطب کرتے ہوئے کہا ''کیا یہ مناسب نہیں ہوگا کہ آپ گھڑی بھر کیلئے میری بات سن لیں ......اگر میری بات آپ کو اچھی لگے تو ٹھیک ہے......ورنہ یہ کہ ہم خود ہی یہاں سے چلے جائیں گے، اور آئندہ کبھی یہاں نہیں آئیں گے''

اس پر اُسید نے کہا: لَقَد أنصَفتَ ...... یعنی ''یہ تو تم نے بہت ہی انصاف کی بات کہی ہے......'' اور اس کے ساتھ ہی وہ ان کی بات سننے کیلئے ان کے سامنے بیٹھ گیا۔

تب حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ نے اسے دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں مطلع کیا، اللہ کا پیغام پہنچایا، دینِ برحق قبول کر لینے کی دعوت دی، اور اپنے مخصوص اور دلنشین انداز میں کچھ قرآنی آیات بھی تلاوت کیں......

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی باتیں اُسید بن الحُضیر کے دل میں اترتی چلی گئیں، اس کے شعور ووجدان میں عجیب سا احساس بیدار ہونے لگا......اور اسے عجیب جذباتی کیفیت محسوس ہونے لگی......اس کا ضمیر اندر ہی اندر اسے پکار پکار کر کہنے لگا کہ اس

نوجوان کی باتیں بالکل درست ہیں، جس دین کی طرف یہ دعوت دے رہا ہے وہی دینِ برحق ہے، اسے اپنا لینے میں ہی انسانیت کیلئے صلاح وفلاح اور سعادتمندی کا راز پوشیدہ ہے......

اور تب......اس کا انداز بدلنے لگا، اس کا لب ولہجہ بدلنے لگا، اس کی نظریں بدلنے لگیں، لمحہ بھر کیلئے اس نے مڑ کر اپنے ساتھیوں کی جانب دیکھا، اور پھر یوں کہنے لگا: مَا أحسَنَ هٰذَا القَولُ وَأصدَقَهٗ ...... یعنی ''کتنی اچھی اور سچی ہیں اس کی باتیں......''

اور اب بدلے ہوئے انداز اور دھیمے لہجے میں حضرت مصعبؓ سے دریافت کرنے لگا ''اگر کوئی دینِ اسلام قبول کرنا چاہے تو اسے کیا کرنا ہوگا؟''

حضرت مصعبؓ نے جواب دیا ''غسل کر کے پاک صاف لباس زیب تن کرنا ہوگا، اور پھر خلوصِ دل کے ساتھ تصدیق' نیز زبان سے اس بات کا اقرار واظہار کرنا ہوگا کہ ''أشھد أن لا الٰہ الا اللہ، وأشھد أن محمداً رسول اللہ''۔

یہ بات سنتے ہی اُسید وہاں سے روانہ ہوگیا، اور پھر کچھ ہی دیر گذری تھی کہ لوگوں نے دیکھا کہ وہ باغ میں موجود اس کنوئیں سے غسل کر کے چلا آرہا ہے، تازہ تازہ پانی کے قطرات اس کے جسم سے ٹپک رہے تھے، اور تب اس نے حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کے سامنے بیٹھ کر تمام مجمع کے سامنے بآوازِ بلند یہ کلمات کہے'' أشھد أن لا الٰہ الا اللہ، وأشھد أن محمداً رسول اللہ''۔

اور یوں یہ شخص اب محض اُسید بن الحُضیر سے ''حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ'' بن گئے......اور اس قافلے میں شامل ہوگئے جو کفر وشرک اور ہر قسم کی گمراہی کے اندھیروں سے نکل کر اب ہدایت اور روشنی کی طرف رواں دواں تھا......

حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کا چونکہ اس قبیلے میں اور اس معاشرے میں بڑا اثر ورسوخ تھا، لہٰذا ان کے قبولِ اسلام کے بعد اب وہاں پورے علاقے میں دینِ اسلام کی نشرو اشاعت کا راستہ کافی حد تک ہموار ہو گیا، لوگ بڑے پیمانے پر دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے...... آخر وہ وقت بھی آیا کہ مدینہ شہر میں ایسی مناسب اور سازگار فضاء قائم ہو گئی کہ جسے دیکھتے ہوئے خود رسول اللہ ﷺ و دیگر تمام اہلِ ایمان مکہ سے مستقل طور پر ہجرت کر کے مدینہ آپہنچے......اور پھر رسول اللہ ﷺ کی زیرِ قیادت روئے زمین پر معرضِ وجود میں آنے والی اولین اسلامی ریاست کا دارالحکومت یہی شہر ''مدینہ'' ہی بنا۔

☆......حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی زندگی قبولِ اسلام کے بعد اب یکسر بدل کر رہ گئی، سختی کی بجائے مزاج میں اب نرمی اور خوش اخلاقی آ گئی، اکثر ان کی طبیعت پر رقت طاری رہتی، بالخصوص قبولِ اسلام کے موقع پر حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی زبانی جو گفتگو سنی تھی، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اُس موقع پر ان کی زبانی جو قرآنی آیات سنی تھیں، اللہ کا جو کلام سنا تھا، وہ نورانی کلام...... جسے سنتے ہی پلک جھپکتے میں ان کے دل کی دنیا بدل گئی تھی، کفر و شرک کے اندھیروں کی جگہ اب وہاں ایمان کی شمع جل اٹھی تھی......

یہی وجہ تھی کہ اُس دن کے بعد سے ہمیشہ تاحیات قرآن کریم کے ساتھ ان کا انتہائی والہانہ تعلق رہا، قرآن کریم کے ساتھ ان کا تعلق بس ایسا ہی تھا کہ جیسے سخت گرمی کے موسم میں، شدید قحط کے زمانے میں، کسی تپتے ہوئے صحرا میں، کسی کو اچانک ٹھنڈے اور میٹھے پانی کے چشمے تک رسائی نصیب ہو جائے......

لہٰذا حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ بڑے ہی شوق اور شغف کے ساتھ زیادہ سے زیادہ تلاوتِ قرآن میں مشغول رہا کرتے تھے...... بالخصوص دن بھر کی مصروفیات کے بعد......

نیز کاروبارِ زندگی کے اس شوروشغب کے بعد جب رات کا سکوت ہر طرف چھا جاتا...... خاموشی تمام کائنات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی......تب اس پُرسکون ماحول میں......خاموشی کی اس فضاء میں......مدینہ منورہ کی مضافاتی بستی ''قباء'' میں ایک نخلستان کے قریب واقع ان کے گھر سے نہایت ہی مؤثر اور دلنشین انداز اور سریلی آواز میں تلاوتِ قرآن کی صدا بلند ہونے لگتی......اکثر ان کے پڑوسی اس انتظار میں' نیز موقع کی تلاش میں رہتے کہ کب اُسید کی وہ دلکش آواز بلند ہوگی......تاکہ ہم بھی ان کی سریلی آواز میں تلاوتِ قرآن سن سکیں......

حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی وہ دلکش آواز' اور وہ دلنشین انداز......اور وہ پرسوز تلاوتِ قرآن......اس چیز کے منتظر اور مشتاق صرف یہ زمین والے ہی نہیں تھے......بلکہ آسمانوں پر بسنے والے فرشتے بھی ان کی تلاوت سے متأثر ہوا کرتے تھے، اور ان کی تلاوت سننے کیلئے بے چین رہا کرتے تھے......

چنانچہ ایک بار آدھی رات کے قریب حضرت اُسید رضی اللہ عنہ اپنے گھر سے متصل کھلی جگہ میں لیٹے ہوئے تھے، فضاء میں ہر طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی، بہت ہی پرسکون ماحول تھا، ایسے میں بے اختیار ان کا دل چاہا کہ قرآن کریم کی تلاوت کی جائے، تب یہ اٹھ کر بیٹھ گئے، تلاوت شروع کی، اپنے پُرکشش انداز میں، اور بہت ہی دلنشیں آواز میں......

انہیں تلاوت کرتے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گذری تھی کہ انہوں نے دیکھا کہ ان کا گھوڑا جو قریب ہی بندھا ہوا تھا، وہ بدکنے اور اچھل کود کرنے لگا، یہاں تک کہ انہیں اندیشہ ہونے لگا کہ کہیں وہ رسی تڑا کر بھاگ نہ جائے......

اس منظر کی وجہ سے چونکہ یہ اپنے گھوڑے کی طرف متوجہ ہو گئے اور تلاوت موقوف کردی،

تو گھوڑا ابھی رک گیا، جس پر انہوں نے دوبارہ تلاوت شروع کی، تب گھوڑے نے بھی فوراً ہی دوبارہ اچھل کود شروع کردی...... حتیٰ کہ انہیں اندیشہ ہوا کہ قریب ہی گہری نیند سوئے ہوئے ان کے بیٹے یحییٰ کو کہیں اچھل کود کرتا ہوا یہ گھوڑا قدموں تلے کچل نہ ڈالے...... یہ سوچ کر یہ اپنی جگہ سے اٹھے اور اپنے بیٹے کی طرف جانے لگے تا کہ اسے جگا سکیں۔

اس طرف جاتے ہوئے اچانک ان کی نگاہ آسمان کی طرف اٹھ گئی، تب انہیں بادل کا ایک ٹکڑا نظر آیا، جس میں جابجا بہت سے روشن چراغ ٹمٹمار ہے تھے، بہت ہی خوشنما اور دلکش منظر تھا وہ...... کچھ دیر یہ اسی طرح اپنی جگہ ساکت و جامد کھڑے ہوئے بڑے ہی انہماک کے ساتھ یہ خوشنما اور روح پرور نظارہ دیکھتے رہے، اور اسی دلفریب منظر میں کھوئے رہے، اور پھر وہ بادل آہستہ آہستہ آسمان کی جانب بلند ہوتا گیا...... حتیٰ کہ رفتہ رفتہ ان کی نگاہوں سے اوجھل ہو گیا۔

جب صبح ہوئی تو رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ نے یہ تمام ماجرا بیان کیا، جس پر آپؐ نے فرمایا: تِلكَ المَلَائِكَةُ كَانَت تَستَمِعُ اِلَيكَ يَا اُسَيد...... یعنی ''اے اُسید! وہ تو فرشتے تھے جو آپ کی تلاوتِ قرآن سُن رہے تھے'' (۱)

☆...... حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کو جس طرح قرآن کریم کے ساتھ بہت زیادہ شغف تھا' اور بڑے ہی دلنشین انداز میں قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے...... اسی طرح انہیں رسول اللہ ﷺ کے ساتھ بھی بہت زیادہ عقیدت و محبت تھی، خصوصاً جب آپؐ خطبہ دے رہے ہوتے' یا کسی موقع پر وعظ و نصیحت میں مشغول ہوتے، تب اُسید دنیا و مافیہا

(صحیح مسلم [۶۹۷] کتاب صلاۃ المسافرین وقصرہا، باب (نمبر ۳۶) نزول السکینۃ لقراءۃ القرآن۔ وغیرہ۔

سے بے خبر ہمہ تن گوش ہو کر آپؐ کی طرف متوجہ ہو جاتے......

رسول اللہ ﷺ کے ساتھ حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی جو محبت وعقیدت تھی، اور جو تعلقِ خاطر تھا، اس کا اظہار اس واقعے سے بھی ہوتا ہے کہ ایک بار کسی محفل میں جب رسول اللہ ﷺ تشریف فرما تھے، اُس وقت وہاں اتفاقاً کچھ بے تکلفی کی فضاء تھی ، دوستانہ قسم کا ماحول تھا، شرکائے محفل میں سے ہر کوئی اپنی اپنی کوئی بات سنا رہا تھا......اسی دوران اُسیدؓ نے بھی اپنی کوئی بات سنائی ، جس پر سبھی لوگ خوب محظوظ ہوئے اور ہنس دیئے، تب آپؐ نے بھی اظہارِ پسندیدگی کے طور پر ان کی کمر میں ہلکی سی انگلی چبھوئی......تب اچانک اِنہیں ایک ترکیب سوجھی، اور یہ فوراً ہی منہ بسورتے ہوئے یوں کہنے لگے: أوجَعْتَنِي يَا رَسُولَ اللّه! ...... یعنی ''اے اللہ کے رسول! آپ نے تو مجھے درد کر دیا......''

اس پر رسول اللہ ﷺ نے فوراً جواب میں یہ ارشاد فرمایا: اِقتَصّ مِنِّي يَا اُسَيد! یعنی ''اے اُسید! آپ مجھ سے اپنا بدلہ لے لیجئے''

تب اُسیدؓ نے عرض کیا: اِنّ عَلَيكَ قَمِيصاً ، وَلَم يَكُن عَلَيَّ قَمِيصٌ حِينَ غَمَزْتَنِي ...... یعنی ''اے اللہ کے رسول! آپ کے جسم پر تو قمیص ہے، جبکہ آپ نے مجھے جب انگلی چبھوئی تھی تب مجھ پر قمیص نہیں تھی'' (یعنی چونکہ کسی کھلی جگہ بیٹھے ہوں گے، لہٰذا ہوا کی وجہ سے اتفاقاً ان کے جسم سے اس جگہ سے کپڑا ہٹ گیا ہوگا)

اس پر رسول اللہ ﷺ نے اپنے جسمِ مبارک سے قمیص ہٹائی ......تب فوراً ہی عقیدت ومحبت سے سرشار اُسیدؓ نے آپؐ کے جسمِ مبارک کو بوسہ دیا، اور اس کے بعد عرض کیا: بِأبِي أنتَ وَأمِّي يَا رَسُولَ اللّٰه! اِنّهَا لَبُغيَةٌ كَنتُ أتَمَنّاهَا ...... یعنی ''اے اللہ کے رسول! میرا مقصد تو بس یہی تھا......جس کی آرزو عرصے سے میرے دل میں تھی'' (۱)(۲)

☆......جس طرح حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کے دل میں رسول اللہ ﷺ کیلئے انتہائی عزت واحترام اوروالہانہ عقیدت ومحبت کے جذبات موجزن تھے......اسی طرح آپ ﷺ بھی ہمیشہ ان کے ساتھ خاص شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے رہے......آپ نےؐ اس حقیقت کو ہمیشہ ملحوظ رکھا کہ اُسید رضی اللہ عنہ تومدینہ کے ان باشندوں میں سے تھے جنہوں نے کافی ابتدائی دور میں دینِ اسلام قبول کیا تھا، چنانچہ ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے موقع پر یہ شریک تھے، لہٰذا یہ ان خوش نصیب افراد میں سے تھے جن کی طرف سے پرزور دعوت اور مسلسل اصرار کے نتیجے میں ہی آپ ؐ مکہ سے ہجرت فرما کر مستقل طور پر مدینہ تشریف لے آئے تھے......تب مدنی زندگی میں غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تھا، اوراس حوالے سے بھی حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی کیفیت یہ چلی آرہی تھی کہ ہمیشہ ہر غزوے کے موقع پر شریک بلکہ پیش پیش رہے تھے، چنانچہ غزوات کے حوالے سے ہی ان کی یہ بات بھی آپ ؐ

حاشیہ صفحہ گذشتہ:

(۱) الراوی: ابولیلیٰ الانصاری۔ المحدث: الذہبی۔ المصدر: المہذب [۶/۳۱۳۷]

(۲) یعنی بدلہ لینا ہرگز مقصود نہیں تھا، بلکہ اس بہانے رسول اللہ ﷺ کے جسمِ مبارک کو بوسہ دینے کی آرزو تھی۔ نیز اس واقعے سے جہاں حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ کیلئے عقیدت ومحبت ظاہر ہوتی ہے، وہیں رسول اللہ ﷺ کا اعلیٰ اخلاق بھی ظاہر ہوتا ہے، آپ ؐ کو اللہ عزوجل کی جانب سے خیرالبشر اور افضل الانبیاء والرسل کے شرف سے نوازا گیا، لیکن اس کے باوجود اپنے امتیوں کے ساتھ اس قدر حسنِ اخلاق اور عجز وانکسار، جیسا کہ آپ ؐ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے بالکل آخری ایام میں ایک بار مسجد میں اپنے منبر پر تشریف فرما ہوتے ہوئے یہ اعلان فرمایا تھا: (مَن كُنتُ جَلَدتُ لَهُ ظَهراً فَهٰذا ظَهرِي ، فَليَستَقِد مِنهُ ، وَمَن كُنتُ شَتَمتُ لَهُ عِرضاً فَهٰذَا عِرضِي ، فَليَستَقِد مِنهُ) یعنی ''جس کسی کو میں نے ناحق کبھی مارا پیٹا ہو تو یہ میری کمر حاضر ہے، وہ آئے اور مجھ سے بدلہ چکالے......اگر میں نے کبھی کسی کو بے عزت کیا ہو تو وہ آئے اور مجھ سے اپنا انتقام لے لے'' (مجمع الزوائد للہیثمی، عن الفضل بن عباسؓ۔ حدیث: ۱۴۲۵۲، ج: ۹، باب فی وداعہ ﷺ)۔

کے ذہن میں تھی کہ غزوۂ اُحد کے دوران جب ایک موقع پر آپؐ دشمنوں کے نرغے میں پھنس گئے تھے' تب آپؐ کی طرف سے دفاع کرتے ہوئے انہیں تلواروں اور نیزوں کے بہت سے زخم آئے تھے جن میں سے چند زخم اتنے گہرے تھے کہ ان سے شفایاب ہونے میں انہیں طویل عرصہ لگ گیا تھا۔

مزید یہ کہ اپنی قوم اور قبیلے میں خاندانی طور پر نسل درنسل ان کی بڑی حیثیت چلی آرہی تھی......اللہ کے دین کی خاطر اپنے پرانے رسم ورواج' اپنی سرداری' جاہ ومنصب' اور شان وشوکت سے دستبرداری اختیار کرتے ہوئے اب یہ ہمہ وقت آپؐ کی خدمت اور صحبت ومعیت میں ہی رہنے لگے تھے، اللہ کے دین کی تبلیغ اور نشر واشاعت کو ہی اب انہوں نے اپنا مقصدِ حیات بنالیا تھا...... یہ وہ تمام حقائق تھے جن سے آپؐ بخوبی آگاہ تھے، اور یہی وجہ تھی کہ آپؐ ان کا کافی لحاظ فرمایا کرتے تھے۔ لہٰذا اگر کسی معاملے میں یہ اپنی قوم کے کسی فرد سے متعلق آپؐ کی خدمت میں کوئی گذارش کرتے تو آپؐ ان کی گذارش کو رد نہیں فرماتے تھے۔

چنانچہ ایک بار حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ نے اپنی قوم (بنوعبدالأشہل) کے کسی گھرانے کے بارے میں رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں گذارش کی کہ ''اے اللہ کے رسول! یہ لوگ محتاج اور مفلوک الحال ہیں''

اس پر آپؐ نے جواب دیا ''اے اُسید! آپ ہمارے پاس ایسے وقت پہنچے ہیں کہ جب ہم سبھی کچھ تقسیم کر چکے ہیں، لہٰذا آئندہ جب کبھی ہمارے پاس کچھ (مالِ غنیمت' یا صدقات وغیرہ) آئے تب آپ ہمیں ان افراد کے بارے میں یاد دلا یئے گا''

اس کے بعد کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ (سات ہجری میں) ''فتحِ خیبر'' کا یادگار واقعہ پیش آیا،

جس کے نتیجے میں بڑی مقدار میں مالِ غنیمت خیبر سے مدینہ پہنچا۔تب آپؐ نے اس گھرانے کے افراد کو بطورِ خاص بہت کچھ عطاء فرمایا......

اسی کیفیت میں وقت کا سفر جاری رہا،حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کیلئے والہانہ عقیدت ومحبت ......جبکہ آپؐ کی طرف سے ان کیلئے شفقت وعنایت کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا......حتیٰ کہ آپؐ کا مبارک دور گذر گیا......آپؐ تادمِ آخر ان سے نہایت خوش اور مسرور ومطمئن رہے۔

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں جس طرح اُس معاشرے میں انہیں بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا......ان کی یہی حیثیت آپؐ کے بعد بھی برقرار رہی۔

اور پھر ۲۰ھ میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہ بیمار پڑ گئے،آخر مختصر علالت کے بعد رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت اُسید بن الحُضیر رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔

ان کے جسدِ خاکی کو مضافاتی بستی ''قباء'' (جہاں ان کے خاندان بنو عبدالأشہل کا مسکن تھا) سے مدینہ شہر لایا گیا، جہاں مسجدِ نبوی میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اقتداء میں ان کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی،اس کے بعد جب ان کا جسدِ خاکی مسجد نبوی سے آخری آرامگاہ یعنی ''بقیع'' کی جانب لے جایا جانے لگا تو اس موقع پر مسجد سے ''بقیع'' تک مسلسل حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ انہیں کندھا دینے والوں میں شامل رہے، اور پھر ''بقیع'' میں انہیں سپردِ خاک کردیا گیا۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں۔

الحمدللہ آج بتاریخ ۲۹/ ربیع الثانی ۱۴۳۶ھ،مطابق ۱۸/فروری ۲۰۱۵ء بروز بدھ یہ باب مکمل ہوا۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ:

حذیفہ کے والد ''یمان'' کاتعلق مکہ میں قبیلہ ''عَبس'' سے تھا،اس قبیلے سے تعلق رکھنے والے دیگر سبھی افراد کی مانند وہاں مکہ میں یمان کے شب وروز بھی معمول کے مطابق بسر ہورہے تھے......البتہ (ظہورِاسلام سے قبل) ایک روز یہ واقعہ پیش آیا کہ یمان کا اپنے قبیلے کے کسی فرد کے ساتھ کسی بات پر جھگڑا ہوگیا، پہلے تلخ کلامی' اور پھر زدوکوب کا سلسلہ ہوا جس کے دوران وہ شخص اس کے ہاتھوں مارا گیا......تب انتقام سے بچنے کی خاطر یہ مکہ شہر سے بھاگ کھڑا ہوا......اور پھر چھپتے چھپاتے آخر مدینہ (اُس دور میں جسے یثرب کہا جاتا تھا) جا پہنچا، جہاں اس نے مدینہ شہر کی ایک مضافاتی بستی ''قباء'' میں آباد مشہور اور طاقتور خاندان ''بنوعبدالأشہل'' میں باقاعدہ پناہ حاصل کرلی، اور پھر رفتہ رفتہ وہاں معاشرے میں ان لوگوں کے ساتھ اس کے تعلقات استوار ہوتے چلے گئے۔

آخر مرورِوقت کے ساتھ یہ تعلقات اس قدر خوشگوار اور مستحکم ہوگئے کہ وہیں اس خاندان ''بنوعبدالأشہل'' میں اس کی شادی بھی ہوگئی،اور پھر اس کا بیٹا پیدا ہوا،جس کا نام ان دونوں میاں بیوی نے ''حذیفہ'' رکھا۔

یمان کو اپنے شہر مکہ سے نکلنے کے بعد وہاں کی یاد ستاتی رہتی تھی ،لیکن وہ خوف کی وجہ سے وہاں جانے سے گھبراتا تھا،البتہ جب کافی وقت گذر چکا تو اب وہ سوچنے لگا کہ شاید میرے قبیلے والے میری اُس غلطی (یعنی میرے ہاتھوں ایک شخص کی موت) کو اب بھلا چکے ہوں گے......یہ سوچ کر یمان نے اب وقتاً فوقتاً مدینہ سے مکہ آمد ورفت کا سلسلہ شروع کردیا، لیکن اسی پرانے خوف کی وجہ سے وہاں رہائش اختیار نہیں کی، اپنی مستقل رہائش بدستور

مدینہ میں ہی رکھی۔

اور پھر جب دینِ اسلام کا سورج طلوع ہوا، اور جزیرۃ العرب پر آفتابِ نبوت اپنی کرنیں بکھیرنے لگا...... تب یمان ایک بار جب مکہ گیا ہوا تھا...... (یہ اُس دور کی بات ہے جب ہجرتِ مدینہ کا واقعہ ابھی پیش نہیں آیا تھا، رسول اللہ ﷺ مکہ میں ہی مقیم تھے) تب مکہ میں یمان کی موجودگی کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ اس کے قبیلے عَبس کے چند افراد نے رسول اللہ ﷺ کی بعثت ورسالت کے بارے میں جب خبریں سنیں تو یہ فیصلہ کیا کہ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کر کے براہِ راست آپؐ کی زبانی پیغامِ حق سنا جائے، اور اس کے بعد دینِ اسلام قبول کرنے یا نہ کرنے کے بارے میں کوئی مناسب فیصلہ کیا جائے۔

یمان کو جب اس بات کا علم ہوا تو یہ بھی اپنے خاندان ''عَبس'' کے ان افراد کے ہمراہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں پہنچا، آپؐ کی مبارک گفتگو سنی، اللہ کا مقدس کلام سنا، جس پر یہ سبھی افراد انتہائی متأثر ہوئے، اور دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے، اور یوں اب ''یمان'' رسول اللہ ﷺ کے صحابی ''حضرت یمان رضی اللہ عنہ'' بن گئے۔

اور پھر جب یمان اس سفر سے لوٹ کر واپس اپنے گھر مدینہ پہنچے تو وہاں انہوں نے اپنی اہلیہ کو بھی دینِ اسلام اور پیغمبرِ اسلام کے بارے میں مطلع کیا اور قبولِ اسلام کی دعوت دی، چنانچہ اس دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے وہ بھی مسلمان ہوگئیں۔

یوں ان دونوں میاں بیوی کا وہ کمسن بیٹا ''حُذیفہ'' مدینہ میں مسلم گھرانے کا چشم و چراغ تھا، اور ایسے عظیم والدین کے زیرِ سایہ پرورش پا رہا تھا کہ جو بالکل ابتدائی دور میں ہی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مسلمان ہوگئے تھے، چنانچہ حذیفہ کو بالکل بچپن میں ہی...... رسول اللہ ﷺ کی زیارت اور دیدار سے قبل ہی ایمان کی انمول دولت نصیب ہوگئی تھی۔

رسول اللہ ﷺ کی زیارت اور دیدار کا شوق حذیفہؓ کے رگ و پے میں سمایا ہوا تھا، جب سے وہ مسلمان ہوئے تھے رسول اللہ ﷺ کے حالات جاننے کیلئے، نیز آپؐ کے اوصافِ حمیدہ کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کیلئے وہ مسلسل کوشش اور جستجو میں لگے رہتے تھے۔

چنانچہ حذیفہؓ جب کچھ بڑے اور سمجھدار ہو گئے تو ایک بار بطورِ خاص رسول اللہ ﷺ سے ملاقات کی غرض سے مدینہ سے سفر کرتے ہوئے مکہ پہنچے، جہاں انہیں زندگی میں پہلی بار آپؐ کا دیدار نصیب ہوا۔

اس کے بعد جب رسول اللہ ﷺ ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو ایک روز حذیفہؓ نے آپؐ سے دریافت کیا: أمُهَاجِرٌ أنَا أم انصَارِيٌّ يَا رَسُولَ اللّه؟ یعنی ''اے اللہ کے رسول! کیا میں مہاجرین میں سے ہوں ...... یا انصار میں سے؟'' (۱)

اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: اِن شِئتَ كُنتَ مِنَ المُهَاجِرِينَ ، وَاِن شِئتَ كُنتَ مِنَ الأنصَار ۔ یعنی ''اگر تم چاہو تو خود کو مہاجرین میں شمار کر لو، اور اگر چاہو تو انصار میں''

اس پر حذیفہؓ نے عرض کیا: بَل أنَا أنصَارِيٌّ يَا رَسُولَ اللّه ۔ یعنی ''اے اللہ کے رسول! میں انصاری ہوں''۔

رسول اللہ ﷺ کی مدینہ تشریف آوری کے بعد حذیفہؓ اور ان کے والد یمانؓ دونوں کی یہی کیفیت رہی کہ ہمہ وقت زیادہ سے زیادہ رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضری اور علمی استفادے میں مشغول و منہمک رہا کرتے تھے۔

ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد محض اگلے ہی سال جب مشرکین و مخالفین کی طرف سے مسلمانوں

(۱) چونکہ حذیفہؓ کے والد یمانؓ کا تعلق مکہ سے تھا، جبکہ والدہ کا تعلق مدینہ سے تھا، اس وجہ سے انہیں یہ اشکال ہوا کہ ان کا شمار مہاجرین میں ہوگا یا انصار میں......؟ (شاید ہجرتِ مدینہ کے فوری بعد مہاجرین و انصار کے مابین مؤاخاۃ کے موقع پر یہ اشکال پیش آیا ہوگا)۔

کے خلاف مسلح جارحیت کا سلسلہ شروع ہوا تو اس حوالے سے باپ بیٹا دونوں کی کیفیت یہ رہی کہ اولین غزوہ یعنی ''بدر'' میں یہ دونوں ہی شریک نہیں ہو سکے تھے، دوسرے غزوے یعنی اُحد کے موقع پر دونوں ہی شریک ہوئے تھے، البتہ اس موقع پر یمان شہید ہو گئے، جبکہ باقی تمام غزوات میں حذیفہ ہمیشہ شریک رہے۔

اولین غزوہ یعنی ''بدر'' سے ان دونوں کی غیر حاضری کی وجہ یہ ہوئی کہ اس غزوے سے چندروز قبل جب مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین حالات کافی کشیدہ چل رہے تھے، جنگ کے بادل منڈلا رہے تھے...... ایسے میں یہ باپ بیٹا دونوں مدینہ شہر سے باہر کچھ فاصلے پر اپنے کسی کام کاج کے سلسلے میں چلے جا رہے تھے، تب اچانک مشرکینِ مکہ کا ایک مسلح دستہ وہاں آ دھمکا، ان دونوں کو انہوں نے گرفتار کر لیا...... اور پھر بڑی ہی مشکلوں سے اس شرط پر رہا کیا کہ اگر مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے مابین جنگ کی نوبت آئی تو یہ اس جنگ سے لاتعلق اور الگ تھلگ رہیں گے...... مسلمانوں کے ساتھ مل کر مشرکین کے خلاف کسی جنگ میں شامل نہیں ہوں گے، کسی محاذ آرائی میں مسلمانوں کا ساتھ نہیں دیں گے۔

چنانچہ اس شرط پر رہائی پانے کے بعد یہ دونوں جب مدینہ پہنچے تو انہوں نے رسول اللہ ﷺ کو اس صورتِ حال سے آگاہ کرتے ہوئے دریافت کیا کہ ''اب ہمیں کیا کرنا چاہئے؟''

تب آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: نَفِي بِعَهْدِهِم ، وَنَستَعِينُ عَلَيهِم بِاللّٰهِ تَعَالَىٰ ...... یعنی ''اُن کے ساتھ کیا ہوا وعدہ پورا کیا جائے گا، اور بس اللہ ہی سے ہم ان کے خلاف مدد طلب کرتے رہیں گے'' (یعنی مشرکین کی قید سے رہائی کی خاطر ان دونوں نے یہ جو وعدہ کیا تھا کہ ہم رہائی کے بعد مشرکین کے خلاف کسی جنگ کا حصہ نہیں بنیں گے۔ لہٰذا اب ہم وعدہ خلافی نہیں کریں گے)۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس ہدایت (یعنی وعدہ خلافی سے گریز) پر عمل کرتے ہوئے یہ دونوں باپ بیٹا غزوۂ بدر کے موقع پر شریک نہیں ہوئے تاکہ مشرکین کے ساتھ کئے گئے وعدے کی خلاف ورزی نہ ہو۔

اس کے بعد اگلے ہی سال یعنی ۳ھ میں غزوۂ اُحد کا واقعہ پیش آیا، اس موقع پر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ شریک ہوئے اور خوب شجاعت و بہادری کے جوہر دکھائے، بڑی ہی بے جگری اور استقامت کے ساتھ لڑے، اس موقع پر انہیں بہت سے زخم بھی لگے......البتہ جان بچ گئی۔

جبکہ حذیفہؓ کے والد یمانؓ اس موقع پر شہید ہو گئے......لیکن ان کے ساتھ افسوسناک واقعہ یہ پیش آیا کہ ان کی شہادت مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں نہیں ہوئی، بلکہ ایک غلط فہمی کے نتیجے میں وہ خود مسلمانوں ہی کی تلواروں کی زَد میں آ گئے اور جانبر نہ ہو سکے۔

ہوا یوں کہ غزوۂ اُحد کے آغاز سے کچھ قبل رسول اللہ ﷺ نے تمام عورتوں اور بچوں کو دشمن سے حفاظت کی خاطر ایک محفوظ مقام پر جمع ہونے کی تاکید فرمائی تھی، اور پھر آپؐ نے یمان نیز ایک اور شخص (ثابت بن وقشؓ) کے بڑھاپے اور کمزوری کو دیکھتے ہوئے ان دونوں کو یہ تاکید فرمائی تھی کہ ''تم دونوں میدانِ جنگ میں دشمن کے خلاف باقاعدہ لڑنے کی بجائے بس اسی مقام پر ان عورتوں اور بچوں کی حفاظت کرنا''

چنانچہ یہ دونوں اسی مقام پر موجود تھے، لیکن......جب معرکہ شروع ہوا، اور پھر رفتہ رفتہ دونوں طرف سے جنگ میں خوب شدت آنے لگی......تب یمانؓ سے صبر نہیں ہو سکا......اور اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے یوں کہنے لگے: ''ہمیں کس چیز کا انتظار ہے؟ کیوں نہ ہم اپنی اپنی تلوار اٹھائیں اور رسول اللہ ﷺ سے جا ملیں؟......شاید اللہ ہمیں بھی شہادت کا درجہ

نصیب فرمادے''

اور پھر دونوں نے اپنی تلواریں اٹھائیں، اور میدانِ جنگ کی طرف چل دیئے، اور پھر وہاں پہنچنے کے بعد جنگ میں کود پڑے......اس موقع پر یمانؓ کے ساتھی ثابتؓ کو مشرکینِ مکہ کے ہاتھوں شہادت نصیب ہوئی، لیکن یمانؓ کو وہاں موجود مسلمان پہچان نہیں سکے، یوں یمانؓ غلطی سے ان کی تلواروں کا نشانہ بن گئے......یمانؓ خود چونکہ کافی عمر رسیدہ تھے، اس لئے نیچے گر گئے، اور کچھ بول بھی نہیں سکے، جبکہ حذیفہؓ وہاں سے کچھ دور تھے......البتہ یہ کہ اتفاقاً انہوں نے یہ منظر دیکھ لیا، تب وہ دوڑے ہوئے وہاں پہنچے، اور مسلسل بآواز بلند پکارتے رہے'' أبی......أبی '' یعنی '' یہ تو میرے والد ہیں''

لیکن اُس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، مزید یہ کہ اس افراتفری میں کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی، کسی کو کچھ سجھائی نہیں دے رہا تھا......آخر ان سب کی نگاہوں کے سامنے عمر رسیدہ یمانؓ نے آخری ہچکی لی، اور اپنے اللہ سے جا ملے......سبھی لوگ بس دیکھتے اور افسوس کرتے رہ گئے۔ حُذیفہؓ نے ان لوگوں کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے بس اتنا کہا: یَغفِرُ اللّٰہُ لَکُم......وَهُوَ أرحَمُ الرَّاحِمِين (۱) یعنی '' اللہ تمہیں معاف فرمائے......یقیناً وہ تو تمام رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم کرنے والا ہے''

رسول اللہ ﷺ کو جب اس انتہائی افسوسناک غلطی کے بارے میں اطلاع ہوئی تو آپؐ نے بیت المال سے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو اس قتلِ خطاً کی دیت ادا کرنا چاہی، لیکن انہوں نے نہایت ہی ادب کے ساتھ یہ کہتے ہوئے دیت قبول کرنے سے معذرت کر لی کہ '' اے اللہ کے رسول! میرے والد اللہ کی راہ میں شہادت کے آرزومند تھے، ان کی یہ آرزو پوری

(۱) یوسف [۹۲]

ہوگئی، لہٰذا اب دیت کی کوئی ضرورت نہیں''۔

اور پھر مزید یوں بھی کہا: اَللّٰهُمّ اشْهَد أنِّي تَصَدَّقتُ بِدِيَّةِ أبِي عَلَىٰ المُسْلِمِين ۔
یعنی''اے اللہ! تو گواہ رہنا کہ میں نے اپنے والد کی دیت مسلمانوں پر صدقہ کردی ہے''
یعنی بیت المال سے یہ رقم مستحق اور نادار مسلمانوں کی فلاح و بہبود میں ہی خرچ ہوگی......
لہٰذا یہ رقم حضرت حذیفہؓ کی طرف سے صدقہ ہوگئی۔

رسول اللہ ﷺ تو پہلے ہی حضرت حذیفہؓ پر بہت زیادہ شفقت وعنایت فرمایا کرتے تھے، اب ان کے اس فیصلے اور اس اندازِ فکر کی وجہ سے آپؐ کے نزدیک ان کی قدر و منزلت مزید بڑھ گئی۔

☆......رسول اللہ ﷺ کو اپنے رب کی طرف سے جو خاص حکمت و دانش اور بے مثال فہم و فراست عطاء کی گئی تھی اس کا ایک اثر یہ تھا کہ آپؐ ہمیشہ اپنے تمام صحابۂ کرام میں سے ہر ایک کا بغور جائزہ لیا کرتے تھے، تاکہ اس کی شخصیت کو اور اس کے مزاج کو سمجھا جاسکے، اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اس کی شخصیت اور مزاج میں چھپی ہوئی قدرتی اور فطری خوبیوں اور صلاحیتوں کا کھوج لگایا جاسکے......اور پھر اسے کوئی ایسی ہی ذمہ داری سونپی جائے جس سے اس کی یہ خفیہ صلاحیتیں مزید نکھر سکیں، نیز یہ کہ اس سے دینِ اسلام اور تمام اسلامی معاشرے کو بھی خوب فائدہ اور نفع پہنچ سکے......جس طرح کسی مشین میں ہر پرزہ یقیناً بڑی اہمیت اور افادیت کا حامل ہوا کرتا ہے، لیکن اس سے استفادہ تبھی ممکن ہوگا کہ جب ہر پرزہ اپنی درست جگہ پر ہو......

لہٰذا رسول اللہ ﷺ ہر ایک کی نفسیات کو سمجھنے اور اس میں چھپے ہوئے''جوہر'' کو جان لینے کے بعد کوئی ایسی ہی ذمہ داری اسے سونپا کرتے تھے جو اس کی شخصیت میں پوشیدہ اس جوہر

کے مطابق ہو۔

رسول اللہ ﷺ اپنے اسی اصول اور اسی معمول کے مطابق حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کو بھی جانچتے اور پرکھتے رہتے تھے، آخر آپ ﷺ کو ان کی شخصیت اور مزاج میں تین خصوصیات نمایاں طور پر محسوس ہوئیں:

☆ پہلی خصوصیت: انتہائی ذہانت وفطانت، جو مشکل ترین اور پیچیدہ قسم کے معاملات کے حل میں ہمیشہ ان کی مددگار رہتی تھی۔

☆ دوسری خصوصیت: معاملہ فہمی، یعنی فوری طور پر اور فی البدیہ معاملے کو خوب سمجھ لینا، حقیقت کی تہ تک پہنچ جانا، اور پھر فوری طور پر مناسب فیصلے اور درست اقدام کی صلاحیت۔

☆ تیسری خصوصیت: مکمل رازداری برتنا، کہ کوئی کبھی سمجھ ہی نہ سکے کہ ان کے دل میں کیا ہے؟ کیا خیالات گردش کر رہے ہیں؟ کن سوچوں کے دھارے بہہ رہے ہیں؟ کسی کو ان کے ارادوں کی بھنک بھی نہ پڑ سکے۔(۱)

یہ اُس زمانے کی بات ہے جب مدینہ میں مسلمانوں کو ایک بہت بڑی مشکل جو درپیش تھی وہ یہود اور منافقین کا خفیہ گٹھ جوڑ تھا، یہ لوگ مسلمانوں کے درمیان ہی بودوباش رکھتے تھے، اسی معاشرے کا حصہ تھے، انہی کی صفوں میں رہتے تھے، لہٰذا یہ لوگ مارِ آستین تھے، ہر وقت مسلمانوں کے درپے آزار رہا کرتے تھے، مسلمانوں کے درمیان رہتے ہوئے انہی کے خلاف خفیہ سازشوں کے تانے بانے بننے میں ہمہ وقت مصروف رہا کرتے تھے۔

ایسے میں مشکل یہ تھی کہ منافقین تو بظاہر مسلمان ہی تھے، ہر قدم پر ان کے ساتھ موجود رہتے

(۱) راز کو چھپائے رکھنا بہت مشکل کام ہے، یہ ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، اچھے خاصے عقلمند لوگ بھی بعض اوقات کوئی اہم ترین راز فاش کر دیا کرتے ہیں، کبھی بے خیالی میں، کبھی غصے اور طیش کی کیفیت میں، کبھی بہت زیادہ مسرت اور ترنگ میں......لہٰذا یہ بہت ہی نازک معاملہ ہوا کرتا ہے۔

تھے، اپنی زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے تھے، لیکن اندر سے وہ دشمن تھے، لہٰذا ایسی صورتِ حال میں ان کے خلاف علی الاعلان کوئی تادیبی کارروائی ممکن نہیں تھی۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اپنی فطری اور خداداد صلاحیت کی وجہ سے ہر معاملے کا ''کھوج'' لگانے اور حقیقت کی تہ تک پہنچ جانے میں چونکہ بڑی مہارت رکھتے تھے، لہٰذا یہی وجہ تھی کہ یہ اس معاشرے میں موجود ''منافقین'' کو خوب جانتے اور پہچانتے تھے، ان کی خفیہ سرگرمیوں سے خوب واقف رہا کرتے تھے......لہٰذا منافقین اور ان کے ''شر'' سے یہ ہمیشہ مختلف قسم کے اندیشوں میں مبتلا رہا کرتے تھے (دوسرے لوگوں کو منافقین کے ''شر'' اور ان کی سازشوں کے بارے میں چونکہ کوئی اندازہ ہی نہیں تھا، لہٰذا وہ اس بارے میں نسبتاً بےفکر تھے)

منافقین کے ''شر'' پر حذیفہ رضی اللہ عنہ کی جو نگاہ تھی اسی کا یہ اثر تھا کہ یہ فرماتے ہیں کہ:

كَانَ النّاسُ يَسأَلُونَ رَسُولَ اللّهِ ﷺ عَنِ الخَيرِ ، وَكُنتُ أسأَلُهُ عَنِ الشّرِ مَخَافَةَ أن يُدرِكَنِي ۔ (۱) یعنی ''لوگ رسول اللہ ﷺ سے ''خیر'' کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے، جبکہ میں آپؐ سے ''شر'' کے بارے میں دریافت کیا کرتا تھا، اس اندیشے کی وجہ سے کہ کہیں میں کسی ''شر'' کا شکار نہ ہو جاؤں'' (۲)

(۱) صحیح بخاری (حدیث نمبر: ۷۰۸۴) کتاب الفتن (نمبر۹۲) باب: کیف الأمر اذا لم تکن جماعۃ (نمبر۱۱) صحیح مسلم [۱۸۴۷] وغیرہ۔

(۲) یعنی ظاہر ہے کہ انسان کو ''شر'' کے بارے میں علم ہوگا تبھی تو وہ اس شر سے بچنے کی کوئی تدبیر سوچے گا۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی چونکہ یہ کیفیت تھی کہ لوگ تو ہمیشہ رسول اللہ ﷺ سے خیر اور اعمالِ صالحہ کے بارے میں دریافت کیا کرتے تھے، جبکہ حذیفہ رضی اللہ عنہ شر کے بارے میں پوچھا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام کتبِ حدیث میں ''کتاب الفتن'' (یعنی آئندہ جو بڑے بڑے فتنے درپیش آنے والے ہیں ان سے متعلق احادیث) میں سب سے زیادہ احادیث انہی سے مروی ہیں۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے منافقین کی سرگرمیوں پر گہری نگاہ رکھنے کی غرض سے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو چندافراد کے نام بتائے،ساتھ ہی اس سلسلے میں مکمل رازداری برتنے کی تلقین بھی فرمائی......چنانچہ یہ سربستہ راز کبھی فاش نہیں ہوسکا کہ وہ کون لوگ تھے جن کے نام آپؐ نے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو بتائے تھے۔

رسول اللہ ﷺ کی طرف سے تاکید کے مطابق حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ منافقین کی خفیہ سرگرمیوں پرکڑی نگاہ رکھتے،ان کا بغور جائزہ لیتے،اورساتھ ہی ان کی سازشوں کے تدارک 'سدِّ باب' اوردفاع کا راستہ بھی تلاش کرتے،اوررسول اللہ ﷺ کو ہمہ وقت تمام صورتِ حال سے آگاہ رکھتے،اسی وجہ سے یہ ''صاحب سرّ رسول اللہ''یعنی ''رسول اللہ ﷺ کے رازدان'' کے لقب سے معروف ہوگئے۔

☆......غزوۂ خندق کے موقع پر:

منافقین پرنگاہ رکھنے کے علاوہ بھی رسول اللہ ﷺ مزید بہت سے نازک معاملات میں دینِ اسلام اورمسلمانوں کی بہتری اورسلامتی کی خاطرحضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی اسی فطری ذہانت وفطانت سے خوب کام لیتے رہے،بالخصوص حذیفہؓ کا یہ کمال غزوۂ خندق کے تاریخی اورنازک ترین موقع پراپنے عروج کوجاپہنچا تھا،جب مسلمان چہارسودشمنوں کے نرغے میں پھنسے ہوئے تھے،محاصرہ بہت طول پکڑ چکا تھا،آزمائش اپنی انتہاء کوپہنچی ہوئی تھی،محنت ومشقت اورتنگ ودوپورے عروج پرتھی،پریشانی اورخوف کی شدت کی وجہ سے آنکھیں پتھرارہی تھیں،اورکلیجے منہ کوآنے لگے تھے(۱)حتیٰ کہ کچھ لوگوں کے ایمان بھی ڈگمگانے

(۱)جیسا کہ سورۃ الأحزاب،آیت[۱۰]میں اس نازک ترین صورتِ حال کی منظرکشی اس طرح کی گئی ہے:
﴿إذ جَاؤوكُم مِن فَوقِكُم وَمِن أسفَلَ مِنكُم وَإذ زاغَتِ الأبصَارُ وَبَلَغَتِ القُلُوبُ الحَنَاجِرَ......﴾

لگے تھے......

اس موقع پر جو ظاہری پریشانیاں تھیں' مثلاً: طویل محاصرے کے نتیجے میں اشیائے خوردونوش کی شدید قلت' ان ظاہری پریشانیوں کے علاوہ مزید یہ کہ خوف' پریشانی' وسوسے' اندیشے' الجھن' کشمکش' یہ تمام نفسیاتی مشکلات بھی اپنے عروج پر تھیں......

☆......کسی بھی جنگ کے موقع پر کامیابی کیلئے سامانِ حرب وضرب کے ساتھ ساتھ مزید دو چیزوں کی بڑی اہمیت ہوا کرتی ہے، ایک تو نفسیاتی طور پر مضبوطی، جبکہ دوسری چیز: دشمن کے عزائم سے مکمل آگاہی، یا بالفاظِ دیگر ''سراغ رسانی''۔

یعنی دشمن کے حالات' دشمن کی نقل وحرکت' دشمن کے منصوبے اور ارادے' جنگی چالیں' تدبیریں' ان تمام معاملات کے بارے میں مکمل اور درست معلومات کا مہیا ہونا۔

چنانچہ غزوۂ خندق کے اس نازک ترین موقع پر رسول اللہ ﷺ نے حضرت حذیفہ بن الیمانؓ کی فطری مہارت اور خداداد صلاحیت سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ فرماتے ہوئے انہیں رات کی تاریکی میں دشمن کے لشکر میں اندر دور تک جہاں ان کے بڑے سرکردہ سپہ سالاروں کے خیمے نصب تھے' وہاں بھیجنے کا فیصلہ فرمایا، تاکہ ان کی لائی ہوئی اطلاعات کی روشنی میں آئندہ کا لائحۂ عمل ترتیب دیا جاسکے۔

☆......چنانچہ سرفروشی کی یہ داستان سناتے ہوئے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

''اُس رات ہم خندق کے قریب صف بستہ کھڑے تھے، ہمارے سامنے کچھ فاصلے پر مشرکینِ مکہ کا لشکر خوب کیل کانٹے سے لیس پوری آب وتاب کے ساتھ موجود تھا، جبکہ دوسری جانب کچھ فاصلے پر یہودِ مدینہ سے تعلق رکھنے والے قبیلۂ بنوقریظہ کے مسلح دستے

خیمہ زن تھے، جن کی طرف سے ہمیں اپنی عورتوں اور بچوں کے بارے میں شدید خطرہ لاحق تھا (یعنی یہ یہودِ مدینہ شاید سامنے آ کر باقاعدہ جنگ تو نہیں لڑیں گے، لیکن مشرکینِ مکہ کی طرف سے حملے کی صورت میں افراتفری اور محاذ آرائی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ ہماری عورتوں اور بچوں کو نقصان پہنچائیں گے...... کیونکہ یہ یہودی تو مدینہ کے اندر ہی تھے، خندق کے اِس پار)

وہ رات جس قدر سیاہ اور بھیانک تھی، اور جس طرح خوفناک آندھی چل رہی تھی، تیز ہوا کے جھکڑ یوں چل رہے تھے جیسے خوفناک بجلی کڑک رہی ہو، ایسا ہولناک منظر ہم نے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا، تاریکی کا یہ حال تھا کہ خود اپنا ہاتھ تک سجھائی نہ دیتا تھا، اس پر مستزاد یہ کہ اچانک منافقین نے رسول اللہ ﷺ کے سامنے بہانہ سازی شروع کی کہ ہمارے گھر اور ہمارے بچے غیر محفوظ ہیں، لہٰذا ہمیں گھر جانے کی اجازت دیجئے (۱) حالانکہ ہمیں معلوم تھا کہ ان کے گھر غیر محفوظ نہیں ہیں، کیونکہ ان کا تو یہود کے ساتھ مکمل رابطہ اور گٹھ جوڑ تھا (لہٰذا انہیں یہود کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں تھا، خطرہ تو ہمیں تھا) تاہم اس کے باوجود اُس دن جو بھی منافق رسول اللہ ﷺ سے اجازت طلب کرتا، آپؐ اسے اجازت دے دیتے، اس طرح ایک ایک کر کے منافقین بڑی تعداد میں کھسکتے گئے......

اس کے بعد ایسا ہوا کہ رسول اللہ ﷺ اس تاریک رات میں گھوم پھر کر خود صورتِ حال کا جائزہ لینے لگے، تب اس موقع پر آپؐ ہم میں سے ہر ایک کے قریب سے گذرے، اور پھر آپؐ میرے قریب آ کر رک گئے، اُس وقت سردی کی شدت کی وجہ سے میرا برا حال ہو رہا تھا، سردی سے حفاظت کیلئے میرے پاس کوئی انتظام نہیں تھا، بس گھر سے روانہ ہوتے

(۱) جیسا کہ اس آیت میں تذکرہ ہے: ﴿وَيَستأذِنُ فَرِيقٌ مِنهُمُ النَّبِيَّ يَقُولُونَ اِنَّ بُيُوتَنَا عَوْرَة......﴾ (سورۃ الأحزاب:۱۳)

وقت میں اپنی بیوی سے اس کی چادر مانگ لایا تھا، بس وہی میں نے اوڑھ رکھی تھی، جو کہ کافی چھوٹی تھی اور میرے گھٹنوں تک بھی نہیں پہنچ رہی تھی......

دوسری بات یہ کہ مجھے بھوک نے بہت ہی بدحال کر رکھا تھا، لہٰذا میں بھوک کی شدت کی وجہ سے، نیز سردی سے بچنے کی خاطر نیچے کی جانب جھکا ہوا تھا، سیدھا کھڑے ہونے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی، اسی دوران رسول اللہ ﷺ میرے بہت قریب آ گئے، اور سرگوشی کے انداز میں مجھ سے دریافت فرمایا: مَــــن هـــذا؟ یعنی ''یہ کون ہے؟'' میں نے عرض کیا ''حذیفہ'' اس پر آپؐ نے دوبارہ وضاحت چاہی، میں نے پھر عرض کیا کہ ''میں حذیفہ ہوں، اے اللہ کے رسول! حکم فرمایئے'' تب آپؐ نے فرمایا ''دشمن کے کیمپ میں کچھ ہونے والا ہے، لہٰذا تم چپکے سے وہاں جاؤ، اور مجھے وہاں کی صورتِ حال سے مطلع کرو''

تب میں فوری طور پر آپؐ کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے وہاں سے روانہ ہو گیا، اُس وقت سردی کی وجہ سے میری جو کیفیت تھی، آپؐ اسے جان چکے تھے، لہٰذا اس موقع پر آپؐ نے میری جانب دیکھتے ہوئے یہ دعاء فرمائی: اَللّٰهُمّ احفَظْهُ مِن بَینِ یَدَیهِ وَمِن خَلْفِهٖ ، وَعَـن یَـمِیْـنِـهٖ وَعَـن شِمَالِهٖ ، وَمِن فَوْقِهٖ وَمِن تَحْتِهٖ ۔ یعنی ''اے اللہ! تو اس کی حفاظت فرما سامنے سے بھی اور پیچھے سے بھی، دائیں سے بھی اور بائیں سے بھی، اوپر سے بھی اور نیچے سے بھی'' (۱) رسول اللہ ﷺ کا میرے لئے یہ دعاء فرمانا تھا کہ بس فوراً ہی مجھے یوں محسوس ہوا کہ اللہ نے میرے دل سے خوف دور کر دیا، نیز سردی کی شدت بھی جاتی رہی

(۱) چونکہ غزوۂ خندق کے موقع پر مسلمانوں کے دائیں بائیں، آگے پیچھے، اوپر (پہاڑوں پر) نیچے (وادیوں میں) ہر طرف دشمن چھایا ہوا تھا (جیسا کہ اس آیت میں منظرکشی کی گئی ہے: اِذ جَـاؤُوکُـم مِن فَوقِکُم وَمِن أسفَلَ مِنکُم ......﴾ (الأحزاب:۱۰) لہٰذا رسول اللہ ﷺ نے اس موقع پر حضرت حذیفہؓ کیلئے اسی مناسبت سے ہر طرف سے حفاظت کی دعاء فرمائی۔

میں ابھی چلا ہی تھا کہ آپ ﷺ نے مجھے دوبارہ آواز دی اور فرمایا ''اے حذیفہ! واپسی پر تم سیدھے میرے پاس ہی آنا، کسی اور کو کچھ نہ بتانا'' میں نے عرض کیا '' آپ کا حکم سر آنکھوں پر اے اللہ کے رسول......!)

اس کے بعد میں سخت تاریکی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہوا دشمن کے کیمپ کی جانب روانہ ہو گیا، اسی کیفیت میں ......اپنی جان ہتھیلی پر لئے ہوئے میں مسلسل چلتا رہا......حتیٰ کہ دشمن کے کیمپ میں جا پہنچا، اور اب گویا میں انہی کا ایک فرد تھا، وہاں مسلسل گھومتے پھرتے آخر میں ایک ایسی جگہ جا پہنچا جہاں ان کے بڑے سردار قسم کے لوگ خیمہ زن تھے......کچھ دیر گذرنے کے بعد میں نے دیکھا کہ ان کا سپہ سالار ابوسفیان (جو اُس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے) اپنی جگہ سے اٹھا اور اپنے سپاہیوں کو کچھ ضروری ہدایات دینے کی غرض سے ایک جگہ کھڑا ہو گیا، اور گفتگو کے آغاز سے قبل اس نے سب کو تاکید کرتے ہوئے کہا ''جو کچھ میں ابھی کہنے والا ہوں' میری وہ بات کسی صورت مسلمانوں تک نہ پہنچے، لہٰذا ہر کوئی اپنے آس پاس نظر رکھے، اپنے ہم نشین کے بارے میں خوب اطمینان کر لے (کہیں وہ مسلمانوں کا جاسوس نہ ہو)

اور پھر اس تاکید و تمہید کے بعد اور اطمینان کر لینے کے بعد وہ یوں گویا ہوا ''اے جماعتِ قریش! بخدا ہمارا چین و سکون برباد ہو چکا ہے، ہمارے جانور موت کی نیند سوتے جا رہے ہیں، اُدھر بنوقریظہ ہم سے دست کش ہو چکے ہیں، مزید یہ کہ سخت اور تند و تیز آندھی ہمارے لئے الگ مصیبت بنی ہوئی ہے، لہٰذا میرا خیال یہ ہے کہ اب ہمیں یہاں سے واپسی کی تیاری کرنی چاہئے......'' اور پھر فوراً ہی اس نے فَاِنِّي مُرتَحِل ...... یعنی ''میں تو بس چلا......'' یہ الفاظ کہتے ہوئے اپنے اونٹ کی رسی کھولی اور اس پر سوار ہو کر اسے ایڑ لگا دی،

جس پر اس کا اونٹ فوراً ہی اچھل کر اٹھ کھڑا ہوا......تب وہاں افراتفری مچ گئی، ہر کوئی وہاں سے فرار کیلئے بے چین نظر آنے لگا......"

حضرت حذیفہ بن الیمانؓ مزید فرماتے ہیں "جب میں نے ابوسفیان کو وہاں سے اس طرح روانہ ہوتے دیکھا تو اللہ کی قسم اگر مجھے رسول اللہ ﷺ کی طرف سے رازداری برتنے کی تاکید کا لحاظ نہ ہوتا' تو میں اُس وقت ابوسفیان کو بسہولت اپنے تیر کا نشانہ بناتا، اور اسے زندہ نکلنے نہ دیتا"

اس کے بعد حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں "میں اسی طرح بچتا بچاتا واپس چلا آیا، رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، اُس وقت آپؐ کھڑے ہوئے نماز پڑھ رہے تھے، آپؐ نے سردی سے حفاظت کیلئے ایک چادر اوڑھ رکھی تھی، جب آپؐ نے نماز مکمل کی، تو میری طرف متوجہ ہوئے، مجھے اپنے قریب بٹھایا، اور از راہِ شفقت اپنی اس چادر کا ایک پلو مجھے اُڑھا دیا، اور پھر صورتِ حال دریافت فرمائی، میں نے تمام ماجرا کہہ سنایا، اس پر آپؐ کی مسرت کی انتہاء نہ رہی، اور آپؐ نے اللہ کا شکر ادا کیا" (۱)

☆......حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کیلئے یہ والہانہ عقیدت ومحبت' مشکل ترین حالات میں بھی اطاعت وفرمانبرادری اور وفاء شعاری کا یہ بے مثال جذبہ......اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی طرف سے حذیفہؓ کیلئے شفقت وعنایت اور لطف وکرم کا یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا......حتیٰ کہ آپؐ کا مبارک دور گذر گیا، آپؐ ہمیشہ تادمِ آخر ان سے انتہائی مسرور ومطمئن رہے، بالخصوص منافقین کی طرف سے ہمہ وقت جو اندیشہ لاحق رہتا تھا' اس سلسلے میں "سراغ رسانی" کے حوالے سے حضرت حذیفہؓ

(۱) صحیح مسلم [۱۷۸۸] باب غزوۃ الأحزاب۔ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کا یہ واقعہ صحیح مسلم کے علاوہ دیگر متعدد کتبِ حدیث وتاریخ وسیر ومغازی میں بھی مذکور ہے۔ الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ۔

کی جوگراں قدر خدمات تھیں، آپؐ بطورِ خاص اس حوالے سے بہت زیادہ مطمئن رہے اور ان کی ان خدمات کو ہمیشہ سراہتے رہے......

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو اس معاشرے میں جوقدر ومنزلت حاصل تھی آپؐ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلفائے راشدین کے دور میں بھی انہیں وہی حیثیت اور قدر ومنزلت حاصل رہی، بالخصوص منافقین کی خفیہ سرگرمیوں پر نگاہ رکھنے کے معاملے میں اب بھی ان کی خدمات پر بڑی حد تک انحصار کیا جاتا رہا......

اس سلسلے میں خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی کیفیت تو یہ تھی کہ اس معاشرے میں جب کسی کا انتقال ہوجاتا اور جنازہ تیار ہوتا تو وہ اس موقع پر کسی کو کہتے کہ ''جاؤ دیکھ کر آؤ، حذیفہ موجود ہیں یا نہیں؟'' چنانچہ اگر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ موجود ہوتے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ مطمئن ہوجاتے اور آکر اس کی نمازِ جنازہ پڑھاتے، اور اگر یہ موجود نہ ہوتے تو حضرت عمرؓ اس فوت شدہ شخص کے بارے میں کچھ شک کرنے لگتے...... اور خود اس کی نماز پڑھانے یا اس میں شرکت کرنے کی بجائے دوسروں کو پیغام بھجوا دیتے کہ اس کی نمازِ جنازہ پڑھ لو۔

ایک بار حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے زمانۂ خلافت کے دوران اپنے والیانِ ریاست (یعنی اپنی طرف سے مقرر کردہ مختلف علاقوں کے حکمرانوں) کے بارے میں حضرت حذیفہؓ سے دریافت فرمایا ''کیا ان میں سے کوئی منافق ہے؟''

اس پر حضرت حذیفہؓ نے جواب دیا کہ ''جی......ایک ہے''

تب حضرت عمرؓ نے فرمایا ''مجھے بتایئے، کون ہے وہ؟''
اس پر حضرت حذیفہؓ نے معذرت کی (شاید کسی وجہ سے انہوں نے اس ایک منافق شخص کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہیں سمجھا ہوگا، لہٰذا فقط اشارے پر ہی اکتفاء کیا، تاکہ حضرت عمرؓ خود تحقیق کرلیں)

حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''معلوم ہوتا ہے کہ اس بارے میں یا تو حضرت عمرؓ نے خود کچھ تحقیق کی، یا من جانب اللہ ان کی رہنمائی کی گئی، کیونکہ ہماری اس گفتگو کے بعد محض چند روز ہی گذرے تھے کہ حضرت عمرؓ نے اپنے اسی والی (فرمانروا/ گورنر) کو اس کے عہدے سے معزول کردیا۔

☆ ......''اسلامی فتوحات''......اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ:

رسول اللہ ﷺ کے مبارک دور میں' اور پھر حضرات خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم اجمعین کے زمانے میں ''سراغ رسانی'' اور ''منافقین کی نشاندہی'' کے معاملے میں حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جس طرح بڑے پیمانے پر خدمات انجام دیتے رہے اور ان کی ان خدمات پر اعتماد و انحصار کیا جاتا رہا......اسی طرح اسلامی فتوحات کے حوالے سے بھی ان کی خدمات یقیناً ناقابلِ فراموش ہیں۔

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں فتوحات کا سلسلہ بہت وسعت اختیار کرچکا تھا، بہت بڑے پیمانے پر مسلمان برق رفتاری کے ساتھ یکے بعد دیگرے مختلف علاقے فتح کرتے چلے گئے تھے......اور پھر یہی سلسلہ کافی حد تک خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی جاری رہا تھا۔

اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر لڑی جانے والی ان تاریخی جنگوں کے موقع پر، اور خاص

طور پر سلطنتِ فارس کے خلاف جو فیصلہ کن جنگیں لڑی گئیں......ان میں حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کا کردار ہمیشہ نہایت اہم اور قابلِ ذکر رہا۔

چنانچہ سلطنتِ فارس کے متعدد بڑے مشہور اور تاریخی وجغرافیائی اہمیت کے حامل شہر حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی سپہ سالاری میں ہی فتح کئے گئے۔مثلاً: نیشاپور،نہاوند، دَینور،ہمذان (جسے فارسی اور اردو میں ہمدان کہا جاتا ہے) اور ''رَی'' قابلِ ذکر ہیں۔(۱)

اسلامی فتوحات ہی کے حوالے سے ایک اور قابلِ ذکر بات یہ کہ سلطنتِ فارس کے خلاف بڑی تاریخی جنگوں کے طویل سلسلے کے بعد آخر جب سلطنتِ فارس کا دارالحکومت ''مدائن'' بھی (حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت) فتح ہو چکا،تب خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے اس عظیم الشان اور انتہائی تاریخی اہمیت کے حامل شہر

(۱) یہ تمام شہر (نیز ان سے ملحقہ دیگر بہت سے شہر جو اُسی دور میں مسلمانوں نے فتح کئے) ایسے ہیں کہ جو اسلامی فتح سے قبل بھی بڑی اہمیت کے حامل تھے،اور پھر اسلامی فتح کے بعد بھی سیاسی وعسکری اہمیت کے علاوہ علمی،ادبی،ثقافتی ہر لحاظ سے بڑی اہمیت کے حامل رہے اور ہر دور میں ان کی بڑی شہرت رہی،بڑے بڑے علماء اور دانشور انہی شہروں میں گذرے،مثلاً امام مسلم،ابن ماجہ،بیہقی،امام غزالی،فخر الدین رازی وغیرہ......

''رَی'' کے بارے میں قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں اس کی فتح کے بعد وقت کا سفر جاری رہا،حتیٰ کہ عظیم ترین عباسی خلیفہ ''ہارون الرشید'' کی پیدائش اسی شہر میں ہوئی،جبکہ اس کی وفات اور پھر تدفین قریب ہی واقع ''طوس'' نامی شہر میں ہوئی،جو کہ آجکل ''مشہد'' کے نام سے معروف ایرانی شہر ہے۔جبکہ ''رَی'' کے آثار آج بھی بڑے پیمانے پر موجودہ ''تہران'' کے قریب موجود ومحفوظ ہیں۔

☆......''نہاوند'' کی فتح کے حوالے سے ایک وضاحت ضروری ہے کہ اصل میں یہاں لڑی جانے والی جنگ کے موقع پر حضرت عمرؓ نے مشہور صحابی حضرت نعمان بن مُقرن رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا تھا،لیکن دورانِ جنگ ان کی شہادت کے بعد سپہ سالاری کے فرائض حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے سنبھال لئے تھے......اس کے بعد یہ شہر فتح ہوا تھا۔

''مدائن''(۱) کے اولین مسلمان فرمانروا کے طور پر حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو منتخب فرمایا۔ چنانچہ جب یہ مدائن کے فرمانروا کی حیثیت سے اپنا عہدہ سنبھالنے کی غرض سے وہاں پہنچے تو فارسی بہت بڑی تعداد میں انہیں دیکھنے کی غرض سے وہاں جمع ہو گئے، کیونکہ سلطنتِ فارس تو اُس دور میں روئے زمین کی عظیم ترین قوت تھی ، جبکہ مسلمانوں کے ہاتھوں اس عظیم سلطنت کا سورج ہمیشہ کیلئے غروب ہو گیا، لہٰذا مسلمانوں کے ہاتھوں شکست کھانے کی وجہ سے وہ طبعی طور پر اب مسلمانوں سے مرعوب تھے، اسی وجہ سے وہ نسل در نسل اپنے قدیم فارسی شہنشاہوں کی شان وشوکت' رعب اور دبدبہ' اور شاہی جاہ وجلال کا نظارہ کرتے رہنے کے بعد اب سوچ رہے تھے کہ مسلمانوں کی شان وشوکت تو اور زیادہ قابلِ دید ہوگی...... کیونکہ مسلمان تو فاتح تھے، فاتح کی شان وشوکت تو یقیناً مفتوح کی شان وشوکت سے بہت بڑھ کر ہی ہوگی......اسی تصور کی وجہ سے وہ اپنے اس تاریخی شہر کے اولین مسلمان فرمانروا کے استقبال کیلئے اور اس کی ایک جھلک دیکھنے کیلئے بہت بڑی تعداد میں وہاں جمع ہو گئے......لیکن حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ جب وہاں پہنچے تو اس وقت جو کیفیت نظر آئی اس کی وجہ سے وہ تمام مجمع انگشت بدندان رہ گیا...... کیونکہ کیفیت یہ تھی کہ اُس وقت یہ ایک گدھے پر سوار تھے، گدھے کی پشت پر کوئی گدی وغیرہ بھی نہیں تھی ، بالکل ہی ننگی پشت پر بیٹھے ہوئے تھے، مزید یہ کہ اُس وقت انہوں نے اپنے ہاتھ میں خشک روٹی کا ایک ٹکڑا تھاما ہوا تھا جسے چباتے ہوئے چلے آرہے تھے(۲)

☆......خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں سلطنتِ فارس

(۱) موجودہ بغداد کے قریب ''مدائن'' کے آثار اب بھی موجود ہیں ۔

(۲) ان کے اس طرزِ عمل میں یقیناً اس جذبے کی عکاسی تھی کہ مسلمان کی جنگ صرف ''اعلائے کلمۃ اللہ'' کیلئے ہوا کرتی ہے، نہ کہ مالِ غنیمت' کشور کشائی' یا دنیاوی شان وشوکت کیلئے۔

کے دارالحکومت ''مدائن'' کی فتح کے بعد حضرت عمرؓ نے اس محاذ پر برسرِ پیکار سپہ سالارِ اعلیٰ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو یہ پیغام بھیجا کہ شہر مدائن کو اپنی آئندہ کی سیاسی وعسکری سرگرمیوں کیلئے مستقل مرکز نہ بنایا جائے ، بلکہ اس مقصد کیلئے کسی مناسب مقام پر ایک نیا شہر آباد کیا جائے۔

چنانچہ اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے نیا شہر بسانے کی غرض سے مناسب جگہ کے انتخاب کی خاطر حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ نے چند افراد پر مشتمل ایک ٹیم تشکیل دی ،جس کا سربراہ حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا، چنانچہ یہ اپنی اس ٹیم کے ہمراہ کئی روز تک گھوم پھر کر مختلف مقامات کا جائزہ لیتے رہے، آخر انہوں نے اس مقصد کیلئے تمام ضروری پہلوؤں کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ایک جگہ پسند کی ،اور حضرت سعد بن وقاص رضی اللہ عنہ کو اپنی اس پسند سے آگاہ کیا، جس پر انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عمرؓ رضی اللہ عنہ کی طرف سے منظوری ملنے پر اس مقام پر نیا شہر آباد کیا، جو کہ ''کوفہ'' کے نام سے معروف ہو گیا، دیکھتے ہی دیکھتے یہ شہر کوفہ دینی، علمی، ثقافتی، سیاسی، وعسکری، غرضیکہ ہر لحاظ سے تاریخی اہمیت اختیار کر گیا، حتیٰ کہ خلیفۂ چہارم حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ سمیت بہت بڑی تعداد میں حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین یہیں کوفہ میں ہی مستقل آباد ہو گئے تھے۔(۱)

☆...... ''رسمِ عثمانی'' ......اور حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ:

خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے دور میں مشرق ومغرب میں چہار سو اسلامی فتوحات کا سلسلہ بہت زیادہ وسعت اختیار کر گیا تھا......اور پھر خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن

(۱) ''کوفہ'' آجکل عراق کے مشہور شہر ''نجف'' سے بالکل متصل ہی آباد تھا۔

عفان رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں بھی یہ سلسلہ کافی حد تک جاری وساری رہا، جس کے نتیجے میں دینِ اسلام عرب دنیا سے نکل کر بہت دور دراز کے ان علاقوں تک بھی جا پہنچا جہاں کے باشندے غیر عرب تھے......اور یہ چیز یقیناً دینِ اسلام کی حقانیت وصداقت کی بہت بڑی دلیل تھی کہ جس کسی نے بھی انصاف پسندی کے ساتھ اور ہر قسم کے تعصب سے بالاتر ہو کر دینِ اسلام کی تعلیمات کا مطالعہ کیا اور اس سلسلے میں فکر وتدبر سے کام لیا......وہ اسلام کی پاکیزہ تعلیمات سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکا......اور یوں مفتوحہ علاقوں میں مسلمانوں کی طرف سے کسی جبر واکراہ کے بغیر لوگ فوج درفوج دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے۔

لیکن اس حوالے سے اس مثبت اور خوش کُن صورتِ حال کے ساتھ ایک پریشانی بھی ظاہر ہونے لگی، وہ یہ کہ قرآن کریم کے بہت سے کلمات کے تلفظ کے بارے میں لوگوں میں اختلاف کی نوبت آنے لگی۔

قرآن کریم تو عربی زبان میں ہے، اُس دور میں عربی رسم الخط اس قدر ترقی یافتہ نہیں تھا کہ جس طرح بعد کے دور میں بہت سی تبدیلیوں کے بعد اس کی شکل ہوگئی ہے، جبکہ اُس دور میں کیفیت یہ تھی کہ عربی کے بہت سے الفاظ نقطوں کے بغیر ہی لکھے جاتے تھے، اس کے علاوہ بھی متعدد ایسی وجوہات تھیں کہ جن کی بناء پر ایک ہی لفظ کو متعدد طریقوں سے پڑھا جاسکتا تھا، یہی صورتِ حال قرآن کریم کی بھی تھی کہ بہت سے قرآنی الفاظ اور کلمات اس طرح تحریر کئے گئے تھے کہ جنہیں ایک سے زائد طریقے سے پڑھنا ممکن تھا۔

لہٰذا جو اہلِ زبان تھے یعنی عرب، ان کیلئے تو اس میں کوئی دشواری نہیں تھی، کیونکہ وہ معنیٰ ومفہوم سے باخبر ہونے کی وجہ سے سیاق وسباق کی مناسبت سے سمجھ جاتے تھے کہ کس لفظ کو

کس طرح پڑھنا ہے......

البتہ بہت بڑی تعداد میں جو غیر عرب اب مشرف باسلام ہو چکے تھے......انہیں اس معاملے میں کافی دشواری کا سامنا تھا، لہٰذا وہ جب تلاوتِ قرآن کرتے تو ایک ہی لفظ کو کوئی شخص ایک طرح پڑھتا......جبکہ دوسرا کوئی کسی اور طرح پڑھتا......یوں ان میں بسا اوقات بہت سے قرآنی الفاظ کے تلفظ کے معاملے میں باہم اختلاف کی نوبت آتی......

بالخصوص حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ سلطنتِ فارس کے ایک دور دراز کے علاقے ''آرمینیا''(۱) میں جب اسلامی لشکر کے سپہ سالار کی حیثیت سے فرائض انجام دے رہے تھے تب وہاں یہ صورتِ حال ان کے مشاہدے میں آئی کہ مسلمان سپاہی دن بھر اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر میدانِ کارزار میں دشمن کے خلاف برسرِ پیکار رہتے ہیں، اور پھر جب رات کا اندھیرا چھا جاتا ہے تو یہ سپاہی اپنے اللہ سے لو لگانے میں مشغول ہو جاتے ہیں، پھر وہاں تہجد اور دعاء ومناجات کے سلسلے ہوتے ہیں، ہر خیمے سے تلاوتِ قرآن کی آوازیں بلند ہونے لگتی ہیں......ایسے میں تلاوتِ قرآن کے دوران کوئی سپاہی کسی لفظ کو ایک طرح پڑھتا، جبکہ دوسرا کسی اور طرح......یوں ان میں باہم اختلاف ہونے لگتا......

ظاہر ہے کہ یہ بہت ہی نازک اور انتہائی حساس ترین معاملہ تھا، کیونکہ یہ کوئی دنیاوی معاملہ تو نہیں تھا کہ انسان صبر کر لے......دین کے معاملے میں اور بالخصوص قرآنی کلمات کے تلفظ کے بارے میں کس طرح صبر کیا جا سکتا تھا......؟(۲)

مزید یہ کہ اسلامی لشکر کے یہ سپاہی تو وہاں اللہ کے دین کی سربلندی کی خاطر خدمات انجام

(۱) جمہوریہ آرمینیا آجکل روس کے قریب ایک مستقل آزاد ملک ہے۔

(۲) یعنی ان میں سے ہر سپاہی یہ سمجھتا تھا کہ میں درست پڑھ رہا ہوں اور دوسرا غلط......لہٰذا اس غلطی پر وہ اسے ٹوکتا......جبکہ دوسرا یہ اصرار کرتا کہ میں درست پڑھ رہا ہوں اور تم غلط پڑھ رہے ہو......

دے رہے تھے، اور اسی مقصد کی خاطر وہ دن بھر دشمن کے خلاف میدان میں برسرِ پیکار رہا کرتے تھے......لیکن اگر وہ آپس میں ہی اختلاف وافتراق کا شکار ہو جاتے......تو پھر دشمن کے خلاف کس طرح لڑتے......؟

اس کے علاوہ یہ کہ قرآن کریم تو اہلِ ایمان کو باہم اتفاق واتحاد اور اخوت ومساوات کا سبق سکھاتا ہے......لیکن اگر اسی قرآن کی تلاوت اور اس کے کلمات کے تلفظ کے بارے میں ہی اہلِ ایمان باہم دست وگریبان ہونے لگیں......تو یقیناً یہ کس قدر افسوسناک بات ہوگی۔

ظاہر ہے کہ یہ معاملہ بہت ہی نازک اور انتہائی حساس نوعیت کا تھا، اور کسی بھی وقت بڑے فتنے میں تبدیل ہو سکتا تھا، چنانچہ سپہ سالار کی حیثیت سے حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے اس سلسلے میں پیشگی سدِ باب کے طور پر مناسب کارروائی کا فیصلہ کیا، اور اسی مقصد کی خاطر وہ آرمینیا سے طویل سفر کرتے ہوئے مدینہ پہنچے، جہاں انہوں نے خلیفۂ وقت حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کو صورتِ حال کی سنگینی اور نزاکت سے آگاہ کرتے ہوئے اس بارے میں جلد از جلد کسی مناسب اقدام کا مشورہ دیا، اور اس بات پر وہ مسلسل اصرار کرتے ہی رہے، حتیٰ کہ حضرت عثمانؓ نے کبار صحابہ کرام سے مشاورت کے بعد طے کیا کہ قرآن کریم کا ایک نیا نسخہ تیار کیا جائے، اور اس مقصد کیلئے ایسا رسم الخط اختیار کیا جائے کہ جس کی بناء پر ہر کلمے کو صرف اسی طرح پڑھنا ممکن ہو سکے کہ جس طرح اسے پڑھنا مطلوب ہے، کسی اور طرح اسے پڑھا ہی نہ جا سکے۔

چنانچہ اس متفقہ فیصلے پر عملدرآمد کے طور پر نئے رسم الخط کے مطابق قرآن کریم کا ایک نیا نسخہ تیار کیا گیا، اور یہ نیا رسم الخط حضرت عثمانؓ کی طرف نسبت کی وجہ سے ''رسمِ عثمانی'' کے نام سے ہمیشہ کیلئے معروف ہو گیا۔

اس کے بعد اس معاملے نے ہمیشہ کیلئے ''اجماعِ امت'' کی شکل اختیار کرلی، یعنی تمام امت ہمیشہ کیلئے اس بات پر متفق ومتحد ہوگئی کہ قرآن کریم کو ہمیشہ فقط اسی رسم الخط یعنی ''رسمِ عثمانی'' کے مطابق ہی تحریر کیا جائے گا، تاکہ اس کے الفاظ وکلمات کے تلفظ کے معاملے میں امت میں کبھی اختلاف وافتراق کی اور فتنے کی نوبت نہ آسکے۔

یوں کتاب اللہ کی تلاوت کے حوالے سے خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ یہ جو انتہائی گراں قدر اور قابلِ تحسین اقدام کرگئے......اس کے پیچھے دراصل حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ کی کوشش اور مسلسل اصرار کا بڑا عمل دخل تھا۔

☆......آخری ایام......اور وفات:

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ کے دوران مسلسل قابلِ قدر خدمات انجام دیتے رہے......اور پھر آپؐ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دور میں بھی ان کی طرف سے ناقابلِ فراموش خدمات کا یہ طویل سلسلہ جاری رہا، جس کی وجہ سے انہیں ہمیشہ انتہائی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا رہا......لیکن اس کے باوجود ان کی کیفیت یہ تھی کہ مزاج پر ہمیشہ رقت طاری رہتی تھی، خشیتِ الٰہیہ اور فکرِ آخرت کا غلبہ رہتا تھا، ہر وقت یہی فکر دامن گیر رہا کرتی تھی کہ اللہ کی طرف سے کوئی مؤاخذہ نہ ہوجائے، اسی فکر اور خوف کی وجہ سے لرزاں وترساں رہا کرتے تھے، تادمِ زیست یہی کیفیت طاری رہی، بالخصوص آخری ایام میں یہ کیفیت مزید شدت اختیار کرگئی......

آخری عمر میں انہوں نے شہر کوفہ میں مستقل رہائش اختیار کرلی تھی، جہاں رفتہ رفتہ ضعف اور بڑھاپے کی وجہ سے ان کی طبیعت ناساز رہنے لگی تھی......

آخرایک بار رات کے آخری پہر طلوعِ فجر سے کچھ قبل ان کی طبیعت زیادہ ناساز ہوگئی، تب ان کے پڑوسی بڑی تعداد میں ان کی خبرگیری کیلئے وہاں پہنچنے لگے، جن میں متعدد صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین بھی شامل تھے، جوانہی کی طرح مستقل طور پر کوفہ میں آباد ہو گئے تھے۔

حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ نے اپنے ان تیمارداروں کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے دریافت فرمایا ''یہ کون سا وقت چل رہا ہے؟

جواب دیا گیا ''صبح طلوع ہونے ہی والی ہے''

یہ سن کر فرمایا: أعُوذُ بِاللّٰہِ مِن صُبحٍ یُفضي بي اِلیٰ النّار "یعنی ''میں اللہ کی پناہ طلب کرتا ہوں ایسی صبح سے جو مجھے جہنم کی آگ تک پہنچانے کا سبب بن جائے''

اور پھر وصیت کرتے ہوئے فرمایا: لَاتُغَالُوا بِالأکفَانِ ، فَاِن یَکُن لِي عِندَ اللّٰہِ خَیراً بُدِّلتُ بِہٖ خَیراً ، وَاِن کَانَتِ الأخرَیٰ سُلِبَ مِنِّي ذٰلِکَ ۔ یعنی ''میرے کفن کیلئے کسی قیمتی کپڑے کا انتظام نہ کرنا، کیونکہ اگر اللہ کے پاس میرے لئے خیروخوبی ہوئی تو مجھے وہاں بہت بہتر نصیب ہوجائے گا، اور اگر وہاں میرے لئے (خیروخوبی کی بجائے) کچھ اور معاملہ ہوا، تو یہ قیمتی کفن میرے کسی کام نہیں آسکے گا''

یوں بالکل آخری وقت میں بھی یہی پیغام دے گئے کہ دنیاوی مال ومتاع سب عارضی وفانی ہے، جبکہ آخرت کی راحت وکامیابی دائمی وابدی ہے، وہاں کی نعمتیں لازوال ہیں، لہٰذا آخرت کی کامیابی کی فکر زیادہ ہونی چاہئے، دنیا میں اگر کسی کو بڑے قیمتی اور نفیس قسم کے کفن میں لپیٹ کر سفرِ آخرت پر روانہ کیا گیا ہو، لیکن وہاں اس کیلئے راحت کی بجائے کچھ اور معاملہ ہو، تو یہ قیمتی کفن کس کام آسکے گا......؟ جبکہ اگر انسان کا عمل درست ہو، اور اس کی

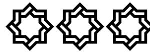
آخرت اچھی ہو، تو پھر مہنگے اور نفیس کفن کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے......!

اور پھر اس نصیحت کے فوری بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا۔

۳۶ھ کے بالکل ہی ابتدائی ایام چل رہے تھے، اُسی دن یہ خبر کوفہ پہنچی تھی کہ مدینہ میں خلیفۂ سوم حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ کی شہادت (جو کہ ۱۸/ ذوالحجہ بروز جمعہ ۳۵ھ کو ہوئی تھی) کے بعد اب خلیفۂ چہارم کی حیثیت سے حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ نے منصبِ خلافت سنبھال لیا ہے...... یہ خبر جس روز کوفہ پہنچی تھی اسی روز وہاں کوفہ میں ان کا انتقال ہوا تھا۔

یوں رسول اللہ ﷺ کے یہ جلیل القدر صحابی حضرت حذیفہ بن الیمان رضی اللہ عنہ اس دنیائے فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔

اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمدللہ آج بتاریخ ۵/ جمادیٰ الاَولیٰ ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲۴/ فروری ۲۰۱۵ء بروز منگل یہ باب مکمل ہوا۔

رَبَّنَا تَقَبَّل مِنَّا اِنّکَ أنتَ السَّمِیعُ العَلِیمُ ، وَتُب عَلَینَا اِنَّکَ أنتَ التَوَّابُ الرَّحِیمُ

حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ:

مکہ شہر میں جب دینِ اسلام کا سورج طلوع ہوا' اوراللہ عزوجل کی جانب سے رسول اللہ ﷺ کوتمام دنیائے انسانیت کیلئے رہبرورہنما کی حیثیت سے مبعوث فرمایا گیا......تب مکہ سے بہت دور مدینہ (جسے اُس دور میں یثرب کہا جاتا تھا) میں مشہور ومعروف خاندان ''بنوسَلَمَہ'' سے تعلق رکھنے والا معاذ بن جبل نامی یہ شخص بالکل ہی نوجوان تھا، اپنے ہم عمر نوجوانوں میں اسے اپنی فہم وفراست' فصاحت وبلاغت' قوتِ بیان' نیز جرأت وشجاعت کے لحاظ سے منفرد اور ممتاز مقام ومرتبہ حاصل تھا، مزید یہ کہ اس کے سراپا اور رنگ وروپ میں فطری طور پر کچھ ایسی کشش تھی کہ جس کی وجہ سے اس معاشرے میں اس کی شخصیت مزید اہمیت اختیار کرگئی تھی، گویا یہ ہر دلعزیز قسم کا نوجوان تھا۔

یہ تقریباً اُن دنوں کی بات ہے کہ جب دعوتِ حق کے سلسلے میں رسول اللہ ﷺ کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں نبوت کے گیارہویں سال حج کے موقع پر منیٰ میں ''یثرب'' یعنی مدینہ سے تعلق رکھنے والے چھ افراد مشرف باسلام ہوئے تھے، اور پھر اس کے اگلے سال یعنی نبوت کے بارہویں سال حج کے موقع پر منیٰ میں ہی آپؐ کی دعوتِ حق پر لبیک کہتے ہوئے مدینہ سے تعلق رکھنے والے بارہ افراد نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خفیہ ملاقات کی تھی، نیز اس موقع پر انہوں نے آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی، جسے بیعتِ عقبہ اُولیٰ کہا جاتا ہے۔

اس موقع پر انہوں نے گذارش کی تھی کہ ''اے اللہ کے رسول! آپ اپنے ساتھیوں میں سے کسی کو ہمارے ساتھ مدینہ روانہ فرمائیے......تاکہ وہ وہاں ہمیں اللہ کے دین کی تعلیم دے

سکے''

اس پر آپؐ نے اپنے نوجوان صحابی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کو ان کے ہمراہ مدینہ روانہ فرمایا تھا، یوں حضرت مصعبؓ رسول اللہ ﷺ کے اولین سفیر اور نمائندے کے طور پر' نیز معلم و مربی کی حیثیت سے مدینہ پہنچے تھے۔

مدینہ پہنچنے کے بعد ان کی محنت وکوشش اور دعوتی سرگرمیوں کے نتیجے میں اب وہاں بڑی سرعت کے ساتھ دینِ اسلام کی نشر واشاعت ہونے لگی تھی، دینِ اسلام' اور پیغمبرِ اسلام کے چرچے گھر گھر ہونے لگے تھے، اور یوں بہت جلد مدینہ شہر ''لا الٰہ الا اللہ'' کے نور سے جگمگانے لگا تھا......

چنانچہ انہی دنوں ایک بار مدینہ کے کسی محلے میں نوجوان (مُعاذ بن جبل) نے بھی حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی گفتگو سنی تھی جو کہ اس کے دل میں اترتی چلی گئی تھی، اور تب اس نوجوان نے اپنے آبائی دین یعنی کفر وشرک سے توبہ کر کے دینِ برحق قبول کر لیا تھا۔

اور پھر نبوت کے تیرہویں سال حج کے موقع پر مدینہ سے آئے ہوئے حجاج میں سے بہتّر افراد نے منیٰ میں عقبہ کے مقام پر جب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ خفیہ ملاقات' نیز آپؐ کے دستِ مبارک پر بیعت بھی کی تھی' جسے ''بیعتِ عقبہ ثانیہ'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے، تب ان بہتّر خوش نصیب افراد میں یہ نوجوان معاذ بن جبل بھی شامل تھا، یہی وہ یادگار موقع تھا کہ جب اس نوجوان کو زندگی میں پہلی بار رسول اللہ ﷺ کا دیدار اور شرفِ ملاقات نصیب ہوا تھا...... یہ نوجوان اپنی زندگی کے اس یادگار ترین لمحے کو تادمِ آخر کبھی بھلا نہیں سکا تھا...... کہ جب اس نے شدتِ جذبات سے لرزتا ہوا اپنا ہاتھ رسول اللہ ﷺ کے دستِ مبارک کی طرف بڑھایا تھا......اور پھر بیعت کی تھی......

یہی وہ تاریخی لمحہ تھا کہ جب مدینہ کا یہ نوجوان معاذ بن جبل اب ہمیشہ کیلئے بدل گیا تھا...... اب یہ رسول اللہ ﷺ کے انتہائی جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ تھے، جو اُن عظیم ترین انسانوں میں سے تھے جن کی مخلصانہ دعوت اور پرزور اصرار کے نتیجے میں ہی ''ہجرتِ مدینہ'' کا تاریخی واقعہ پیش آیا تھا، اور پھر مسلمانوں کے حالات ہمیشہ کیلئے بدل گئے تھے، ایک نئی زندگی کا آغاز ہوا تھا......ایسی زندگی......جو ہر لحاظ سے مکی زندگی سے یکسر مختلف تھی۔

بیعتِ عقبہ ثانیہ کے بعد حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب اپنے ساتھیوں کے ہمراہ مکہ سے واپس مدینہ لوٹے، تب انہوں نے اپنے ہم عمر نوجوان ساتھیوں اور دوستوں کی مدد سے مدینہ میں یہ عجیب وغریب مشغلہ اپنایا کہ یہ لوگ رات کے اندھیرے میں خفیہ طور پر لوگوں کے گھروں سے ان کے بتوں کو اٹھا کر کہیں غائب کر دیا کرتے تھے......لوگوں کے گھروں سے یوں اچانک ان کے خداؤں (بتوں) کا غائب ہو جانا...... یہ چیز ان لوگوں کیلئے بڑی پریشانی اور غصے کا باعث تھی......لیکن یہ صورتِ حال جہاں ایک طرف ان لوگوں کیلئے بہت زیادہ غصے اور جھنجھلاہٹ کا سبب بنی ہوئی تھی ......وہیں اس کا ایک بہت بڑا فائدہ یہ ظاہر ہوا کہ رفتہ رفتہ اب بہت سے لوگ اپنے ان خداؤں (بتوں) کی حقیقت کو اور ان کی بے بسی و بے چارگی کو سمجھنے لگے......وہ لوگ جو سالہا سال سے نسل در نسل کچھ سوچے سمجھے بغیر ان بتوں کی عبادت کرتے چلے آرہے تھے......اب ان پر یہ حقیقت منکشف ہونے لگی کہ ''یہ کیسے ہمارے خدا ہیں ......کہ جو خود اپنی ہی حفاظت نہیں کر سکتے ......تو پھر ہمیں یہ کیا دے سکتے ہیں......؟'' لہٰذا یہی چیز اب غصے اور اشتعال کی بجائے ان کے قبولِ اسلام کا سبب بننے لگی......اور یوں وہ لوگ بڑی تعداد میں دینِ اسلام قبول کرتے چلے گئے۔

اسی طرح کا ایک واقعہ جو کہ اُن دنوں بہت مشہور ہوا تھا، وہ یہ کہ مدینہ میں ''بنوسَلَمَہ'' کے نام سے ایک مشہور و معروف خاندان تھا (مسجدِ قبلتین جس جگہ واقع ہے وہیں یہ خاندان آباد تھا) عمرو بن الجموح نامی شخص اس معزز خاندان کا سربراہ تھا، جو کہ کافی صاحبِ حیثیت انسان تھا، اس نے عبادت کی غرض سے اپنا ایک خاص بت بنا رکھا تھا جو کہ کافی قیمتی اور نفیس قسم کی لکڑی کا بنا ہوا تھا (۱) جس کی وہ بہت زیادہ دیکھ بھال کیا کرتا تھا، ریشمی غلاف اسے پہنا رکھا تھا، اور صبح و شام اسے خوب عمدہ خوشبوؤں کی دھونی دیا کرتا تھا۔ (۲)

ایک روز حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی نوجوانوں نے رات کے وقت موقع پا کر اس بت کو اس کی جگہ سے اٹھالیا (۳) اور پھر اسے لے جا کر ایسی جگہ پھینک دیا جہاں اس خاندان کے لوگ کوڑا اور گندگی وغیرہ پھینکا کرتے تھے۔

اس سردار نے جب دیکھا کہ میرا بت گھر میں اپنی جگہ سے غائب ہے ......تو وہ انتہائی پریشان ہو گیا، اور اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، آخر تلاش کرتے کرتے اسے اپنا بت کوڑے کے ڈھیر پر اوندھے منہ پڑا ہوا ملا......تب اسے بہت زیادہ افسوس ہوا، اور اس بت کے ساتھ ایسا سلوک کرنے والے پر اسے بہت زیادہ غصہ بھی آیا، لہٰذا وہ بت کی طرف دیکھتے ہوئے یوں کہنے لگا ''جس کسی نے میرے اس خدا کے ساتھ یہ سلوک کیا ہے......وہ برباد ہو جائے''

(۱) مکہ چونکہ خشک اور پتھریلا علاقہ تھا لہٰذا وہاں پتھروں کو تراش کر بت بنائے جاتے تھے، جبکہ مدینہ زرعی اور زرخیز علاقہ تھا لہٰذا یہاں اکثر لکڑی کے بت ہوا کرتے تھے۔

(۲) اُس معاشرے میں جو سردار اور صاحبِ حیثیت قسم کے لوگ ہوا کرتے تھے وہ اپنے لئے خصوصی طور پر قیمتی اور عمدہ لکڑی کے بت بنوایا کرتے تھے، لہٰذا عمرو بن الجموح نے بھی ایک ایسا ہی قیمتی بت بنوا رکھا تھا۔

(۳) اُس زمانے میں گھر سیدھے سادھے ہوں گے، کوئی خاص پہرہ یا معقول حفاظتی انتظام بھی نہیں ہوگا۔

اور پھر اسے وہاں سے اٹھا کر وہ واپس اپنے گھر لایا، نہلا دھلا کر صاف ستھرے نئے ریشمی کپڑے پہنائے، خوب عمدہ خوشبو بھی لگائی......اور نہایت احترام کے ساتھ اسے اس کی مخصوص جگہ پر سجا کر رکھ دیا، اور پھر خوب گڑگڑا کر اس سے معذرت کرتے ہوئے اور معافی مانگتے ہوئے یوں کہنے لگا ''کاش اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ یہ حرکت کس نے کی ہے تو میں اس کا برا حال کر ڈالوں......''

اس کے بعد جب دوسرا دن گذرا اور رات کا اندھیرا پھیل گیا......تب حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی زیرِ قیادت نوعمر لڑکوں کا وہی گروہ پھر اُسی طرح چھپتا چھپاتا عمرو بن الجموح کے گھر جا پہنچا، جہاں سے انہوں نے اس بت کو اٹھایا، اور اس بار کوڑے کیلئے مخصوص ایک دوسری جگہ پر لے جا کر اسے پھینک دیا......

صبح جب بوڑھا سردار نیند سے بیدار ہوا تو اسے پھر وہی کیفیت نظر آئی، یعنی اس کا خدا گھر سے غائب تھا......لہٰذا آج پھر وہ اس کی تلاش میں نکل کھڑا ہوا، پہلے تو سیدھا اسی جگہ پہنچا جہاں اسے کل یہ بت پڑا ہوا ملا تھا، لیکن آج وہاں اسے مایوسی ہوئی، لہٰذا مسلسل تلاش کے بعد آخر دوسرے ایک مقام پر اسے وہ غلاظت کے ڈھیر پر پڑا ہوا ملا، کل سے بھی زیادہ بری حالت میں......

تب وہ حسبِ سابق اسے لئے ہوئے واپس اپنے گھر پہنچا، جہاں پہلے تو اس نے اسے نہلا دھلا کر صاف ستھرا کیا، ریشمی لباس پہنایا، خوب عمدہ خوشبو لگائی......لیکن اتنا کرنے کے بعد آج اس سے معافی مانگنے کی بجائے اس نے یہ کیا کہ اپنی تلوار اس کی گردن میں لٹکا دی، اور اسے مخاطب کرتے ہوئے یوں کہا ''مجھے نہیں معلوم کہ تمہارے ساتھ یہ حرکت کون کرتا ہے؟ لہٰذا اگر تم کسی قابل ہو......تو آئندہ اپنی حفاظت خود کر لینا......اس لئے میں نے اپنی

یہ تلوار تمہارے حوالے کردی ہے''

اس کے بعد جب رات ہوئی تو یہی نوعمر لڑکے پھر وہاں پہنچ گئے، بوڑھے سردار کو دیکھا کہ خوب گہری نیند سو رہا ہے، تب وہ سیدھے اس بت کے قریب پہنچے، اس کے گلے میں لٹکی ہوئی تلوار اتاری، اور پھر اسے ہمراہ لئے ہوئے روانہ ہوگئے......حسبِ سابق کوڑے کے ایک ڈھیر کے قریب جب پہنچے تو اتفاقاً انہیں وہاں ایک مرا ہوا کتا نظر آیا، تب انہوں نے رسی کے ذریعے اس بت کو اُس مردہ کتے کے ساتھ باندھ دیا، یعنی اب یہ بت اور مردہ کتا دونوں ساتھی ہوگئے......ایک ہی رسی میں بندھے ہوئے......

جب صبح کا سورج طلوع ہوا، بوڑھا سردار اپنے بت کی تلاش میں نکلا......حسبِ سابق اس بار بھی اسے اپنا بت کوڑے کے ڈھیر پر ہی ملا، البتہ اس بار مزید افسوسناک منظر اس نے یہ دیکھا کہ اس کا بت اور کتا دونوں ایک ساتھ رسی میں بندھے ہوئے اوندھے منہ پڑے ہیں اور کیفیت یہ ہے کہ بت کا منہ مردہ کتے کے جسم کو چھو رہا ہے......

بوڑھے سردار نے جب یہ حال دیکھا تو اپنے بت کو مخاطب کرتے ہوئے بڑی ہی حسرت کے ساتھ یوں کہنے لگا'' آہ......اگر تُو واقعی خدا ہوتا تو آج تُو اور یہ مردار کتا دونوں گندگی کے اس ڈھیر پر یوں ایک ساتھ نہ پڑے ہوتے''

چنانچہ اپنے بت کی اس قدر بے چارگی و بے بسی دیکھنے کے بعد اب اسے شدت کے ساتھ یہ احساس ہونے لگا کہ ''جو خود اپنے لئے خیر اور شر کا مالک نہیں......وہ کسی اور کے کس کام آئیگا؟''

اور پھر بالآخر عمرو بن الجموح نامی اس سردار نے دینِ اسلام کے بارے میں معلومات حاصل کیں......جن سے متأثر ہونے کے بعد اب دینِ برحق قبول کرلیا، یوں مدینہ میں

جہاں مسجدِ قبلتین موجود ہے، اس مقام پر آباد مشہور خاندان بنوسَلِمَہ کے یہ سرداراب رسول اللہ ﷺ کے صحابی ''حضرت عمرو بن الجموح رضی اللہ عنہ'' بن گئے۔ اوران کے اس قبولِ اسلام کے پیچھے......توفیقِ الٰہی کے بعد......حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اوران کے نوعمر ساتھیوں کی گذشتہ سطور میں بیان کی گئی کوشش ہی کا عمل دخل تھا۔

☆......شب وروز کا یہ سفر جاری رہا......آخر رسول اللہ ﷺ جب ہجرت فرما کر مکہ سے مدینہ تشریف لائے، تب نوجوان معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی کیفیت یہ رہنے لگی کہ ہمہ وقت سائے کی مانند آپؐ کی صحبت ومعیت میں رہتے، بالخصوص یہ کہ فطری طور پر ہی چونکہ استعداد وصلاحیت اور ذہانت وفطانت میں ان کی ممتاز حیثیت تھی......لہٰذا آپؐ کی خدمت میں رہتے ہوئے اب یہ ہمہ وقت تحصیلِ علمِ دین اور کسبِ فیض میں مشغول ومنہمک رہنے لگے......

رسول اللہ ﷺ بھی نوجوان معاذ بن جبلؓ کی علمی استعداد' ذہنی صلاحیت' نیز شوق وجستجو کو دیکھتے ہوئے ہمیشہ ان کے ساتھ نہایت ہی شفقت وعنایت کا معاملہ فرماتے تھے، بالخصوص یہ کہ آپؐ نے متعدد مواقع پر انہیں انتہائی کارآمد اور مفید ونافع قسم کی وصیتیں اور نصیحتیں بھی فرمائیں۔

مثلاً ایک بار رسول اللہ ﷺ نے نہایت ہی شفقت کے ساتھ ان کا ہاتھ تھامتے ہوئے ارشادفرمایا: يَـا مُعَاذ! وَاللّٰهِ اِنّي لَأُحِبُّكَ ۔ یعنی ''اے معاذ! اللہ کی قسم میں تم سے محبت کرتا ہوں'' اس کے بعد فرمایا: أُوصِيكَ يَـا مُـعَـاذ! لَاتَـدَعَـنَّ فِـي دُبُرِ كُلِّ صَلَاةٍ تَقُول: ((اَللّٰهُمَّ أَعِنِّي عَلَىٰ ذِكرِكَ وَشُكرِكَ وَحُسنِ عِبَادَتِكَ))(۱)

(۱) ابوداؤد [۱۵۲۲] امام نووی نے یہ حدیث ریاض الصالحین میں باب (نمبر ۲۴۴) فضل الذکر والحث علیہ میں ذکر کی ہے۔ [حدیث نمبر ۱۴۲۳]۔

یعنی ''اے معاذ! میں تمہیں یہ وصیت کرتا ہوں کہ تم ہر نماز کے بعد یہ کلمات کہنا کبھی ترک نہ کرنا (اَللّٰھُمَّ أعِنِّي عَلَىٰ ذِكرِكَ وَشُكرِكَ وَحُسنِ عِبَادَتِكَ)

(اے اللہ! تو میری مدد فرما اپنے ذکر، اپنے شکر، اور اچھے طریقے سے اپنی عبادت کرنے پر) یعنی: ''اے اللہ تو میری مدد فرما تاکہ میں تیرا ذکر کرتا رہوں، تیرا شکر گذار بنا رہوں، اور خوب اچھی طرح تیری عبادت کیا کروں''۔

رسول اللہ ﷺ کا اس طرح معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا ہاتھ تھامنا، اور یوں شفقت ومودّت کا اظہار...... حالانکہ آپ ﷺ کو تو اللہ عزوجل کی جانب سے انتہائی اعلیٰ وارفع مقام ومرتبے سے نوازا گیا، آپؐ تو خیر البشر، سید الأولین والآخرین، اور افضل الأنبیاء والمرسلین تھے...... اس کے باوجود آپؐ کا اپنے ایک امتی کے ساتھ یہ اندازِ گفتگو...... یقیناً یہ آپؐ کے بلند اخلاق کا، نیز آپؐ کے قلبِ مبارک میں اپنی امت کیلئے خیر خواہی اور شفقت ورحمت کے جذبات کا ایک مظہر تھا (۱) مزید یہ کہ اس سے اس قدر ومنزلت کا اظہار ہوتا ہے جو آپؐ کے قلبِ مبارک میں حضرت معاذ بن جبلؓ کیلئے تھی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے جو بے مثال علمی استعداد اور صلاحیت وقابلیت عطاء کی گئی تھی، نیز رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ان کا جو والہانہ تعلقِ خاطر تھا اور آپؐ کی مجلس میں مسلسل حاضری اور کسبِ فیض کا جو سلسلہ تھا...... اسی کا یہ نتیجہ تھا کہ علم ومعرفت کے میدان میں انہیں نہایت بلند ترین مقام ومرتبہ نصیب ہوا، حتیٰ کہ ایک بار خود رسول اللہ ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا: أعلَمُهُم بِالحَلَالِ وَالحَرَامِ مُعَاذُ بن جَبَل۔ (۲) یعنی ''میری امت میں حلال وحرام کے بارے میں سب سے زیادہ علم رکھنے

---

(۱) جیسا کہ آپ ﷺ کے بارے میں قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿لَقَد جَاءَكُم رَسُولٌ مِّن أنفُسِكُم ...... بِالمُؤمِنِينَ رَؤُوفٌ رَّحِيمٌ﴾ (التوبہ: ۱۲۸)

(۲) ترمذی [۳۷۹۰] ابن ماجہ [۱۵۴]

والے معاذ بن جبل ہیں"

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یہ شرف بھی حاصل تھا کہ یہ اُن چند گنے چنے افراد میں سے تھے جن سے رسول اللہ ﷺ وحی لکھوایا کرتے تھے، یعنی "کاتبینِ وحی" میں سے تھے، جس سے یقیناً یہ بات واضح وثابت ہوتی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے نزدیک یہ انتہائی قابلِ اعتماد تھے، لہٰذا یہی وجہ تھی کہ آپؐ کے صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی برگزیدہ جماعت میں اوراس تمام معاشرے میں حضرت معاذ بن جبلؓ کی خاص حیثیت تھی اورانہیں بڑی ہی قدرومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے اسی علمی مقام ومرتبے کومدِنظر رکھتے ہوئے خود رسول اللہ ﷺ اور پھر آپؐ کے بعد خلفائے راشدین بھی علمی معاملات میں ہمیشہ ان کی خدمات حاصل کرتے رہے۔

چنانچہ ماہِ رمضان ۸ ھ میں فتحِ مکہ کے یادگار واقعے کے نتیجے میں جب قریش مکہ بہت بڑی تعداد میں فوج درفوج دینِ اسلام قبول کرنے لگے، تب اس صورتِ حال کے پیشِ نظر آپؐ نے بڑی شدت کے ساتھ اس بات کو محسوس فرمایا کہ اتنی بڑی تعداد میں ان نومسلموں کی دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کیلئے کوئی انتظام بہت ضروری ہے۔

چنانچہ اس مقصد کیلئے آپؐ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو فتحِ مکہ کے بعد وہاں اولین معلم ومربی کی حیثیت سے مقرر فرمایا، چنانچہ رسول اللہ ﷺ کی اپنے لشکر سمیت مکہ سے مدینہ کی جانب واپسی کے بعد بھی کافی عرصے تک یہ وہاں مکہ میں تعلیم وتربیت کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیتے رہے۔

اسی طرح جب ملکِ یمن کے بہت سے علاقے فتح ہو چکے جس کے نتیجے میں نہایت سرعت

کے ساتھ وہاں دینِ اسلام کی نشرواشاعت ہونے لگی ......تب وہاں بڑی تعداد میں ان نومسلموں کی طرف سے بکثرت اس قسم کے پیغام موصول ہونے لگے جن میں ان کی طرف سے رسول اللہ ﷺ کی خدمتِ اقدس میں یہ گذارش کی گئی تھی کہ ''ہماری دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کی غرض سے چند مناسب افراد کو ہماری طرف روانہ کیا جائے......''

اس موقع پربھی آپؐ نے اپنے جلیل القدر صحابۂ کرام میں سے چند حضرات کواس کام کیلئے منتخب فرمایا، اوران سب کا سربراہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کومقرر فرمایا۔

اور جب ان حضرات کی روانگی کا وقت آیا، تب رسول اللہ ﷺ بذاتِ خود انہیں رخصت کرنے کی غرض سے کچھ دور تک ان کے ہمراہ چلتے رہے، اس موقع پر آپؐ کی کیفیت یہ تھی کہ آپؐ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کی سواری کے ہمراہ پیدل چل رہے تھے، جبکہ حضرت معاذؓ سوار تھے...... یہانتک کہ اسی کیفیت میں چلتے چلتے کافی دور نکل آئے......اور پھر ایک جگہ پہنچ کر آپؐ رک گئے، اور حضرت معاذؓ کی جانب متوجہ ہوتے ہوئے استفسار فرمایا: بِمَ تَقْضِي بَينَهُم يَا مُعَاذ؟ یعنی ''اے معاذ! تم اُن (یمن والوں) کے درمیان کس چیز کے مطابق فیصلے کیا کروگے؟'' عرض کیا ''اللہ کی کتاب کے مطابق'' آپؐ نے دریافت فرمایا ''اگر تمہیں وہ مسئلہ اللہ کی کتاب میں نہیں ملا، تب کیا کروگے؟'' عرض کیا ''تب اللہ کے رسولؐ کی سنت کے مطابق......'' آپؐ نے دریافت فرمایا ''اگر اللہ کے رسولؐ کی سنت میں بھی نہیں ملا، تب کیا کروگے؟'' عرض کیا ''تب میں اجتہاد کروں گا'' اس پر آپؐ نے نہایت مسرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ ارشاد فرمایا:

اَلحَمدُلِلّٰهِ الّذِي وَفَّقَ رَسُولَ رَسُولِ اللّٰهِ ۔ (۱) یعنی ''اللہ کا شکر ہے کہ اس نے

(۱) ترمذی[۱۳۲۷] باب ماجاء فی القاضی کیف یقضی۔

اپنے رسول کے قاصد کو توفیق عطاء فرمائی'' (یعنی اسے درست بات سُجھائی......)

اور پھر رسول اللہ ﷺ کی طرف سے اس مسرت واطمینان کے اظہار کے فوری بعد ہی ان الوداعی لمحات میں کچھ ایسی گفتگو ہوئی جس کی وجہ سے اب مسرت کی بجائے کچھ صدمے اور رنج وغم کا ماحول بن گیا...... ہوا یہ کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو رخصت کرتے ہوئے بالکل ہی آخری لمحات میں یوں ارشاد فرمایا: يَا مُعَاذ! إنَّكَ عَسَىٰ أن لَاتَلْقَانِي بَعدَ عَامِي هٰذَا ...... یعنی ''اے معاذ! شاید آج کے بعد تمہاری مجھ سے کبھی ملاقات نہیں ہو سکے گی......''

اور پھر پیچھے مدینہ کی جانب مڑ کر بغور دیکھتے ہوئے ارشاد فرمایا: وَلَعَلَّكَ تَمُرُّ بِمَسجِدِي وَقَبْرِي ......(۱) یعنی ''شاید تم میری مسجد اور میری قبر کے قریب سے گذرو گے''

(مقصد یہ کہ آج تک تو ہمیشہ کیفیت یہ رہی تھی کہ تم جب بھی میری اس مسجد میں آیا کرتے تھے تو وہاں مجھ سے ملاقات ہوا کرتی تھی، لیکن اب اس سفر سے واپسی پر جب تم میری مسجد میں پہنچو گے تو وہاں مجھ سے ملاقات کی بجائے تم فقط میری قبر ہی دیکھ سکو گے)

رسول اللہ ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ گفتگو سننے کے بعد حضرت معاذؓ پھوٹ پھوٹ کر رو دیئے......تب ان کے سبھی ساتھی بھی رونے لگے......(۲)

رسول اللہ ﷺ نے جب ان حضرات کو یوں رنجیدہ وافسردہ دیکھا تو اب ان کی دلجوئی کی

(۱) مسند امام احمد [۲۱۸۳]

(۲) حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اس سفر پر رخصت کرتے وقت رسول اللہ ﷺ نے اس جہانِ فانی سے خود اپنی رخصتی کے بارے میں بھی یہ جو خبر دی تھی......یوں یہ ''الوداع'' دو طرفہ بن گیا تھا......نہ جانے اس بات میں کیا تاثیر ہے کہ اسی بات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میں نے بھی اس کتاب میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا تذکرہ بالکل آخر میں (اس کتاب کیلئے بطور ''الوداع'') رکھا ہے......اللہ ہم سب پر خاص رحم فرمائے۔

خاطر آپؐ نے ارشادفرمایا: اِنّ أولَیٰ النّاسِ بِي المُتَّقُونَ ، مَن کَانُوا وَحَیثُ کَانُوا (۱) یعنی ''میرے ساتھ سب سے زیادہ تعلق والے تو بس ''متقین'' ہی ہیں، وہ جوکوئی بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں'' (۲)

اور پھر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ وہاں سے اس طویل ترین سفر پر روانہ ہوگئے......مدینہ سے یمن......محض اللہ کے دین کی خدمت اوراس کی نشر واشاعت کی خاطر......

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھیوں کی اس سفر پر روانگی کے بعد رسول اللہ ﷺ کی طرف سے انہیں دی گئی اطلاع درست ثابت ہوئی، چنانچہ حضرت معاذؓ کی یمن سے واپسی سے قبل ہی آپؐ اپنے اللہ سے جا ملے، حضرت معاذؓ کی رسول اللہ ﷺ کے ساتھ جوالوداعی ملاقات ہوئی تھی......واقعی وہ ہمیشہ کیلئے ''الوداعی'' ثابت ہوئی، حضرت معاذؓ کو

(۱) مسند امام احمد [۲۱۸۳]

(۲) یعنی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ اوران کے ساتھی مدینہ منورہ سے بہت دوراب ملکِ یمن کی جانب عازمِ سفر تھے اس موقع پر رسول اللہ ﷺ نے جب انہیں رخصت کرتے وقت یہ اطلاع دی کہ آپ جب یمن سے واپس آئیں گے تو مجھ سے ملاقات نہیں ہو سکے گی......اس پر یہ حضرات چونکہ انتہائی دل گرفتہ اور غمگین ہوگئے تھے......لہٰذا اب ان کی اس کیفیت کو دیکھتے ہوئے آپؐ نے ان کیلئے بطورِ تسلی یہ ارشادفرمایا کہ ''میرے ساتھ سب سے زیادہ تعلق والے تو بس ''متقین'' ہی ہیں، وہ جوکوئی بھی ہوں اور جہاں کہیں بھی ہوں'' یعنی آپ حضرات اگرچہ بہت دور جارہے ہیں......لیکن غم کی اورفکر کی کوئی ضرورت نہیں......کیونکہ آپ حضرات جب ''تقویٰ'' وپرہیزگاری کی دولت سے مالامال ہیں......تو بس پھر میرے ساتھ آپ کا تعلق تو ہمیشہ ہی برقرار رہنے والا ہے، خواہ آپ حضرات دور ہوں، یا قریب ہوں، اس سے کوئی فرق پڑنے والا نہیں۔

اسی مناسبت سے یہ اشارہ بھی ہوجائے کہ اگر ہمارے دلوں میں رسول اللہ ﷺ کیلئے عقیدت ومحبت کے جذبات ہیں، اورہم روزِ قیامت آپؐ کا قرب، آپؐ کی شفاعت، نیز جنت میں آپؐ کی صحبت ومعیت کے آرزومند ہیں......تو پھر ہمیں بھی اس مقصد کیلئے ''تقویٰ'' کے معاملے میں اپنی کیفیت کا جائزہ لینا ہوگا......

اس کے بعد کبھی رسول اللہ ﷺ کا دیدار نصیب نہیں ہوسکا، یمن سے واپس مدینہ آمد کے بعد اب ان کی اداس اور بے رونق نگاہیں رسول اللہ ﷺ کو تلاش کرتی رہیں، مسجدِ نبوی میں' مدینہ کے گلی کوچوں میں' ہر جگہ' نگری نگری اور بستی بستی' اب معاذؓ کی آنکھیں اس عظیم شخصیت کے دیدار کیلئے تاحیات بس ترستی ہی رہیں کہ جس کا دیدار اب ممکن نہیں تھا، وہاں اب رسول اللہ ﷺ نہیں تھے، اب فقط آپؐ کی یادیں' آپؐ کی باتیں' اور آپؐ کی نشانیاں باقی تھیں۔

حضرت مُعاذ بن جبل رضی اللہ عنہ عہدِ نبوی کے بعد:

رسول اللہ ﷺ کا مبارک دور گذر جانے کے بعد خلیفۂ اول حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہمیشہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کے ساتھ انتہائی عزت واحترام سے پیش آتے رہے، نیز امتِ مسلمہ اور ملک وملت کی بہتری کیلئے ان کی علمی استعداد سے خوب استفادہ کرتے رہے، اور پھر یہی کیفیت خلیفۂ دوم حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کے زمانۂ خلافت میں بھی جاری رہی۔

خلیفۂ دوم کے زمانۂ خلافت میں ایک بار ایسا ہوا کہ ملکِ شام میں ان کی طرف سے مقرر کردہ والی (گورنر) یزید بن ابی سفیانؓ نے ان کے نام خط میں یہ پیغام تحریر کیا کہ ''اے امیر المؤمنین! شام بہت وسیع وعریض علاقہ ہے، یہاں اب مسلمانوں کی تعداد بھی بہت بڑھ چکی ہے، لہٰذا یہاں ایسے افراد کی شدید اور فوری ضرورت ہے جو دینی تعلیم وتربیت اور رہبری ورہنمائی کا فریضہ سرانجام دے سکیں''

اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے ساتھیوں میں سے پانچ افراد کے ساتھ اس سلسلے میں مشورہ کیا، اور اس مشاورت کی غرض سے انہی پانچ افراد کے انتخاب کی وجہ یہ بیان کی کہ ''آپ حضرات کاتبینِ وحی میں سے ہیں، لہٰذا میں نے ضروری سمجھا کہ میں اس سلسلے میں

آپ حضرات سے ہی مشاورت کروں''

وہ پانچ افراد یہ تھے: حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ۔ حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ۔ حضرت اُبی بن کعب رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ۔

اور پھر ان حضرات کے سامنے مدعیٰ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ ''ملکِ شام میں ہمارے مسلمان بھائی اللہ کے دین کا علم سیکھنے کی غرض سے ہم سے مدد کے طلبگار ہیں، لہٰذا میں آپ حضرات سے اس سلسلے میں مدد کا طلبگار ہوں، آپ حضرات باہم مشاورت کے بعد آپس میں سے ہی کسی تین پر اتفاق کر کے مجھے آگاہ کر دیجئے''

اور پھر مزید فرمایا ''آپ حضرات اگر چاہیں تو آپس میں قرعہ اندازی بھی کرلیں...... پھر بھی اگر بات نہ بن سکی تو پھر میں خود ہی آپ میں سے تین کا انتخاب کرلوں گا''

اس پر وہ حضرات بولے ''قرعہ اندازی کی تو کوئی ضرورت ہی نہیں ہے، کیونکہ ابوایوب کافی عمر رسیدہ ہو چکے ہیں، اُبی بن کعب اکثر بیمار رہتے ہیں، باقی رہ گئے ہم تین''

تب حضرت عمرؓ نے فرمایا ''ٹھیک ہے، آپ تینوں حضرات ملکِ شام کی جانب روانہ ہو جائیں، ابتداء میں آپ تینوں وہاں ''حمص'' میں خدمات انجام دیجئے گا، اور جب وہاں کی صورتِ حال آپ حضرات کو قابلِ اطمینان محسوس ہو، تب آپ تینوں میں سے کوئی ایک وہیں رہ جائے، ایک دِمَشق منتقل ہو جائے، اور ایک فِلَسطین چلا جائے۔

چنانچہ یہ تینوں حضرات (حضرت معاذ بن جبل، حضرت عبادہ بن الصامت (۱) اور حضرت

(۱) حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ اُمِ حرام کے شوہر تھے، اُمِ حرام اُمِ سُلَیم کی بہن تھیں، اُمِ سُلیم حضرت انس کی والدہ اور حضرت ابوطلحہ انصاری کی اہلیہ تھیں، حضرت انس حضرت ابوطلحہ انصاری کے ''ربیب'' تھے، ان جلیل القدر شخصیات میں سے اکثر کا مفصل تذکرہ اس سے قبل گذر چکا ہے۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

ابوالدرداء رضی اللہ عنہم اجمعین) جن کا شمار رسول اللہ ﷺ کے بہت ہی جلیل القدر اور عالی مرتبت صحابۂ کرام میں ہوتا تھا...... خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کی اس ہدایت پر عمل کرتے ہوئے اس طویل سفر پر (مدینہ سے ملکِ شام) روانہ ہو گئے ۔

پہلے یہ تینوں ''حمص'' پہنچے ، جہاں کچھ عرصہ یہ تینوں ہی خدمات انجام دیتے رہے ، اور پھر باہمی مشورے سے حضرت عبادہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کو وہیں چھوڑا ، جبکہ حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ وہاں سے دِمَشق کی جانب ' اور حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فِلَسطین کی جانب روانہ ہو گئے ۔

یہ اُس دور کی بات ہے جب مسلمان روئے زمین کی دونوں عظیم ترین قوتوں یعنی سلطنتِ فارس اور سلطنتِ روم کے خلاف بیک وقت مختلف محاذوں پر برسرِ پیکار تھے ، یہ دونوں قوتیں مسلمانوں کے ہاتھوں اب رُو بہ زوال ہو رہی تھیں ، ان کی شان وشوکت اور جاہ وجلال کا سورج رفتہ رفتہ اب ماند پڑتا جا رہا تھا......

سلطنتِ فارس کے خلاف محاذ پر پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ' اور پھر حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ سپہ سالاری کے فرائض انجام دے رہے تھے ، جبکہ سلطنتِ روم کے خلاف محاذ پر پہلے حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ اور اب حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ سپہ سالاری کے فرائض انجام دے رہے تھے ۔

چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جب حمص سے فِلسطین پہنچے تب سپہ سالار حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بھی وہیں تھے ، جنہوں نے ان کی وہاں آمد پر نہایت مسرت کا اظہار کیا ، اور انتہائی گرمجوشی کے ساتھ ان کا خیر مقدم کیا ، پرانے ساتھی مل بیٹھے ، اور یوں ہنسی خوشی دن گذرنے لگے ۔

لیکن اس کے بعد محض کچھ عرصہ ہی گذرا تھا کہ فلسطین کا تمام علاقہ مشہور ومعروف طاعون ''عمواس'' کی لپیٹ میں آ گیا(۱) جس کے نتیجے میں بہت بڑے پیمانے پر ہلاکتیں ہوئیں، حتیٰ کہ وہاں موجود صرف اسلامی لشکر میں سے جو افراد اس کی لپیٹ میں آنے کی وجہ سے دیکھتے ہی دیکھتے لقمۂ اجل بن گئے' ان کی تعداد پچیس ہزار تھی......جن میں سے بہت بڑی اکثریت حضرات صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی تھی......

اور پھر اسلامی لشکر کے سپہ سالار یعنی خود حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ بھی اس طاعون کا نشانہ بن گئے، اور انتقال کر گئے۔ تب ان کی نمازِ جنازہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔(۲)

حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے انتقال کے بعد خلیفۂ وقت حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے ان کی جگہ فوری طور پر حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو اسلامی لشکر کا سپہ سالار مقرر کر دیا، یعنی اب تعلیم وتربیت کے علاوہ سپہ سالاری کے فرائض بھی انہیں سونپ دیئے گئے، یوں وہاں فلسطین میں ان کی ذمہ داریاں مزید بڑھ گئیں۔

لیکن بہت جلد ہی یہ خود بھی اسی جان لیوا اور مہلک ترین وباء سے متأثر ہو گئے، اور پھر...... بس دیکھتے ہی دیکھتے دنیا سے منہ موڑ گئے۔

یوں وہاں فلسطین میں، اپنے شہر مدینہ سے بہت دور، رسول اللہ ﷺ کی مسجد سے بہت دور، اور مسجدِ قبلتین (جہاں ان کا خاندان ''بنوسَلَمَہ'' آباد تھا) سے بہت دور......اُس پردیس میں

(۱) کہا جاتا ہے کہ اس طاعون کی ابتداء چونکہ بیت المقدس کے قریب ''عمواس'' نامی بستی سے ہوئی تھی' لہٰذا اسی مناسبت سے یہ ''طاعون عمواس'' کے نام سے معروف ہو گیا، اس بارے میں مفصل تذکرہ اس سے قبل حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کے تذکرے کے ضمن میں کیا جا چکا ہے (صفحہ:۱۳۹۔۱۴۰)

(۲) حضرت ابوعبیدہ بن الجراح رضی اللہ عنہ کا مفصل تذکرہ اس سے قبل گذر چکا ہے (صفحات:۱۲۵۔۱۴۱)۔

جہاں وہ محض اللہ کے دین کی خدمت اور نشر و اشاعت کی خاطر گئے تھے، اللہ کے بندوں کو اللہ کا دین سکھانے کی غرض سے وہاں پہنچے تھے...... جو کہ یقیناً مقدس ترین فریضہ ہے، بلکہ ''پیشۂ پیغمبری'' ہے، اللہ کی رضا کی خاطر یہی مقدس ترین فریضہ سرانجام دیتے ہوئے، رسول اللہ ﷺ کے یہ انتہائی جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ۱۸ھ میں محض اڑتیس سال کی عمر میں' اس جہانِ فانی سے کوچ کرتے ہوئے اپنے اللہ سے جا ملے۔ اللہ تعالیٰ جنت الفردوس میں ان کے درجات بلند فرمائیں، نیز ہمیں وہاں اپنے حبیب ﷺ اور تمام صحابۂ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی صحبت و معیت کے شرف سے سرفراز فرمائیں۔



الحمد للہ آج بتاریخ ۱۱/ جمادی الأولیٰ ۱۴۳۶ھ، مطابق ۲/ مارچ ۲۰۱۵ء بروز پیر یہ باب مکمل ہوا۔ یوں الحمد للہ آج (بعد نمازِ مغرب) یہ کتاب بھی مکمل ہوگئی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّاُ اِنَّکَ اَنْتَ الْسَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ، وَتُبْ عَلَیْنَاُ اِنَّکَ اَنْتَ الْتَّوَّابُ الْرَّحِیْمُ،

اَللّٰھُمَّ احشُرنَا مَعَ النَّبِیّینَ وَالصِّدِّیقِینَ وَالشُّھَدَاءِ وَالصَّالِحِینَ، وَارزُقنَا صُحبَۃَ نَبِیِّکَ مُحَمَّدٍ ﷺ وَأصحَابِہٖ فِي جَنَّاتِکَ جَنَّاتِ النَّعِیم، بِرَحمَتِکَ یَا أرحَمَ الرَّاحِمِینَ،

سُبْحَانَ رَبِّکَ رَبِّ العِزَّۃِ عَمَّا یَصِفُوْنَ، وَسَلَامٌ عَلَیٰ الْمُرْسَلِیْنَ، وَالْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ.

اہم مراجع:

اس کتاب کی تیاری میں صحاحِ ستہ (کتاب الفضائل والمناقب' نیز کتاب السِیَر والمغازی) کے علاوہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا (حسبِ حروفِ تہجی):

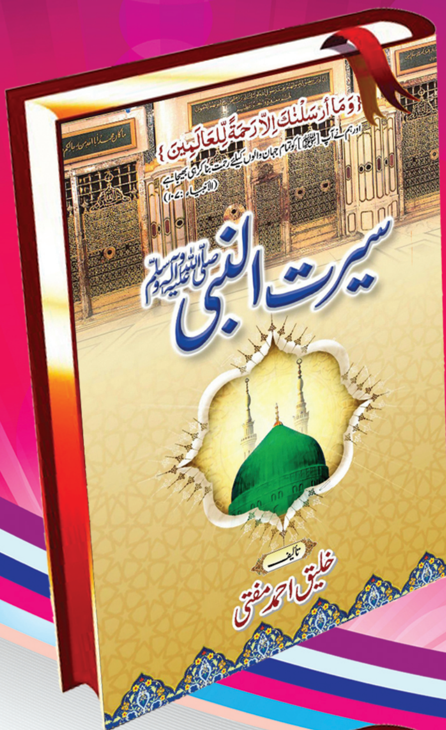
کتاب:	مؤلف:
(۱) ابوبکر الصدیق	علی طنطاوی
ناشر: دارالمنارۃ، جدہ (۱۹۸۶)	
(۲) ابوبکر الصدیق	محمد رِضا
ناشر: دارلکتب العلمیہ، بیروت (۱۹۸۳)	
(۳) البدایہ والنہایہ	ابن کثیر
ناشر: دارہجر للطباعۃ والنشر، جیزہ (۱۹۹۷)	
(۴) الاستیعاب فی معرفۃ الأصحاب	ابن عبدالبر القرطبی
ناشر: دارالاعلام، عمان (۲۰۰۲)	
(۵) الاصابۃ فی تمییز الصحابۃ	ابن حجر العسقلانی
ناشر: المکتبۃ العصریۃ، بیروت (۲۰۱۲)	
(۶) اُسدالغابۃ فی معرفۃ الصحابۃ	ابن الأثیر
ناشر: دارابن حزم، بیروت (۲۰۱۲)	
(۷) تاریخ الاسلام	شمس الدین الذہبی
ناشر: دارالکتاب العربی، بیروت (۱۹۹۰)	

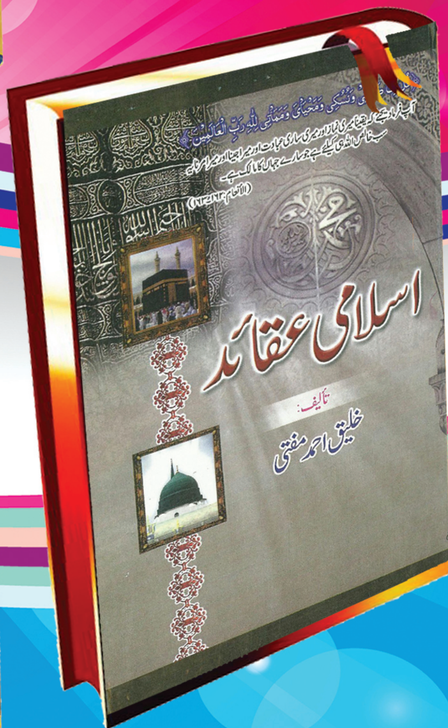
کتاب:	مؤلف:
(۸) تاریخ الخلفاء	جلال الدین السیوطی
ناشر: دار ابن حزم، بیروت (۲۰۰۳)	
(۹) تاریخ عمر بن الخطاب	ابن الجوزی
ناشر: (غیر مکتوب)	
(۱۰) رجال حول الرسول صلی اللہ علیہ وسلم	خالد محمد خالد
ناشر: دار الفکر، بیروت (۲۰۰۵)	
(۱۱) سِیَرُ أعلام النُّبلاء	شمس الدین الذہبی
ناشر: بیت الأفکار الدولیۃ (۲۰۰۴)	
(۱۲) صفۃ الصفوۃ	ابن الجوزی
ناشر: دار المعرفۃ للطباعۃ والنشر، بیروت (۱۹۸۵)	
(۱۳) صُوَر من حیاۃ الصحابۃ	عبدالرحمٰن رأفت الباشا
دار النفائس، بیروت (۱۹۹۲)	
(۱۴) الطبقات	ابن سعد
ناشر: مکتبۃ الخانجی، القاہرہ (۲۰۰۱)	

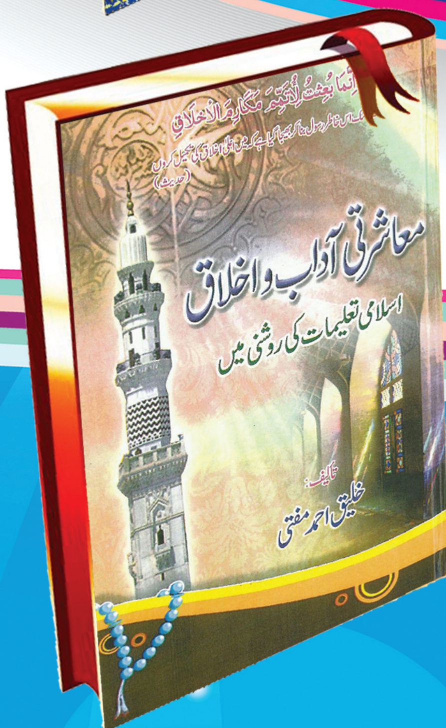
(۱۴) العشرۃ المبشرون بالجنۃ۔ تألیف: احمد سید احمد علی۔ ناشر: مکتبۃ الکویت۔

(۱۵) فضائل الصحابۃ	احمد بن حنبل
ناشر: دار ابن الجوزی، دمام (۱۹۹۹)	

(۱۶) الکامل فی التاریخ۔ ابن الأثیر۔ ناشر: دار الکتب العلمیۃ، بیروت (۱۹۸۷)


سیرت النبی ﷺ
تألیف
خلیق احمد مفتی


اسلامی عقائد
تالیف:
خلیق احمد مفتی


معاشرتی آداب و اخلاق
اسلامی تعلیمات کی روشنی میں
تالیف:
خلیق احمد مفتی


السعادة